ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت

پروفیسر محمد اسلم

ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت

پروفیسر محمد اسلم
سابق صدر شعبۂ تاریخ
پنجاب یونیورسٹی
لاہور

ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہِ پنجاب لاہور

انتشارات ادارہ تحقیقات پاکستان

شمارہ ۸۵

تشکر

ادارہ تحقیقات پاکستان متروکہ وقف املاک بورڈ حکومت پاکستان کی مالی امداد کا ممنون ہے جس کی وجہ سے ادارے کے لئے تصنیف و تالیف کا کام آسان ہو گیا ہے۔

ISBN : 969 - 425 - 084-6

طبع اول : مارچ ۱۹۹۵ء

قیمت : -/۲۴۰ روپے

طابع : ایس ۔ ایم ۔ اظہر رضوی

مطبع : اظہر سنز پرنٹرز، ۱۰۸ لٹن روڈ، لاہور

انتساب

میں اپنی اس ادنیٰ سی کاوش کو بصدِ ادب
اپنے شیخِ طریقت
حضرتِ مولانا الشاہ ابرار الحق صاحب حقی
کے نام معنون کرتا ہوں
جن سے میں نے اللہ کا نام سیکھا

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

اظہارِ تشکر

راقم الحروف نے بھارت کے متعدد اسفار میں وہاں کے مشہور کتاب خانوں میں ملفوظات کے موضوع پر مطبوعہ کتابیں اور مخطوطے تلاش کئے اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ان پر مقالے تحریر کئے۔ ان میں سے چند مقالے ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک' ماہنامہ بیّنات کراچی' ماہنامہ المعارف لاہور' ماہنامہ بُرہان دہلی' مجلّہ اقبال لاہور' اور ینٹل کالج میگزین اور ماہنامہ جامعہ محمدی شریف میں شائع ہوئے جو میں اس کتاب میں ان جرائد کے مدیرانِ محترم کے شکریے کے ساتھ شامل کر رہا ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت میں مشفق خواجہ صاحب' جناب اظہر حسن صدیقی' جنابِ محترم بی اے قریشی اور جناب میاں عبدالشکور احسن صاحب نے مختلف طریقوں سے میری مدد فرمائی جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

متروکہ وقف بورڈ نے اس کتاب کی اشاعت کے لئے خصوصی گرانٹ منظور کی۔ راقم الحروف صمیمِ قلب سے بورڈ کے کارپردازوں کا شکر گزار ہے۔ اگر یہ خصوصی گرانٹ نہ ملتی تو شاید یہ کتاب کبھی منصۂ شہود پر نہ آتی۔

جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار' ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ بھی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے مجھے یہ اجازت دی کہ میں لائبریری اوقات کے علاوہ بھی لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کر سکتا ہوں اور جب تک میں وہاں بیٹھنا چاہوں لائبریری کا سٹاف میری اعانت کے لئے موجود رہے گا۔ اسی طرح مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے سابق لائبریرین بشیر الدین صاحب اور اورینٹل سیکشن کے انچارج عبدالشاہد خان شروانی مرحوم بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے مولانا آزاد لائبریری میں میری ہر طرح سے

مدد کی۔

آخر میں میری یہ دعا ہے کہ ربِ کریم میاں غلام محمد رام گڑھی ثم حافظ آبادی کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے جن کی صحبت میں بیٹھ کر مجھے بچپن میں تصوّف کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوا۔

خادم الابرار
محمد اسلم

ندوۃ المصنفین لاہور
۲۳ اگست ۱۹۹۳ء

فہرست

ملفوظاتی ادب کی اہمیت

ملفوظات کیا ہیں؟

راقم الحروف اس کا جواب اپنے فاضل بزرگ علامہ اخلاق حسین دہلوی مدظلہ العالی سے بہتر نہیں دے سکتا۔ موصوف نے اس سوال کا جواب ان الفاظ گہربار میں دیا ہے۔ "ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں ان بیانات کا جو اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب و تحریص کے لئے صوفی بزرگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ ان میں سامعین کی استعداد کا' ان کے امراض قلبیہ کے دفعیہ کا اور ان کی رُوحانی ترقی کا پورا پورا لحاظ ہوتا ہے۔ اکابر اولیاء اللہ کا ذکر بھی آجاتا ہے' جو اثر اور تاثیر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ملفوظات کو اشارات و ارشادات اور اقوال و فوائد بھی کہتے ہیں اور ان کے مجموعوں کو کتبِ اہلِ سلوک اور کتبِ مشائخ سے تعبیر کرتے ہیں۔"

۳ شعبان ۷۰۷ھ / ۲۸ جنوری ۱۳۰۸ء کو امیر حسن علاء سجزی' سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نوّر اللہ مرقدہٗ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضرت والا قدر اس وقت حاضرین سے مصروف گفتگو تھے اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں خانقاہ کا پورا ماحول جنّت نگاہ اور فردوس گوش بنا ہوا تھا۔ معاً امیر حسن کے دل میں خیال آیا کہ اس ماحول کو الفاظ میں مقیّد کر لیں تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان رُوح پرور مناظر کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ امیر حسن کا یہ خیال ایک تاریخی فیصلہ بن گیا۔

امیر حسن علاء سجزی نے تصوف میں ایک نئی صنف ایجاد کی اور ملفوظ نویسی کی داغ بیل ڈال دی اور یہ فن تصوف کی نشر و اشاعت کا ایک مؤثر ذریعہ بن گیا۔ امیر حسن کے اس تجربے نے اہلِ قلم کو اس طرف متوجہ کیا اور اُوچہ شریف سے لے کر بہار شریف تک ملفوظات کی ترتیب و تدوین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ امیر حسن کے ایک برادر طریقت علی بن محمود جاندار نے سلطان المشائخ" کے ملفوظات دُررِ نظامی کے عنوان سے قلمبند کئے۔ حمید قلندر نے حضرت خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ کے ملفوظات خیرالمجالس کے نام سے مرتب کئے۔ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کے فرزند ارجمند سید محمد اکبر حسینیؒ نے ان کے ارشادات جوامع الکلم کے عنوان سے اور محمد علی سامانیؒ نے سیرِ محمدی کے نام سے جمع کئے۔ حضرت برہان الدین غریبؒ کی

مجالس میں ہونے والی گفتگو کو عماد کاشانی نے نفائس الانفاس کے عنوان سے اور حماد کاشانی نے احسن الاقوال کے عنوان سے ترتیب دیا۔ حضرت حمید الدین سوالی ؒ کے ملفوظات ان کے پوتے فرید الدین محمود نے سرورالصدور فی نورالبدور کے نام سے مدوّن کئے۔ اخی جمشید راجگیری ؒ کی گفتگو یحیٰی بن علی الاصغر قنوجی نے ملفوظاتِ اخی جمشید راجگیری کے عنوان کے تحت قلمبند کر لی۔

مخدوم شرف الدین احمد بن یحیٰی منیری ؒ کے ملفوظات کے دو مجموعے زین بدر عربی نے معدن المعانی اور خوان پُرنعمت کے عنوانات سے مرتب کئے۔ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت ؒ کے ملفوظات جامع العلوم کے عنوان سے علاء الدین نے اور خزانۂ جواہر جلالیہ کے نام سے فضل اللہ نے مرتب کئے۔ سید محی الدین رضوی نے ملفوظاتِ شاہ مینا لکھنوی ؒ جمع کئے اور خواجہ جمال نے حضرت سعد خیر آبادی ؒ کی مجالس میں ہونے والی گفتگو کو تحفۃ السعداء کے نام سے محفوظ کر لیا۔ محمود بن سعد ایرجی نے شیخ احمد کھٹو گنج بخش ؒ کے ملفوظات مرتب کئے۔ شیخ رکن الدین ؒ نے حضرت عبدالقدوس ؒ کی زبانِ فیض ترجمان سے نکلے ہوئے الفاظ لطائف قدوسی میں محفوظ کر لئے اور شیخ محمد بن فضل اللہ نے حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی ؒ کے ملفوظات جمع کر لیے۔ حضرت خواجہ معین الدین نقشبندی ؒ نے اپنے والد بزرگوار خواجہ خاوند محمود ؒ کے ملفوظات مراۃ طیبہ کے نام سے محفوظ کر لئے۔ محمد خان شاہ جہاں پوری نے ملفوظِ رزاقی کے عنوان سے شاہ عبدالرزاق بانسوی ؒ کے ملفوظات مرتب کئے اور شاہ روف احمد ؒ نے دُرّ المعارف کے نام سے شاہ غلام علی دہلوی ؒ کے ملفوظات مدوّن کئے۔ ان بزرگوں کے علاوہ بھی مختلف خانقاہوں میں ملفوظات کے مجموعے تیار ہوئے۔ راقم الحروف نے زیرِ نظر کتاب میں فوائد الفواد سے لے کر دُرّ المعارف کے درمیان تیار ہونے والے ملفوظات کا جائزہ لیا ہے۔ ان ملفوظات کی تلاش میں راقم الحروف نے محمد شاہ لائبریری احمد آباد' مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ' رضا لائبریری رام پور' خدا بخش اور سینٹل پبلک لائبریری پٹنہ' آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری احمد آباد' کتاب خانہ خانقاہ قلندریہ کاظمیہ کاکوری' کتاب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ' کتاب خانہ دارالعلوم دیو بند' کتاب خانہ دارالمصنفین اعظم گڑھ' کتاب خانہ مفتی نجم الحسن خیر آباد اور کتاب خانہ نورالحسن راشد کاندھلہ کے متعدد سفر کئے۔ ان ملفوظات کے مطالعہ سے تاریخ کے کئی اہم گوشے ہمارے سامنے آئے۔ راقم کی یہ دیانت دارانہ رائے ہے کہ اگر اسلامی ہند کی تاریخ مرتب کرتے وقت ان ملفوظات سے استفادہ کیا جاتا تو آج ہماری تاریخ اس تاریخ سے جو ہمارے نصاب میں شامل ہے' بالکل مختلف ہوتی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ملفوظات لٹریچر ہندوستان کی تہذیبی و فکری تاریخ کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس سے نہ صرف صوفیاء کرام کی زندگی اور ان کے افکار و

نظریات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس دور کی ذہنی فضاء، معاشی حالات، ادبی تحریکات اور سماجی رجحانات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

قرونِ وُسطیٰ کے بیشتر ہندی مؤرخین ایرانی نظریۂ تاریخ سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تاریخوں میں صرف بادشاہوں کے حالات اور جنگی مہموں کی تفصیل ملتی ہے۔ عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کی کہیں کوئی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ملفوظات ہمارے تاریخی ماخذ کی اس تکلیف دہ کمی کو ایک حد تک پورا کر دیتے ہیں۔ ان میں عوام کے دلی جذبات، ان کی پوشیدہ آرزوئیں، کشاکشِ حیات میں ہار جیت، ان کی مایوسیاں اور پریشانیاں، ان کی معصوم مسرّتیں سب ہی محفوظ ہو گئی ہیں۔

ملفوظات کا شاید ہی ایسا کوئی مجموعہ ہو جس میں احتکار کی مذمت نہ آئی ہو۔ جب تاجر پیشہ افراد کسی بزرگ کی ملاقات کو جاتے تو وہ بزرگ ان کی موجودگی میں احتکار کی مذمت ضرور کرتے تھے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ مرض قرونِ وُسطیٰ میں عام تھا۔ حضرت حمید الدین سوالیؒ فرماتے ہیں کہ محتکر کی یہ کتنی بدبختی ہے کہ لوگ قحط کے زمانے میں دانے دانے کو ترستے ہیں اور وہ ان کی مصیبت پر خوش ہوتا ہے کہ اناج کا بھاؤ بڑھ رہا ہے اور وہ خوب منافع کمائے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص دوسروں کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر خوش ہو۔

اہم تاریخی انکشافات

ملفوظات کے مطالعہ سے ایک نیا انکشاف ہوا ہے۔ مخدوم جہانیاں جس زمانے میں مدینہ طیبہ میں قیام پذیر تھے، ان دنوں انھوں نے وہاں ایک نئی رسم دیکھی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ اُحد سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو شہداء کے گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اور آہ و بکا کی آوازیں آرہی تھیں لیکن سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں خاموشی تھی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ حمزہؓ کی شہادت پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہے؟ جب انصار تک یہ بات پہنچی تو انھوں نے اپنی خواتین کو حضرت حمزہؓ کی تعزیت کرنے کے لئے بھیجا۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہاں یہ رواج ہو گیا کہ جب لوگ کسی کے ہاں تعزیت کے لئے جاتے ہیں تو پہلے حضرت حمزہؓ کی تعزیت کرتے ہیں اور پھر متوفی کے لواحقین سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں۔ یہ رواج مخدوم صاحب کے زمانے تک وہاں چلا آتا تھا۔

حملۂ تیمور سے پہلے حضرت چراغِ دہلیؒ کے انتقالِ پُرملال کے ساتھ دہلی کا روحانی مرکز ختم

ہو گیا اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد امیر تیمور نے دہلی کے سیاسی مرکز کو کمزور کر دیا- بالفاظ دگر روحانی مرکز کی کمزوری سیاسی مرکز کی کمزوری کا پیش خیمہ ثابت ہوئی- مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے دھرم کے احیاء کے لئے کئی تحریکیں اٹھیں اور بعض جگہ انہوں نے جارحیت کا رنگ اختیار کر لیا- حضرت شاہ میناؒ (م ۱۴۷۹ء) کے ملفوظات میں مرقوم ہے کہ ان کے لڑکپن میں بکسر کے حاکم رائے تاس نے لکھنؤ پر حملہ کیا- مسلمانوں نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لی تو رائے تاس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور محصورین کو اشیائے خورونوش کے حصول میں بڑی تکالیف اٹھانا پڑی-اسی طرح شیخ سعد خیر آبادیؒ کے ملفوظات تحفتہ السعداء میں منقول ہے کہ خیر آباد پر چودھری کہرو نام کے ایک چمار کا تسلط قائم ہو گیا تھا اور لوگ اس کے ظلم و تشدد سے نالاں تھے- ردولی اودھ میں ایک بڑا روحانی مرکز تھا جسے حضرت احمد عبدالحق ردولویؒ (م ۱۴۳۳ء)، شیخ محمد عارفؒ، شیخ محمدؒ، شیخ صفیؒ اور حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۱۵۳۷ء) نے اپنے انفاس طیبہ سے مدتوں تک معطر رکھا تھا- اس کے باوجود لودھیوں کے عہد میں وہاں ہندوؤں کا عمل دخل شروع ہو گیا اور بازاروں میں سر عام سور کا گوشت فروخت ہونے لگا تھا- شراب بھی عام دستیاب تھی اور مجاذیب جام بکف بازاروں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے- شیخ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ ان حالات میں ان کے والد محترم حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ بددل ہو کر ردولی سے نقل مکان کر کے موجودہ صوبہ ہریانہ کے شہر شاہ آباد میں آبسے- سلاطین سادات و لودھی کے زمانے میں ہندوؤں کے غلبے کے یہ واقعات معاصر تاریخوں میں نہیں ملتے اور ان کا واحد ماخذ ملفوظات ہیں-

شاہ مینا لکھنویؒ کے ملفوظات کے مطالعہ سے ایک نئی حقیقت منکشف ہوئی- نیوٹن نے کشش ثقل کا نظریہ ۱۶۶۶ء میں ایک سیب کو درخت سے نیچے گرتے دیکھ کر پیش کیا تھا- اس نظریے کی "دریافت" سے دو صدیاں پیشتر حضرت شاہ میناؒ (م ۱۴۷۹ء) نے حرکت طبعی، حرکت قصری اور حرکت ارادی کے عنوان سے نیوٹن کے نظریے سے ملتا جلتا ایک نظریہ پیش کیا تھا-

خواص و عوام جونپور کے سلطان حسین شرقی (م ۱۵۰۰ء) کو موسیقی کے سرپرست حکمران کی حیثیت سے جانتے ہیں اور "خیال" کی ایجاد کا سہرا اس کے سر پر باندھتے ہیں- شاہ میناؒ کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر اس کے عہد حکومت میں کوئی صوفی نماز جمعہ ادا کرنے جامع مسجد نہیں جاتا تھا تو اس سے باقاعدہ باز پرس کی جاتی تھی- ایک بار ایک صوفی نے مسافر ہونے کا بہانہ پیش کیا تو سلطان حسین نے علماء کا ایک وفد اس کے مواخذہ کے لئے بھیجا اور صوفی صاحب کو جونپور کی سکونت ترک کرنا پڑی-

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ پرتگیز بحری قزاق تھے اور ان کی دستبرد سے بحیرۂ عرب

اور خلیج فارس میں کوئی جہاز محفوظ نہ رہتا تھا- پرتگیز ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کی سرکردگی میں پہلی بار جنوبی ہند پہنچے تھے- اس لئے ان کی قزاقانہ سرگرمیوں کا آغاز سولہویں صدی کے شروع میں ہوا- ۱۴۷۲ء میں شاہ عالم گجراتیؒ کا ایک عقیدت مند شیراز سے احمد آباد آیا تو اس نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ راستے میں بحری قزاقوں نے اس کا سامان لوٹ لیا ہے- اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پرتگیزوں کی آمد سے بہت پہلے جنوبی ہند کے عربی النسل باشندے بھی بحری قزاقی میں سرگرم عمل تھے-

خواجہ ابوالفضل محمد بن احمد بن حسین المعروف بہ صدر الدین راجو قتالؒ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے حقیقی بھائی اور رُوحانیت میں ان کے جانشین تھے- ان کی کنیت، صحیح نام اور حلیہ حضرت شاہ عالم گجراتیؒ کے ملفوظات سے ہی معلوم ہوا اور اسی تصنیفِ دلپذیر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سید جلال الدین سرخپوش بخاریؒ کا اصل نام حسین تھا-

عوام خواجہ حافظ شیرازی کو ایک رند مشرب شاعر سمجھتے ہیں- حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کچھ عرصہ شیراز میں مقیم رہے تھے جہاں ان کی حافظ سے اکثر ملاقات رہتی تھی- موصوف نے خواجہ صاحب کو--- یکے از مجذوبانِ بارگاہ عالی و محبوبانِ بارگاہ متعالی--- فرمایا ہے- حضرت والاقدر، حافظ شیرازی کو ولی اللہ سمجھتے تھے-

سلطان معزالدین کیقباد (۱۲۹۰ء --- ۱۲۸۷ء) کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ وہ رندمشرب حکمران تھا اور اس کا زیادہ تر وقت ناؤ نوش اور نازک اندام حسیناؤں کی صحبت میں گزرتا تھا- سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نوّر اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات ذررِ نظامی میں یہ منقول ہے کہ اس نے اپنے ایک معتمد خواجہ سرا کافور کو حکم دیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کو اس کے دادا سلطان غیاث الدین بلبن کی روح کو ایصالِ ثواب کی غرض سے کچھ رقم خیرات کیا کرے- چنانچہ اس رقم میں سے کافور نے سلطان المشائخؒ کو بھی کچھ رقم بھجوائی-

امیر تیمور نے جب دہلی کی جانب پیش قدمی کی تو پنجاب سے گزرتے وقت فصلیں تباہ کر ڈالیں- اس لئے اس کے دہلی کی جانب جانے کے بعد پنجاب میں قحط رُونما ہو گیا- تیمور ہندوستان سے سمر قند واپس جاتے ہوئے لاکھوں افراد کو قید کر کے ساتھ لے گیا- ان قیدیوں میں حضرت شیخ احمد کھٹو رحمتہ اللہ علیہ بھی تھے- رسد کی کمی کی وجہ سے قیدی بھوکوں مرنے لگے- ایک دن تیمور کا ایک رشتے دار قیدیوں کے معائنہ کے لئے آیا تو اس نے ہر ٹولی میں سے دس تا پندرہ قیدی کم پائے-

برِعظیم پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیرالدین محمد بابر نے تزک لکھتے وقت انسان

دوستی کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ تزکِ بابری میں برِعظیم پاک و ہند کی فتح کا ذکر پڑھئے تو ایسا لگتا ہے کہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اتنا بڑا انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ لطائفِ قدوسی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بابر نے شاہ آباد جیسے سرسبز و شاداب قصبے کو اس بُری طرح اُجاڑا کہ دور دور تک سوائے ویرانی کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شیخ رکن الدینؒ اس پر شاہد ہیں کہ مغل لشکر نے وہاں ہزاروں افراد کو جن میں صدہا اولیاء اللہ بھی شامل تھے' تہ تیغ کر ڈالا۔ شاہ آباد کے نواح میں دیپال پور علماء و صلحاء کی بستی تھی جسے شیخ رکن الدینؒ نے "دارالاسلام" لکھا ہے۔ بابر کی تاخت کے وقت وہاں "--- علماء و صلحاء بسیار کشتہ شدند و کتب خانہ ہا غارت شدند---" خدا جانے ان کتب خانوں کی تباہی کے وقت بابر کے جذبۂ علم دوستی کو کیا ہوا تھا؟ بابر کے حملے کے وقت گنگوہ کے نواح میں جمنا کے کنارے لکھنوتی میں بھی بے شمار علماء و صلحاء مارے گئے اور ان کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ قرآن حکیم میں کیا خوب ارشاد ہوا ہے:

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسد و ھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ۔

بابر نے برِعظیم پاک و ہند کی فتح کے بعد مختلف پرگنوں میں بڑے سخت گیر اور جفا پیشہ افسر مقرر کئے تھے۔ گنگوہ کے مغل عامل میر حسن علی نے ظلم و ستم پر کمر باندھی اور "فقراء و ضعفاء" تک کو معاف نہ کیا۔ ان حالات میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ بددل ہو کر گنگوہ سے یہ کہتے ہوئے چل پڑے کہ جہاں ظلم ہو گا' وہ وہاں نہیں رہیں گے۔ موصوف چلتے ہوئے "بہتہ مقہوریٔ ظالماں" بلند آواز سے اللہ اکبر لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر پڑھتے جا رہے تھے۔

پانی پت کی جنگ میں سلطان ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد افغانوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور مغلوں کے خوف سے وہ بہار اور بنگال کی جانب فرار ہو گئے۔ حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ دریائے سرجو کے کنارے پر ان بھگوڑے افغانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ کشتیاں کم پڑ گئیں۔ بدقسمتی سے وہاں یہ افواہ پھیل گئی کہ مغل فوج جلد ہی وہاں پہنچنے والی ہے۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی افغانوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور جب وہ ایک دوسرے پر سبقت کر کے کشتی میں سوار ہوتے تو کشتی ان کے بوجھ سے دریا میں ڈوب جاتی۔

شاہ رکن الدین شطاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار شاہی فیل خانے کا ایک ہاتھی مست ہو گیا۔ مغل بادشاہ بابر کے فرزند مرزا ہندال کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے فیلبان سے کہا کہ اس ہاتھی کو اس کے پاس لائیں۔ فیلبان نے کہا کہ آدمی کی بُو سے ہاتھی کی مستی بڑھتی ہے اور موجودہ حالت میں وہ سواری کے لائق نہیں ہے۔ شاہزادے نے کہا کہ جیسے بھی ہو اسے اس کے پاس لائیں۔ جب وہ ہاتھی شہزادے کے پاس لایا گیا تو اس نے اس کے دانت پکڑ کر اتنا زور لگایا کہ ہاتھی تلملا اٹھا اور اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ مرزا ہندال اس کے دانتوں پر پاؤں

رکھ کر اس پر سوار ہو گیا اور اس کی ساری مستی جاتی رہی۔ حضرت رکن الدین شطاریؒ فرماتے ہیں مرزا ہندال "صاحب تصرف" تھا۔

ہمایوں کی شیر شاہ کے ہاتھوں شکست اور جلا وطنی کے بعض اسباب اب تک صیغۂ راز میں تھے۔ شیخ رکن الدینؒ نے ان پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ گجرات کا سلطان بہادر شاہ راجستھان میں ہندوؤں کے سب سے بڑے سیاسی مرکز چتوڑ کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ پورے ملک کے مسلمانوں کی نگاہیں چتوڑ پر لگی ہوئی تھیں اور ان کی ہمدردیاں بہادر شاہ کے ساتھ تھیں۔ ان حالات میں ہندوؤں نے ہمایوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا اور اسے فی منزل ایک لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا۔ ہمایوں نے رقم کے لالچ میں بہادر شاہ کی مملکت پر حملہ کر دیا۔ اپنی مملکت کو بچانے کی غرض سے بہادر شاہ کو چتوڑ کا محاصرہ اٹھانا پڑا جس کا مسلمانوں کو بیحد رنج ہوا۔ حضرت رکن الدینؒ رقم طراز ہیں کہ ان کے والد بزرگوار شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے دتو سروانی کو خواب میں حکم دیا کہ وہ گجرات جائے اور وہاں کے مشائخ کو ان کا سلام پہنچانے کے بعد کہے کہ ہمایوں اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اسے یہاں سے نکالنے کے لئے متحد ہو جائیں۔ یہ اگرچہ خواب کا واقعہ ہے لیکن اس سے مذہبی طبقوں کے رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمایوں سے ناخوش تھے۔ لطائف قدوسی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مشائخ کرام کا رجحان ہمایوں کی بجائے افغانوں کی جانب تھا۔

حاجی پور بہار میں شطاریوں کی خانقاہ مرجع خلائق تھی۔ بابر اور ہمایوں کے زمانے میں شاہ ابوالفتح شطاریؒ کی بزرگی کا بڑا شہرہ تھا۔ جب ہمایوں شیر شاہ کے مقابلے کو بہار گیا تو وہ شاہ صاحب کی زیارت کے لئے حاضر ہوا۔ اس وقت شاہ صاحب پالکی میں سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ ہمایوں نے فرط عقیدت سے ان کی پالکی کو کندھا دیا تھا۔

شاہ رکن الدین شطاریؒ (م ۱۷۰۵ء) کے ملفوظات سے یہ معلوم ہوا کہ مغل بادشاہ ہمایوں نے کوئی وظیفہ پڑھنا شروع کیا تھا جو کسی بے احتیاطی سے "خراب" ہو گیا اور اس کے اثر سے تفرقہ و انتشار پیدا ہوا جس کے نتیجے میں اسے تخت و تاج سے محروم ہونا پڑا۔ شاہ رکن الدینؒ نے اپنے ملفوظات میں ہمایوں کو--- شاہ ولایت دست گاہ--- فرمایا ہے۔

شاہ وجیہہ الدین گجراتیؒ (م ۱۵۸۸ء) کے ملفوظات میں گجرات کے بارے میں بعض ایسی معلومات ملتی ہیں جن کا ذکر معاصر تاریخوں میں نہیں ملتا۔ وہاں اس زمانے میں مہدوی اور بوہرے سرگرم عمل تھے اور لوگ وہاں سے ہجرت کرنے کے بارے میں علماء و مشائخ سے مشورے کر رہے تھے۔ ۱۵۷۲ء میں وہاں بغاوت ہو گئی اور باغیوں نے گجرات کے مغل گورنر مرزا عزیز

کوکلتاش کا محاصرہ کر لیا۔ اس بغاوت میں علماء و مشائخ نے باغیوں کی طرفداری کی تھی۔

شاہ عبدالرزاق بانسویؒ (م ۱۷۲۴ء) کے ملفوظات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں اودھ میں امن و امان کی صورت حال اچھی نہ تھی۔ بانسہ شریف (ضلع بارہ بنکی) کے گردونواح میں امن و امان مفقود ہو چکا تھا اور بڑے بڑے زمیندار اپنے مخالفوں کی بستیاں لوٹتے اور جلاتے پھرتے تھے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنی مشہور تصنیف--- اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام--- میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے دسنہ کے ایک ذی علم بزرگ کے ذاتی کتاب خانے میں ایک مخطوطے کی جلد کی پشت پر بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کا یہ شعر لکھا دیکھا تھا:

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے

بابائے اردو کے خیال میں یہ اردو زبان کا قدیم ترین شعر ہے۔ لاہور میں مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں شاہ ابو اسحاق قادریؒ ایک ولی اللہ رہتے تھے جو حضرت داؤد کرمانی شیر گڑھیؒ کے خلیفۂ مجاز اور شاہ ابوالمعالی لاہوریؒ کے برادرِ طریقت تھے۔ ان کی ایک تصنیف--- رسالۂ ناطقہ--- رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے جس کی تلخیص راقم الحروف نے شائع کر دی ہے۔ شاہ ابو اسحاق قادریؒ نے یہ شعر حضرت ضیاء الدین سنائیؒ کا بتایا ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جو حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ اور شاہ شرف الدین بو علی قلندرؒ جیسے صوفیاء کرام کا احتساب کیا کرتے تھے۔ ان کی وفات پر حضرت سلطان المشائخؒ نے بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا تھا:

یک ذات بود حامئ شریعت حیف آں نیز نماند

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو عام طور پر ہم عصر تاریخوں میں نہیں ملتے اور ان کا واحد ماخذ ملفوظات ہیں۔

✪✪✪

فوائد الفواد

صاحبِ ملفوظات

صاحبِ ملفوظات کا اسم گرامی محمد اور لقب نظام الدین تھا۔ انہیں عام طور پر سلطان المشائخ یا محبوب الٰہی کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دہلی والے انہیں پیار سے "سلطان جی" کہتے ہیں۔

سلطان المشائخ بخاری سید تھے اور ان کا سلسلۂ نسب جعفر تواب بن امام علی نقیؒ سے جا ملتا ہے۔ تاتاری یورش کے زمانے میں ان کے دادا اور نانا بخارا سے لاہور چلے آئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا۔ وسط ایشیاء اور افغانستان پر تسلط جمانے کے بعد جب تاتاریوں کی نظریں پنجاب اور دہلی کی جانب اٹھنے لگیں تو ان بزرگوں نے لاہور اور دہلی کو غیر محفوظ خیال کرتے ہوئے بدایوں کا رخ کیا۔

بدایوں اس زمانے میں دہلی کے بعد سب سے بڑا علمی و روحانی مرکز مانا جاتا تھا۔ فوائد الفواد کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہاں مولانا رضی الدین صغانی صاحبِ مشارق الانوار' مولانا سراج الدین ترمذی' مولانا علاء الدین اصولی' قاضی جمال الدین ملتانی' خواجہ شادی مقری' شیخ عزیز بشیر' قاضی کمال الدین جعفری' شیخ احمد' حافظ سراج الدین بدایونی' مسعود نخاسی' خواجہ عزیز کرک' خواجہ ابوبکر موئے تاب' ملک یار اور خواجہ شاہی موئے تاب جیسے بزرگوں نے علمی اور روحانی بساط جما رکھی تھی اور ایک عالم ان کے علم و فضل سے فیض یاب ہو رہا تھا۔

اس علمی اور روحانی ماحول میں ۲۹ اکتوبر ۱۲۳۶ء کو ماہِ صفر کے آخری چہار شنبہ کو سلطان المشائخ نے آنکھیں کھولیں۔ آپ پانچ سال کے ہوئے تو سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کی والدہ ماجدہ بی بی زلیخاؒ نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ بڑی تنگی ترشی کے دن تھے۔ گھر میں اکثر فاقے ہوا کرتے تھے۔ جس دن گھر میں آٹے کی ایک چٹکی تک نہ ہوتی اس دن بی بی زلیخاؒ اپنے ہونہار فرزند سے کہتیں' "بیٹا! آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔" سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ والدہ ماجدہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر انہیں روحانی کیف ملتا۔

سلطان المشائخ نے جب ابتدائی تعلیم مکمل کی تو ان کی والدہ محترمہ انہیں لے کر دہلی چلی گئیں۔ وسط ایشیاء پر تاتاریوں کی یلغار کے وقت وہاں سے بڑی تعداد میں علماء و فضلاء جانیں بچا کر دہلی چلے آئے تھے اور ان دنوں دہلی رشکِ بخارا اور غیرتِ بغداد بنی ہوئی تھی۔ یہاں انہوں نے مولانا شمس الدین خوارزمی اور مولانا کمال الدین زاہد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مولانا شمس الدین خوارزمی وہی بزرگ ہیں جو مستوفیءِ ممالک کے منصب پر فائز ہوئے تھے اور اس موقع پر تاج الدین سنگریزہ نے کہا تھا:

تماما خون بکام دل دوستان شدی
مستوفیءِ ممالک ہندوستان شدی

ان سے سلطان المشائخ نے مقاماتِ حریری کا درس لیا اور مؤخرالذکر بزرگ سے حدیث پڑھی۔ جب آپ بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے بیعت ہوئے تو ان سے ابوشکور سلمی کی "تمہید" اور عوارف المعارف کے پانچ باب پڑھے۔

دہلی میں سلطان المشائخ کی قیام گاہ سے قریب بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے برادرِ اصغر شیخ نجیب الدین متوکلؒ رہتے تھے۔ جب سلطان المشائخ نے ان سے بابا صاحب کے کمالات سنے تو ان کے دل میں ان کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا اور انہوں نے فرطِ عقیدت سے بابا صاحب کے نام کا ورد شروع کر دیا۔ آخر ایک روز موصوف اجودھن روانہ ہو گئے۔ جب آپ بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے انہیں دیکھ کر یہ شعر پڑھا:

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

بابا فریدالدین مسعودؒ نے انہیں اسی روز بیعت کر لیا اور بابا صاحب کے داماد اور مرید شیخ بدرالدین اسحاقؒ نے مرشد کے حکم پر ان کے لئے ایک حجرے میں چارپائی کا انتظام کر دیا۔ وہ بڑی تنگی ترشی کا دور تھا۔ بابا صاحبؒ کے مرید ان کے کھانے کے لئے جنگل سے ڈیلے (ننیث) بین کر لاتے اور انہیں ابال کر افطاری کے وقت اپنے مرشد کے سامنے رکھ دیتے۔ مریدوں کے لئے اجودھن میں زنبیل گھمائی جاتی اور لوگ اس میں بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے ڈال دیتے۔ اس ماحول میں سلطان المشائخ نے اپنے روحانی سفر کا آغاز کیا۔

سلطان المشائخؒ بابا فریدالدینؒ کی حیات میں تین بار اجودھن تشریف لے گئے اور اپنے مرشد کے وصال کے بعد انہوں نے سات بار اجودھن کا سفر کیا۔ شوال ۶۶۳ھ / جولائی ۱۲۶۵ء میں بابا صاحب نے سلطان المشائخ کو دہلی جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور ۵ محرم ۶۶۴ھ / ۱۷

۱ - بعض تذکروں میں تماما کی جگہ "صدرا" لکھا ہوا ہے۔

اکتوبر ۱۲۶۵ء کو انہوں نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔

سلطان المشائخ نے ایک غیبی اشارہ پا کر دہلی کی ایک نواحی بستی غیاث پور میں سکونت اختیار کی۔ ابتداء میں انہوں نے بھی غیاث پور میں بڑی تنگی ترشی کا زمانہ دیکھا۔ جب فتوحات کا دروزاہ کھلا تو ان کے لنگر سے صدہا افراد کو کھانا ملنے لگا۔ ان کے جماعت خانے میں ایک زمانے میں چار صد درویش موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ہم عصر معاشرے کی جس طرح سے اصلاح کی اس کی ایک جھلک ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں دکھائی دیتی ہے۔

سلطان المشائخ ہم عصر سلاطین سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے۔ علاء الدین خلجی کا ولی عہد خضر خان ان کا مرید ہوا لیکن آپ سلطان سے کبھی نہیں ملے۔ سلطان کو اگر کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو وہ قاصد کے ذریعے دعا کی التماس کرتا۔ اس کے فرزند قطب الدین مبارک خلجی کے ساتھ سلطان المشائخ کے تعلقات کشیدہ رہے اور سلطان غیاث الدین تغلق نے علماء کے مجبور کرنے پر انہیں محضر میں طلب کیا۔

ساٹھ برس تک مسندِ رشد و ہدایت پر تشریف فرما ہونے کے بعد سلطان المشائخ نے ۳ اپریل ۱۳۲۵ء کو انتقال فرمایا۔ شاہ ابوالفتح رکن الدین ملتانیؒ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ان کے خلفاء میں سے شیخ نصیرالدین چراغ دہلی، شیخ فخرالدین زرادی، شیخ برہان الدین غریب، قاضی محی الدین کاشانی، حسام الدین ملتانی، قطب الدین منور ہانسوی، شمس الدین یحییٰ، علاء الدین نیلی، اخی سراج اور وجیہہ الدین پائلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے مریدوں میں امیر خسرو، امیر حسن علاء سجزی اور علی بن محمود جاندار لائق ذکر ہیں۔

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات کا اصل نام نجم الدین حسن ہے لیکن وہ علمی و دینی حلقوں میں امیر حسن علاء سجزی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا ہاشمی النسب ہونا ثابت ہے۔ ان کے بزرگ عرب سے ہجرت کر کے سجستان میں آباد ہوئے اور آغازِ سلطنتِ دہلی میں جب وسطِ ایشیاء، خوارزم، سجستان اور افغانستان سے شرفاء کے متعدد گھرانے ہندوستان چلے آئے تو امیر حسن علاء سجزی کے بزرگوں نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ۱۲۵۴ء میں امیر حسن علاء سجزی پیدا ہوئے۔

دہلی اس زمانے میں رشکِ بغداد اور غیرتِ بخارا بنی ہوئی تھی۔ تاتاریوں کے خوف سے سیکڑوں علماء و فضلاء وسطِ ایشیاء سے نقلِ مکان کر کے دہلی چلے آئے تھے۔ برنی نے اسی بنا پر

اس عہد کو "خیرالاعصار" لکھا ہے۔

امیر حسن علاء سجزی کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا دیوان اور فوائد الفواد اس پر دال ہیں۔ موصوف کی امیر خسرو کے ساتھ بڑی دوستی تھی اور یوں بھی دونوں خواجہ تاش تھے۔ غیاث الدین بلبن کا فرزند شہزادہ محمد اہل علم کا بڑا قدردان تھا۔ جب وہ ملتان کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے ان دونوں کو اپنے پاس بلالیا۔ امیر خسرو شہزادہ محمد کے مصحف بردار مقرر ہوئے اور دوات دار کا منصب امیر حسن علاء سجزی کو ملا۔ شہزادہ محمد منگولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ امیر خسرو منگولوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ امیر حسن کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بھی گرفتار ہوئے یا اس آفت سے محفوظ رہے۔

شہزادہ محمد جیسے قدردان کی شہادت کے بعد یہ دونوں حضرات دہلی آئے اور یہاں آنے کے بعد انہوں نے شہزادے کے ایسے درد انگیز مرثیے لکھے کہ غیاث الدین بلبن جیسا سخت دل سلطان بھی اثر لئے بغیر نہ رہ سکا۔

امیر حسن علاء سجزی فوج سے وابستہ تھے۔ ایک بار انہوں نے سلطان المشائخ کو بتایا کہ وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے ساتھ لکھنوتی گئے تھے اور خشکی وتری کے سفر میں ہمیشہ سلطان کے ساتھ رہے۔ ایک بار وہ آٹھ ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے بتایا کہ وہ دیو گیر گئے ہوئے تھے۔ دہلی میں بھی ان کی رہائش چھاؤنی میں تھی اور وہیں سے موصوف سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں سلطان علاء الدین خلجی کی مدح میں متعدد قصیدے موجود ہیں' جن سے ان کے سلطان کے ساتھ تعلقات اور اس کے دربار سے وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔

شیخ جمالی صاحب سیرالعارفین لکھتے ہیں کہ جوانی کے عالم میں امیر حسن علاء سجزی رند مشرب اور ناؤ نوش کے رسیا تھے لیکن جب انہوں نے سلطان المشائخ کے دست مبارک پر توبہ کی تو ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مسعود علی محوی لکھتے ہیں کہ انہوں نے تجرد اختیار کیا اور شادی نہیں کی۔

امیر حسن علاء سجزی کا پندرہ سال تک سلطان المشائخ سے تعلق رہا۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے مرشد گرامی کے ملفوظات جمع کر کے ادب میں ایک نئی صنف کی بنا ڈالی۔ سلطان المشائخ اور امیر خسرو کی وفات کے بعد دہلی سے ان کا جی اچاٹ ہو گیا۔ ادھر حضرت برہان الدین غریبؒ سات سو درویشوں کو ساتھ لے کر دہلی سے دکن روانہ ہو گئے۔ اب دہلی میں امیر حسن علاء سجزی کے لئے کیا کشش رہ گئی تھی۔ انہی ایام میں سلطان محمد بن تغلق نے دیو گیر کو

دارالحکومت قرار دے کر دہلی کے باشندوں کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا۔ لہذا امیر حسن علاء سجزی بھی دیو گیر چلے گئے اور وہیں ۱۳۳۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تصانیف میں سے فوائد الفواد' دیوان' مخ المعانی اور قواعد النحو ہم تک پہنچے ہیں۔

فوائد الفواد

فوائد الفواد حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کی پندرہ سالہ تعلیمات کا نچوڑ ہونے کے علاوہ معلومات کا ایک بیش بہاخزانہ ہے جس میں شریعت' طریقت' عبادات' احسان' عدل' رشد و ہدایت' تاریخی واقعات اور اپنے ہم عصر معاشرے کو درپیش مسائل پر آنجناب نے اظہار خیال فرمایا ہے۔

تاریخی ماخذ

ملفوظات میں بعض ایسے اشخاص کا بھی ذکر آیا ہے جن کا ذکر اور کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ اگر فوائد الفواد میں شیخ زندہ دل لاہوری' علی مولا بدایونی' شیخ الاسلام اودھ رفیع الدین' شہاب الدین میرٹھی' مولانا کیتھلی' شادی مقری' خواجگی مقری لاہوری' ایتمر' خواجہ شادی لکھنوتی' خواجہ عزیز کوتوال' جلال قصاب شاعر' قضیہ مادھو' قاسم مقری' خواجہ محمود پتوہ' مسعود نخاسی' تلکش' میر جھجو' ایتکر' سید عماد' سعید قریشی' حافظ سراج الدین بدایونی' قاضی کمال الدین جعفری' عزیز بشیر بدایونی' زیرک' لیلیح اور علی بہاری کا ذکر نہ آیا ہوتا تو آج ہم ان کے ناموں سے بھی واقف نہ ہوتے۔

اسی طرح بعض بزرگوں مثلاً بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ' شیخ بہاء الدین زکریاؒ' حضرت جلال الدین تبریزیؒ' شیخ سیف الدین باخرزیؒ' قاضی حمید الدین ناگوریؒ' شیخ بدر الدین اسحٰقؒ' شیخ نجیب الدینؒ متوکل' خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ' عثمان حرب آبادیؒ' نظام الدین ابوالموئدؒ صوفی حمید الدین سوالیؒ' شیخ بدر الدین غزنویؒ اور خواجہ اجل شیرازی کابلیؒ کا کوئی تذکرہ فوائد الفواد سے استفادہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

سلطان شمس الدین التمش

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ سلطان شمس الدین التمش نے حضرت شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردیؒ اور شیخ اوحد الدین کرمانی کی زیارت کی تھی۔ ان میں سے ایک بزرگ نے اسے بشارت دی تھی کہ وہ بادشاہ ہو گا۔[1]

۱ - فوائد الفواد' مطبوعہ لاہور: ۱۹۶۶ء' ص ۳۵۸۔

حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ التمش کا حافظہ بہت تیز تھا اور وہ شاعروں سے ان کا اپنا کلام سننے میں دلچسپی لیتا تھا۔ ایک بار ناصری اسے اپنا کلام سنا رہا تھا اور سلطان اسی دوران میں اپنا کام بھی کرتا جاتا تھا۔ کام میں مصروفیت کے باوجود اسے ناصری کے اشعار یاد رہے۔[۱]

سلطان جی فرماتے ہیں کہ رات کو سوتے میں التمش کی جتنی بار آنکھ کھلتی وہ وضو کرتا اور دوگانہ ادا کر کے پھر سو جاتا۔ اس وقت وہ کسی خادم کو وضو کرانے کے لئے تکلیف نہ دیتا۔[۲]

سلطان المشائخ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ بدایوں میں بڑے میٹھے اور عمدہ قسم کے آم ہوتے تھے۔ جب شمس الدین التمش وہاں گورنر بن کر گیا تو اس کی خدمت میں آم پیش کئے گئے۔ اس نے آم کھانے کے بعد اس پھل کا نام پوچھا تو حاضرین نے کہا کہ اسے آم کہتے ہیں۔ ترکی زبان میں آم بڑا فحش لفظ ہے جو خواتین کی موجودگی میں نہیں بولا جاتا۔ اس لئے التمش نے کہا کہ اسے آئندہ نغزک کہا کریں۔[۳]

سلطان المشائخ کا بچپن بدایوں میں گذرا اس لئے وہ اس شہر سے خوب واقف تھے۔ ایک روز انہوں نے امیر حسن علاء سجزی کو بتایا کہ شمس الدین التمش نے، جن دنوں وہ بحیثیت گورنر بدایوں میں مقیم تھا، ایک میدان (گراؤنڈ) بنا رکھا تھا جہاں وہ چوگان کھیلا کرتا تھا۔[۴]

فوائد الفواد میں کئی موقعوں پر حوضِ شمسی کا ذکر آیا ہے۔ اس کے کنارے اہل اللہ کی نشست رہا کرتی تھی اور اب بھی بہت سے بزرگ مثلاً شیخ سماء الدین سہروردی، شیخ نجیب الدین فردوسی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ نجیب الدین متوکل اور داؤد پالی حوض شمسی سے قریب دفن ہیں۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ کسی بزرگ نے سلطان شمس الدین التمش کو خواب میں دیکھا تو سلطان نے اسے بتایا کہ حوض بنوانے کی وجہ سے اس کی مغفرت ہو گئی ہے۔[۵] یہ واقعہ دُررِ نظامی میں بھی آیا ہے۔

ایک روز سلطان المشائخ نے حاضرین کو بتایا کہ سلطان شمس الدین التمش اپنے ایک پہلو میں سید نور الدین مبارکؒ کو اور دوسرے پہلو میں قاضی فخرالائمہ کو بٹھایا کرتا تھا۔ جب شیخ

---

۱ - ایضاً" ص ۳۵۹-
۲ - ایضاً"-
۳ - ایضاً" ص ۳۵۷-
۴ - ایضاً"-
۵ - ایضاً" ص ۲۰۵-

قطب الدین کا شاہی دہلی تشریف لائے تو سلطان نے انہیں اپنے محل میں بلایا۔ جب موصوف وہاں پہنچے تو ان بزرگوں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں تشریف رکھیں گے؟ انہوں نے کہا: "علوم کے سایہ تلے۔" جب وہ قریب پہنچے تو سلطان نے اٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑا اور محل خاص میں لے جا کر اپنے پاس بٹھایا۔[۱]

ایک مجلس میں سلطان جی نے سلطان شمس الدین التمش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں اس کی تاریخ وفات یاد آ گئی ہے۔ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

بسال ششصد و سی و سہ از ہجرت
نماند شاہ جہان شمس دین عالم گیر[۲]

سلطانہ رضیہ

سلطان شمس الدین التمش کے بیں بیٹے تھے لیکن سب کے سب نکمے اور نالائق تھے۔ وہ اپنے مصاحبوں سے کہا کرتا تھا کہ اس کی بیٹی رضیہ میں کاروبار حکومت چلانے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے پانچ بیٹے تھے[۳] اور ان کی موجودگی میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر شریعت میں عورت کو خلافت دینی اور سجادے پر بٹھانا روا ہوتا تو آپ اپنی بیٹی بی بی شریف کو خلافت نامہ دے کر اپنا جانشین مقرر کرتے۔[۴] یہ عجیب اتفاق ہے کہ سلطان اور شیخ وقت ایک ہی ذہن سے سوچتے تھے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ عورت کی حکمرانی کے خلاف نہ تھے۔ جب رضیہ تخت نشین ہوئی تو اس وقت دہلی میں سیکڑوں جید علماء موجود تھے جو تاتاریوں کے خوف سے وسط ایشیاء سے نقل مکان کر کے دہلی چلے آئے تھے اور ان میں سے کسی نے بھی رضیہ کے خلاف فتویٰ نہیں دیا۔ اس زمانے میں ایسی ایسی پاکباز خواتین موجود تھیں کہ وہ طاعت و تقویٰ میں مردوں کو شرماتی تھیں۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اندرپت میں ایک عورت رہتی تھی جو بی بی فاطمہ سام کے نام سے موسوم تھی۔ وہ صاحبۂ کشف و کرامت تھی۔ اس نے بڑی طویل عمر پائی۔ حضرت نجیب الدین متوکل نے اسے بہن بنایا ہوا تھا۔ جب کبھی موصوف کے ہاں فاقہ ہوتا تو بی بی فاطمہ سام

۱۔ "ایضاً" ص ۴۰۱۔

۲۔ "ایضاً" ص ۲۶۵۔

۳_ Nizami, K.A: The Life And Times of Shaikh Farid-ud-Din Gang-i-Shakar, Aligarh: 1955, p. 59

۴۔ سید محمد کرمانی، 'سیر الاولیاء' دہلی: ۱۳۰۲ھ، ص ۱۹۱۔

کو کشف کے ذریعے اس کا علم ہو جاتا اور وہ ایک بڑی وزنی روٹی پکا کر ان کے گھر بھجوا دیتی۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی اس ولیہ کی زیارت کی تھی۔[۱] سلطان جی فرماتے ہیں کہ بابا فرید الدین گنج شکر بی بی فاطمہ سام کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ مرد ہے جسے عورت کی شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔[۲] سلطان جی نے اسی مجلس میں حاضرین کو بتایا کہ درویش جب دعا کرتے ہیں تو پہلے خدا کو نیک عورتوں کا واسطہ دیتے ہیں اور پھر نیک مردوں کا' کیونکہ نیک عورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اسی ضمن میں آنجناب نے فرمایا کہ جب جنگل سے کوئی شیر نکلتا ہے تو اس کی بابت یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ وہ نر ہے یا مادہ۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مرد ہو یا عورت' طاعت اور تقویٰ میں مشہور ہونا چاہیے۔[۳]

سلطان غیاث الدین بلبن

سلطان المشائخ نے ایک مجلس میں حاضرین کو بتایا کہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عقیدہ بہت اچھا تھا۔ وہ نماز پنجگانہ اور نماز جمعہ وقت پر ادا کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے قاضیٔ لشکر سے پوچھا کہ رات کیسی گذری ہے؟ قاضی نے عرض کیا کہ یہ بات سلطان پر بھی روشن ہے۔ جامع ملفوظات امیر حسن علاء سجزی نے سلطان المشائخ سے اس کی وضاحت چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ شب قدر تھی۔[۴]

سلطان غیاث الدین بلبن تخت نشینی سے پہلے اُلغ خان کے لقب سے ملقب تھا۔ ایک بار وہ سلطان ناصرالدین محمود کے ساتھ ملتان جاتے ہوئے اجودھن سے گذرا تو بابا فرید الدین مسعودؒ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تھا۔[۵]

بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

سیر الاولیاء کے بعد فوائد الفواد بابا فرید کے حالات پر سب سے اہم ماخذ ہے اور اس سے استفادہ کئے بغیر ان کی سوانح حیات نامکمل رہے گی۔ خود سلطان المشائخ نے بھی ان کے ملفوظات جمع کرنا شروع کئے تھے۔ ایک مجلس میں انہوں نے امیر حسن علاء سجزی کو بتایا کہ جب

---

۱ - فوائد الفواد' ص ۲۱۶۔

۲ - ایضاً'' ص ۳۶-- ''آن زن مردیست کہ اُورا در صورتِ زنان فرستادہ اند--''

۳ - ایضاً'' ص ۳۵-

۴ - ایضاً'' ص ۲۹۳-

۵ - ایضاً'' ص ۱۷۱

انہوں نے بابا صاحب کے ملفوظات جمع کرنا شروع کیے تو انہوں نے اس کی اطلاع بابا صاحب کو کر دی۔ اس کے بعد جب بابا صاحب کسی مجلس میں گفتگو فرماتے تو حاضرین کو دیکھ کر استفسار فرماتے کہ نظام الدین موجود ہیں؟ اگر کبھی ان کی عدم موجودگی میں گفتگو فرماتے تو ان کی آمد کے بعد ان کی خاطر گفتگو دہرا دیتے۔ سلطان جی نے امیر حسن کو بتایا کہ وہ مجموعہ اب تک ان کے پاس محفوظ ہے۔[۱]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان ناصر الدین محمود ملتان جاتے ہوئے اجودھن سے گذرا تو اس کی طرف سے اُلغ خان چار گاؤں کی ملکیت کا قبالہ اور کچھ نقدی لے کر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے قبالہ تو واپس کر دیا لیکن نقدی یہ کہہ کر قبول کر لی کہ درویشوں کے کام آئے گی۔[۲]

ایک روز بابا صاحب کو سماع کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس وقت کوئی قوال موجود نہ تھا۔ انہوں نے شیخ بدر الدین اسحٰق سے فرمایا کہ قاضی حمید الدین ناگوری نے جو خط بھیجا ہے' وہ لے آئیں' شیخ موصوف ایک خریطہ اٹھا لائے جس میں خطوط رکھے ہوئے تھے۔ جب شیخ صاحب نے خریطے میں ہاتھ ڈالا تو اتفاق سے مطلوبہ خط ہی ہاتھ لگا۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ وہ کھڑے ہو کر خط پڑھیں۔ ابھی انہوں نے اتنا ہی پڑھا تھا: فقیر حقیر ضعیف نحیف محمد عطاء کہ بندۂ درویشاں است و از سر و دیدہ خاکِ قدمِ ایشاں" تو بابا صاحب پر حالت طاری ہو گئی۔[۳]

حضرت نظام الدین اولیاء نے بابا صاحب سے عوارف المعارف کے پانچ باب "سبقاً سبقاً" پڑھے تھے۔ بابا صاحب کو اس کتاب سے بڑی اُنسیت تھی۔ ایک بار اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ان کے ہاں فرزند پیدا ہوا تو بابا صاحب نے نومولود کا نام صاحب عوارف المعارف کے نام پر شہاب الدین رکھا۔[۴]

بابا فرید الدین مسعود کے ایک خلیفہ تھے' جن کا نام نامی عارف تھا۔ عام تذکروں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ بابا صاحب سے بیعت ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ ملتان و اوچ کے والی نے انہیں سو تنکے دے کر کہا کہ وہ انہیں بابا صاحب کی خدمت میں پہنچا دیں۔ شیخ عارف نے پچاس تنکے خود رکھ لئے اور پچاس بابا صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ بابا صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تنکے لانے والے نے "برادرانہ تقسیم" کی ہے۔ شیخ عارف نے شرمندہ ہو

۱۔ ایضاً" ص ۵۰۔

۲۔ ایضاً" ص ۱۷۱۔

۳۔ ایضاً" ص ۶ - ۲۵۵۔

۴۔ ایضاً" ص ۳۸۔

کر بقیہ پچاس تنکے بابا صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے اور اپنے کئے پر معافی طلب کی۔ بابا صاحب کی یہ کرامت دیکھ کر شیخ عارف ان کے مرید ہو گئے اور کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر خرقۂ خلافت لے کر سیہون چلے گئے۔[۱] بابا صاحب کے خلفاء کی فہرست میں شیخ عارف کا نام نہیں ملتا۔ اس کا واحد ماخذ فوائد الفواد ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ

امیر حسن علاء سجزی لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک باغ اور قابل کاشت اراضی کی ملکیت کی دستاویزات حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں بھیجیں۔ حضرت نے قبول نہ کیں اور یہ کہلا بھیجا کہ وہ اس باغ اور اراضی کے لائق نہیں ہیں۔ بعد ازاں انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ باغ اور اراضی قبول کر لیتے تو لوگ کہتے کہ شیخ اپنے باغ کی طرف جا رہے ہیں یا اپنی زمین دیکھنے جا رہے ہیں۔ کیا یہ ان کے کرنے کے کام ہیں؟ آپ نے اس موقع پر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ان کے مشائخ میں سے کسی نے ایسی چیزیں قبول نہیں کیں۔[۲]

یہ بات بڑی قابل تعجب ہے کہ سلطان جی حنفی ہونے کے باوجود غائبانہ نماز جنازہ کے قائل تھے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں میں قیام کے زمانے میں ایک دن سوتھ ندی کے کنارے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دہلی میں شیخ الاسلام فوت ہو گیا ہے' آیئے اس کی نماز جنازہ پڑھیں۔[۳] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت تبریزی بھی غائبانہ نماز جنازہ کے قائل تھے۔

شہاب الدین عمر سہروردیؒ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت نجم الدین کبریٰ یہ کہا کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ جو نعمت ہو سکتی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کو عطا فرمائی ہے مگر ذوق سماع عطاء نہیں فرمایا۔[۴]

حضرت بہاء الدین زکریاؒ

سلطان جی فرماتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے سترہ دنوں میں اپنے مرشد سے جو

۱۔ ایضاً" ص ۳۶۵۔
۲۔ ایضاً" ص ۱۷۱۔ "از خواجگانِ ما و مشائخ ما ہیچ کس ازیں بابت نکردہ است"۔
۳۔ ایضاً" ص ۲۴۵۔
۴۔ ایضاً" ص ۵۶۔ "ہر نعمتی کہ در بشر ممکن است شیخ شہاب الدین را دادند الّا ذوق سماع۔"

نعمتیں حاصل کی ہیں وہ اوروں کو سالوں میں بھی نصیب نہ ہوئیں۔ جب انہیں خلافت ملی تو شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے پرانے خادم برگشتہ ہو گئے کہ انہوں نے سالہا سال محنت کی اور کچھ نہ ملا اور ایک ہندوستانی چند روز میں شیخیت لے گیا۔ یہ بات شدہ شدہ حضرت سہروردی تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ دوسرے گیلی لکڑیاں لائے ہیں ان میں کس طرح آگ لگ سکتی ہے؟ زکریاؒ خشک لکڑی لایا تھا جس میں ایک ہی پھونک سے آگ لگ گئی۔[1]

سلطان جی نے ایک مجلس میں فرمایا کہ شیخ بہاء الدین زکریا کی کنیزیں اور پسنہاریاں بھی ذاکرہ اور شاغلہ تھیں۔[2] ان کے ایک مرید تھے جن کا نام حسن افغان تھا۔ وہ بڑے بلند رُوحانی مرتبے پر فائز تھے۔ حضرت زکریا فرمایا کرتے تھے' "اگر خدا نے قیامت کے دن مجھ سے پوچھا کہ میرے لئے کیا لائے ہو تو میں کہوں گا کہ حسن افغان کو لایا ہوں۔"[3]

سلطان جی فرماتے ہیں کہ حسن افغان کو کشفِ قلوب عطاء ہوا تھا۔ ایک روز انہوں نے مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ جب نماز ہو چکی اور نمازی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو انہوں نے امام سے کہا کہ نماز میں اس کا دھیان بنا ہوا تھا۔ اس نے ملتان سے دہلی جا کر غلام خریدے اور انہیں خراسان لے جا کر فروخت کیا۔ وہ اس پورے سفر میں اس کے پیچھے مارے مارے پھرتے رہے ہیں۔ کیا نماز اسی کا نام ہے؟[4] یہ واقعہ علی بن محمود جاندار نے دُررِ نظامی میں بھی نقل کیا ہے۔

سلطان جی نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ ناصر الدین قباچہ کے دورِ حکومت میں ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا' شیخ جلال الدین تبریزی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اُوشی موجود تھے۔ انہی ایام میں منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک رات حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے ایک تیر قباچہ کو دیتے ہوئے فرمایا کہ اسے یونہی منگولوں کے لشکر کی جانب چلا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اگلے روز جب سورج طلوع ہوا تو ملتانیوں نے دیکھا کہ منگول محاصرہ اٹھا کر جا چکے ہیں۔[5]

ملتان کے حاکم ناصر الدین قباچہ اور دہلی کے سلطان شمس الدین التتمش میں رقابت چل

---

۱ - ایضاً" ص ۷۲۔
۲ - ایضاً" ص ۲۵۳۔
۳ - ایضاً" ص ۱۵۔
۴ - ایضاً" ص ۱۵۔
۵ - ایضاً" ص ۱۸۵۔

رہی تھی- قباچہ کے اطوار و اخلاق بھی اچھے نہ تھے- نیز وہ خود مختاری کا اعلان کر کے دہلی کی نوزائدہ اسلامی حکومت کو کمزور کر رہا تھا- اس لئے حضرت بہاء الدین زکریاؒ اور ملتان کے قاضی مولانا شرف الدین نے سلطان شمس الدین التمش کو خط لکھ کر ملتان پر قبضہ کرنے کی دعوت دی- اتفاق سے یہ خط قباچہ کے ہاتھ لگ گیا- اس نے ان دونوں بزرگوں کو اپنے حضور طلب کیا کہ یہ خط انہی نے لکھا تھا- قباچہ نے قاضی کو تو فوراً قتل کرا دیا لیکن وہ حضرت زکریا کا بال بھی بیکا نہ کر سکا- اس واقعہ کے جلد بعد شمس الدین التمش نے ملتان پر یلغار کر دی اور قباچہ مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے سندھ کی جانب فرار ہو گیا- التمش نے اس کا تعاقب کیا اور قباچہ روہڑی سے فرار ہوتے وقت دریا میں ڈوب گیا- ملتان، اوچہ اور سندھ پر التمش کا قبضہ ہو گیا-[۱] اس واقعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریا مضبوط مرکز کے حامی اور طوائف الملوکی کے مخالف تھے-

قاضی منہاج سراج جزجانی

قاضی منہاج سراج جزجانی صاحب طبقات ناصری بڑے بلند پایہ واعظ تھے- سلطان جی ہفتے کے روز ان کا وعظ سننے جایا کرتے تھے- انہوں نے امیر حسن علاء سجزی کو بتایا کہ ان کے وعظ و نصیحت سے بڑی لذت حاصل ہوا کرتی تھی- حضرت والا نے بھری بزم میں اس کا اعتراف کیا کہ ایک بار موصوف قاضی صاحب کا وعظ سن کر بے ہوش ہو گئے تھے- سلطان جی فرماتے ہیں کہ ایک بار کسی بزرگ نے قاضی صاحب سے کہا کہ وہ قضاء کے لائق نہیں، انہیں تو شیخ الاسلام ہونا چاہئے تھا-[۲]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ دہلی میں سماع کا رواج نہ تھا- قاضی منہاج سراج صاحب سماع تھے اس لئے جب وہ منصب قضاء پر فائز ہوئے تو سماع کو بڑا فروغ ملا-[۳]

نُور مُترک

ایک مجلس میں امیر حسن علاء سجزی نے عرض کیا کہ علماء نُور مُترک کے عقائد پر بڑی لے دے کرتے ہیں، حقیقت حال کیا ہے؟ سلطان جی نے فرمایا کہ آسمان سے جو پانی برستا ہے،

---

۱ - ایضاً" ۲۰۶-

۲ - ایضاً" ص ۴۲۹-

۳ - ایضاً" ۲۰۷-

وہ اس سے زیادہ پاکیزہ تھا۔ امیر حسن نے عرض کیا کہ طبقاتِ ناصری میں یہ لکھا ہے کہ وہ علماء کو ناجی اور مرجی کہتا تھا اور اسے دہلی کے علماء سے بڑی کد تھی۔ اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ انہیں دنیا میں آلودہ دیکھتا تھا اس واسطے علماء نے بھی اس کی طرف بہت سی باتیں منسوب کر دیں (اسے ملحد اور قرملی بھی کہا)۔ سلطان جی نے فرمایا کہ نُور تُرک بڑے تنگ دست رہتے تھے لیکن وہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے۔ ان کا ایک غلام تھا جو دھنیے کا کام کرتا تھا۔ وہ روزانہ ایک درہم لا کر انہیں دیتا اور یہی ان کی وجہ معاش تھی۔ ایک مرتبہ سلطانہ رضیہ نے کچھ سونا ان کی خدمت میں بھیجا۔ نُور تُرک ایک لاٹھی اٹھا کر سونے کو پیٹنے لگے اور شاہی قاصد سے کہنے لگے کہ اسے واپس لے جائے۔[۱]

آخری ایام حیات میں نُور تُرک نے مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں وہ صحرا سے لکڑیاں بین کر لاتے اور انہیں بیچ کر اپنی گذر بسر کرتے۔ وہاں دہلی کے ایک حاجی نے انہیں پہچان لیا اور ان کی خدمت میں دو سیر چاول پیش کئے' جو انہوں نے قبول کر لئے۔ وہ حاجی بڑا حیران ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے سونا رد کر دیا تھا اور اب دو سیر چاول قبول کر لئے ہیں۔ اس کے دل میں یہ خیال آیا تو نُور تُرک نے کہا کہ مکے کو دہلی پر قیاس نہ کریں۔ یہاں کا دانا دُنکا بھی انہیں عزیز ہے۔ دہلی کی اور ہی بات تھی۔ ان دنوں وہ جوان تھے' اب ان کے جسم میں ویسی قوت نہیں رہی۔[۲]

پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں کہ وہ علماء سُوء کو خوب لتاڑتے تھے اس لئے انہوں نے نُور تُرک کو عوام کی نظروں سے گرانے کے لئے ملحد اور قرملی مشہور کر دیا تھا۔ نظامی صاحب کی یہ بات بڑا وزن رکھتی ہے کہ انہوں نے آخری عمر میں مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اگر وہ ملحد ہوتے تو وہاں نہ جاتے۔ مکے میں ملحد یا قرملی کا کیا کام ہے؟[۳]

نور ترک کچھ عرصہ ہانسی میں بھی رہے تھے۔ وہاں وہ وعظ کیا کرتے تھے۔ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے کئی بار ان کا وعظ سنا تھا۔ ایک بار بابا صاحب پھٹے پرانے کپڑے پہن کر ان کا وعظ سننے گئے۔ جونہی ان کی نظر بابا صاحب پر پڑی تو وہ کہنے لگے "مسلمانو! اب سخن کا صراف آ گیا ہے۔" بعد ازاں ان کی اتنی تعریف کی کہ کوئی بادشاہ کی بھی اتنی مدح نہیں کرتا۔[۴]

---

۱ - ایضاً" ص ۳۳۵۔

۲ - ایضاً" ص ۳۳۵۔

۳ - خلیق احمد نظامی' سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات' دہلی : ۱۹۵۸ء ص ۱۳۸۔

۴ - فوائد الفواد' ص ۳۳۵۔

شیخ سیف الدین باخرزیؒ

فوائد الفواد شیخ باخرزی کے بارے میں معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ چشتی حلقوں میں بڑے مقبول تھے۔ سلطان جی نے ایک مجلس میں فرمایا کہ انہیں سارے علوم یاد تھے۔ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ ایک بار ان کے مریدوں نے ان سے کہا کہ وہ دوسرے مشائخ کی طرح زیادہ شعر کیوں نہیں کہتے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ان کا ایک شعر ایک کتاب کے برابر ہے۔[1] شیخ سیف الدین باخرزی کا ذکر کرتے ہوئے سلطان جی نے فرمایا کہ شیخ ابو سعید ابوالخیر اور اوحد الدین کرمانی نے بہت عمدہ نظمیں کہی ہیں۔[2]

عثمان حرب آبادیؒ

شیخ عثمان حرب آبادی غزنی میں رہتے تھے۔ وہ بڑے بزرگ انسان تھے اور انہوں نے قرآن حکیم کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ وہ سبزی پکا کر فروخت کیا کرتے تھے اور اسی سے اپنی گذر بسر کرتے تھے۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ گاہک انہیں کھوٹے سکے دے جاتے اور وہ ان کے عوض سالن دے دیتے۔ موصوف لوگوں پر ظاہر کرتے کہ وہ کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ جب ان کا وقت آخر آیا تو وہ خدا کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ "اے اللہ! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ مجھے کھوٹے سکے دے جاتے تھے اور میں انہیں قبول کر لیتا تھا۔ میں نے کبھی کھوٹا سکہ رد نہیں کیا۔ اگر مجھ سے کوئی کھوٹی طاعت ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے اسے رد نہ کرنا۔"[3]

جار اللہ زمخشری

سلطان جی فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت بہاء الدین زکریا نے شیخ صدر الدین قونوی کو خواب میں یہ منظر دکھایا کہ فرشتے جار اللہ زمخشری صاحب الکشاف کو زنجیروں میں جکڑ کر دوزخ کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ جار اللہ زمخشری کا فرقۂ معتزلہ سے تعلق تھا اس لئے مولانا نجم الدین سنامی اس کی تصانیف جلانے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔[4]

---

۱ - ایضاً" ص ۵۸۔ "ہر بیتی کہ از آں ماست برابر کتابیست۔"
۲ - ایضاً"۔
۳ - ایضاً" ص ۵۳۔
۴ - ایضاً" ص ۱۸۷۔

تاج الدین ریزہ

تاج الدین ریزہ قیامِ سلطنتِ دہلی کے ابتدائی زمانے میں بڑے نامور شاعر ہو گزرے ہیں۔ جب سلطان جی کے استاد مولانا شمس الدین خوارزمی مستوفیٔ ممالک کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہوئے تو ریزہ نے ان کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا مطلع تھا۔[۱]

صدرا کنوں بکام دل دوستان شدی
مستوفیِ ممالکِ ہندوستان شدی

شیخ جلال الدین تبریزیؒ

موصوف حضرت ابو سعید تبریزیؒ کے مریدِ باصفا تھے لیکن منگولوں کے حملے میں ان کی شہادت کے بعد شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مرشد کی جتنی خدمت کی ہے اس کا عشرِ عشیر بھی دوسروں کے حصے میں نہیں آیا۔ حضرت تبریزی اپنے برادرِ طریقت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی معیت میں بغداد سے ملتان روانہ ہوئے لیکن نیشا پور پہنچ کر دونوں بزرگوں میں شکر رنجی ہو گئی اور یہیں سے ان کے راستے الگ ہو گئے۔

سلطان شمس الدین التمش بغداد میں قیام کے زمانے میں ان کی زیارت سے مشرف ہو چکا تھا اور وہ ان کے مقام و عظمت سے کما حقہٗ واقف تھا۔ جب حضرت تبریزی دہلی کے قریب پہنچے تو سلطان نے اپنے عمائدین کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ دہلی میں قیام کے دوران میں موصوف مرجع خلائق ہو گئے تو شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ ان سے حسد کرنے لگا۔[۲] اس نے ان کے خلاف ایک گھناؤنی سازش تیار کی اور ایک فاحشہ عورت کو کچھ رقم دے کر ان پر تہمت لگائی۔[۳] یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سلطان شمس الدین التمش نے اس مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے صدہا علماء و مشائخ کو ایک مقررہ دن جامع مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ نجم الدین صغریٰ جانتا تھا کہ حضرت تبریزی اور شیخ بہاء الدین زکریا میں رنجش چل رہی ہے' اس لئے اس نے

۱ - ایضاً" ص ۱۱۶۔ بعض کتابوں میں راقم نے صدرا کی جگہ شمسا بھی لکھا دیکھا ہے۔
۲ - شیخ محمد اکرام' آبِ کوثر' لاہور : ۱۹۵۲ء ص ۲۳۷۔
۳ - سید صباح الدین عبدالرحمن' بزمِ صوفیہ' کراچی : ۱۹۹۰ء' ص ۱۰۳۔

سلطان سے کہہ کر انہیں ہی اس مجلس کا صدر مقرر کرایا- جب حضرت جلال الدین تبریزی مسجد میں داخل ہوئے تو شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے آگے بڑھ کر ان کے جوتے اٹھا لئے- ان کا یہ احترام دیکھ کر حاضرین نے کہا کہ بات یہیں ختم ہو جانی چاہئے- اس پر حضرت زکریاؒ نے فرمایا کہ اس مقدمے کا فیصلہ شریعت کے مطابق ہوگا اس لئے مدعیہ کو حاضر کیا جائے- مدعیہ کو شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے حضور پیش کیا گیا تو وہ ان کا جاہ و جلال دیکھ کر کانپنے لگی- اس نے بھری محفل میں اس بات کا اعتراف کیا کہ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے اسے کچھ رقم دے کر شیخ جلال الدین تبریزی پر تہمت لگانے کے لئے تیار کیا تھا- اس میں سے نصف رقم اسے مل چکی ہے اور بقیہ نصف رقم ایک بقال کے پاس بطورِ امانت رکھی ہوئی ہے جو سازش کی تکمیل پر اسے ملنی ہے- سلطان شمس الدین التمش نے اسی وقت نجم الدین صغریٰ کو اس کے منصب سے معزول کر کے شیخ بہاء الدین زکریا کو شیخ الاسلام بنایا-[۱]

اس تہمت سے بری ہونے کے بعد حضرت جلال الدین تبریزی نے دہلی میں رہنا پسند نہ کیا اور آپ بدایوں تشریف لے گئے- سلطان جی فرماتے ہیں کہ دہلی سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے فرمایا کہ جب وہ اس شہر میں آئے تھے تو زرِ خالص تھے، اب چاندی بن کر یہاں سے جا رہے ہیں-[۲] یہی بات اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث نے بھی نقل کی ہے-[۳]

شیخ حسین زنجانیؒ

فوائد الفواد میں امیر حسن علاء سجزی لکھتے ہیں کہ ایک مجلس میں سلطان المشائخ نے فرمایا کہ سید علی ہجویریؒ اور شیخ حسین زنجانیؒ ایک ہی پیر کے مرید تھے- حضرت زنجانی لاہور میں رہتے تھے- ایک روز حضرت ہجویری کے مرشد نے انہیں حکم دیا کہ وہ لاہور میں سکونت اختیار کریں- انہوں نے عرض کیا کہ وہاں حسین زنجانی جو موجود ہیں- مرشد نے فرمایا کہ وہ لاہور جائیں- جب سید علی ہجویری لاہور پہنچے تو اس وقت رات ہو چکی تھی اور شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے- اس لئے انہوں نے رات شہر سے باہر گذاری- اگلے روز جب شہر کا دروازہ کھلا تو لوگ ایک جنازہ لے کر باہر نکلے- انہوں نے متوفیٰ کے بارے میں استفسار کیا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ جنازہ حسین زنجانی کا ہے-[۴]

---

۱ - شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، لاہور: ۱۹۵۲ء، ص ۳۳۷-
۲ - فوائد الفواد، ص ۱۹۶-
۳ - عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، دہلی: ۱۳۳۲ھ، ص ۴۴-
۴ - فوائد الفواد، ص ۵۷-

بعض اہل علم نے اس روایت پر بڑی تحقیق کی ہے اور یہ روایت تاریخ کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ میرے ناقص خیال میں یہ الحاقی روایت ہے۔ محبیر مکرم' پروفیسر نثار احمد فاروقی' صدر شعبۂ عربی' دہلی یونیورسٹی اپنی تصنیف --- نقدِ ملفوظات --- میں لکھتے ہیں کہ ملفوظات کے نسخوں میں بعد کو درگاہی لوگوں اور پیرزادوں نے اپنے مقاصد کے تحت کچھ تحریفیں بھی کر رکھی ہیں۔[1]

لاہور میں سرکلر روڈ اور موہنی روڈ کے درمیان پیر عزیز الدین کئیؒ کا مزار ہے۔ اس کا فاصلہ حضرت سید علی ہجویری کی درگاہ سے دو فرلانگ ہو گا۔ زائرین کا ہجوم حضرت ہجویری کی درگاہ میں رہنے گا جس سے مجاورین لو لاکھوں روپے سالانہ کی آمدنی ہونے لگی۔ حضرت علی ہجویری کی موجودگی میں پیر کئی کے مزار پر کون جاتا۔ جب وہاں کے مجاورین بھوکوں مرنے لگے تو انہوں نے مشہور کر دیا کہ پیر کئی حضرت ہجویری کے استاد تھے اور مؤخر الذکر بزرگ نے یہ کہا تھا کہ پہلے میرے استاد کے مزار پر حاضری دیں' پھر ان کے مزار پر آئیں۔ حضرت علی ہجویری کا وصال ۱۰۷۲ء کے لگ بھگ ہوا اور پیر کئی ان کی وفات کے ۱۰۹ سال بعد لاہور تشریف لائے۔ شیخ محمد اکرام نے پیر کئی کا سال وفات ۱۲۱۵ء تحریر کیا ہے۔[2] اسی سے ان کے استاد اور شاگرد ہونے کی قلعی کھل جاتی ہے۔

شیخ جمالی نے سیر العارفین میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور شیخ حسین زنجانی کو ہمعصر بتایا ہے۔[3] شاہجہان نامہ کے مصنف محمد صالح کنبوہ نے بھی لاہور میں حضرت اجمیری اور شیخ زنجانی کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔[4] داراشکوہ نے بھی سفینۃ الاولیاء میں انہیں ہم عصر بتایا ہے۔[5] حضرت ہجویری کا سال وفات ۱۰۷۲ء بتایا جاتا ہے اور حضرت حسین زنجانی ۱۲۰۴ء میں فوت ہوئے تھے۔[6] ان حالات میں سید علی ہجویری ان کے جنازے میں کیسے شریک ہو گئے؟ حضرت علی ہجویری نے کشف المحجوب میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ ملک شام میں بانیا ندی کے کنارے موضع بیت الجن میں جب ان کے مرشد کا انتقال ہوا تو اس وقت اُن کا سر اِن کے زانو پر تھا۔[7] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مرشد نے انہیں اپنی زندگی میں لاہور نہیں بھیجا۔ اس

۱ ۔ نثار احمد فاروقی' نقدِ ملفوظات' لاہور : ۱۹۸۹ء' ص ۲۱۰۔
۲ ۔ شیخ محمد اکرام' آبِ کوثر' لاہور : ۱۹۵۲ء' ص ۹۶۔
۳ ۔ شیخ جمالی' سیر العارفین' لاہور : ۱۹۸۹ء ص ۱۳۔
۴ ۔ محمد صالح' شاہجہان نامہ' لاہور ۱۹۵۸' جلد اول' ص ۵۰۔
۵ ۔ دارا شکوہ' سفینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ)' کراچی : ۱۹۶۱ء' ص ۱۳۸۔
۶ ۔ مفتی غلام سرور' خزینۃ الاصفیاء' کانپور : ۱۹۱۴ء' ج ۲' ص ۲۵۱۔
۷ ۔ سید علی ہجویری' کشف المحجوب' (ترجمہ مولانا ابوالحسنات) لاہور ۱۳۹۳ھ' ص ۳۲۵۔

لئے فوائد الفواد کی یہ روایت الحاقی معلوم ہوتی ہے۔[۱]

جعلی کتابیں

اس زمانے میں بزرگوں کے نام سے جعلی کتابیں وجود میں آنے لگی تھیں۔ ایک مجلس میں حاضرین میں سے کسی نے کہا:

مردی مرا در اودھ کتابی نمود و گفت کہ این نبشتہ خدمت مخدوم است۔ خواجہ (ذکر اللہ بالخیر) فرمود کہ نقاوت [illegible] است۔ من ہیچ کتابی نہ نبشتہ ام۔[۲]

(ترجمہ) ایک شخص نے اودھ میں (مجھے) ایک کتاب دکھائی اور کہا کہ یہ جناب والا کی تصنیف ہے۔ خواجہ (نظام الدین اولیاء) نے فرمایا کہ اس نے غلط کہا ہے۔ میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ سلطان جی کی طرف سے اتنی عمدہ وضاحت کے باوجود ہمارے فاضل بزرگ علامہ اخلاق حسین دہلوی فرماتے ہیں کہ اس عبارت میں چونکہ سلطان جی کا نام نامی نہیں آیا' صرف "خواجہ" لکھا ہوا ہے' اس لئے اس عبارت سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سلطان جی نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔[۳]

قرونِ وسطیٰ میں بزرگوں کے نام سے کتابیں لکھنے کی غلط رسم پڑ گئی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث رقم طراز ہیں کہ ان کے زمانے تک حضرت بو علی قلندر کے نام سے کئی مثنویاں وجود میں آ گئی ہیں۔[۴]

امن و امان کی صورت حال

سلطان جی کے زمانے میں راستے محفوظ نہ تھے۔ عام طور پر ہندو ڈاکو مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ فوائد الفواد کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اجمیر کی حدود میں سرشام ڈاکے پڑنے لگتے تھے۔[۵] ایک اور موقع پر سلطان جی فرماتے ہیں کہ موصوف اجودھن سے دہلی آ رہے تھے۔ سرستی کی حدود میں ایک روز قبل ہندو ڈاکوؤں نے مسلمانوں کے قافلے پر حملہ کر کے بہت سے مسافروں کو قتل کر دیا۔ اگلے روز جب سلطان جی کا ادھر سے گذرا ہوا تو انہوں نے

---

۱ - اس روایت پر بہت لے دے ہوئی ہے۔
۲ - فوائد الفواد' ص ۷۶۔
۳ - علامہ اخلاق حسین' آئینہ ملفوظات' دہلی ۱۹۸۳ء' ص ۸۸۔
۴ - عبدالحق محدث' اخبار الاخیار' دہلی ۱۳۳۲ھ' ص ۲۹۔
۵ - فوائد الفواد' ص ۷۷۔

کشتوں میں مولانا کیتھلی کی نعش شناخت کر لی اور فاتحہ پڑھ کر آگے روانہ ہو گئے۔[۱] ایک مجلس میں آنجناب نے حاضرین کو بتایا کہ محمد نیشا پوری نامی ایک نقیب گجرات جا رہا تھا۔ اس علاقے میں ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ اثنائے سفر ایک ہندو نے تلوار لے کر اس پر حملہ کر دیا۔[۲]

ایک بار سلطان جی اجودھن سے دہلی جا رہے تھے کہ راستے میں ہندو ڈاکوؤں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کے پاس ایک گودڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا' اس لئے جان بچ گئی۔[۳] ایک مجلس میں انہوں نے ایک ہندو چور کا ذکر فرمایا جو رات کے وقت بابا فریدالدین مسعود کی والدہ ماجدہ کے گھر چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔[۴] بدایوں کے علاقے میں کٹھر ایک قدیم قصبہ ہے' وہاں بکثرت ہندو چور موجود تھے۔[۵] دہلی کے گرد و نواح میں میواتیوں کا زور تھا۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ وہ شہر کے دروازہ کمال تک آ جاتے تھے اور لوگ ان کے خوف سے اس طرف نہیں جاتے تھے۔ نمازِ مغرب سے قبل ہی شہر کے دروازے بند ہو جاتے تھے اور اگر کوئی شخص مغرب سے قبل باہر چلتا پھرتا نظر آتا تو دربان شور مچانے لگتے تھے کہ جلد اندر آ جا۔[۶]

جوامع الکلم حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس میں بھی یہ عبارت موجود ہے:

دران ایام میواں می آیند' میز دند' میبردند' از نماز دگر بالائی حوض سلطان کسی نمی باشد۔ ہمہ درون شہر می آیند۔[۷]

(ترجمہ) اس زمانے میں میواتی آتے' مار پیٹ کر کے (مال) لے جاتے۔ نمازِ عصر کے بعد حوض سلطان پر کوئی شخص نہ رہتا۔ سبھی شہر کے اندر آ جاتے تھے۔

ایک اور مجلس میں سلطان جی نے فرمایا کہ ملتان اور اجودھن کے درمیان بھی راستہ پُر خطر تھا۔[۸] ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دیہاتوں میں مسلمان عاملوں کا عمل دخل نہ تھا۔

---

۱ - ایضاً'' ص ۱۴۳۔
۲ - ایضاً'' ص ۴۹۔
۳ - ایضاً'' ص ۳۲۰۔
۴ - ایضاً'' ص ۲۴۰۔
۵ - ایضاً'' ص ۲۲۷۔۔ آنجا قطاعِ طریق بسیار بودند۔
۶ - ایضاً'' ص ۶۱۔
۷ - محمد اکبر حسینی' جوامع الکلم' کانپور : ۱۳۵۶ھ' ص ۲۴۹۔
۸ - فوائد الفواد' ص ۲۳۵۔

ہندو ڈاکو پورے ملک میں دندناتے پھرتے تھے حتیٰ کہ دہلی کے دروازے غروب آفتاب سے قبل ہی بند کرنے پڑتے تھے۔ اس سے مسلمان حکمرانوں کی بے بسی اور کمزوری بھی مترشح ہوتی ہے۔

معاشی حالت

مسلمان حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس کے باوجود ان کی مالی حالت بڑی پتلی تھی۔ اکثر بزرگوں کے حالات میں ایسی روایات ملتی ہیں کہ ان کے گھروں میں فاقوں کی نوبت آ جاتی تھی۔ سلطان جی کے لڑکپن میں ان کے گھر میں فاقے ہوتے تھے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ بابا فرید الدین کے مرید شام کے وقت اجودھن میں زنبیل گھماتے تھے اور لوگ اس میں روٹیوں کے بچے کھچے ٹکڑے ڈال دیتے تھے جس سے درویشوں کی گذر بسر ہوتی تھی۔ بعض لوگ اپنے کپڑے فروخت کر کے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مجبور تھے۔ سرکاری ملازمین اور فوجیوں کو بروقت تنخواہ نہ ملتی تھی۔ ایک روز امیر حسن علاء سجزی سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس دن وہ بڑے پریشان حال تھے۔ سلطان جی نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ تنخواہ نہیں ملی۔[۱] غربت کا یہ عالم تھا کہ ایک لونڈی پانچ روپے میں فروخت ہوتی تھی۔[۲]

حملۂ منگول

سلطان جی فرماتے ہیں کہ جس سال (۶۶۵ھ) بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے انتقال فرمایا اسی سال منگولوں نے اس علاقے (ملتان و دیپال پور) پر حملہ کیا۔[۳] ایک اور موقع پر انہوں نے منگولوں کے ہاتھوں لاہور کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے۔[۴] سلطان جی نے ایک مجلس میں حاضرین کو بتایا کہ بدرالدین غزنوی' غزنی سے لاہور آئے۔ ان دنوں لاہور آباد تھا۔ (یعنی اب آباد نہیں ہے' منگولوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہے)۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے سفر کا ارادہ کیا۔ کبھی ان کے دل میں آتا کہ وہ غزنی واپس چلے جائیں اور کبھی دہلی جانے کو جی چاہتا۔ غزنی میں ان کے والدین' بھائی بہن اور دوسرے اعزاء تھے اور دہلی میں صرف ایک داماد رہتا تھا۔ انہوں نے غزنی جانے کے لئے قرآن مجید سے فال لی تو عذاب کی آیت نکلی۔ پھر دہلی جانے کی نیت سے فال لی تو بہشت میں بہنے والی ندیوں کاذکر آیا۔ بدرالدین غزنوی لاہور سے دہلی چلے گئے۔ چند

---

۱ - ایضاً" ص ۹۴۔
۲ - ایضاً" ص ۳۳۹۔
۳ - ایضاً" ص ۳۷۴۔
۴ - ایضاً" ص ۲۰۲۔

دنوں بعد خبر آئی کہ منگولوں نے غزنی پر حملہ کر کے بہت سے افراد کو قتل کر دیا ہے۔ ان مقتولین میں بدرالدین غزنوی کے متعلقین بھی تھے۔[۱]

براوو قوم کا عروج

براوو گجرات و کاٹھیاواڑ کے ہندوؤں کی ایک پنچ ذات تھی۔ سلطان قطب الدین خلجی کا منظورِ نظر خسرو خان اسی قوم کا فرد تھا جو نو عمری میں "مسلمان" ہو گیا تھا۔ اس نمک حرام نے اپنے آقا کو قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ہم قوم براوو ہزاروں کی تعداد میں شہر میں داخل ہو گئے اور مسجدوں پر قبضہ کر کے وہاں مورتیاں رکھ دیں۔ قرآن مجید کی کھلم کھلا بے حرمتی ہونے لگی۔ اسی زمانے میں سلطان جی کی ایک مجلس میں ان "ملاعین" کی شورش کا ذکر ہوا۔ امیر حسن علاء سجزی نے آنجناب کو مطلع کیا کہ چاروں اطراف سے تشویشناک خبریں آ رہی ہیں۔[۲]

چشتیہ سلسلے میں چلّہ نہیں ہے

سلطان جی نے ایک مجلس میں بابا فریدالدین مسعودؒ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ انہوں نے زندگی میں صرف ایک بار جرأت کی اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے چلہ کاٹنے کی اجازت طلب کی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس سے شہرت ہوتی ہے اور خواجگانِ چشت میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا۔[۳]

مختلف درگاہوں میں خواجگانِ چشت کی چلہ گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ لاہور میں سید علی ہجویریؒ کی درگاہ میں اور ہسپتال روڈ پر حضرت یعقوب زنجانیؒ کے روضۂ مبارک میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی چلہ گاہیں موجود ہیں۔ لاہور میں لاہور روڈ پر ضلع کچہری کی حدود میں ٹبہ بابا فرید کے نام سے ایک عمارت موجود ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہاں بابا فرید نے چلہ کاٹا تھا۔ حضرت معین الدین اجمیری کے مرید اور بابا فرید کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے اس قول کے مطابق ان چلہ گاہوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟

---

۱ - ایضاً" ص ۴۴۔

۲ - ایضاً" ص ۳۷۳۔

۳ - ایضاً" ص ۴۲۔۔ "فرمود کہ حاجت نیست ازیں شہرت حاصل آید۔ از خواجگانِ ما ہم چنین نیامدہ است۔"

چشتیوں کی وسیع القلبی

چشتی سلسلے کے صوفیاء بڑے وسیع القلب تھے۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ ناگور میں ایک ہندو رہتا تھا۔ حضرت صوفی حمید الدین سوالی ناگوری نے کئی بار فرمایا کہ وہ "ولی" ہے۔[۱] سلطان جی نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ اشاعرہ کا مذہب ہے کہ جس مومن کا خاتمہ کفر پر ہو گا، وہ کافر ہے اور جس کافر کا خاتمہ ایمان پر ہو گا، وہ مومن ہے۔

مسندِ فقر ورثہ نہیں ہے

سلطان جی فرماتے ہیں کہ غزنی میں ایک شیخ طریقت تھے اور ان کے چار بیٹے تھے۔ ان کا ایک غلام زیرک نام بڑا نیک اور صالح تھا۔ جب شیخ کا وقتِ آخر آیا تو مریدوں نے ان سے پوچھا کہ ان کی مسند پر کون بیٹھے گا؟ شیخ نے کہا "زیرک"۔ جب زیرک کو اس کا علم ہو تو اس نے شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کے فرزند اسے ان کا جانشین نہیں ہونے دیں گے۔ شیخ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس کی مشکل حل کریں گے۔ شیخ کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں نے زیرک سے جھگڑا شروع کیا۔ وہ شیخ کی قبر پر گیا اور انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ انہی دنوں منگولوں نے غزنی پر حملہ کیا اور شیخ کے چاروں بیٹے حملہ آوروں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ زیرک پوری دلجمعی کے ساتھ مسند پر بیٹھ گیا۔[۲]

حضرت اخی جمشید راج گیری کے ملفوظات میں بھی اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ موجود ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ایک شیخ کے سات فرزند تھے جو نماز و روزہ کے پابند اور حلم، علم، تواضع اور خُلق جیسی صفات سے متصف تھے۔ ہر چند وہ عبادت میں مصروف رہتے لیکن عشق الٰہی سے خالی تھے۔ جب شیخ کا وقتِ آخر آیا تو بیٹوں نے ان سے پوچھا کہ ان کا سجادہ کس فرزند کے حصے میں آئے گا؟ شیخ نے فرمایا "ہم اللہ کی امانت کے امین ہیں۔ اگر کوئی اس کا اہل نہ ہو تو ہم اسے امانت سونپ دیں تو خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ اس صورت میں ہمارا شمار خدا کے دوستوں میں نہ ہو گا۔ نیز قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ان اللہ لا یحب الخائنین۔" شیخ نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ اس شہر میں ایک ہندو غلام ہے جو آب کاری کا کام کرتا ہے۔ اسے اس کے مالک سے خرید کر ان کے پاس لائیں۔ موصوف اسے مشرف باسلام کر کے اپنے

---

۱ - ایضاً" ص ۴۸۔ "ہندوی را بہ کرات گفتی کہ این ولی خداست۔"

۲ - ایضاً" ص ۵۔

سجادہ پر بٹھائیں گے۔ بیٹے اس بات پر سخت ناراض ہوئے تو شیخ نے کہا کہ سجادہ میراث نہیں ہے۔ اگر کوئی باپ مرتے وقت مال و دولت چھوڑے تو یقیناً بیٹے اس کے وارث ہوتے ہیں لیکن "کارِ عشق و محبت" میراث نہیں ہوتا۔[1]

آدابِ دستر خوان

کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھلانے کے لئے تھال اور لوٹا لایا جاتا تھا۔ اسے ابوالیاس کہتے تھے یعنی ناامیدی کا باپ' کیونکہ اس کے بعد کھانے کے لئے اور کچھ نہیں لایا جاتا۔ اسی طرح صوفیوں کے ہاں نمکدان کو ابوالفتح کہتے تھے۔[2] اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ درویش کھانا شروع کرنے سے پہلے نمک کی ایک چٹکی منہ میں ڈالتے تھے۔ حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات "احسن الاقوال" میں بھی ابوالفتح کا ذکر آیا ہے۔ وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ دسترخوان کو "بساط رحمت" کہا جاتا تھا۔[3] اجودھن میں بابا صاحب کے ابتدائی زمانے میں محمد نامی ایک شخص بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اگر دسترخوان ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ بابا صاحب نے اپنی انگلی سے زمین پر ایک دائرہ کھینچ کر فرمایا کہ اسے ہی دسترخوان سمجھ لو۔[4]

درسِ اخلاق

سلطان المشائخ نے ایک روز حاضرین سے کہا کہ اگر کوئی شخص ان کے راستے میں کانٹے رکھے اور انتقاماً" وہ بھی اس کے راستے میں کانٹے بچھائیں' تو پھر دنیا میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے لیکن درویشوں میں یہ دستور نہیں ہے۔ یہاں نیک و بد کے ساتھ نیک ہی ہونا چاہئے۔[5]

حاضرین میں سے ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ بعض لوگ ان کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں جنہیں سننے کی وہ تاب نہیں لا سکتے۔ یہ سن کر سلطان جی نے فرمایا کہ انہوں نے سب کو معاف کیا' لہٰذا حاضرین بھی معاف کر دیں اور کسی سے دشمنی نہ رکھیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اندرپت کا ایک شخص چھجو ہمیشہ ان کے درپئے آزار رہتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو تیسرے روز حضرت اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کی مغفرت کے لئے

۱۔ یحییٰ بن علی اصغر' ملفوظات اخی جمشید راجگیری' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ' یونیورسٹی گلشن نمبر ۴ / ۶۶ فارسیہ مذہب' ورق ۵۹ ب۔

۲۔ فوائد الفواد' ص ۳۴۷۔

۳۔ حماد بن عماد کاشانی' احسن الاقوال' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ' یونیورسٹی گلشن نمبر فارسیہ مذہب تصوف ۳۱۸' ورق ۱۹ الف۔ ۴۔ فوائد الفواد' ص ۹۳۔ ۵۔ ایضاً' ص ۳۸۔

دعا کی۔ آپ نے چھجو کی قبر پر کھڑے ہو کر فرمایا "پروردگارا جس نے مجھے برا بھلا کہا میں نے اسے معاف کیا۔ میری وجہ سے اسے عذاب نہ دینا۔"[1]

مشائخ کے ہاں طریقۂ تعظیم

سلطان جی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ اوحدالدین کرمانیؒ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے ہاں آئے۔ شیخ الشیوخ نے اپنا مصلیٰ لپیٹ کر گھٹنے تلے دبا لیا۔ یہ مشائخ کے نزدیک نہایت اعلیٰ درجے کی تعظیم ہے۔[2]

متابعتِ شیخ

حضرت بابا فرید نے ایک بار دعا مانگی اور فرمایا کہ حاضرین میں کوئی ہے جو اسے یاد رکھے۔ سلطان جی نے عرض کیا کہ وہ اسے یاد رکھیں گے۔ بابا صاحب نے انہیں دعا یاد کرائی اور پھر ان سے سُنی۔ اس موقع پر بابا صاحب نے اعراب درست کرائے۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ دوسرے اعراب بھی درست تھے لیکن انہوں نے ان پر بابا صاحب کے اعراب کو ترجیح دی۔ ایک روز بدرالدین اسحٰق نے ان سے کہا کہ انہوں نے بہت اچھا کیا جو بابا صاحب کے اعراب کے مطابق دعا یاد کی۔ یہ سن کر سلطان جی نے فرمایا کہ اگر عربی گرائمر کا امام سیبویہ بھی آ کر کہے کہ جیسے وہ پڑھتے ہیں' اس سے کچھ اور معنی نکلتے ہیں' تو موصوف اس کی بات نہ مانیں گے۔ اس پر بدرالدین اسحٰق نے کہا کہ جس طرح سے سلطان جی شیخ کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔[3]

بیعت زندہ سے کرنی چاہئے

بابا فرید الدین کا سب سے بڑا بیٹا (خواجہ نصیرالدینؒ) دہلی گیا اور وہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار اقدس کے پائنتی بیٹھ کر اپنا سر منڈوا کر خود کو خواجہ صاحب کا مرید سمجھنے لگا۔ بابا صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ خواجہ صاحب ان کے مخدوم ہیں لیکن یہ بیعت درست نہیں ہے۔ مرید ہونے کے لئے شیخ کا ہاتھ تھامنا ضروری ہے۔[4]

---

۱ - ایضاً' ۱۹۴۔

۲ - ایضاً' ص ۵۶۔

۳ - ایضاً' ص ۴۲۔

۴ - ایضاً' ص ۱۳۲۔

متقی اور تائب کا فرق

ایک مجلس میں سلطان المشائخ نے فرمایا کہ دو شخصوں میں تائب اور متقی کے بارے میں بحث چل نکلی- ان میں سے ایک کہتا تھا کہ متقی کو تائب پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی گناہ نہیں کیا- دوسرا کہتا تھا کہ تائب افضل ہے کیونکہ اس نے گناہوں کی لذت سے آشنا ہونے کے بعد ان سے منہ موڑا ہے- جب دونوں کسی فیصلے پر نہ پہنچ پائے تو انہیں ایک جولاہا کھڈی پر بیٹھا اپنے کام میں مشغول نظر آیا- انہوں نے اسے حَکم بنایا- اس نے کہا کہ وہ تو اُمّیِ محض ہے- وہ تائب اور متقی کے فرق کو نہیں جانتا- البتہ وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ جو دھاگا ٹوٹ جاتا ہے وہ اسے گانٹھ لگا کر جوڑ دیتا ہے لیکن وہ دھاگہ اس دھاگے جتنا مضبوط نہیں ہوتا جو بغیر جوڑ کے ہوتا ہے-[1] یہ واقعہ علی بن محمود جاندار نے بھی سلطان جی کی زبانِ مبارک سے "دُررِ نظامی" میں نقل کیا ہے-[2]

اُس زمانے میں ہندوستان میں علمِ حدیث نہ تھا

سلطان جی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صرف تین یا چار حدیثوں کی روایت کی ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے دس حدیثوں کی- ابن مسعود کے بارے میں حضرت نے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے صرف ایک حدیث کی روایت کی ہے-[3] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علماء پر فقہ کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ حدیث کی طرف توجہ ہی نہ دیتے تھے- ملفوظات میں ہمیں یہی ملتا ہے کہ فلاں عالم قدوری پڑھا رہے تھے اور فلاں بزرگ بزدوی کا درس دے رہے تھے- کہیں درسِ حدیث کا ذکر نہیں ملتا- جس ابنِ مسعودؓ کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا ہے کہ انہوں نے صرف ایک حدیث کی روایت کی ہے' وہ ۸۴۸ حدیثوں کے راوی ہیں[4] اور انہی روایات کے سہارے فقۂ حنفی کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے- ابنِ عباس

---

۱ - ایضاً" ص ۳۵۵-

۲ - علی بن محمود جاندار' دُررِ نظامی' مخطوطہ سر سالار جنگ میوزیم حیدر آباد نمبر ۲۶۰ / ۵۹۹ / ۶۱' ورق ۱۵ الف-

۳ - فوائد الفواد' ص ۱۹۸-

۴ - ڈاکٹر حفیظ رضی' عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ' لاہور: ۱۹۷۱ء' ص ۱۳۱-

کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ صرف دس حدیثوں کے راوی تھے۔ ان کا شمار کثیرالروایات صحابہ میں ہوتا ہے اور ان سے ۲۶۶۰ حدیثیں مروی ہیں۔[1]

ہندوؤں کی سخت دلی

ایک روز ایک مسلمان غلام اپنے ہندو بھائی کو ساتھ لے کر سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ اس کا بھائی اسلام کی طرف کچھ رغبت رکھتا ہے یا نہیں؟ اس نے عرض کیا کہ وہ اسی نیت سے اسے یہاں لایا ہے کہ شاید جناب کی توجہ سے وہ مسلمان ہو جائے۔ حضرت نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اس قوم پر کسی کے کہنے سننے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر وہ کسی صالح مرد کی صحبت میں بیٹھتا رہے تو شاید مسلمان ہو جائے۔[2]

فوائد الفواد میں لاہور کا ذکر

سلطان المشائخ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ لاہور میں بہت سے بزرگ محو خواب ابدی ہیں۔[3] ایک بار آپ نے امیر حسن علاء سجزی کی موجودگی میں فرمایا کہ بدایوں میں شادی مقری نام کے ایک قاری رہتے تھے اور ان کا استاد خواجگی مقری لاہور میں قیام پذیر تھا۔ ایک بار لاہور سے ایک مسافر بدایوں آیا تو شادی مقری نے اس سے لاہور کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ پہلے وہاں طوفانی بارش ہوئی جس سے بہت سے گھر تباہ ہو گئے۔ اس کے بعد آگ بھڑک اٹھی جس سے بڑا نقصان ہوا۔ یہ سن کر شادی مقری نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کا آقا زندہ نہیں ہے۔ مسافر نے کہا کہ ہاں اس کا انتقال ہو چکا ہے۔[4] فوائد الفواد واحد کتاب ہے جس میں خواجگی مقری کا نام آیا ہے۔ اگر سلطان جی اس کا ذکر نہ کرتے تو آج ہم یہ بھی نہ جانتے کہ لاہور میں کبھی اتنے اونچے پایہ کا قاری موجود تھا۔

سلطان جی نے ایک مجلس میں فرمایا کہ لاہور کے چند تاجر سامانِ تجارت لے کر گجرات کاٹھیاواڑ گئے۔ وہاں ان دنوں ہندوؤں کا عمل دخل تھا۔ ہندو سوداگروں نے ان کا سامان خریدنے پر آمادگی ظاہر کی تو لاہوریوں نے دوگنی قیمت بتائی اور پھر بھاؤ تاؤ کر کے اس سے نصف قیمت

---

۱ - اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، لاہور: ۱۹۷۳ء، ج ۱۴، ص ۷۹۱۔

۲ - فوائد الفواد، ص ۳۰۵۔

۳ - ایضاً، ص ۵۷-- "بسیار بزرگان آنجا خفتہ اند۔"

۴ - ایضاً، ص ۲۶۲۔

پر مال بیچنے پر رضا مند ہو گئے۔ جب ہندو تاجروں نے یہ معاملہ دیکھا تو ان سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ وہ لاہور سے آئے ہیں۔ ہندوؤں نے ان سے پوچھا کہ ان کے شہر میں تاجر ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں کہ قیمت کچھ اور بتاتے ہیں اور پھر مال کسی اور نرخ پر فروخت کرتے ہیں؟ لاہوریوں نے اثبات میں جواب دیا تو ہندوؤں نے ان سے کہا کہ جس شہر میں ایسا معاملہ ہو' وہ تو آباد نہیں رہ سکتا۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ جب وہ تاجر لاہور واپس پہنچے تو منگول شہر کو تباہ کر چکے تھے۔[۱]

منگولوں نے ۲۷ اپریل ۱۲۴۶ء کو لاہور فتح کیا اور اسی روز حضرت پیر زکی اور حضرت پیر صلاح الدین ابوالمجاہد المعروف بہ پیر بلخی شہید ہوئے تھے۔ پیر بلخی کے مزار مبارک کا کتبہ لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے اور اس پر ان کا یوم شہادت ۹ ذی الحجہ ۶۴۳ھ کندہ ہے۔[۲]

دہلی کے بارے میں چند نادر معلومات

فوائد الفواد میں دہلی کے ایک بازار کا ذکر آیا ہے' جو کرپاہی بازار کے نام سے موسوم تھا۔[۳] نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کپڑے کا کاروبار ہوتا تھا۔ اس زمانے میں دہلی میں ایک مدرسہ تھا جو مدرسۂ معزی کہلاتا تھا۔ وہاں مولانا زین الدین نام کے ایک بزرگ رہتے تھے جو عالمانہ گفتگو فرماتے تھے' حالانکہ وہ اُمیِ محض تھے۔[۴] دہلی میں ملک عزالدین بختیار نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس کے بالمقابل حمام تعمیر کیا تھا۔[۵] ۵ ذی الحجہ ۷۱۷ھ ر ۸ فروری ۱۳۱۸ء کو ایک شخص سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ "دارالخلافت" سے آرہا ہے۔ امیر حسن علاء سجزی نے وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ اس چھاؤنی سے آیا ہے جو "سیری" میں ہے اور اسے اب دارالخلافت کہنے لگے ہیں۔[۶] یہ سلطان قطب الدین مبارک خلجی کا دور حکومت تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ الامام الاعظم خلیفہ رب العالمین اور خلیفۃ اللہ جیسے القاب لکھوانے شروع کئے تھے۔[۷] اس لئے خلیفۃ اللہ کے دارالسلطنت کو "دارالخلافت" ہی کہنا چاہئے۔ حضرت امیر خسرو نے مثنوی نُہ سپہر میں دہلی کو دارالخلافت ہی لکھا ہے:[۸]

---

۱ - ایضاً' ص ۲۰۱۔

۲ - محمد اسلم' خفتگانِ خاکِ لاہور' لاہور : ۱۹۹۳ء' ص ۵۰۱۔

۳ - فوائد الفواد' ص ۱۱۳۔

۴ - ایضاً' ص ۳۷۔

۵ - ایضاً' ص ۲۵۶۔

۶ - ایضاً' ۳۱۱۔

۷ - خلیق احمد نظامی' سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات' دہلی : ۱۹۵۸ء' ص ۲۸۸۔

۸ - امیر خسرو' مثنوی نُہ سپہر' کلکتہ : ۱۹۴۸ء' ص ۷۷۔

مگر گفت بغداد با ہر کہ آید
کہ دارالخلافہ بہ دہلی نشاید

فوائد الفواد میں حوضِ رانی سے قریب باغِ جسرت کا ذکر آیا ہے۔ ابتدائی زمانے میں سلطان جی نے وہاں دعا کی تھی کہ جہاں خدا کی مرضی ہو' انہیں بھیج دے۔ یہیں انہوں نے ہاتفِ غیبی سے غیاث پور کا نام سنا' حالانکہ اس وقت تک موصوف اس نام سے بھی آگاہ نہ تھے۔[۱]

خضر آباد دہلی کی ایک قدیم بستی ہے۔ طماس خان نے اس کا ذکر گنجی خضر آباد کے نام سے کیا ہے۔[۲] مرزا سنگین بیگ جیسے مؤرخوں کا خیال ہے کہ یہ بستی خضر خان بانی خاندان سادات نے بسائی تھی۔[۳] اس خیال کی تردید فوائد الفواد سے ہوتی ہے۔ امیر حسن علاء سجزی خضر آباد کی چھاؤنی میں رہتے تھے۔[۴] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خضر آباد سلطان جی کے زمانے میں موجود تھا۔ راقم کا یہ خیال ہے کہ خضر آباد' سلطان علاء الدین خلجی کے ولی عہد خضر خاں نے آباد کیا تھا۔ یہ وہی شہزادہ ہے جس کا ذکر امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی "دول رانی خضر خان" میں کیا ہے۔

بدایوں کی علمی اور روحانی فضاء

مولانا سراج الدین ترمذی' مولانا علاء الدین اُصولی' قاضی جمال الدین ملتانی' خواجہ شادی مقری بدایوں میں مدفون تھے۔ امیر حسن علاء سجزی نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ بدایوں گیا تھا اور اس نے ان بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کی اور جو راحت اس نے وہاں پائی ویسی اور کہیں نہیں ملی۔[۵] سلطان المشائخ کے جدامجد' نانا بزرگوار اور والدِ محترم بدایوں ہی میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ اسی لئے اس شہر کو "مدینۃ الاولیاء" کہتے ہیں۔ ایک مجلس میں سلطان المشائخ نے نام لئے بغیر بدایوں کے ایک سید کا ذکر کیا جو وجیہ و شکیل' صالح اور عالم متبحر تھا۔ جو شخص اسے دیکھتا وہ کہتا کہ یہ واقعی سید ہے۔ سلطان المشائخ نے بھی اسے دیکھا تھا۔ موصوف فرماتے ہیں کہ بدایوں میں اس کے بہت سے شاگرد تھے۔[۶]

---

۱ - فوائد الفواد' ص ۲۴۲۔
۲ - طماس خان' طماس نامہ' لاہور : ۱۹۸۶ء' ص ۲۹۳۔
۳ - مرزا سنگین بیگ' سیرالمنازل' دہلی : ۱۹۸۲ء' ص ۷ / ۶۔
۴ - فوائد الفواد' ص ۴۳۔
۵ - ایضاً' ص ۳۵۱۔
۶ - ایضاً' ص ۳۱۳۔

شمس الدین التتمش بدایوں میں گورنر کے فرائض انجام دے چکا تھا۔ اس نے وہاں مسجد بنوائی جو شمسی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ بدایوں میں ہی التتمش نے سلطان تاج الدین یلدوز کو قید میں رکھا تھا۔ اس کا انتقال وہیں ہوا اور شمسی مسجد کی دیوار کے ساتھ اس کی قبر تا حال موجود ہے۔[۱]

سلطان المشائخ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ بدایوں کا کوتوال عزیز درویشوں کا خدمت گذار اور شیخ ضیاء الدین بداونی کا مرید تھا۔ وہ عین عالم جوانی میں بدایوں میں شہید ہوا۔[۲]

مولانا رضی الدین حسن صغانی، صاحب مشارق الانوار بدایوں میں رہتے تھے۔ پھر انہوں نے کول (علی گڑھ) میں سکونت اختیار کر لی۔[۳]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ بدایوں میں عزیز بشیر نامی ایک درویش رہتا تھا۔ وہ بدایوں سے اس ارادے سے دہلی گیا کہ قاضی حمید الدین ناگوری کے فرزند مولانا ناصح الدین سے خرقہ حاصل کرے۔ مؤخر الذکر بزرگ نے حوض سلطان کے کنارے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں اسے خرقہ عطاء کرنا تھا۔ اتفاق سے اس کی زبان سے یہ نکل گیا کہ اس حوض کی کیا حقیقت ہے۔ بدایوں میں اس سے بھی بڑا حوض ہے۔ یہ بات ایک صاحب دل بزرگ محمد کبیر نے بھی سن لی۔ انہوں نے مولانا ناصح الدین سے کہا کہ وہ عزیز بشیر کو خرقہ نہ دیں، وہ بے ہودہ گو ہے۔[۴]

قاضی کمال الدین جعفری بدایوں میں متعین تھے۔ اُمورِ قضاء میں مشغولیت کے باوجود وہ قرآن حکیم کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرتے تھے۔ جب وہ بوڑھے ہو گئے اور ان کی قوت جواب دے گئی تو وہ "مسبعاتِ عشر" کی تلاوت پر ہی اکتفا کرنے لگے۔ کسی نے اس کی بابت پوچھا تو قاضی صاحب نے فرمایا کہ "مسبعاتِ عشر" جامع اوراد ہیں۔[۵]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ احمد نامی بزرگ نہایت ہی صالح اور ابدال صفت انسان تھا۔ وہ اگرچہ پڑھا لکھا نہ تھا پھر بھی سارا دن احکام شریعت اور مسائل کی تحقیق میں لگا رہتا تھا۔[۶]

---

۱ - شیخ قاری بشیرالدین پنڈت، تاریخ ہندی قرونِ وسطیٰ، علی گڑھ: ۱۹۳۹ء، ص ۲۳۰۔
۲ - فوائدالفواد، ص ۲۹۴۔
۳ - ایضاً" ص ۱۷۹۔
۴ - ایضاً" ص ۲۹۰۔
۵ - ایضاً" ص ۳۸۱۔
۶ - ایضاً" ص ۷۹۔

جب سلطان المشائخ نے بدایوں کی بجائے دہلی میں سکونت اختیار کی تو احمد بھی دہلی چلا آیا۔

اس زمانے میں بدایوں میں سبعہ کا قاری موجود تھا۔ وہ بڑا نیک اور صالح تھا۔ اس کا نام شادی مقری تھا۔ اس کی یہ کرامت تھی کہ جو شخص اس سے قرآن مجید کا ایک ورق پڑھ لیتا' اسے اللہ کے فضل و کرم سے پورا قرآن مجید حفظ ہو جاتا تھا۔[۱]

اسی زمانے میں مولانا علاء الدین بدایوں میں رہتے تھے۔ وہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ سے فیض یافتہ تھے۔ ان کا شمار اس عہد کے عالموں اور دانشمندوں میں ہوتا تھا۔ سلطان المشائخ نے ہدایہ کے ایک نسخے کا مقابلہ ان کے نسخے کے ساتھ کیا تھا۔[۲]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ملک یار نام کے ایک بزرگ بدایوں کی ایک مسجد میں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا ظاہری علم تو اتنا نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں "خاص علم" سے نوازا تھا۔ ایک بار لوگوں نے ان کے امام بننے پر اعتراض کیا تو مولانا علاء الدین نے فرمایا کہ اگر انہیں بغداد کی جامع مسجد کا امام مقرر کیا جائے تو بھی ان کے مرتبے سے کم ہے۔[۳]

خواجہ ابوبکر موئے تاب بدایوں میں رہتے تھے۔ وہ ایک رات بیدار ہوئے' وضو کیا' دو نفل ادا کئے اور جان بحق تسلیم ہو گئے۔ یہ واقعہ بیان کر کے سلطان المشائخ نے فرمایا کہ لوگ جیسے جیتے ہیں ویسے ہی مرتے ہیں۔[۴]

خواجہ شاہی موئے تاب بھی بدایوں میں رہتے تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری انہیں "شاہی روشن ضمیر" کہا کرتے تھے۔ ان کا رنگ سیاہ تھا۔[۵]

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ بدایوں میں مسعود نخاس نامی ایک درویش رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خواجہ شاہی موئے تاب نے اپنا "حمام" خوب گرم کیا ہوا ہے۔ یہ اسی میں جل مرے گا۔ اس بزرگ کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور وہ جوانی ہی میں فوت ہو گئے۔[۶]

سلطان جی فرماتے ہیں کہ خواجہ عزیز کرک نامی ایک بزرگ بدایوں میں مدفون ہیں۔ ابتدائے حال میں وہ جوہری تھے' پھر انہوں نے درویشی اختیار کر لی۔[۷]

---

۱ - ایضاً" ص ۲۶۲۔
۲ - ایضاً" ص ۲۷۸۔
۳ - ایضاً" ص ۲۸۰۔
۴ - ایضاً" ۲۸۹۔
۵ - ایضاً"۔
۶ - ایضاً" ص ۲۹۱۔
۷ - ایضاً" ص ۳۶۴۔

سلطان المشائخ کے مرید خاص حافظ سراج الدین نے بدایوں میں سکونت اختیار کر لی تھی ان کے نفسائے معطر نے تا دیر بدایوں کے ماحول کو معطر کئے رکھا۔[1]

یہ تھی بدایوں کی وہ علمی اور رُوحانی فضاء' جس میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے آنکھیں کھولیں اور اس ماحول نے ان کی سیرت سازی اور مستقبل بنانے میں خاص کردار ادا کیا۔

✪✪✪

۱ - ایضاً" ص ۲۸۹۔

دُررِ نظامی

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کے مریدوں میں سے امیر حسن علاء سجزی، علی بن محمود جاندار، خواجہ محمد بن مولانا بدرالدین اسحاق اور خواجہ عزیز الدین صوفی نے بالترتیب فوائد الفواد، دُررِ نظامی، انوارالمجالس اور تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار کے عنوانات سے اپنے مرشدِ گرامی کے ملفوظات جمع کئے تھے۔ مؤخرالذکر دونوں بزرگوں کی کاوشیں اب ناپید ہیں۔ امیر حسن علاء سجزی کی تالیف فوائد الفواد کو شہرتِ دوام ملی ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے علی بن محمود جاندار کے جمع کردہ ملفوظات کے دو مخطوطے دریافت ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک مخطوط سر سالار جنگ میوزیم حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے [۱] اور دوسرا نسخہ بوہار گلشن کلکتہ میں موجود ہے۔[۲] راقم السطور کو بھارت کے آخری سفر کے دوران میں ان دونوں مخطوطوں سے استفادہ کرنے کی سعادت ملی ہے۔

جامع ملفوظات

دُررِ نظامی میں علی بن محمود جاندار نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ سے بیعت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے قاضی محی الدین کا شانی کے توسط سے بیعت کی درخواست پیش کی جو منظور ہوئی۔ ان کی دوسری درخواست پر سلطان المشائخ نے انہیں محلوق ہونے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ جامع ملفوظات نے قاضی صاحب کے توسط سے یہ بھی حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ مقروض ہیں اس لئے نوکری ترک نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ درخواست بھی منظور ہوئی۔[۳]

بیعت کے بعد علی بن محمود نے سلطان المشائخ سے قرآن پاک حفظ کرنے کی اجازت مانگی۔ حضرت نے اجازت دیتے ہوئے انہیں یہ نصیحت فرمائی کہ وہ قرآن حکیم کسی اچھے قاری سے ابوعمر عاصم رحمۃ اللہ کی روایت سے پڑھنا سیکھیں۔[۴]

---

۱ - مخطوط نمبر ۳۶۰ / ۵۹۹ / ۶۱۔ مخزونہ سرسالار جنگ میوزیم حیدر آباد، دکن۔

۲ - روٹو گراف نمبر ۲۶۴، سیمینار لائبریری شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۳ - دُررِ نظامی، مخطوطہ سرسالار جنگ میوزیم، ورق ۳۱ ب۔

۴ - ایضاً، ورق ۳۰ ب۔

دررِ نظامی کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جامع ملفوظات ۱۳ رمضان المبارک ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) کو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کے حلقۂ مریدی میں داخل ہوا تھا۔[۱]

علی بن محمود لکھتے ہیں کہ وہ اور مولانا الشیبانی ہر ہفتے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور وہاں جو باتیں سنتے تھے' انہیں نقل کر لیتے تھے۔[۲]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس مجموعہ ملفوظات کا نام دُررِ نظامیہ تحریر فرمایا ہے[۳] لیکن مذکورہ بالا دونوں مخطوطوں میں متن میں اس کا نام دُررِ نظامی لکھا ہے[۴]' اس لئے میں اسے ہی صحیح سمجھتا ہوں۔

جامع ملفوظات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ موصوف سلطان المشائخ کے مرید تھے اور انہوں نے خلاصۃ اللطائف کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ شیخ محدث نے اس کتاب سے ایک مختصر سی عربی عبارت بھی نقل کی ہے۔[۵]

دُررِ نظامی کے ایک اندراج سے یہ معلوم ہوا کہ علی بن محمود کا ایک بیٹا مسمیٰ ابوالقاسم تھا جو بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔[۶]

دُررِ نظامی کا زمانۂ تالیف

امیر حسن علاء سجزی نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کی ایک مجلس کے ملفوظات ۱۲ صفر ۷۱۹ھ کی تاریخ کے تحت درج کیے ہیں۔ یہ مجلس فوائد الفواد کے آخر میں ہے اور دُررِ نظامی کی ابتداء میں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جس زمانے میں فوائدالفواد قریب الاختتام تھی ان دنوں علی بن محمود دُررِ نظامی کا آغاز کر رہے تھے۔ اس حساب سے اس تصنیف دلپذیر میں زیادہ تر مواد فوائد الفواد کی تکمیل کے بعد کا ہونا چاہیے۔

دُررِ نظامی کے مندرجات

دُررِ نظامی میں امام غزالی' جار اللہ زمخشری اور عین القضاۃ کے حوالے ملتے ہیں۔ اس

۱- ایضاً" ورق ۳۹ ب۔

۲- ایضاً" ورق ۲ ب۔

۳- خلیق احمد نظامی' "ملفوظات کی اہمیت" مقالہ مشمولہ نذرِ عرشی' مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء' ص ۴۳۶۔

۴- دُررِ نظامی' ورق ۲ الف--- "این رسالہ را دُررِ نظامی نام کردہ شد۔"

۵- عبدالحق محدث' اخبارالاخیار' مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ' ص ۹۴ - ۹۵۔

۶- دُررِ نظامی' ورق ۵ ب۔

سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی تصانیف سلطان المشائخ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ حضرت کو حدیث پر عبور تھا۔ موصوف علمی مباحث میں حدیث سے استدلال کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ملفوظات میں ان موضوع حدیثیں بھی آ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شبِ معراج میں آنحضرتؐ کو بارگاہ ایزدی سے خرقہ ملا تھا۔[1]

بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

دُررِ نظامی میں بابا فرید کے بارے میں بڑا مواد موجود ہے۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس سے استفادہ نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ دُررِ نظامی کی کمیابی ہو۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ابتداء میں بابا فریدؒ ہانسی میں رہتے تھے۔ جب وہاں ان کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا تو انہوں نے نقل مکانی میں ہی عافیت جانی۔ موصوف ہانسی سے اپنے آبائی وطن کوتھے وال تشریف لے گئے۔[2] یہ مجہول سی جگہ تھی اس لئے وہاں معاش کم تھی۔ ملتان نزدیک ہونے کی وجہ سے بابا صاحب وہاں بھی مستور نہ رہ سکے اس لئے موصوف لاہور چلے گئے۔ یہ ایک بڑا شہر تھا جو آبِ رواں (راوی) کے کنارے آباد تھا۔ اس لئے وہاں ان کا جی نہ لگا۔ اس زمانے میں اجودھن ایک مجہول سا گاؤں تھا اس لئے حضرت وہاں تشریف لے گئے اور اپنی زندگی کے آخری ۲۷ سال وہیں گزارے۔[3]

اس ملفوظ سے بابا فریدؒ کا لاہور میں قیام ثابت ہے۔ جس جگہ ان دنوں ضلع کے دفاتر ہیں، وہاں ان کی رہائش گاہ موجود ہے۔[4]

حضرت نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ بابا فریدؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ پیر مرید کے لئے مشاطہ کا حکم رکھتا ہے۔ بابا صاحب اپنے مریدوں کو کسی شخص کی امانت اپنے پاس رکھنے سے منع کرتے تھے۔[5] ایک روز سلطان المشائخ نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ بابا فرید الدینؒ نہ ہی کسی سے ادھار لیتے اور نہ ہی مال جمع کرتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ آتا اسے خرچ کر ڈالتے اور اگر کچھ نہ آتا تو صبر کرتے تھے۔ بابا فریدؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ فقیر کو ادھار نہیں لینا چاہیے۔[6]

---

۱ - "ایضاً" ورق ۴۹ ب۔

۲ - کوتھے وال پر ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا مضمون، ماہنامہ المعارف، لاہور، بابت ماہ جولائی ۱۹۸۳ء۔

۳ - دُررِ نظامی، ورق ۹۶ ب۔

۴ - نور احمد چشتی، تحقیقاتِ چشتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴، ص ۴۹۲۔

۵ - دُررِ نظامی، ورق ۴۹ ب۔

۶ - "ایضاً" ورق ۵۹ ب۔

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ ایک روز بابا فریدؒ نے سماع سننے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے اس روز کوئی قوال وہاں موجود نہ تھا۔ بابا صاحب نے حضرت بدرالدین اسحاقؒ کو بلا کر کہا کہ وہ قاضی حمیدالدین ناگوریؒ کا خط لائیں۔ موصوف "خریطۂ مکتوبات" اٹھا لائے اور اس میں سے قاضی صاحب کا خط تلاش کر لیا۔ بابا فریدؒ نے انہیں حکم دیا کہ وہ کھڑے ہو کر خط پڑھیں۔ جب انہوں نے یہ رباعی پڑھی :

آں عقل کجا کہ درکمال تو رسد — آں روح کجا کہ در جلال تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی ز جمال — آں دیدہ کجا کہ در جمال تو رسد

تو بابا صاحب پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جو تحریر و تقریر میں نہیں آ سکتی۔[1]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے حجرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس وقت بابا فریدؒ ننگے سر تھے اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ موصوف بار بار یہ رباعی پڑھ رہے تھے :

خواہم کہ ہمیشہ در وفای توزیم — خاکی شوم و بزیر پای تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم و برای تو زیم

بابا صاحب یہ رباعی پڑھ کر سجدہ ریز ہو جاتے اور کچھ دیر بعد کھڑے ہو کر رقص کرنے لگتے۔

سلطان المشائخ بڑی دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر ہمت کر کے حجرے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنا سر بابا صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ بابا صاحب خدا جانے اس وقت کس عالم میں تھے۔ انہوں نے سلطان جی کو مخاطب کر کے فرمایا "بخواہ چہ میخواہی"۔ انہوں نے فوراً عرض کیا "من چیزی از نعمت دین خواستم" بابا صاحب نے فرمایا وہ نعمتیں انہیں دی جاتی ہیں۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ عمر بھر ان کے دل میں یہ ملال رہا کہ اس وقت انہوں نے کیوں نہ اس بات کی التجا کی ان کا انتقال سماع کے دوران ہو۔[2]

حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ بابا فریدؒ اپنی مجالس میں عوارف المعارف کے حقائق بیان کیا کرتے تھے۔[3]

قرون وسطیٰ میں سلسلہ چشتیہ کی خانقاہوں میں عوارف المعارف کا درس معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ اسی سے اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بابا فریدؒ کا تو یہ حال تھا

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۰۲ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۹۹ الف --- "چرانخواستم کہ در سماع بمیرم۔"
۳ - ایضاً" ورق ۴۹ الف۔

کہ اگر بھی ان کی طبیعت سماع کی طرف مائل ہوتی اور قوال میسر نہ آتا تو موصوف اپنے کسی مرید سے عوارف المعارف کی چند سطریں پڑھوا کر سنتے اور ان پر وجد طاری ہو جاتا۔

بابا صاحب نے عوارف المعارف کے چند باب سبقاً سبقاً سلطان المشائخ کو پڑھائے تھے۔ جن دنوں ان کے ہاں عوارف المعارف کا درس ہو رہا تھا، بابا صاحب کے ہاں بیٹا ہوا۔ انہوں نے صاحب عوارف المعارف کے نام کی مناسبت سے اس کا نام شہاب الدین رکھا۔[۱]

جامع ملفوظات نے ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء سے یہ سنا کہ بابا فریدؒ کبھی کبھی "ڈولہ" میں سوار ہوا کرتے تھے۔[۲] درر نظامی میں ایک موقع پر "کھچڑی" کا ذکر بھی آیا ہے۔[۳] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فارسی بول چال میں ہندی الفاظ بلا تکلف بولے جاتے تھے

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص بابا فریدؒ کا مرید ہونے کی خواہش کا اظہار کرتا تو بابا صاحب اسے فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھنے کو کہتے۔ اس کے بعد اس سے آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ...... الخ پڑھواتے اور پھر اس سے شھداللہ انہ لا الٰہ الا ھو اور ان الدین عنداللہ الاسلام کا اقرار کرواتے۔ پھر اس سے کہتے "بیعت کرو مجھ ضعیف سے، مجھ ضعیف کے خواجہ سے اور خواجہ کے خواجہ سے اور اقرار کرو کہ میں اپنے ہاتھ کو روکوں گا بُرے کام سے اور قدم کو روکوں گا بُری جگہ جانے سے اور نگاہ کو قابو میں رکھوں گا نہ دیکھنے والی چیز سے۔" جب مرید اس کا اقرار کرتا تو اس سے یہ بھی عہد لیتے کہ وہ شریعت پر عمل کرے گا۔ پھر اس سے انشاء اللہ کہلواتے۔[۴]

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ نے بابا فریدؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں فقط ایک بار جرأت کا مظاہرہ کیا اور ان سے چلہ کاٹنے کی اجازت مانگی۔[۵] خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسی باتوں سے درویش کی شہرت ہوتی ہے۔ نیز یہ ان کے پیروں کا طریقہ نہیں ہے۔[۶]

---

۱ - حسن علاء سجزی، فوائدالفواد (اردو ترجمہ)، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص ۱۷۳۔
۲ - دُرر نظامی، ورق ۲۹ الف۔
۳ - ایضاً، ورق ۸۶ الف۔
۴ - ایضاً، ورق ۳۸ ب۔
۵ - ایضاً، ورق ۲۸ الف۔
۶ - ایضاً۔

حضرت نظام الدینؒ کے جانشین حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کی ایک مجلس میں چلہ کشی کا ذکر آیا تو موصوف نے حاضرین کو بتایا :

"خواجگان ما در اربعین نہ نشستہ اند"[1]

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ بابا فرید اور ان کے داماد حضرت بدرالدین اسحاق بیٹھ کر اپنے گھٹنے کھڑے رکھتے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر مراقبہ کیا کرتے تھے۔[2]

حضرت نظام الدینؒ سے روایت ہے کہ پہلے بخارا میں شیخ سیف الدین باخرزیؒ کا انتقال ہوا اور اس سانحہ کے تین سال بعد شیخ بہاء الدین زکریاؒ واصل بحق ہوئے۔ حضرت زکریا کی رحلت کے تین سال بعد بابا فریدؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔[3]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ رحمۃ اللہ

دُررِ نظامی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں بڑا اہم مواد موجود ہے۔ اس کے باوجود یہ تصنیف ان کے سوانح نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہی

جامع ملفوظات سلطان المشائخ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ان کے ابتدائی زمانے میں ایک روز شیخ نجیب الدین متوکلؒ ان کے ہاں تشریف لائے۔ سلطان جی نے اپنی والدہ ماجدہ سے کہا کہ ان کے لئے کھانا لائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان سے ہاں کھانا کہاں سے آیا؟[4]

حضرت نظام الدینؒ نے ابتدائی زمانے میں عسرت کا ایسا دور دیکھا تھا کہ جب اپنے بڑھاپے میں اس کا ذکر کرتے تو ان کا دل بھر آتا تھا۔ موصوف فرماتے ہیں کہ غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) میں دہلی میں خربوزے اتنے سستے تھے کہ دو جیتل کے ایک من آتے تھے۔ اس کے باوجود فصل کا موسم گذر جاتا تھا اور خربوزے چکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ انہوں نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ نہ ہی تو خربوزے خریدنے کی ہمت ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی شخص بطور تحفہ لا کر دیتا تھا۔ یہ واقعہ بیان کر کے موصوف نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ اللہ کے فضل سے ان کے دل میں خربوزوں کی طلب بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔[5]

عسرت کے اسی دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ ان کے ہاں جس

---

۱ - محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۲۳۱۔
۲ - دُررِ نظامی، ورق ۵ ب۔
۳ - ایضاً، ورق ۱۱۶ الف۔
۴ - ایضاً، ورق ۲ الف۔
۵ - ایضاً، ورق ۶۱ الف۔

روز فاقہ ہوتا تو ان کی والدہ محترمہ انہیں مخاطب کر کے فرماتیں "آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔" سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ موصوف اپنی والدہ محترمہ سے یہ بات سن کر ہمیشہ ذوق حاصل کرتے اور اس وقت کے منتظر رہتے کہ دیکھئے دوبارہ کب موصوفہ یہ بات فرماتی ہیں۔ حضرت نے حاضرین کو بتایا کہ اس انتظار سے ان کے دل میں ذوق پیدا ہوتا اور انہیں راحت ملتی۔[1]

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ درویش کے گھر میں شبِ فاقہ شبِ معراج ہوتی ہے۔[2]

ایک روز سلطان جی نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ نوجوانی کے عالم میں موصوف دہلی کی مسجد غیاثی میں جایا کرتے تھے اور ان دنوں وہاں امیر عالم والوالجی وعظ کیا کرتا تھا۔[3]

جس دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ بابا فریدؒ سے بیعت ہوئے اس روز انہوں نے بابا صاحب سے پوچھا کہ اب وہ تعلم اختیار کریں یا نوافل میں مشغول ہو جائیں؟ بابا صاحب نے فرمایا کہ وہ انہیں تعلم سے منع نہیں کرتے لیکن وہ دونوں کام کریں۔ سلطان جی فرمایا کرتے تھے کہ درویش کو ضروری علم آنا چاہئے۔[4]

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک روز جب وہ سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت موصوف ––– وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کی تفسیر بیان فرما رہے تھے اور دوران گفتگو ابن عباسؓ کے حوالے بھی دیتے جاتے تھے۔[5]

علی بن محمود جاندار لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ کسی مرید کی تعظیم کے لئے نہ اٹھتے تھے لیکن جب کبھی قاضی محی الدین کاشانی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ آخر عمر میں جب ان کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تو انہوں نے قاضی صاحب سے معذرت کر لی۔[6] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں علماء کی بڑی قدر تھی اور موصوف اپنے عالم مریدوں کا کھڑے ہو کر استقبال کیا کرتے تھے۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۶۲ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۶۴ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۶۵ ب۔
۴ - ایضاً" ورق ۷ ب۔
۵ - ایضاً" ورق ۱۰ ب۔
۶ - ایضاً" ورق ۲ ب۔

حضرت بہاء الدین زکریاؒ

چشتی بزرگوں کے ملفوظات میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ چشتی حلقوں میں بڑے مقبول تھے۔

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت زکریاؒ صرف سترہ روز شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ کی خدمت میں رہے اور اس مختصر سی مدت میں انہوں نے جو فیض اپنے مرشد سے پایا وہ دوسروں نے سالہا سال میں بھی حاصل نہیں کیا۔ جب شیخ الشیوخ نے انہیں خلافت سے نوازا تو شیخ کے پرانے مرید رنجیدہ ہوئے کہ وہ مدتوں سے یہاں پڑے ہیں اور یہ نووارد چند ہی روز میں اتنی بڑی نعمت لے کر جا رہا ہے۔ اس پر شیخ الشیوخ نے فرمایا کہ وہ گیلا ایندھن لے کر ان کی خدمت میں آئے ہیں اور زکریا چوب خشک لے کر آیا تھا جسے ایک ہی پھونک میں آگ لگ گئی۔[1]

حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ جوانی کے عالم میں حضرت زکریا اپنے چچا کے سامان کی تجارت کیا کرتے تھے۔[2] ایک بار انہیں تجارت میں خسارہ ہوا تو چچا نے انہیں طعنہ دیا جس نے تازیانے کا کام دیا۔ حضرت زکریا تجارت کا شغل چھوڑ کر تحصیل علم کے لئے بخارا تشریف لے گئے اور حصول علم کے بعد بغداد میں شیخ الشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[3]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت بہاء الدین زکریا کے مرید خاص حسن افغان بڑے اونچے پایہ کے بزرگ تھے اور انہیں کشف القلوب ہوتا تھا۔ حضرت زکریا ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لائے ہیں تو موصوف حسن افغان کو بارگاہ خداوندی میں پیش کر دیں گے۔[4] امیر حسن علاء سجزی نے فوائد الفواد میں یہ واقعہ ۲۶ شوال ۷۰۷ھ کو منعقد ہونے والی مجلس کے ضمن میں درج کیا ہے۔

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت بہاء الدین زکریا نفلی روزے کم رکھا کرتے تھے لیکن عبادت بکثرت کرتے تھے۔ جب کوئی نفلی روزوں کے بارے میں سوال کرتا تو موصوف یہ آیت پڑھ کر اسے خاموش کر دیتے :

---

۱ - ایضاً" ورق ۴۶ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۸۳ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۸۲ ب۔
۴ - ایضاً" ورق ۲۳ الف۔

كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحًا

(المومنون : ۵۱)

سلطان المشائخ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ملتان میں ناصرالدین قباچہ نے مدرسہ قائم کیا تھا۔ قاضی قطب الدین کاشانی وہیں رہتے تھے اور مدرسہ کی مسجد میں امامت بھی فرماتے تھے۔ حضرت زکریا کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز ان کی اقتداء میں ادا فرماتے۔ ایک روز قاضی صاحب نے ان سے کہا کہ موصوف اتنی دور سے وہاں آنے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟ حضرت زکریا نے فرمایا کہ وہ اس پر عمل کرتے ہیں :

من صلی خلف عالم تقی فکا نما صلی خلف نبی — جس نے متقی عالم کے پیچھے نماز ادا کی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز ادا کی۔۲

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا بیمار ہوئے تو ایک اجنبی نے ایک خط لا کر حضرت صدرالدین عارف کو دیا اور ان سے التماس کی کہ اسے حضرت زکریا کی خدمت میں پیش کر دیں۔ حضرت زکریا نے وہ خط پڑھ کر حاضرین سے کہا "دوستو! ہمارا وقت سفر آ گیا ہے۔" حاضرین ان کی بات سن کر رونے لگے۔ اگلی شب حضرت زکریا بام سے گرے اور اسی صدمے سے ان کا انتقال ہوا۔۳

حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص سیاہ لباس پہن کر حضرت زکریا کے سامنے آتا تو موصوف اسے دیکھ کر فرماتے "یہ کیا شیطان کا لباس پہن کر آ گئے ہو۔"۴

حضرت جلال الدین تبریزیؒ

حضرت نظام الدین اور دوسرے چشتی مشائخ کے ملفوظات میں حضرت جلال الدین تبریزی کا بار بار ذکر آتا ہے۔ ایک دن سلطان المشائخ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت جلال الدین تبریزی نے جتنی خدمت اپنے مرشد کی کی ہے اتنی کسی مرید نے نہیں کی۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ ہر سال حج کو جایا کرتے تھے۔ ان کا معدہ کمزور تھا اس لئے سرد کھانے سے پرہیز فرماتے تھے۔ حضرت جلال الدین تبریزی اپنے سر پر انگیٹھی رکھ کر شیخ کے ساتھ چلتے کہ پتہ نہیں موصوف کس وقت کھانا طلب فرما لیں۔۵ ایک روایت ہے کہ کوئلوں کی گرمی سے ان

---

۱ - ایضاً" ورق ۳۷ ب۔

۲ - ایضاً" ورق ۲۲ الف۔

۳ - ایضاً" ورق ۱۱۶ الف۔

شیخ الاسلام بہاء الدین از بام بیفتاد بدران شب برحمت حق پیوست۔

۴ - ایضاً" ورق ۹۶ الف۔ این لباس شیطان است۔

۵ - ایضاً" ورق ۲۹ الف۔

کے سر پر بال اُگنے بند ہو گئے تھے۔

حضرت امیر خسروؒ

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ امیر خسرو دن بھر کے واقعات اور حالاتِ حاضرہ رات کے وقت حضرت نظام الدین کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے اور موصوف یہ واقعات سن کر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔[۱]

علی بن محمود جاندار امیر خسرو کے برادر طریقت تھے اس لئے وہ ان کی عادات سے خوب واقف تھے۔ موصوف امیر خسرو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ شطرنج کے خوب ماہر تھے۔[۲]

شیخ سنائی

حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ شیخ سنائی کے والد آدم اور سلطان محمود غزنوی کے استاد شیخ شیبہ ہمسائے تھے۔ ایک رات شیخ شیبہ نے خواب میں دیکھا کہ آدم کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جو بہت بڑا عالم اور شاعر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور آدم کا بیٹا اللہ تعالیٰ کے حضور میں توحید پر مبنی اشعار پڑھ رہا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان اشعار کے طفیل غزنی کے تمام باشندوں کو بخش دیا۔ اگلی صبح شیخ شیبہ نے یہ ماجرا شیخ آدم سے بیان کیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ موصوف فوت ہو گئے اور ان کی وفات کے بعد سنائی پیدا ہوئے۔ حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ سنائی ابتداء میں اُمی محض تھے۔[۳]

امام اعظم ابو حنیفہؒ اور خواب کی تعبیر

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ کسی خلیفے نے خواب میں حضرت عزرائیل کو دیکھا اور اس سے سوال کیا کہ اس کی عمر کتنی باقی ہے؟ اس نے پانچ انگلیاں دکھائیں۔ اس سے پانچ دن بھی مراد لئے جا سکتے تھے اور پانچ سال بھی۔ خلیفہ کو اس بارے میں بڑا تردد تھا۔ اس نے حضرت ابو حنیفہؒ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ ملک الموت نے یہ نہیں کہا کہ وہ پانچ دن یا پانچ سال اور جئے گا' بلکہ اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچ چیزوں کا علم کسی کو نہیں دیا:

---

۱ - ایضاً" ورق ۴۶ الف۔

۲ - ایضاً"۔

۳ - ایضاً" ورق ۴۶ ب' ۴۷ الف۔

ان اللہ عندہٗ علمُ السّاعۃِ و ینزلُ الغیثَ و یعلمُ ما فی الارحامِ وَ ماتدری نفسٌ ماذا تکسبُ غداً وَما تدری نفسٌ بِاَیِّ اَرضٍ تموتُ اِنَّ اللہ علیمٌ خبیرًا ۔
(لقمان : ۳۴)

خلیفہ یہ تعبیر سن کر خوش ہوا اور امام صاحب کو خلعت دے کر رخصت لیا۔[1]

حضرت نظام الدین کے زمانے میں اس قصے کی نسبت امام ابوحنیفہؒ کی طرف ہو گئی تھی' ورنہ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ امام مالکؒ کو خواب میں حضور نبی کریمؐ نے ایسا اشارہ کیا تھا اور انہوں نے امام ابن سیرینؒ سے اس کی تعبیر پوچھی تھی اور انہوں نے وہ جواب دیا تھا جو مذکورہ بالا روایت میں امام اعظم کی طرف منسوب ہے۔

امام ناصرؒ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ امام ناصرالدین کو سکتہ ہوا تو لوگوں نے انہیں مردہ سمجھ کر دفن کر دیا۔ رات کے وقت قبر میں انہیں ہوش آیا تو انہوں نے سورۂ یاسین کی تلاوت شروع کر دی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک کفن چور نے ان کی قبر کھودنی شروع کر دی۔ امام صاحب کو جب محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی قبر کھود رہا ہے تو انہوں نے آواز ہلکی کر دی۔ کفن چور نے جب کفن اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو امام صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے۔ کفن چور کا مارے دہشت کے پتہ پھٹ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ امام صاحب کو اس کی موت پر بڑا رنج ہوا۔

امام صاحب رات کے اندھیرے میں اپنے گھر کی طرف چلے اور راستے میں موصوف اپنے دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ لوگ کہیں ان کو دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔ اس لئے موصوف آہستہ آہستہ چھپتے چھپاتے اپنے گھر پہنچے اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ وہ فلاں شخص ہیں' انہیں سکتہ ہو گیا تھا اور لوگ انہیں مردہ سمجھ کر دفن کر آئے تھے حالانکہ وہ زندہ تھے۔ یوں انہوں نے لوگوں کا خوف دور کر دیا۔[2]

جامع فوائد الفواد نے یہی واقعہ سات ذی القعدہ ۷۱۰ھ کی مجلس کے ضمن میں درج کیا ہے۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ امام ناصر نے اس واقعہ کے بعد تفسیر ناصری لکھی تھی۔[3]

---

۱ - ایضاً'' ورق ۱۰۸ الف۔
۲ - ایضاً'' ورق ۳۰ ب۔
۳ - ایضاً'' امیر حسن علاء سجزی' فوائدالفواد' (اردو ترجمہ) مطبوعہ لاہور' ۱۹۷۳ء' ص ۱۳۱۔

شیخ فریدالدین عطارؒ

دُررِ نظامی میں مرقوم ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء ایک ایسے شخص سے ملے جس نے شیخ فریدالدین عطار کو دیکھا تھا۔ اس شخص نے سلطان جی کو بتایا کہ جب چنگیز خان کا لشکر نیشاپور پہنچا تو شیخ عطار اپنی خانقاہ میں سترہ مریدوں کے ساتھ قبلہ رُو ہو کر بیٹھ گئے۔ جب منگول وہاں پہنچ کر قتل عام کرنے لگے تو موصوف نے فرمایا "این چہ تیغ قہاریست و این چہ تیغ جبار یست۔" جب شیخ عطار کے قتل کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا "این چہ کرم است و این چہ احسانست۔"

یہ واقعہ بیان کر کے سلطان المشائخ نے فرمایا کہ سالک کو چاہئے کہ وہ تمام کام خدا پر چھوڑ دے اور اس کی رضا کے سامنے سرِتسلیم خم کر دے۔ موصوف نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ جب منگولوں کا لشکر چنگیز خان کی قیادت میں نیشاپور پہنچا تو حاکمِ خراسان نے شیخ عطار سے کہا کہ موصوف دعا فرمائیں کہ یہ لشکر واپس چلا جائے۔ شیخ موصوف نے فرمایا کہ اب دعا کا وقت نہیں رہا، اب تسلیم و رضا کا وقت ہے۔

حضرت نظام الدین نے یہ روایت بیان کر کے فرمایا کہ موصوف اس بات کے قائل ہیں کہ نزولِ بلا کے وقت بھی دعا کی جائے تاکہ اس سے کم سے کم نقصان پہنچے۔[۱]

نجم الدین صغریٰ

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ ایک بار خواجہ معین الدین اجمیریؒ نجم الدین صغریٰ سے ملنے گئے۔ وہ اس زمانے میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھا۔ اس نے خواجہ بزرگ کو دیکھ کر رخ پھیر لیا۔ انہوں نے اس بے رخی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے نالاں ہے۔ دراصل وہ ان کی مقبولیت پر حسد کرتا تھا۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو موصوف انہیں اپنے ساتھ اجمیر لے جاتے ہیں۔ خواجۂ بزرگ نے خواجہ قطب الدین سے فرمایا: بابا قطب الدین! تم میرے ساتھ اجمیر چلو۔ تم مسند پر بیٹھنا اور میں تمہارے سامنے کھڑا رہوں گا۔" --- خواجہ قطب الدین نے عرض کیا "اللہ اللہ! میری کیا مجال ہے کہ میں آپ کے سامنے بیٹھوں۔" خواجۂ بزرگ نے فرمایا "اچھا تو

---

۱ - دُررِ نظامی، ورق ۶۰ الف۔

پھر تم جانو۔" خواجہ صاحب اجمیر روانہ ہو گئے اور ادھر دہلی میں خواجہ قطب الدین کا انتقال ہو گیا۔[1]

سلطان التمش

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد کسی نے اسے خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا ماجرا گذرا۔ سلطان نے کہا کہ حوضِ شمسی تعمیر کرنے کی وجہ سے اس کی مغفرت ہو گئی ہے۔[2]

حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے فرزندوں کو سرکاری زمین ملی۔ اس زمین کے بارے میں ان کا مقطع سے کچھ اختلاف ہو گیا۔ بیٹوں کے اصرار پر خواجۂ بزرگ خود دہلی گئے تاکہ سلطان التمش سے مل کر یہ قضیہ طے کرا دیں۔ خواجہ قطب الدین نے اپنے مرشد سے کہا کہ وہ یہ تکلیف نہ کریں' موصوف خود سلطان سے مل کر ان کا کام کروا دیں گے۔ جب خواجہ قطب الدین سلطان التمش کے ہاں پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ اس سے قبل اس نے ان سے ملنے کی کئی بار خواہش ظاہر کی تھی لیکن خواجہ صاحب اسے اپنے ہاں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ خواجہ صاحب نے سلطان کو مقطع کے ساتھ اختلاف سے آگاہ کیا اور اس نے فوراً ان کا کام کر دیا۔[3]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ قاضی محی الدین کاشانی سے منقول ہے کہ سلطان شمس الدین التمش اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ایک ہی سال میں فوت ہوئے تھے۔[4]

معزالدین کیقباد

عام طور پر سلطان معزالدین کیقباد (۱۲۸۷ء تا ۱۲۹۰ء) کو ایک عیاش طبع حکمران سمجھا جاتا ہے جس کے شب و روز فسق و فجور کی مجلسوں میں گزرتے تھے۔

دُررِ نظامی کی روایت ہے کہ کیقباد نے اپنے دادا سلطان غیاث الدین بلبن کی روح کو ایصالِ ثواب کے لئے اپنے ایک معتمد خواجہ سرا کافور کو حکم دیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کو خیرات کیا

---

۱ - ایضاً ورق ۸۴ ب

۲ - ایضاً" ورق ۱۱۵ الف-

۳ - ایضاً" ورق ۸۳ ب-

۴ - ایضاً" ورق ۱۱۵ الف-

کرے۔ ایک بار کافور نے اس رقم میں سے دو ٹنکے سلطان جی کی خدمت میں بھی بھیجے جو انہوں نے قبول کر لئے۔ اس کے بعد بھی وہ متواتر کئی ٹنکے سلطان جی کی خدمت میں پیش رقم بھیجتا رہا۔[۱]

عہدِ علائی

جس زمانے میں علی بن محمود جاندار دُررِ نظامی مرتب کر رہے تھے وہ سلطان علاء الدین خلجی کا دورِ حکومت تھا۔ اس کی سخت گیر پالیسی کے باوجود چوری چکاری عام تھی۔ جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ بزرگوں کے گھر بھی غیر محفوظ تھے۔ ایک بار چور شیخ احمد نہر والی کے گھر کا بھی صفایا کر گئے تھے۔[۲]

دُررِ نظامی کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں مسلح ہندو راہزن جنگلوں میں مسافروں کو لوٹا کرتے تھے۔[۳] ایک دوسرے موقعہ پر علی بن محمود جاندار لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں راستے غیر محفوظ تھے۔[۴]

علاء الدین خلجی کا عہدِ حکومت خیر و برکت کا دور سمجھا جاتا ہے۔ حضرت نظام الدین اس بابرکت عہد کے لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اکثر لوگوں کے مال حرام اور مشتبہ ہیں۔[۵]

قدیم دہلی

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ابتداء میں غیاث پور، جہاں حضرت نظام الدین رہتے تھے' ایک معمولی سا گاؤں تھا[۶] اور وہاں بہت کم آبادی تھی۔ جب سلطان کیقباد نے کیلو گھری میں سکونت اختیار کی تو لوگوں کی توجہ غیاث پور کی طرف ہوئی۔[۷]

علی بن محمود جاندار نے حوضِ رانی کے نواح میں "باغِ جنت" کی نشان دہی کی ہے۔[۸] (حوضِ رانی کے علاقے میں اب شاندار بنگلے بن گئے ہیں اور ہمارے فاضل بزرگ قاضی سجاد حسین پرنسپل مدرسہ فتح پوری نے بھی وہیں ایک بنگلہ تعمیر کروایا ہے)۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۰۱ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۷۵ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۵۴ ب۔
۴ - ایضاً" ورق ۸۷ الف۔
۵ - ایضاً" ورق ۵۹ الف۔
۶ - ایضاً" ورق ۷۳ الف --- "موضعی مجہول بود---"
۷ - ایضاً" ورق ۷۳ الف۔
۸ - ایضاً" ورق ۷۲ ب۔

راقم الحروف نے جوامع الکلم کے بار بار مطالعہ سے قدیم دہلی کے تیرہ دروازوں کا کھوج لگایا تھا۔ ضیاء الدین برنی نے چودھویں دروازے "بمندر کال" کی نشاندہی کی ہے۔[۱] حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات نفائس الانفاس میں پندرہویں دروازے "دروازۂ پل" کا سراغ ملتا ہے۔[۲] دُررِ نظامی میں دہلی کے سولہویں دروازے "دروازۂ کمال" کا ذکر آیا ہے۔[۳]

علی بن محمود جاندار نے ایک بزرگ شیخ حاجی رُوزبہ کا ذکر کیا ہے جن کی قبر "دروازۂ غزنین" کے باہر فصیل کے ساتھ تھی۔[۴]

توبہ کی اقسام

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ توبہ کی تین اقسام ہیں: ماضی، حال اور مستقبل۔

ماضی کی توبہ یہ ہے کہ دشمنوں کو راضی کرے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے دس درہم غصب کئے ہوں تو وہ توبہ توبہ کہنے سے معاف نہیں ہوں گے تاآنکہ دس درہم مالک کو لے جا کر نہ دے۔ اگر کسی شخص کو گالی دی ہو اور وہ مر گیا ہو تو اس کی صفات بیان کرے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرے اور اگر اس سے زنا کا ارتکاب ہوا ہو تو توبہ کرے، لوگوں کو کھانا کھلائے اور شربت پلائے۔

حال کی توبہ یہ ہے کہ اپنے گناہوں پر پشیمان اور نادم ہو۔ مستقبل کی توبہ یہ ہے کہ وہ عہد کرے کہ آئندہ گناہ نہ کرے گا۔

اس موقع پر حضرت محی الدین کاشانی نے سلطان المشائخ سے پوچھا کہ اگر کسی نے اوائل جوانی میں گناہ کیا ہو اور بعد میں توبہ کر لی ہو لیکن کبھی کبھی دل میں اس پرانے گناہ کا خیال آجاتا ہو، تو اسے یہ کیسے معلوم ہو کہ اس کی توبہ قبول ہو گئی ہے اور اس گناہ کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ وہ یہ دیکھے کہ اگر اس گناہ کے تصور سے اسے لذت محسوس ہوتی ہو تو وہ یہ سمجھ لے کہ ہنوز اس گناہ کا اثر باقی ہے (یعنی اس کی توبہ قبول نہیں ہوئی) اور اگر اس کے تصور سے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہو تو وہ یہ جان لے کہ اس گناہ کا اثر زائل ہو چکا ہے اور یہ توبہ کی قبولیت کی دلیل ہو گی۔[۵]

---

۱ - ضیاء الدین برنی، تاریخِ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ج ۲، ص ۱۰۔
۲ - عماد کاشانی، نفائس الانفاس، مخطوطہ مخزونہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، نمبر ۳۳۳، ص ۶۵۔
۳ - دُررِ نظامی، ورق ۲۷ الف۔
۴ - ایضاً، ورق ۸۵ ب۔
۵ - ایضاً، ورق ۱۴ الف، ۱۴ ب۔

معرفت کی حقیقت

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار کسی اجنبی نے حضرت بایزید بسطامیؒ سے کہا کہ اسے معرفت کے معنی بتائیں۔ حضرت نے کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اگلے روز اس نے پھر یہی سوال کیا تو حضرت نے حسبِ سابق کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ وہ ان سے معرفت کے بارے میں سوال کرتا ہے اور موصوف جواب دینے کی بجائے کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ "میرے بھائی یہی معرفت ہے۔ کسی کی حاجت پوری کرو اور کسی کو راحت پہنچاؤ۔"[1]

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ غزنین سے مولانا فخرالدین نامی ایک بزرگ کسی پیر پارسا سے ملنے گئے۔ جب یہ ان کے ہاں پہنچے تو اس وقت پیر صاحب مہمانوں کے لئے کھانا پکانے میں مصروف تھے' اس لئے مولانا کی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن مولانا نے پیر صاحب سے کہا کہ وہ اتنا لمبا سفر کر کے ان سے استفادہ کرنے آئے تھے اور وہ کھانا پکانے میں مصروف رہتے ہیں' اس لئے استفادہ کا موقع ہی نہیں ملتا۔ پیر صاحب نے مولانا سے پوچھا کہ انہوں نے معرفتِ خدا کے موضوع پر بھی کچھ پڑھا ہے؟ مولانا نے کہا کہ انہوں نے تو اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ معرفتِ خدا سے باخبر ہوتے تو پھر کتابیں نہ لکھتے۔[2]

صوفیوں کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ جو شخص معرفتِ خدا کے بارے میں علم رکھتا ہے وہ اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتا اور جو اس کے متعلق لکھتا ہے' وہ معرفت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

تائب اور متقی میں فرق

علی بن محمود جاندار نے تائب اور متقی میں فرق بیان کیا ہے۔[3]

یہ واقعہ فوائد الفواد میں ۱۳ ماہ صفر ۷۱۹ھ کو منعقد ہونے والی مجلس کے ذیل میں بھی درج ہے۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۲ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۱۳ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۱۵ الف۔

اخوت کی اقسام

ایک روز حضرت نظام الدینؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اخوت دو طرح کی ہوتی ہے:

۱- اخوتِ نسب
۲- اخوتِ دین

ان دونوں میں سے اخوتِ دینی قوی تر ہے- اس کی دلیل دیتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ اگر دو حقیقی بھائی ہوں اور ان میں سے ایک کافر ہو اور دوسرا مومن' تو مومن اپنے کافر بھائی کی میراث نہیں لے سکتا- اسی لئے اخوتِ نسب کمزور ہے- اب رہی اخوتِ دین' تو یہ بڑی مضبوط ہے کیونکہ ان بھائیوں کا تعلق دنیا میں تو ہے ہی' آخرت میں بھی رہے گا-۱

نفلوں کی جماعت

چشتیوں کے ہاں جماعت کے ساتھ نفل ادا کرنے کا رواج تھا- حضرت سلطان المشائخ نے اسے اپنے بزرگوں کا مسلک بتایا ہے- موصوف نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ بابا فریدؒ کے حکم سے انہوں نے بھی نفل باجماعت ادا کئے تھے بلکہ امامت کا شرف بھی انہیں کے حصے میں آیا تھا-۲

زکوٰۃ کی اقسام

حضرت نظام الدینؒ اولیاء نے ایک روز حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ زکوٰۃ کی تین اقسام ہیں :

۱- زکوٰۃ شریعت
۲- زکوٰۃ طریقت
۳- زکوٰۃ حقیقت

زکوٰۃ شریعت یہ ہے کہ دو سو درہم پر پانچ درہم زکوٰۃ دے- زکوٰۃ طریقت یہ ہے کہ پانچ درہم اپنے پاس رکھ کر باقی رقم زکوٰۃ دے دے اور زکوٰۃ حقیقت یہ ہے کہ پوری رقم زکوٰۃ میں دے دے اور اپنے پاس کچھ نہ رکھے-۳

---

۱ - ایضاً'' ورق ۵۷ الف-
۲ - ایضاً'' ورق ۲۲ ب-
۳ - ایضاً'' ورق ۲۶ الف-

ہدیۂ شاہی کا حکم

سلطان المشائخؒ نے ایک روز جامع ملفوظات کی موجودگی میں فرمایا کہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مرشد حضرت ابوسعید تبریزیؒ اور ان کے مرید اکثر فاقہ سے رہتے تھے۔ موصوف کسی سے کچھ نہ لیتے۔ دن کو ان کا اور ان کے مریدوں کا روزہ ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت تمام حضرات کڑوے خربوزے (حنظل) سے افطار کرتے اور رات بھر عبادت میں مصروف رہتے۔ ایک روز حاکم تبریز نے قاصد کے ہاتھ کچھ رقم حضرت ابوسعید کے خادم کو بھجوائی۔ اس نے اسی رقم سے افطاری کا سامان خرید کر حضرت کے سامنے لا رکھا۔ اگلی صبح حضرت نے خادم کو بلا کر کہا کہ گذشتہ رات انہیں عبادت میں لذت محسوس نہیں ہوئی اس لئے وہ یہ بتائے کہ افطاری کا سامان کہاں سے آیا تھا؟ خادم نے ڈرتے ڈرتے سارا واقعہ سنایا۔ حضرت ابوسعید نے پوچھا کہ جب شاہی قاصد رقم لے کر خانقاہ میں آیا تھا تو وہ کہاں کھڑا ہوا تھا؟ خادم نے اس جگہ کی نشاندہی کی تو حضرت نے وہاں سے مٹی اکھڑوا کر خانقاہ سے باہر پھنکوا دی۔[۱]

بیعت صرف زندہ سے کرنی چاہئے

حضرت نظام الدینؒ اولیاء سے روایت ہے کہ بابا فریدؒ کا ایک بیٹا دہلی جا کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر بیٹھ گیا اور خود کو ان کا مرید سمجھ کر مخلوق ہو گیا۔ بابا صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے بیٹے کو لکھا کہ خواجہ صاحب ان کے مخدوم اور مرشد ہیں لیکن غائب سے بیعت جائز نہیں۔ صحیح بیعت وہ ہے جو زندہ شیخ کے ہاتھ پر کی جائے۔[۲]

اہل بہشت کا ایک گروہ

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ ایسے خوش نصیب لوگ بھی ہوں گے جنھیں قیامت کے دن فرشتے اس طرح گھسیٹ کر بہشت میں لے جائیں گے جس طرح بچوں کو گھسیٹ کر مکتب کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ لوگ خدا کی بارگاہ میں التجا کریں گے کہ انہوں نے محبت کے ساتھ اس کی عبادت کی تھی لہذا اس عبادت کے صلے میں وہ بہشت میں نہیں جانا چاہتے۔ بارگاہ خداوندی سے فرشتوں کو یہ حکم ملے گا کہ انھیں زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی بہشت کی طرف لے جائیں۔[۳]

---

۱ - ایضاً'' ورق ۷۰ الف۔

۲ - ایضاً'' ورق ۳۷ الف۔

۳ - ایضاً'' ورق ۱۷ الف۔

عصمتِ انبیاء

حضرت نظام الدینؒ نے ایک روز حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انبیاء کرام گناہوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں لیکن اولیاء اللہ گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں، معصوم نہیں۔[۱]

شہرت بعد از مرگ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار لوگوں نے صوفی حمید الدین ناگوریؒ سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض بزرگ مرنے کے بعد نامور ہو جاتے ہیں اور بعض بزرگوں کو لوگ بھلا دیتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو بزرگ اپنی زندگی میں مشہور ہو گئے تھے وہ مر کر گمنام ہو گئے اور جو زندگی میں گمنام رہتے تھے وہ مر کر مشہور ہو گئے۔[۲]

کرنے کا کام

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دن کو روزہ رکھے، رات کو عبادت کرے اور وہ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکا ہو، تو سمجھ لیجئے کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اصل کام دل سے دنیا کی محبت ختم کرنا ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی دنیا کی محبت ہو اور وہ خدا سے محبت کا دم بھرتا ہو، تو جان لیجئے کہ وہ کذاب ہے۔ قیامت کے دن ایسا شخص خدا کے دوستوں کے سامنے شرم سار ہو گا۔[۳]

عزلت کا فائدہ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ عزلت کا فائدہ فکر و ذکر ہے اور یہ بزرگ ترین عبادت ہے۔ یہ نعمت خلق سے خلوت اور گوشہ نشینی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔[۴]

---

۱ - ایضاً" ورق ۸۸ الف۔
۲ - ایضاً" ورق ۹۶ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۷۰ ب۔
۴ - ایضاً" ورق ۷۰ ب۔

مومن ہونے کی شرط

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ اتیمور نامی ایک ترک نے دہلی میں ایک مسجد بنوائی اور بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو امامت کے فرائض سونپے۔ اس نے انہیں رہنے کے لئے ایک مکان بھی دیا۔ کچھ عرصہ بعد اتیمور نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام کے ساتھ کی اور اس تقریب پر ایک لاکھ ٹنکے سے بھی زیادہ رقم خرچ کر ڈالی۔ ایک دن شیخ موصوف نے اس سے کہا کہ جب تک وہ اس سے زیادہ رقم راہ خدا میں خرچ نہیں کرتا اس وقت تک وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ اتیمور نے ناراض ہو کر انہیں امامت سے الگ کر دیا اور مکان بھی خالی کرا لیا۔ شیخ نجیب الدینؒ اس سلوک پر بڑے رنجیدہ ہوئے اور دہلی سے اجودھن چلے گئے۔ انہوں نے بابا صاحب کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ بابا صاحب نے ان سے کہا کہ ایسی باتوں پر دل تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ مزید براں انہوں نے اپنے برادر خورد کی تسلی کے لئے یہ آیت بھی پڑھی:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا

(البقرہ: ۱۰۶)

کچھ عرصہ بعد اتمر نامی ایک شخص اس نواح میں آیا اور اس نے بابا صاحب اور ان کے اعزاء کی بڑی خدمت کی۔[1]

مشائخ زادے

دُررِ نظامی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے کے بعض مشائخ اپنے نالائق فرزندوں کے ہاتھوں نالاں رہتے تھے۔ جامع ملفوظات مشائخ زادوں کے اطوار و اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ

ایک شیخ طریقت نے اپنے فرزندوں کے بجائے ایک غلام کو اپنی مسند پر بٹھایا تھا۔[2]

بابا فریدالدین گنج شکرؒ بھی اپنے فرزندوں سے خوش نہ تھے۔ موصوف فرمایا کرتے تھے کہ

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۸ الف' ۱۸ ب۔

۲ - ایضاً" ورق ۴۶ الف۔

اگر عورت کو خلافت اور مشائخ کا سجادہ دینا مناسب ہوتا تو اپنی صاحبزادی بی بی شریفہ کو اپنا جانشین بنا دیتے-۱۔ یہ تو اس وقت کے شیخ کے خیالات تھے۔ سلطان شمس الدین التمش بھی اپنے بیس بیٹوں کی موجودگی میں یہ کہا کرتا تھا کہ اس کی بیٹی رضیہ میں حکمران بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

---

۱ ۔ خلیق احمد نظامی' سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات' مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء ص ۱۳۶۔

سُرورُ الصدُور

سلطان التارکین صوفی حمید الدین سوالی ناگوریؒ کا شمار چشتیہ سلسلہ کے اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا[1] ہے۔ دارا شکوہ ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ مقتدر مشائخ میں ان کا بڑا اونچا مرتبہ ہے۔ وہ علم ظاہری اور باطنی کے جامع اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ خدا نے ان کو بڑا بلند مرتبہ عطا کیا تھا[1]۔ موصوف نے کافی طویل عمر پائی اور ایک روایت کے مطابق ان کی سلطان المشائخ سے ملاقات بھی ثابت ہے۔[2] ان کے ملفوظات "سرور الصدور" کے مطالعہ سے قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی دینی، سیاسی اور سماجی زندگی کے کئی اہم گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔

نام و نسب

ابو محمد کنیت[3]، حمیدالدین نام، صوفی لقب اور سلطان التارکین خطاب تھا۔ یہ خطاب ان کے مرشد خواجہ معین الدین حسن سجزیؒ نے انہیں عطا کیا تھا۔ شہزادی جہاں آراء بیگم رقم طراز ہے کہ خواجۂ بزرگ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا تھا:

التارک الدنیا و الفارغ عن العقبیٰ سلطان التارکین[4]

مولانا عبدالحی لکھنوی نے نزہتہ الخواطر میں ان کا شجرۂ نسب یوں درج کیا ہے:

حمید بن احمد بن محمد بن ابراہیم بن محمد بن سعید[5]

سلطان التارکین کا سلسلہ نسب حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی سیدنا سعید بن زیدؓ سے، جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے، جا ملتا ہے[6]۔ سلطان التارکین

---

۱ ۔ دارا شکوہ، سفینتہ الاولیاء، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۹۔

۲ ۔ عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، آزر گلکشن، ورق ۵۶ ب۔
"۔۔ گویند کہ درمیان او و حضرت سلطان المشائخ ملاقات واقع شدہ۔۔"

۳ ۔ ایضاً، ورق ۵۶ الف۔

۴ ۔ جہاں آرا بیگم، مونس الارواح، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، آزاد گلکشن، ورق ۳۷ ب۔

۵ ۔ عبدالحی لکھنوی، نزہتہ الخواطر، مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۴۷ء، ج ۱، ص ۱۳۵۔

۶ ۔ جہاں آرا بیگم، مونس الارواح، ورق ۳۷ ب۔

فرماتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار لاہور میں سکونت پذیر تھے' جس وقت لاہور میں کافروں کا عمل دخل شروع ہوا تو موصوف دہلی چلے آئے اور یہاں آ کر انہوں نے ایک مستعرب[1] کی بیٹی سے شادی کر لی[2]۔ سلطان التارکین کے نانا منجم تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی کو ان کی ولادت کی خوشخبری سنائی تھی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو ان کی بعض نشانیاں بھی بتا دی تھیں لیکن وہ خود اپنے عظیم المرتبت نواسے کی ولادت سے قبل ہی فوت ہو گئے تھے[3]۔ سلطان التارکین اکثر فخریہ انداز میں کہا کرتے تھے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کے دہلی پر قبضہ کے بعد سب سے پہلے جو بچہ پیدا ہوا' وہ موصوف ہی تھے[4]۔

تعلیم و تربیت

بھارت کے نامور مورخ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی مشہور تصنیف "بزم صوفیہ" میں خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ کے خلفاء میں ان کا محض نام لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے اور اتنے اہم بزرگ کے حالات زندگی لکھنے مناسب نہیں سمجھے[5]۔ شیخ محمد اکرام نے اپنی تصنیف "آب کوثر" میں صرف ڈیڑھ صفحہ ان کے لئے وقف کیا ہے[6]۔ مؤرخین نے سلطان التارکین کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان کے بچپن اور تعلیم و تربیت کے بارے میں ان کے تمام سوانح نگار خاموش ہیں۔ تاہم اتنا ظاہر ہے کہ دہلی اور ناگور' جہاں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گذرا' علم و ادب کے گہوارے تھے۔ انہوں نے اس تعلیمی ماحول میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو گی۔ سرور الصدور کے دیباچہ میں ان کے ایک استاد مولانا شمس الدین حلوائی کا نام ملتا ہے[7]۔ سرور الصدور کے مندرجات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مطالعہ میں بڑے اعلیٰ پایہ کی علمی کتابیں رہتی تھیں' جس سے ان کے اعلیٰ علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

محمد غوثی مندوی لکھتا ہے کہ سلطان التارکین عارفانہ مذاق رکھتے تھے اور ان کی یہ رباعی ان کے عارفانہ مذاق اور سخن سنجی کی آئینہ دار ہے :

---

۱ - عرب میں جو غیر عرب آباد ہو گئے تھے' وہ مستعرب کہلاتے تھے۔
۲ - سرور الصدور' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' فارسی تصوف ۲۱ / ۱۲۱' ورق ۷۔
۳ - ایضاً"۔
۴ - ایضاً"۔
"--- اول کسے کہ بعد از اسلام در دہلی زادہ شد' من بودم---"
۵ - سید صباح الدین عبدالرحمٰن' بزم صوفیہ' مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء' ص ۶۱۔
۶ - محمد اکرام' آب کوثر' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء' ص ۲۳۶ - ۲۳۷۔
۷ - سرور الصدور' ورق ۱۱۔

اے دوست دل خستہ ہوای تو گرفت
در باغ وفای تو نوای تو گرفت
ہر چند کہ بگذاشت برای تو گذاشت
ہر چیز کہ بگرفت برای تو گرفت!۱

سلطان التارکین کثیر التصانیف بزرگ تھے۲۔ ان کی تصانیف میں "اصول الطریقہ" بڑی مشہور ہے۔ یہ کتاب شیخ عبدالحق محدث کے زمانے تک موجود تھی اور انھوں نے اس کے لمبے چوڑے اقتباسات اخبار الاخیار میں دیئے ہیں جنھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں علمی انداز میں بڑی اونچی سطح پر تصوف پر بحث کی گئی ہے۔

توبہ اور بیعت

مولانا جمالی کی روایت ہے کہ سلطان التارکین نوجوانی میں بڑے خوبصورت تھے اور جو عورت انہیں دیکھتی وہ دل و جان سے ان پر فریفتہ ہو جاتی۔ جب انہوں نے خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی تو ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۳۔ امیر حسن سجزی' سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ تائب ہو گئے تو ان کے پرانے عیش پسند ساتھی ان کے پاس آئے اور انہیں دوبارہ گناہ کی زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دینے لگے۔ ان کی باتیں سن کر حضرت نے فرمایا کہ وہ اب ایسا نہیں کر سکتے۔ جب ان کے ساتھیوں نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا:

این آزار بند خود را من چنان محکم بستہ ام کہ فردای قیامت بہ حوران بہشت ہم نکشایم۴۔

(ترجمہ) میں نے اپنا یہ آزار بند اتنا کس کر باندھ لیا ہے کہ قیامت کے روز جنت کی حوروں کے لئے بھی نہیں کھولوں گا۔

طلبِ خدا

شہزادی جہاں آراء بیگم لکھتی ہیں کہ ایک روز خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ بہت خوش

۱۔ محمد غوثی مندوی' گلزار ابرار' مخطوطہ جان رے لینڈ لائبریری مانچسٹر' فارسی ۱۸۵' ورق ۲۰ ب۔

۲۔ عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۸ الف۔
"۔۔۔ اُو را تصنیفات و اشعار و مکتوبات بسیار است۔۔۔"

۳۔ مولانا جمالی' سیرالعارفین' مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری' پیر زادہ کلکشن' ورق ۹ الف ب۔

۴۔ حسن سجزی' فوائدالفواد' مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء' ص ۳۴۶۔

تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ درِ حاجت کھلا ہوا ہے' جس نے جو کچھ مانگنا ہو مانگ لے۔ حضرت کے ارشاد پر کسی نے دنیا مانگی اور کسی نے دین' جب خواجہ بزرگ نے سلطان التارکین کی طرف رخ کر کے فرمایا:

می خواہی کہ در دین و دنیا معزز و مکرم باشی؟

(ترجمہ) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ دین اور دنیا میں معزز اور مکرم رہو؟

تو سلطان التارکین نے عرض کیا:

بندہ را خواہش غیب شد خواست خداوند تعالیٰ است[1]۔

بندے کی خواہش ہی ختم ہو گئی ہے۔ اب صرف خدا کی طلب ہے۔

طرزِ بود و باش

سلطان التارکین ایک عام دیہاتی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا رہن سہن دیکھ کر ابتدائی دور میں برصغیر میں بسنے والے دیہاتیوں کی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ موضع سوال میں ان کے تصرف میں بقول امیر خورد کرمانی ایک بیگھہ زمین تھی[2]۔ جہاں آراء بیگم نے اس زمین کا رقبہ "یکدو طناب" بتایا ہے[3]۔ جمالی نے ان کی مملوکہ زمین کا رقبہ "دہ جریب" لکھا ہے[4]۔ اس اختلاف کے باوجود یہ ظاہر ہے کہ ان کے قبضے میں اتنی تھوڑی زمین تھی کہ ان کا گذارہ بمشکل ہوتا تھا۔

ان کے سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ حضرت نصف زمین میں خریف کی اور بقیہ نصف میں ربیع کی فصل بوتے تھے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس زمانے میں ادل بدل کر فصلیں بونے کے طریقے سے لوگ واقف نہ تھے' اس لئے وہ آدھی زمین میں ایک موسم میں فصل بوتے تھے اور بقیہ نصف زمین میں دوسرے موسم میں'[5] حضرت کے قبضے میں اتنی تھوڑی زمین تھی کہ وہ ہل چلانے کے لئے بیلوں کی جوڑی بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ بیلچے سے زمین کھودتے اور اس میں غلہ اور سبزیاں کاشت کرتے[6]۔ آج ہمارے ہاں چشتیہ سلسلے کے کتنے ایسے گدی نشین یا صوفی ہیں' جو اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے اپنی روزی کماتے ہیں؟

---

۱ - جہان آرا بیگم' مونس الارواح' ورق ۳۷ ب۔

۲ - امیر خورد کرمانی' سیرالاولیاء' مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ' ص ۱۵۶۔

۳ - جہان آرا بیگم' مونس الارواح' ورق ۳۸ الف۔

۴ - جمالی' سیرالعارفین' ورق ۹ ب۔

۵ - خلیق احمد نظامی' مڈیول انڈیا' اے سلیکٹی' مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء' ج ۱ ص ۳۰۱۔

۶ - امیر خورد کرمانی' سیرالاولیاء ص ۱۵۶۔

"--- بدستِ مبارک خود بکلند راست کردے و چیزے بکاشتے---"

ان کے پاس ایک گائے بھی تھی جس کا دودھ وہ خود ہی دوہ لیا کرتے تھے۔

امیر خورد کرمانی لکھتے ہیں کہ ایک بار ناگور کے "مقطع" کو خبر ہوئی کہ سلطان التارکین بڑی غربت اور تنگ دستی میں گذارہ کرتے ہیں تو اس نے ان کی خدمت میں کچھ نقدی بھیجی اور ان سے التجا کی کہ وہ کچھ زمین لے لیں تو فراغت سے گذر بسر ہو۔ حضرت نے قاصد کو جواب دیا:

از خواجگان ما کسے ازین بابت قبول نکردہ است و ایں بیگھہ کہ بلک منست مرا کافی است۔[1]

(ترجمہ) ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے تحفے قبول نہیں کئے۔ یہ ایک بیگھہ زمین جو میری ملک ہے' میرے لئے کافی ہے۔
شیخ نے نقدی بھی قاصد کے ہاتھ واپس بھجوا دی۔

ایک بار کسی درویش نے بادشاہ سے ان کی تنگ دستی کا ذکر کیا اس نے پانصد تنکے اور ایک گاؤں کا قبالہ ان کی خدمت میں بھیجا۔ بادشاہ نے قاصد سے کہا کہ اس کی طرف سے بڑے عجز و انکسار کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کرے کہ وہ یہ نذرانہ قبول کر لیں۔ اس وقت ان کی اہلیہ کے سر پر اوڑھنی نہ تھی اور وہ اپنے پیرہن سے اپنا سر ڈھانکے ہوئے تھی۔ جب شیخ نے اس سے بادشاہ کے بھیجے ہوئے نذرانے کو قبول کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تو اس نیک بخت نے کہا:

اے خواجہ تو چہ می خواہی کہ فقر چندیں سالہ خود را باطل کنی۔ تو خاطر جمع دار من دو سیر ریسمان بدست خود رشتہ ام ازان مقدار جامہ خواہد شد کہ ترا فوطہ و مرا دامنے مرتب شود۔[2]

(ترجمہ) اے خواجہ تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اتنے سالوں کے فقر کو خراب کرو۔ تم اطمینان رکھو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے دو سیر سوت کاتا ہے۔ اس سے اتنا کپڑا بن جائے گا جو تمہاری دھوتی اور میرے دوپٹے کے لئے کافی ہو گا۔
شیخ نے اہلیہ کا جواب سن کر قاصد سے کہا کہ انہیں بادشاہ کے فرستادہ نذرانے کی حاجت نہیں ہے۔

۱۔ ایضاً" ص ۱۵۷۔
۲۔ ایضاً"۔

سلطان التارکین ایسے مشائخ کے سخت مخالف تھے جو نذرانے قبول کر لیتے تھے یا مال جمع کرتے تھے۔ انہیں بہاء الدین زکریا کے مال جمع کرنے پر بڑا اعتراض تھا اور اس سلسلے میں ان بزرگوں کے درمیان خط و کتابت رہتی تھی۔ ناگور کا ایک تاجر ناگور سے کنجد لے کر ملتان جایا کرتا تھا اور ملتان سے روئی لا کر ناگور میں بیچا کرتا تھا' وہ سلطان التارکین کے خط شیخ بہاء الدین زکریا کے نام لے جاتا اور ان کے جواب لکھوا کر ناگور لاتا[۱]۔ حسن اتفاق سے یہ خط و کتابت ایک مخطوطے کی صورت میں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

مشائخِ چشت کے اکثر ملفوظات جعلی ہیں

چشتیہ سلسلے کے مشائخ میں سے آپ پہلے بزرگ ہیں جو صاحبِ تصنیف ہیں[۲]۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان سے پہلے جو ملفوظات کے مجموعے خواجہ معین الدین حسن اجمیری' خواجہ قطب الدین بختیار کاکی' شیخ فریدالدین گنج شکر اور بدرالدین اسحٰق کی طرف منسوب ہیں' وہ سب وضعی ہیں' ہمارے خیال کی تائید حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے اس بیان سے ہوتی ہے:

از مشائخ شجرۂ ما ہیچ شیخی تصنیف نہ کردہ است[۳]۔

ہمارے شجرہ میں جن بزرگوں (کے نام آتے ہیں) ان میں سے کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔

حضرت چراغ دہلی کے جانشین سید بندہ نواز گیسو درازؒ نے بھی ملفوظات کے ان مجموعوں کو "سرسر ہمہ افتراست" کہہ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا ہے[۴]۔

سرور الصدور

سلطان التارکین کے ملفوظات "سرور الصدور" کا پورا نام "سرور الصدور و نور البدور" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے[۵]۔ اس کا ایک ناقص الطرفین مخطوطہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی' کراچی کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔

۱۔ ایضاً' ص ۱۵۸۔

۲۔ عبدالحیی لکھنوی' نزہتہ الخواطر' ج ۱' ص ۱۴۵۔
"--- وھو اول من صنف من المشائخ الچشتیہ---"

۳۔ حمید قلندر' خیرالمجالس' مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء' ص ۵۲۔

۴۔ سید محمد اکبر حسینی' جوامع الکلم' ص ۱۳۴۔

۵۔ سرور الصدور' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' فارسی تصوف ۲۱ / ۲۱۱۔

راقم السطور نے علی گڑھ کے مخطوطے سے استفادہ کیا ہے۔ سرور الصدور کا متن بڑے سائز کے 92 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی تحریر فرماتے ہیں کہ سرور الصدور کے مندرجات کی ترتیب غلط ہے کیونکہ بعض مجالس کی تاریخیں آگے پیچھے ہو گئی ہیں[۱]۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ فاضل مرتب نے امیر حسن سجزی، حمید قلندر یا سید محمد اکبر حسینی کی طرح ہر مجلس کی کارروائی کو باقاعدہ ترتیب نہیں دیا تھا اور اپنے عظیم المرتبت دادا کی وفات (۱۲۷۶ء / ۶۷۳ھ) کے بعد جب وہ ان کے ملفوظات لکھنے بیٹھے تو ان کے پیش نظر اپنے نوٹ اور یاد داشتیں تھیں، اس لئے مجالس کی ترتیب آگے پیچھے ہو گئی ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں حضرت کے ستائیس برسوں کے "فوائد، معارف اور لطائف" مندرج ہیں اور یہ کتاب ناگور کے مضافات میں ذیمہ نامی ایک گاؤں میں مکمل ہوئی[۲]۔

سرور الصدور کے مرتب

سرور الصدور کے مرتب کا نام متن میں کہیں نہیں آیا،اس لئے ہمارے مؤرخین ابھی تک اس کے مرتب کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔ بعض لوگوں نے سرور الصدور کی ترتیب کا سہرا سلطان التارکین کے پوتے شیخ محی الدین یا شیخ قطب الدین کے سر باندھا ہے[۳]۔ مجمع الاولیاء کے فاضل مصنف محمد اکبر حسینی اردستانی اسے شیخ فریدالدین محمود بن شیخ عبدالعزیز بن سلطان التارکین کی تصنیف بتاتے ہیں[۴]۔ ہمارے خیال میں یہی قول راجح ہے۔

جامع ملفوظات شیخ فریدالدین محمود چشتیہ سلسلہ میں اپنے عظیم المرتبت دادا سلطان التارکین کے مرید تھے۔ حضرت نے اپنے پوتے اور مرید کی تربیت بڑے اہتمام کے ساتھ کی تھی[۵]۔ موصوف اوائل عمر سے ہی بڑے عابد و زاہد اور شب بیدار تھے۔ سلطان التارکین فرمایا کرتے تھے کہ انہیں اس بات پر شرم آتی ہے کہ جب وہ رات کو تہجد ادا کرنے کے لئے بیدار ہوتے ہیں تو وہ فرید کو عبادت میں مشغول پاتے ہیں[۶]۔

---

۱ - خلیق احمد نظامی، سم اسپیکٹس آف ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان انڈیا ڈیورنگ دی تھرٹینتھ سینچری، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۱ء، ص ۳۷۶۔

۲ - سرورالصدور، ورق ۶۰۔

۳ - ایضاً" دیباچہ، ورق ۵۔

۴ - محمد اکبر حسینی اردستانی، مجمع الاولیاء، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، اتھے ۶۴۵، ورق ۶۱۳ ب۔

"--- ملفوظات شیخ حمید الدین او جمع نمودہ سرور الصدور نام کردہ است---"

۵ - ایضاً" ورق ۶۱۳ ب۔

۶ - سرور الصدور، ورق ۱۱۔

سرورالصدور کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین محمود بڑے صاحب ذوق انسان تھے اور وہ عربی، فارسی اور ہندی میں بڑے اچھے شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کے اشعار سرورالصدور میں موجود ہیں۔

علی اکبر حسینی اردستانی لکھتے ہیں کہ فرید الدین ناگوری سلطان التارکین کے بڑے فرزند شیخ عبدالعزیز کے نور نظر تھے۔ موصوف محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی تشریف لے گئے۔ انہوں نے سو برس کے لگ بھگ عمر پائی اور دہلی میں فوت ہوئے۔ ان کا مزار خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے قریب واقع ہے[1]۔

سرور الصدور کی اہمیت

سرور الصدور میں تیرہویں صدی کی بعض اہم شخصیات کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات درج ہیں۔ سلطان التارکین نے سلطان شمس الدین التمش، قاضی منہاج، فخر ناقلہ، حسام درویش، نجیب الدین نخشبی اور قاضی حمید الدین ناگوری کا ذکر بڑے عمدہ پیرائے میں کیا ہے۔ یہ سبھی حضرات ان کے ہم عصر تھے، اس لئے اُن کے بارے میں ان کی آراء بڑی مستند سمجھی جاتی ہیں۔

اسی طرح سرور الصدور کے مطالعہ سے برعظیم میں قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں، معیار تعلیم اور علمی فضاء کے بارے میں بھی بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بقول سرور الصدور اس عہد کے مذہبی خیالات اور رجحانات کا نادر اعتماد مرقع ہے[2]۔ علی اکبر حسینی اردستانی رقم طراز ہے کہ سرور الصدور میں سلطان التارکین کے ستائیس برسوں کے "فوائد، معارف اور لطائف" درج ہیں[3]۔ ہمارے خیال میں ان ملفوظات کو چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات کا مرقع سمجھنا چاہئے۔

سلطان محمد بن تغلق کی ایک بیٹی بی بی راستی کی شادی سلطان التارکین کے پڑپوتے شیخ فتح اللہ بن شیخ اوحد الدین بن شیخ فرید الدین کے ساتھ ہوئی تھی[4]۔ اس شادی سے پہلے سلطان محمد بن تغلق اور دولہا میاں کے دادا شیخ فریدالدین کے درمیان کئی خطوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ اتفاق

۱۔ محمد اکبر حسینی اردستانی، مجمع الاولیاء، ورق ۲۱۴ الف۔
۲۔ خلیق احمد نظامی، سم اسپیکٹس آف ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان انڈیا ڈیورنگ دی تھرٹینتھ سینچری، ص ۲۷۰۔
۳۔ محمد اکبر حسینی اردستانی، مجمع الاولیاء، ورق ۲۱۴ الف۔
۴۔ رسائل سلطان التارکین، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، فارسی تصوف ۲۱ / ۱۶۱، ورق ۴۷۔

سے یہ خط و کتابت "رسائل سلطان التارکین" میں محفوظ ہے اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسے شائع کر دیا ہے۔[1]

سلطان التارکین کا ذوقِ مطالعہ

سرور الصدور میں سید علی ہجویریؒ، امام ابوالقاسم قشیریؒ اور رضی الدین صغانیؒ کا ذکر آیا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف سلطان التارکین کے مطالعہ میں رہ چکی تھیں۔ سرور الصدور کے مندرجات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موصوفؒ کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا اور بڑی بلند پایہ کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ سرور الصدور میں الکشاف، مشارق الانوار، نہج البلاغہ، سیر الملوک، تفسیر زاہدی، مصباح الدجی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات (فوائد الفواد) کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس پایہ کی علمی کتابیں سوال جیسے دور افتادہ گاؤں میں بھی دستیاب تھیں۔

نذر و فتوح

جامع ملفوظات بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلطان التارکین نذر و فتوح میں تصرف نہ کرتے تھے۔ اگر کوئی ارادتمند ان کے لئے کوئی تحفہ لاتا یا نذر پیش کرتا تو آپ اس کی دلداری کے لئے قبول کر لیتے لیکن اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے کسی نیک کام میں صرف کر ڈالتے تھے۔[2]

یادِ الٰہی

ملفوظات کے ایک اندارج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان التارکین کا زیادہ وقت دشت و صحرا میں گذرتا تھا جہاں وہ خلقِ خدا سے الگ تھلگ ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔[3]

ہندوی زبان کا استعمال

سرور الصدور کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلطان التارکین اپنے گھر میں "ہندوی زبان" میں بات چیت کیا کرتے تھے۔[4] ملفوظات کے مطالعہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ جب ہندو ان کی ملاقات کو آتے تو موصوف ان سے ہندوی زبان میں ہی گفتگو فرمایا کرتے تھے۔[5]

۱ - خلیق احمد نظامی، مڈیول انڈیا، اے مسلینی، ج ۱، ص ۳۱۵- ۳۱-

۲ - ایضاً" ورق ۹-

۳ - ایضاً"-

۴ - ایضاً" ورق ۸- ۵ - ایضاً" ورق ۳۵-

سرور الصدور میں کھٹ، پہلکہ، چوڑہ اور تھال کھچڑی جیسے ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف فارسی میں گفتگو فرماتے ہوئے بھی ہندی الفاظ بکثرت استعمال فرماتے تھے۔ صوفیاء نے برِّعظیم میں اردو زبان کی تخلیق اور ترویج میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

ترکِ خواہشات

جامع ملفوظات شیخ فریدالدین محمود تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان التارکین نے ایک مجلس میں حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا:

فردا خدائے تعالیٰ این نخواہد پرسید کہ برائے من چہ آوردی۔ خواہد پرسید کہ اے بندگانِ من! برائے من چہ ترک آوردہ بودید؟[۱]

(ترجمہ) قیامت کے روز خدا تعالیٰ یہ نہیں پوچھے گا کہ میرے لئے کیا لائے ہو۔ وہ یہ پوچھے گا کہ اے میرے بندو! میرے لئے تم نے کیا ترک کیا تھا؟ وہ لاؤ اور دکھاؤ۔

سلطان التارکین کی اہلیہ

سلطان التارکین کی اہلیہ محترمہ خدیجہ زہد و ورع میں رابعۂ عصر سمجھی جاتی تھیں۔ شیخ جمالی کا بیان ہے کہ وہ مسلسل روزے رکھتی تھیں اور ہفتہ ہفتہ تک افطار نہ کرتی تھیں[۲]۔ جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ موصوفہ سخاوت کے لئے دور دور تک مشہور تھیں اور ان کے در سے کوئی حاجت مند خالی نہ لوٹتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد لوگ ان کے مزار پر جا کر حاجتیں مانگتے ہیں تو خدا پوری کر دیتا ہے[۳]۔

سلطان التارکین کا مسلک

شیخ فرید الدین محمود تحریر فرماتے ہیں کہ سلطان التارکین نے ایک مجلس میں فرمایا:

اعتقاد اہلِ سنّت و جماعت آنست کہ تکفیرِ اہلِ قبلہ بدعت است۔ اہلِ قبلہ را کافر نباید گفت[۴]۔

(ترجمہ) اہلِ سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ اہلِ قبلہ کو کافر کہنا بدعت ہے۔ اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہنا چاہئے۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۴۴۔
۲ - جمالی' سیرالعارفین' ورق ۹ ب۔
۳ - سرور الصدور' ورق ۹۔
۴ - ایضاً" ورق ۳۶۔

غمِ مسلمانی

سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ قحط کا زمانہ تھا کہ ایک آدمی اپنے گھر آیا اور اس نے اپنے اہلِ خانہ سے دریافت کیا کہ گھر میں کتنا غلہ ہے؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ ایک کندوری اناج سے بھری ہوئی ہے۔ اس نیک مرد نے کہا کہ کندوری توڑ کر غلہ نکال لو اور اسے بازار لے جا کر جس بھاؤ کوئی خریدے بیچ دو۔ جب اہلِ خانہ وہ غلہ بیچ آئے تو اس نیک مرد نے کہا کہ اب گھر کی ضروریات کے لئے ہر روز بازار سے' جس بھاؤ غلہ ملے' خرید لایا کرو تاکہ تنگی کے ایام میں خلقِ خدا کی موافقت ہو۔ یہ واقعہ بیان کر کے سلطان التارکین فرمانے لگے کہ گذشتہ زمانے کے مسلمان اس طرح کے ہوا کرتے تھے اور اس طرح سے مسلمانوں کا فکر کیا کرتے تھے![1]

اوّل طعام بعد کلام

شیخ فریدالدین محمود رقم طراز ہیں کہ جب حضرت کے سامنے کھانا چنا جاتا تو پھر موصوف کوئی اور کام نہ کرتے تھے۔ سلطان التارکین دوسروں کو بھی اس بات کی تلقین کیا کرتے تھے کہ جب کھانا سامنے موجود ہو تو پھر کوئی اور کام نہیں کرنا چاہئے[2]۔ کھانے کی موجودگی میں انسان کی توجہ اسی طرف لگی رہتی ہے اس لئے اسے یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ سلطان التارکین کا یہ منشا تھا کہ انسان پہلے کھانا کھا لے پھر یکسو ہو کر اپنے کام میں لگ جائے۔

مسئلہ رُویتِ باری[3]

سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ قاضی عبدالجبار معتزلہ فرقے کا پیرو تھا اور وہ رویتِ باری کا انکار کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک درویش کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی اور ایک روز اس نے قاضی کی دعوت کی۔ جب قاضی ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے اسے کھانا بھجوا دیا لیکن خود اس کے سامنے نہ آئے۔ قاضی نے کھانا لانے والے سے کہا کہ جب تک وہ درویش کو نہ دیکھ لے اس وقت تک کھانا نہیں کھائے گا۔ قاضی کا پیغام ملتے ہی درویش باہر آیا اور اسے مخاطب کر

---

۱ - ایضاً'' ورق ۴۸۔
"--- در آن وقت چنین مسلمانان بوده اند و غمِ مسلمانی چنین داشته اند---"
۲ - ایضاً'' ورق ۱۴۔

کے کہنے لگا کہ جب ایک انسان کی پیش کردہ نعمتوں کو' انسان کے دیکھے بغیر نہیں کھاتے' تو خدا کی نعمتوں کو' خدا کے دیکھے بغیر کیوں کر کھاتے ہو؟ قاضی کو مسئلہ رویتِ باری سمجھ آ گیا اور وہ اپنے عقیدے سے تائب ہو گیا[1]۔

گوشت خوری سے اجتناب

سرور الصدور کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان التارکین گوشت خوری سے مکمل اجتناب کرتے تھے اور وہ اپنے لئے کسی کی جان لینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ حضرت اپنے مریدوں اور لواحقین سے یہ کہا کرتے تھے:

اگر بروح من چیزی بخواہید کہ بدہید' باید کہ گوشت ندہید[2]۔

(ترجمہ) اگر تم میں سے کوئی میری روح کے ایصالِ ثواب کے لئے کوئی چیز دینا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ گوشت نہ دے۔

گوشت خوری سے اجتناب کے ضمن میں سلطان التارکین نے ایک حکیم کا واقعہ سنایا جو جنگل میں سکونت رکھتا تھا اور صرف سبزیاں کھایا کرتا تھا۔ اس نے روٹی کھانا بھی چھوڑ دی تھی۔ اتفاق سے ایک روز ایک شخص ادھر آ نکلا تو اسے حکیم کی بودوباش دیکھ کر اس پر بڑا رحم آیا۔ اس نے حکیم سے از رہ ہمدردی کہا کہ اگر وہ سلطان کی ملازمت اختیار کر لے تو اسے سبزی کھانے کی حاجت نہ رہے گی۔ حکیم اس کی بات سن کر ہنس دیا اور کہنے لگا کہ اگر وہ سبزی کھانے کی عادت ڈال لے تو اسے سلطان کی خدمت کرنے کی حاجت نہ رہے گی۔ جامع ملفوظات یہ واقعہ لکھ کر فرماتے ہیں کہ سلطان التارکین نے یہ حکایت اس لئے بیان فرمائی کہ یہ ان کے حسبِ حال تھی کیونکہ ان کا معمول سبزی کھانا تھا اور موصوف دوسروں کو بھی سبزی کھانے کی تلقین کرتے رہتے تھے[3]۔

ذخیرہ اندوزی کی مذمت

سلطنت دہلی کے ابتدائی دور میں مرتب ہونے والے چشتی بزرگوں کے ملفوظات میں احتکار (ذخیرہ اندوزی) کی مذمت ملتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے معاشرہ میں بھی

---

۱ - ایضاً" ورق ۳۸۔
۲ - ایضاً" ورق ۹۔
۳ - ایضاً ورق ۳۵۔

یہ لعنت موجود تھی۔ سرور الصدور میں سلطان التارکین نے بھی احتکار کی مذمت کی[۱]۔ موصوف کہا کرتے تھے کہ محتکر (ذخیرہ اندوز) کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ لوگ جس چیز سے غمناک ہوتے ہیں وہ اس سے خوش ہوتا ہے[۲]۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ نے بھی ان سماج دشمن عناصر کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ لاہور محض اسی وجہ سے تباہ ہوا کہ وہاں کے تاجر لین دین میں بددیانت تھے[۳]۔ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کے ملفوظات میں مرقوم ہے کہ سفرِ گجرات کے دوران میں چند سوداگر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے انہیں مخاطب کر کے احتکار کی مذمت فرمائی۔[۴] پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں کہ بار بار ملفوظات میں ان عنوانات پر گفتگو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیاء نے سماج کے فاسد عناصر کی روک تھام کی تھی۔[۵]

عمالِ حکومت کی چیرہ دستیاں

سرور الصدور کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ناگور میں عمالِ حکومت کی چیرہ دستیاں عام تھیں۔ سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ ایک بقال زادہ بڑا مال دار تھا اور سرکاری آفیسر اس سے مال چھیننا چاہتے تھے۔ وہ غریب بھاگم بھاگ سلطان التارکین کی اہلیہ بی بی خدیجہؒ کے پاس آیا اور ان سے مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے بقال زادے کو بچانے کی ہر ممکن سعی کی لیکن اس کے باوجود وہ عمالِ حکومت کے سامنے بے بس ہو گئیں اور انہوں نے اس کا مال چھین لیا۔

کل مولود یولد علیٰ الفطرۃ الاسلام

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک بقال کو اولاد کی خواہش تھی اور وہ اسی خواہش میں بوڑھا ہو گیا۔ بڑھاپے کے عالم میں اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اسے لے کر سلطان التارکین کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ برکت کے لئے اسے اپنی کلاہ عنایت فرمائیں۔ انہوں نے بچے کو دیکھ کر فرمایا "کل مولود یولد علیٰ الفطرۃ الاسلام"۔ بعد ازاں انہوں نے یہ دعا فرمائی۔ " اللھم ثبتہ علی الفطرۃ"۔ موصوف نے اس بچے کو لباس مرحمت فرمایا اور

---

۱ - ایضاً" ورق ۴۸۔
۲ - خلیق احمد نظامی' نذرِ عرشی' مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء' ص ۴۴۴۔
۳ - امیر حسن سجزی' فوائد الفواد' ص ۲۰۳ ـ ـ ۲۰۴۔
۴ - محمد اکبر حسینی' جوامع الکلم' ص ۱۵۔
۵ - خلیق احمد نظامی' نذرِ عرشی' ص ۴۴۴

سورۃ فاتحہ پڑھ کر حاضرین سے کہا کہ وہ دعا کریں کہ یہ بچہ فطرت پر قائم رہے۔ جب دعا ختم ہوئی تو حضرت نے چند کھجوریں بوڑھے کو عنایت کیں اور بچے کو مخاطب کر کے "ہندوی زبان" میں فرمایا' "تو میرا مرید ہے' خدا نے چاہا تو بڑے اونچے مرتبے پر فائز ہو گا"[1]۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی صوفیاء کرام کی خدمات گنواتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ صوفیاء نے جہالت کے خلاف جہاد کیا ہے[2]۔ حبیب مکرم پروفیسر نورالنبی' شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ایک بار کسی شخص نے سلطان التارکین سے درخواست کی کہ وہ ان سے تصوف کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حضرت نے اسے جواب دیا کہ وہ ناگور میں حدیث کی تدریس و اشاعت میں مشغول ہیں اس لئے ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اسے تصوف کی تعلیم دے سکیں[3]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام کو علم حدیث سے کتنا شغف تھا اور وہ اس کے مقابلے میں تصوف کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔

بے علم مفتی

سلطان التارکین نے ایک مجلس میں فرمایا کہ لاہور میں ایک مفتی رہتا تھا جس کے پاس قدوری کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ تھی۔ جب کوئی شخص اس سے فتویٰ لینے آتا تو وہ قدوری دیکھ کر فتویٰ دے دیتا تھا[4]۔

قاضیوں کی تین اقسام

سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ سلطان غیاث الدین بلبن کہا کرتا تھا:

من سہ قاضی دارم' یکی قاضی آنست کہ از منؑ نترسد و از خدا بترسد' دویم قاضی از خدا نترسد و از من بترسد' سوم کہ است نہ از من بترسد و نہ از خدا بترسد۔ بعدہ فرمودی فخر ناقلہ از من بترسد و از خدا نترسد۔ قاضی لشکر از خدا نہ ترسد از من ترسد و عالم منہاج نہ از من ترسد نہ از خدا ترسد[5]۔

---

۱ - سرور الصدور' ورق ۳۵۔
۲ - خلیق احمد نظامی' سم اسپیکٹس آف ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان انڈیا ڈیورنگ دی تھرٹینتھ سینچری' ص ۲۶۲۔
۳ - نور النبی' ڈویلپمنٹ آف ریلیجس تھاٹ ان انڈیا' مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۳ء' ص ۳۱۔
۴ - سرور الصدور' ورق ۳۳۔
۵ - ایضاً" ورق ۴۰۔

(ترجمہ) میرے تین قاضی ہیں- ایک قاضی وہ ہے جو مجھ سے نہیں ڈرتا لیکن خدا سے ڈرتا ہے- دوسرا قاضی خدا سے نہیں ڈرتا لیکن مجھ سے ڈرتا ہے- جو تیسرا قاضی ہے وہ نہ مجھ سے ڈرتا ہے اور نہ ہی خدا سے ڈرتا ہے- بعد ازاں وہ کہا کرتا تھا کہ فخر ناقلہ مجھ سے ڈرتا ہے لیکن خدا سے نہیں ڈرتا' قاضی لشکر خدا سے ڈرتا ہے مجھ سے نہیں ڈرتا' منہاج نہ مجھ سے ڈرتا ہے اور نہ ہی خدا سے ڈرتا ہے-[1]

طالبِ دنیا کا حال

سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ سلطان معزالدین کیقباد کے دربار میں ہوری نام کی ایک عورت تھی جو علماء سے بے ہودہ قسم کا مذاق کیا کرتی تھی- اس نے قاضی منہاج سے بھی کئی بار بھرے دربار میں ناشائستہ حرکات کیں- ایک بار اس نے منہاج کی گردن میں شال ڈال کر کھینچی اور اس کے گال پر چپت رسید کیا- یہ واقعہ بیان کر کے سلطان التارکین فرمانے لگے کہ وہ "چاہ دنیا" میں مبتلا تھا- اسی لئے اس کی یہ گت بنی[2]- بالفاظ دگر اگر تارک الدنیا ہوتا تو وہ شاہی دربار میں نہ جاتا اور اس کی ایسی گت نہ بنتی-

گجرات کی ایک عجیب رسم

سرور الصدور کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں گجرات (کاٹھیاواڑ) میں ایک عجیب رسم پائی جاتی تھی- جنگجو اور طاقتور قسم کے لوگ پا بہ زنجیر کھڑے رہتے تھے- یہ گویا ایک طرح سے بہادری کا دعویٰ کرنے والوں کے لئے چیلنج ہوتا تھا کہ اگر کوئی ان سے لڑنا چاہے تو وہ زنجیر کھول کر ان سے مقابلہ کر لے[2]-

ناگور میں نیل کی کاشت

سیر الاولیاء کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناگور میں کنجد (تل) بکثرت پیدا ہوتے تھے جو ملتان بھیجے جاتے تھے اور ان کے بدلے ملتان سے روئی لائی جاتی تھی[3]- سرور الصدور میں "خروارِ نیل" کا ذکر آتا ہے[4]- اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ناگور میں نیل کی کاشت ہوتی تھی یا وہاں نیل کا کاروبار ہوتا تھا-

---

۱ - ایضاً"-

۲ - ایضاً" ورق ۲۹-

۳ - امیر خورد کرمانی' سیر الاولیا' ص ۱۵۸-

۴ - سرور الصدور' ورق ۹۱-

خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ

خواجہ معین الدین اجمیریؒ حضرت سلطان التارکین کے مرشد تھے اور انھوں نے ان کی صحبتِ کیمیا اثر میں کافی وقت گزارا تھا۔ اس لئے خواجۂ بزرگ کے بارے میں ان کی معلومات دوسروں کی نسبت زیادہ مستند ہیں۔ سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے نوے برس کی عمر میں شادی کر لی۔ اس بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں دو بیٹے عنایت کئے۔ ایک روز باتوں باتوں میں خواجہ صاحب نے سلطان التارکین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جب وہ جوان اور غیر شادی شدہ تھے تو اس وقت اگر کوئی حاجت پیش آتی تو وہ خدا کے حضور دعا کرتے اور ان کی حاجت فوراً پوری ہو جاتی۔ اب جب وہ بوڑھے اور صاحب اولاد ہو گئے ہیں تو ان کی دعا دیر سے قبول ہونے لگی ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟ سلطان التارکین نے عرض کیا کہ اس کی وجہ تو وہی بہتر جانتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد سلطان التارکین نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا ذکر چھیڑا اور عرض کیا کہ جب وہ تنہا رہتی تھیں تو انہیں رزق بھی غیب سے ملتا تھا اور وہ بے موسم پھل کھایا کرتی تھیں۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی توجہ بٹ گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو حکم ہوا۔ "ہزی الیک بجذع النخلہ"۔ سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ خواجہ صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی[1]۔

سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ان کے مرشد خواجہ معین الدین حسن اجمیری کو تین زبانوں پر دسترس دی تھی۔ وہ عربی' فارسی اور ہندوی زبانیں بخوبی جانتے تھے اور ان تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا ایک ہندوی دوہڑا پیش خدمت ہے:

او کہند بھجن دھن گئی دوھی برمین
او کہند دیک نجا نی بار بجتی تین[2]۔

سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ ان کے مرشد کو دنیا کے ساتھ مطلق کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی مجلس میں دنیا کا کبھی ذکر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہ کوئی دنیاوی حکایت سننا پسند کرتے تھے[3]۔

شہزادی جہاں آراء بیگم اپنی تصنیف "مونس الارواح" میں رقم طراز ہے کہ خواجہ معین

---

۱ - سرور الصدور ' ورق ۱۵۔
۲ - ایضاً'' ورق ۹۰۔
۳ - ایضاً'' ورق ۵۔
"-- ہرگز در مجلس ایشان ذکر دنیا نبودے و اصلاً'' حکم دنیا شنیدہ نشدی--"

الدین حسن اجمیری اور صوفی حمیدالدین ناگوری کی اولاد میں رشتے ناطے ہوتے رہے ہیں[۱]۔

نجیب الدین نخشبی

نجیب الدین نخشبی کے بارے میں سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ موصوف خواجہ اجمیری کے "یار" تھے اور سلطان شمس الدین التمش نے انہیں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز کیا تھا۔ سلطان التارکین کی روایت ہے کہ التمش انہیں "پدر" کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا[۲]۔

امام فخرالدین رازی

امام فخرالدین رازی کے بارے میں سلطان التارکین فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان محمد سام (شہاب الدین محمد غوری) نے امام رازی کو پانچ ہزار کتابیں عنایت کیں۔ سلطان التارکین کی روایت ہے کہ امام رازی کی وفات کے بعد ان کی تحریریں جمع کی گئیں تو لوگوں نے حساب لگایا کہ وہ ہر روز چھ جز لکھا کرتے تھے[۳]۔

✪✪✪

۱ - جہان آرا بیگم، مونس الارواح، ورق ۳۸ الف۔
"--- میانِ اولاد و امجاد حضرت پیر دستگیر و شیخ حمید الدین نسبتہا و خویشہا واقع شد---"۔
۲ - سرور الصدور، ورق ۱۵۔
۳ - ایضاً۔

خیرالمجالس

برِّ عظیم پاک و ہند میں قرونِ وسطیٰ میں تحریر ہونے والے ملفوظات لٹریچر میں حضرت چراغ دہلیؒ کے ملفوظات" خیرالمجالس" کا بڑا اُونچا مقام ہے۔ صاحبِ ملفوظات حضرت خواجہ نصیرالدین محمود اَودھی المعروف بہ چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے مشائخ عظام میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اکتیس برس تک اپنے شیخ طریقت سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نوّر اللہ مرقدہٗ کی مسند پر بیٹھ کر ان کی جانشینی کا حق ادا کیا اور ہزاروں طالبان حق کی رہنمائی کر کے انہیں منزلِ مقصود تک پہنچایا۔[1]

حضرت چراغ دہلی کے اَجدادِ کرام خراسان کے رہنے والے تھے۔ ان کے جدامجد سید عبداللطیف یزدی خراسان پر منگولوں کے حملے سے پہلے نقل مکاں کر کے لاہور چلے آئے۔ ان کے لاہور میں قیام کے دوران میں حضرت چراغ دہلی کے والدِ بزرگوار سید یحییٰ پیدا ہوئے۔[2] تاریخ کی ورق گردانی سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ساداتِ کرام کے اس خانوادے کو زیادہ عرصے تک لاہور میں رہنے کا موقع نہیں ملا۔ ۶۴۳ھ / ۱۲۴۶ء میں منگولوں نے ۹ ذی الحجہ / ۲۷ اپریل کو لاہور پر حملہ کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ منگولوں کے اسی حملے میں شیخ کبیر ابوالمجاہد صلاح الدینؒ المعروف بہ پیر بلخی اور حضرت پیر زکیؒ شہید ہوئے۔[3] لاہور پر منگولوں کے حملے سے قبل ہی سید عبداللطیف لاہور کی سکونت ترک کر کے اَودھ میں جا بسے تھے۔

سید یحییٰ نے جواں ہو کر تجارت کا پیشہ اپنایا۔ موصوف پشمینہ کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ ایک متمول تاجر تھے اور ان کے گھر میں ہر طرح کی آسائش میسر تھی۔ ان کے پاس کئی غلام تھے جو ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اور متعدد کنیزیں تھیں جو گھر کا کام کاج سنبھالے ہوئے تھیں۔[4]

۱۔ خلیق احمد نظامی، مرتب، خیرالمجالس، مطبوعہ علی گڑھ : ۱۹۵۹ء، دیباچہ ص ۳۹۔

۲۔ صباح الدین عبدالرحمن، بزمِ صوفیہ، اسلام آباد : ۱۹۹۰ء، ص ۳۰۱۔

۳۔ محمد اسلم، خفتگانِ خاکِ لاہور، لاہور : ۱۹۹۳ء، ص ۵۰۱۔

۴۔ محمد بن مبارک کرمانی، سیرالاولیاء، اسلام آباد : ۱۹۷۸ء، ص ۲۴۸۔

حضرت چراغ دہلی ۶۷۵ھ / ۱۲۷۶ء میں اودھ میں پیدا ہوئے- ان کے تذکرہ نگاروں میں ان کی جائے ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے- بعض تذکرہ نویسوں کے خیال میں اجودھیا ان کا مسقط الراس تھا اور بعض مؤرخوں کی رائے میں بارہ بنکی کو ان کی جائے ولادت ہونے کا شرف حاصل ہے- متاخرین نے پہلے گروہ کے خیال کی تائید کی ہے-

حضرت چراغ دہلی ابھی نو برس کے ہوئے تھے کہ والد ماجد کا سایۂ شفقت ان کے سر سے اٹھ گیا[۱]- ان کی والدہ محترمہ بڑی متقی اور عبادت گذار خاتون تھیں- ان کی تربیت سے موصوف لڑکپن میں ہی نمازِ باجماعت کے پابند ہو گئے- آں محترمہ اپنے فرزند کی تعلیم کی جانب سے غافل نہ تھیں- ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت چراغ دہلی نے فقہ کی مشہور کتاب بزدوی قاضی محی الدین کاشانی جیسے نابغۂ روزگار بزرگ سے پڑھی اور ہدایہ کا درس مولانا عبدالکریم شیروانی سے لیا- انہوں نے دوسرے علوم مولانا افتخار الدین محمد گیلانی کی خدمت میں رہ کر حاصل کئے- ان کے اساتذہ میں مولانا شمس الدین یحییٰ کا نام بھی ملتا ہے[۲]-

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد، جیسا کہ ہر ماں چاہتی ہے، ان کی والدۂ محترمہ بھی یہ چاہتی ہوں گی کہ ان کا نورِ نظر اپنے والد مرحوم کی طرح کاروبار شروع کرے یا درس و تدریس کا پیشہ اپنائے، لیکن چراغ دہلی نے اپنی والدۂ ماجدہ کی خواہش کے برعکس فقر و تجرید کا دشوار راستہ اختیار کیا- موصوف فجر کی نماز کے بعد اپنے بہنوئی خواجہ محمود (والدِ بزرگوار علامہ کمال الدینؒ) کے ہمراہ چہل قدمی کے بہانے گھر سے نکلتے اور جب ایک بزرگ کے مقبرے کے قریب پہنچتے تو اپنے برادرِ نسبتی کو گھر بھیج دیتے اور خود مقبرے میں بیٹھ کر ذکر و شغل میں مشغول ہو جاتے- جب نماز کا وقت ہوتا تو خود ہی اذان دیتے اور اس نواح میں کام کرنے والے مزدور پیشہ افراد کو جمع کر کے نماز باجماعت ادا کرتے- نمازِ عشاء کے بعد حضرت اپنے گھر آتے اور رات چھت پر بسر کرتے- رات کا بیشتر حصہ بھی جاگتے ہوئے گذر جاتا[۳]- خیرالمجالس کے ایک اندراج سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ معمول کئی سال تک جاری رہا-

پچیس سال کی عمر میں جب انہوں نے فقر و تجرید کی راہ اختیار کی تو دنیاوی لذات سے منہ موڑ لیا[۴]- اس راہ میں انہوں نے کڑی ریاضتیں کیں- موصوف کئی برسوں تک اودھ کے جنگلات میں گھومتے رہے- انہوں نے صوم دوام کو اپنا معمول بنا لیا تھا جس پر وہ مرتے دم تک

---

۱ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۴۹ الف-

۲ - رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ: ۱۹۱۴ء، ص ۲۳۸-

۳ - خلیق احمد نظامی، کتابِ مذکور، دیباچہ ص ۴۱-

۴ - عبداللہ خویشگی، کتابِ مذکور، ورق ۴۹ الف-

قائم رہے۔ وہ جنگلی پھل کھا کر سحری کرتے اور شام کو سنبھالو کے پتوں سے افطار کرتے[1]۔ ان مجاہدوں نے ان کے سرکش نفس کو مار کر ان کے مزاج میں صبر و تحمل پیدا کر دیا جو مسند نشینی کے بعد ان کے بہت کام آیا۔

جب چراغ دہلی ۴۳ برس کے ہوئے تو ان کے دل میں کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا داعیہ پیدا ہوا۔ ان کے بخت نے اس موقع پر ان کی یاوری کی اور موصوف گھومتے پھرتے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء نور اللہ مرقدہٗ کے آستانے پر پہنچ گئے۔ ایسے ہی موقع پر حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ شعر پڑھا تھا[2]:

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم
سر زمینے بود منظور آسمانے یافتم

یہ سلطان علاء الدین خلجی (۱۳۱۶ء --- ۱۲۹۶ء) کے ابتدائی دور حکومت کا واقعہ ہے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور دوپہر سے ذرا قبل سلطان المشائخ گرمی سے بچنے کے لئے اپنے بالا خانے سے اُتر کر جماعت خانے سے ملحقہ ایک حجرے میں آرام فرمانے کے لئے جا رہے تھے کہ ان کی مردم شناس نظر ادھیڑ عمر کے ایک شخص پر پڑی جو برگد کے پیڑ تلے کھڑا تھا۔ حضرت ایک ہی نظر میں جان گئے کہ یہ نو وارد حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی طرح چوب خشک لے کر حاضر ہوا ہے جسے ایک ہی پھونک مارنے سے آگ لگ جائے گی۔ اس نووارد میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو سلطان المشائخ کے جانشین میں ہونا ضروری تھیں۔ حضرت والا قدر نے حجرے میں جانے کے فوراً بعد اپنے خادم خواجہ نصیر کے ذریعے چراغ دہلی کو اپنی خدمت میں طلب فرمایا۔ موصوف ڈرتے ڈرتے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا "بیٹھ جاؤ۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ تمہارے والد کیا کام کرتے تھے[3]؟"

حضرت چراغ دہلی ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے دست بستہ عرض کیا "میرے والد کے کئی غلام تھے جو پشمینہ کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ میرا مقصد حضرتِ والا کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کرنا ہے۔ یہ غلام یہاں درویشوں کی جوتیاں سیدھی کرنے اور دل و جان سے ان کی خدمت کرنے آیا ہے۔"[4] یہ جواب سن کر حضرتِ والا قدر کا ذہن فوراً اس واقعہ کی جانب منعطف ہوا جب وہ اجودھن میں حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج

---

۱ - ایضاً۔
۲ - عبدالرؤف' جواہرِ علویہ' لاہور (تاریخ اشاعت ندارد)' ص ۱۴۰۔
۳ - محمد بن مبارک کرمانی' کتابِ مذکور' ص ۲۴۸۔
۴ - خلیق احمد نظامی' کتابِ مذکور' دیباچہ' ص ۴۳۔

شکرؒ کی خانقاہ عالیہ میں فقر و فاقہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک بار ان کا ایک ہم سبق اجودھن سے گذرا تو اس نے سلطان المشائخ کو بوسیدہ لباس اور خستہ حالت میں دیکھ کر کہا کہ اگر وہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرتے تو اس وقت تک ان کا شمار دہلی کے نامور علماء میں ہونے لگتا اور وہ فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے۔ حضرت نے اپنے دوست کو تو کوئی جواب نہ دیا لیکن اپنے شیخ طریقت سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے پُرتکلف کھانے کا ایک خوان سلطان المشائخ کو دیا اور کہا کہ اسے وہ اپنے دوست کے پاس لے جائیں اور اُس سے کہیں:

نہ ہمرہی تو مرا، راہ خویش گیر بُرو
ترا سعادت بادا، مرا نگوں ساری[1]

جب چراغ دہلی نے یہ واقعہ سلطان المشائخ کی زبان فیض ترجمان سے سنا تو ان کے دل میں عشق کی چنگاری بھڑک اٹھی اور وہ اسی آستاں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے بڑی جان کاوی، دل سوزی اور عشق و جذبے سے اپنے مرشد کی خدمت کی کہ پرانے مرید بھی ان پر رشک کرنے لگے اور وہ سب کے محبوب نظر بن گئے۔

حضرت چراغ دہلی کی والدۂ محترمہ ہنوز بقید حیات تھیں۔ اس لئے موصوف اپنے مرشد کے حکم سے ان کی خدمت میں اودھ چلے جاتے اور جب مرشد کی یاد آتی اور محبت جوش مارتی تو وہ والدۂ محترمہ سے اجازت لے کر دہلی کی جانب چل پڑتے۔ دہلی میں ان کا قیام ابتداء میں چالیس یوم، ہوا کرتا تھا۔ پھر بیس یوم اور آخر میں دس یوم ہو گیا تھا۔ روانگی سے ایک روز قبل سلطان المشائخ کا خادم خاص اقبال ان کے پاس آتا اور کہتا کہ وہ اپنا اسباب باندھنا شروع کریں، اگلے روز سلطان المشائخ انہیں وداع کریں گے[2]۔

دہلی میں قیام کے دوران میں احباب ان کی دعوتیں کرتے اور سلطان المشائخ کے ذریعے انہیں اپنے ہاں تشریف لانے کا پیغام بھجواتے۔ غیاث پور سے جہاں سلطان المشائخ کی خانقاہ تھی، شہر تک جاتے ہوئے چراغ دہلی تھک جاتے اور اسی روز واپسی مشکل ہو جاتی اور موصوف رات اپنے محبّ مکرّم مولانا برہان الدین غریبؒ کے ہاں گذارتے۔ اگلی صبح کوئی دوست ناشتے پر بلاتا اور پھر قیلولہ کرنے کے بعد جانے کی اجازت دیتا۔ یوں ایک دعوت قبول کر کے دو دن ضائع جاتے۔ ایک بار چراغ دہلی نے اپنے مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ دعوتیں اڑانے کے لئے دہلی نہیں آتے ان کی آمد کا مقصد تو دولتِ دیدار حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں دعوت قبول کرنے سے معذور جانیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کرتا کہ وہ چراغ دہلی کی ضیافت کرنا چاہتا ہے تو حضرت اسے منع کر دیتے[3]۔

۱ - مفتی عتیق الرحمن عثمانی، منارِ صدا، دہلی: ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۲۔
۲ - حمید قلندر، خیرالمجالس، ص ۲۵۹۔
۳ - ایضاً، ص ۱۸۷۔

جب تک چراغ دہلی کی والدہ ماجدہ بقیدِ حیات رہیں، ان کی آمد و رفت اودھ رہی۔ ان کے انتقال کے بعد انہوں نے مستقل طور پر دہلی میں سلطان المشائخ کی خانقاہ کے جماعت خانے میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے مرشد کی آخری سانس تک ان سے جدا نہ ہوئے[1]۔

سلطان المشائخ کے وصال سے چند ماہ قبل ان کے مخصوص حلقۂ مریدین میں ان کے خلفاء کے تقرر کے بارے میں سوچ بچار ہونے لگا۔ ایک روز چراغ دہلی، مولانا فخرالدین زرّادی، سیّد حسن، امیر خسرو اور سلطان المشائخ کے دونوں خادم اقبال اور مبشّر سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے امیر خسرو کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حضرتِ والا قدر سے اس موضوع پر بات کریں۔ ایک روز موقع پا کر امیر خسرو نے سلطان المشائخ کی خدمت میں خلفاء کے تقرر کے بارے میں گفتگو کی تو انہیں نے امیر خسرو سے فرمایا کہ وہ موزوں افراد کے نام لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کریں۔ امیر خسرو نے ۳۲ افراد پر مشتمل ایک فہرست مرتب کر کے سلطان المشائخ کو دکھائی تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں تو بہت زیادہ نام ہیں۔ حضرت کے ایماء پر امیر خسرو نے نظرثانی کے بعد دوسری فہرست مرتب کی تو حضرت نے کچھ ردّ و بدل کے بعد اس پر صاد فرمایا[2]۔ مولانا فخرالدین زرّادی جیسے عالم متبحّر نے خلافت نامہ تیار کیا اور سیّد حسن نے مطلوبہ تعداد میں اس کی نقلیں تیار کیں[3]۔

۲۰ ذوالحجہ ۷۲۴ھ / ۸ دسمبر ۱۳۲۴ء کو سلطان المشائخ نے چاشت کے وقت حضرت قطب الدین منوّر ہانسوی کو طلب فرمایا اور انہیں خرقۂ خلافت پہنا کر خلافت نامہ عطا فرمایا۔ زوال کے بعد چراغ دہلی کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس وقت حضرتِ والا قدر کو یہ احساس ہوا کہ چراغ دہلی اس تقدیم و تاخیر کو دل میں جگہ نہ دے دیں اس لئے ان دونوں بزرگوں کو طلب فرمایا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دونوں بھائی بھائی ہیں۔ اس لئے اس تقدیم و تاخیر کو دل میں جگہ نہ دیں۔ حضرت نے انہیں معانقہ کرنے، ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرنے اور شکرانے کے نوافل ادا کرنے کا حکم دیا[4]۔

خلفاء کے تقرر کے صرف چار ماہ بعد ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ / ۳ اپریل ۱۳۲۵ء کو محمد بن تغلق کی تخت نشینی کے چند ہفتے بعد سلطان المشائخ کا انتقال ہو گیا۔ اپنے آخری لمحاتِ حیات میں

---

۱ - شیخ جمالی، سیرالعارفین (اردو ترجمہ)، لاہور: ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۶۔
۲ - خلیق احمد نظامی، خیرالمجالس، دیباچہ، ص ۴۷۔
۳ - پروفیسر محمد حبیب، حضرت نظام الدین اولیاء، دہلی: ۱۹۷۰ء، ص ۳۴۔
۴ - خلیق احمد نظامی، خیرالمجالس، دیباچہ، ص ۴۷۔

انہوں نے چراغ دہلی کو بلا بھیجا۔ جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو سلطان المشائخ نے وہ تبرکات جو بزرگوں سے انہیں ملے تھے، ان کے سپرد کئے - یہ ایک طرح سے ان کی جانشینی کا اعلان تھا۔

سلطان محمد بن تغلق فروری ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہوا اور اپریل ۱۳۲۵ء کے اوائل میں چراغ دہلی مسند نشین ہوئے۔ بدقسمتی سے ان دونوں کے تعلقات ابتداء میں ہی کشیدہ ہو گئے۔ اس کی چند وجوہات تھیں۔ اولاً یہ کہ سلطان کے مصاحبوں میں سعد منطقی، عبید شاعر، نجم انتشار اور مولانا علیم الدین جیسے فلسفی اور منطقی شامل تھے اور وہ ان کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے سے معقولات کو منقولات پر ترجیح دینے لگا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ اس کے ذہنی محرکات فلسفہ کے تابع ہو گئے تھے[1]۔ سلطان کے افکار و رجحانات میں بعض اہم مذہبی تحریکوں کا ردعمل نظر آتا ہے۔ وہ "الدین و الملک توامان" کا قائل تھا۔ وہ دین و سیاست کے درمیان حائل اس خلیج کو پر کرنا چاہتا تھا جو خلافتِ راشدہ کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں وہ خلافت کے مرکزی کردار کا حامی تھا اور مرکز گریز رجحانات ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے زمانے میں امام ابن تیمیہؒ (م ۱۳۲۸ء) کے افکار و نظریات عالم اسلام میں پھیل گئے تھے۔ امام صاحب نے مسلمانوں کے دین، سیاست اور سماج کے ایک ایک گوشے کو قرآن و سنّت کی روشنی میں پرکھا اور عجمی افکار اور بدعت کے خلاف محاذ کھول دیا۔ تصوف کے معاملے میں امام صاحب کے خیالات متشددانہ تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا واسطہ رفاعی سلسلے کے فقراء سے پڑا تھا جو شریعت کی حدود پھلانگ گئے تھے اور انہوں نے اباحتیوں کے طور طریقے اختیار کر لئے تھے۔ اتفاق سے امام ابن تیمیہ کے شاگردِ رشید امام عبدالعزیز اردبیلیؒ دہلی چلے آئے تھے[2]۔ سلطان ان کی بڑی تعظیم کیا کرتا تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ سلطان ان کی صحبت میں رہتے ہوئے امام ابن تیمیہ کے خیالات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ان افکار کی ایک زد صوفیہ کرام پر بھی پڑی اور سلطان خانقاہی نظام کا مخالف ہو گیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ جس طرح جماعتِ صحابہ خلفائے راشدین کی ممد و معاون بنی ہوئی تھی اسی طرح علماء اور صوفیہ اس کے ممد و معاون بن کر حکومت کا کاروبار چلائیں۔ اس نے صوفیوں کو خانقاہوں سے نکل کر مختلف علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لئے جانے کا حکم دیا اور اس سلسلے میں بعض بزرگوں پر تشدد بھی کیا۔ حضرت شمس الدین یحیٰی کی مثال ہمارے سامنے ہے[3]۔ ملتان کے سجادہ نشین شیخ ہود کو ایک معمولی سے جرم کی پاداش میں قتل کروا دیا۔ اس نے شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ کو اپنا جامہ دار مقرر کیا[4] اور سفر و حضر میں

۱۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی : ۱۹۵۸ء، ص ۳۲۷۔

۲۔ ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، اسلام آباد : ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۰۔

۳۔ شیخ عبدالحق محدث، اخبارالاخیار، دہلی : ۱۳۳۲ھ، ص ۹۷۔

۴۔ عبداللہ خویشگی، کتاب مذکور، ورق ۵۰ الف۔

انہیں اپنے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ ایک بار انہیں ایذا دینے کی غرض سے سونے چاندی کے برتنوں میں ان کے سامنے کھانا رکھا۔ اس سے اس کی یہ غرض تھی کہ اگر وہ کھانا کھانے سے انکار کریں گے تو اسے حکم عدولی پر محمول کر کے انہیں سزا دے گا اور اگر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا تناول فرمائیں گے تو خلافِ شرع کام کرنے کی بنا پر انہیں سزا دے گا۔ حضرتِ والا نے ایک روٹی اٹھائی اور برتن میں سے سالن نکال کر اس پر ڈالا اور چند لقمے تناول فرمائے[۱]۔ اس طرح سلطان کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔ حضرتِ والا نے یہ تمام تکالیف اپنے شیخ طریقت کے کہنے پر برداشت کیں انہوں نے ایک بار انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انہیں شہر میں لوگوں کے درمیان رہنا ہو گا اور ان کی جفائیں برداشت کرنا ہوں گی[۲]۔

بعض تذکرہ نویسوں نے سلطان اور شیخ کے تعلقات میں کشیدگی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ جب سلطان نے دہلی کی بجائے دولت آباد کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تو دہلی کے تمام باشندوں کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا۔ اس موقع پر چراغِ دہلیؒ نے اپنے شیخ کی خانقاہ کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ سلطان محمد بن تغلق کے ستائیس سالہ دور حکومت میں ان کے ساتھ اتنی زیادتیاں ہوئیں کہ جب ان کا ذکر مولانا برہان الدین غریبؒ کی مجلس میں ہوتا تو وہ بے اختیار ہو کر رونے لگتے۔ جب سلطان محمد بن تغلق ایک باغی طغی کا تعاقب کرتے ہوئے سندھ پہنچا تو اس نے ایک فرمان بھیج کر دہلی سے عمائدینِ حکومت، علماء اور مشائخ کو اپنے حضور طلب کیا۔ ان مشائخ میں چراغِ دہلیؒ بھی شامل تھے۔ محمد بن تغلق ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو ٹھٹھہ کے نواح میں سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ اس موقع پر اس کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہوا تو "جمیع خانان و ملوک و تمام علماء و مشائخ اہل سلوک" نے اتفاق سے فیروز تغلق کو تخت پر بٹھایا گیا[۳]۔ اسے تخت پر بٹھانے کا مشورہ دینے والوں میں چراغ دہلیؒ بھی شامل تھے۔ فیروز بڑا نیک دل حکمران ثابت ہوا۔ وہ چراغ دہلیؒ کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ حضرت کی زندگی کے آخری پانچ سال سلطان فیروز تغلق کے عہد میں آرام و آسائش سے گذرے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے اکابر کے سلسلے کو منظم کیا اور ہزاروں افراد کی تربیت کی۔

اسی زمانے میں ایک بار سلطان فیروز تغلق چراغ دہلیؒ کی زیارت کے لئے ان کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا اور حضرت قیلولہ فرما رہے تھے۔ ان کے خادم خاص زین الدین علی بھی اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ سلطان خانقاہ کے صحن میں کھڑا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ اسی اثناء میں زین الدین علی بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے چراغ دہلیؒ کو سلطان کی آمد سے

۱۔ عبدالحق محدث، کتاب مذکور، ص ۸۱۔

۲۔ سید محمد بن مبارک کرمانی، کتاب مذکور، ص ۲۴۷۔

۳۔ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص ۴۳۔

مطلع کیا۔ حضرت سلطان کے پاس جانے کی بجائے وضو کرنے لگے اور پھر نوافل پڑھنے شروع کر دیے۔ اس موقع پر سلطان نے اپنے مصاحب تاتار خان سے کہا "ہم بادشاہ نہیں ہیں۔ حقیقی بادشاہ تو یہ حضرات ہیں۔" تھوڑی دیر بعد شیخ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے۔ زمین پر ایک دری بچھائی گئی۔ سلطان اور تاتار خان چراغ دہلیؒ کے ساتھ کچھ دیر دری پر بیٹھے اور حضرت سے رخصت طلب کی۔[۱]

چراغ دہلی کے آخری زمانۂ حیات میں تراب نامی ایک قلندر ایسے وقت میں خانقاہ میں در آیا جب چراغ دہلیؒ اپنے حجرے میں اکیلے تھے۔ اس بدبخت نے جناب کو اکیلے پا کر ان پر چاقو سے گیارہ زخم لگائے۔[۲] مزاحمت کرتے ہوئے حضرت کے ہاتھوں کی انگلیاں اس بُری طرح زخمی ہو گئیں کہ زخم درست ہونے کے بعد بھی موصوف قلم نہیں پکڑ سکتے تھے۔ جب حضرت کے زخموں سے بہنے والا خون پرنالے کے راستے نیچے گرا تو مولانا زین الدین علی، مولانا عبدالمقتدر تھانیسری اور مولانا صدر الدین طبیب حضرت کے حجرے کی جانب لپکے۔ انہوں نے تراب کو قابو کیا اور پکڑ دھکڑ میں مولانا زین الدین علی کے بھی زخم آئے۔ چراغ دہلیؒ نے ان حضرات سے قسم لی کہ وہ تراب کو کوئی ایذا نہ دیں گے۔ اس موقع پر حضرت نے حکم دیا کہ اسے بیس ٹنکے دے کر وہاں سے چلتا کریں۔[۳] صُوفیہ کے اِس حسنِ اخلاق کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

حضرت چراغ دہلیؒ ان زخموں سے جانبر تو ہو گئے لیکن خون کی کمی کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ اس پر صومِ دوام اور شب بیداری نے انہیں مزید کمزور کر دیا۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جس سے کسی کو مَفر نہیں۔ چراغ دہلیؒ نے ۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ / ۱۲ اگست ۱۳۵۶ء کو انتقال فرمایا۔ غسلِ میت کی سعادت بندہ نواز گیسو درازؒ کے حصے میں آئی۔[۴] حضرت کا روضۂ مبارک اس بستی میں ہے جو ان کے نام کی مناسبت سے "چراغ دِلّی" کہلاتی ہے۔ سلطان بہلول لودھی اور علامہ کمال الدینؒ بھی وہیں آرام فرما ہیں۔

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات حمید قلندر کے حالات زندگی کے بارے میں ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہیں۔[۵] خیر المجالس کے ایک اندراج سے یہ معلوم ہوا کہ وہ کیلوکھڑی کے رہنے والے تھے۔ ان

۱۔ محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، کانپور: ۱۳۵۶ھ، ص ۲۲۰۔
۲۔ عبداللہ خویشگی، کتاب مذکور، ورق ۵۲ ب۔
۳۔ حمید قلندر، کتاب مذکور، ص ۲۸۷۔
۴۔ شیخ جمالی، کتاب مذکور، ص ۱۳۳۔
۵۔ خلیق احمد نظامی، خیرالمجالس، دیباچہ ص ۴۔

کے والد مولانا تاج الدین حضرت سلطان المشائخ کے مرید تھے۔ انہوں نے نوعمری میں اپنے فرزند حمید کو بھی اپنے مرشد کا مرید کروا دیا۔ ایک روز مولانا تاج الدین، حمید کو ساتھ لے کر سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ افطاری کا وقت تھا اور حضرت والا قدر روزہ افطار کر رہے تھے۔ انہوں نے نصف روٹی حمید کو عطا فرمائی۔ جب وہ یہ نعمتِ غیر مترقبہ لے کر باہر نکلے تو وہاں چند قلندر کھڑے تھے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ انہیں بھی اس تبرک میں شریک کریں۔ انہوں نے وہ روٹی حمید کے ہاتھ سے چھین کر آپس میں تقسیم کر لی۔ جب ان کے والد مولانا تاج الدین کو یوں روٹی چھن جانے کا علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے سے بہت خفا ہوئے کہ اس نے اتنی بڑی نعمت یونہی گنوا دی۔ مولانا تاج الدین نے یہ واقعہ سلطان المشائخ کو سنایا تو انہوں نے فرمایا "خاطر جمع رکھو۔ تمہارا بیٹا قلندر بنے گا"[1]۔

خیرالمجالس کی تدوین سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حمید پڑھا لکھا انسان تھا اور اسے شاعری کا بھی ذوق تھا۔ اُسنے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اب نایاب ہو چکا ہے[2]۔ اسے قرآن و حدیث پر بھی عبور حاصل تھا لیکن اس نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق قلندرانہ وضع اختیار کر لی اور گیروے رنگ کا لباس اختیار کر لیا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے جب دہلی کے باشندوں کو دولت آباد جا کر آباد ہونے کا حکم دیا تو حمید قلندر بھی دکن چلے گئے۔ وہاں انہیں سلطان المشائخ کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ کی صحبت میسر آئی[3]۔ خیرالمجالس کے ایک اندراج سے یہ معلوم ہوا کہ اس نے حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات جمع کرنا شروع کئے تھے اور وہ بیس مجالس کے ملفوظات جمع کر چکا تھا کہ کام رک گیا[4]۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات" نفائس الانفاس"حمید قلندر کے مرتب کردہ ہیں' جو بیس مجالس پر مشتمل ہیں[5]۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ" نفائس الانفاس" کے متن میں جامع ملفوظات نے اپنا نام عماد کاشانی المعروف بہ دبیر لکھا ہے[6]۔

حمید قلندر دکن میں کتنے سال رہا' اس کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے چند سال بعد دہلی کے باشندوں کو دولت آباد سے واپس جانے کی اجازت دی تو بہت سے لوگ دہلی چلے گئے اور یوں دولت آباد کی رونق کم ہو گئی۔ ان حالات میں حمید قلندر کا جی دولت آباد

---

۱ - شیخ عبدالحق محدث' کتابِ مذکور' ص ۱۱۔
۲ - عبداللہ خویشگی' کتابِ مذکور' ورق ۱۳۷ الف۔
۳ - ایضاً۔
۴ - حمید قلندر' کتابِ مذکور' ص ۹۔
۵ - عبداللہ خویشگی' کتابِ مذکور' ورق ۱۳۷ الف۔
۶ - عماد کاشانی' نفائس الانفاس' مخطوطہ کتابخانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ' نمبر ۳۳۳۔ ص ۲۔

سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ دہلی چلا آیا۔ یہاں ان دنوں سلطان المشائخ کی مَسند پر حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغِ دہلیؒ تشریف فرما تھے۔ حمید کو بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا چسکا پڑ چکا تھا اور وہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات بھی جمع کر چکا تھا۔ اس نے چراغِ دہلیؒ کی صحبت کو غنیمت جان کر ایک روز ان کی خدمت میں حاضری دی۔ ملاقات کے وقت اس نے حضرت کو بتایا کہ وہ اور اس کا والد سلطان المشائخ سے بیعت ہیں۔ حمید کی زبان سے اپنے مرشد کا نام سنتے ہی حضرت کھڑے ہو گئے اور اسے گلے لگا کر فرمانے لگے کہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اسے اتنی بڑی سعادت حاصل ہے اور وہ ان کا برادرِ طریقت ہے[1]۔

حمید قلندر نے حضرت چراغ دہلیؒ کی سَو مجالس کے ملفوظات مرتب کئے ہیں۔ اس دوران میں حضرت اس کے کام کی نگرانی فرماتے رہے اور جب ایک جز تیار ہو جاتا تو حضرت اسے ملاحظہ فرماتے[2]۔ حمید قلندر اگر ان کی کوئی کرامت نقل کرتا یا ان کے لئے کوئی بڑا لقب استعمال کرتا تو حضرت فوراً اسے حذف کرنے کا حکم صادر فرماتے۔ خیرالمجالس سلطان فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی دورِ حکومت کے سیاسی، مذہبی اور سماجی حالات کا ایک بہترین مرقع ہے۔ اس کی کئی مجالس میں حضرت چراغِ دہلیؒ نے عہدِ فیروزی کا عہدِ علائی کے ساتھ مَوازنہ کیا اور عہدِ فیروزی میں اشیائے صرف کی گرانی کا گِلہ کیا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے سلطان علاء الدین خلجی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بڑا بیدین انسان تھا اور ایک بار وہ نبوّت کا دعویٰ کرنے والا تھا لیکن دہلی کے کوتوال علاءُ الملک نے سمجھا بجھا کر اسے اس ارادے سے باز رکھا[3]۔ ایک اور موقع پر ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی ایک اَن پڑھ حکمران تھا۔ وہ الحمد شریف، سُورۂ اخلاص اور التحیات کے علاوہ اور کچھ نہ جانتا تھا۔ وہ جائز اور ناجائز میں تمیز رَوا نہ رکھتا تھا اور جو اس کے جی میں آتا تھا احکامِ شریعت کی پَرواہ کئے بغیر کر گذرتا تھا[4]۔ برنی نے اسے بیدین ثابت کرنے میں کوئی کسر رَوا نہیں رکھی۔ ضیاء الدین برنی نے سلطان علاء الدین خلجی کی جو بھیانک تصویر کھینچی ہے اس کے بَرعکس خیرالمجالس میں سلطانِ موصوف کو ایک ولی اللہ کے روپ میں دکھایا گیا ہے جس کے مزار پر جا کر عوام مَنّتیں مانا کرتے تھے[5]۔ مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی نے منگولوں کے حملوں کے سدِّباب کے لئے ایک بڑی فوج تیار کی اور اس کے اخراجات پُورے کرنے کے لئے اشیائے صَرف کی قیمت بندی کی تھی لیکن خیرالمجالس میں چراغِ دہلیؒ نے سلطان کے مصاحبِ خاص ملکُ التجّار قاضی حمید الدین کی زبانی یہ

---

۱ ۔ شیخ عبدالحق محدّث، کتابِ مذکور، ص ۔۔
۲ ۔ حمید قلندر، کتابِ مذکور، ص ۴۸۔
۳ ۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ : ۱۸۶۲ء، ص ۲۶۵۔
۴ ۔ ایضاً، ص ۲۹۴۔
۵ ۔ حمید قلندر، کتاب مذکور، ص ۲۴۳۔ ۲۴۱۔

واقعہ نقل کیا ہے کہ قیمت بندی کے پیچھے عوام کے لئے جذبۂ خیر خواہی کارفرما تھا اور سلطان مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا[۱]۔ خیرالمجالس عہدِ علائی سے لے کر عہدِ فیروزی تک کا ایک اہم تاریخی ماخذ ہے جو شاہی دربار کی مسموم اور خوشامدانہ فضاء سے دور رہ کر تیار کیا گیا ہے اس عہد کی تاریخ لکھتے وقت کوئی ذمہ دار مؤرخ اس تصنیفِ دل پذیر سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

خیرالمجالس میں حمید قلندر اپنے بارے میں لکھتا ہے کہ ایک روز اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ خضر آباد چلا جائے۔ یہ جگہ دریا کے کنارے واقع ہے اور بڑی صاف ستھری ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ وہاں رہنے سے نمازِ جمعہ کی ادائیگی مشکل ہو جائے گی اس لئے کیلوکھڑی میں رہنا بہتر ہو گا۔ ویسے بھی وہاں اس کے والد مولانا تاج الدین کی رہائش گاہ ہے اور چراغِ دہلیؒ کی خدمت میں آمد و رفت میں بھی آسانی رہے گی۔ پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا یہ سب فضول باتیں ہیں۔ وہ خیرالمجالس کی تدوین شروع کر چکا ہے اگرچہ وہ اس کام کے لائق تو نہیں ہے لیکن جو اس کی سمجھ میں آتا ہے' وہ لکھ لیتا ہے تاکہ اس کی ایک علمی یادگار دنیا میں باقی رہ جائے۔ ان حالات میں شہر میں رہنا ہی مناسب رہے گا[۲]۔

حمید قلندر نے ایک روز حضرت چراغ دہلیؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ کچھ وقت عبادت میں ضرور صرف کرتا ہے لیکن صومِ دوام اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ گرمیوں کے موسم میں دہلی میں شدید گرمی پڑتی ہے اور وقفے وقفے سے پیاس لگتی ہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ درویش اگر روزہ نہ رکھ سکے تو تقلیلِ طعام کرے۔ حمید قلندر نے اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ ایک بار ماہِ رجب کی یکم تاریخ تھی اور اس روز جمعہ تھا۔ حمید قلندر نے حضرت چراغ دہلیؒ کے فرمان کے مطابق نفلی روزہ رکھ لیا۔ نمازِ جمعہ کے بعد گرمی کی وجہ سے اس کی حالت غیر ہو گئی اور اس کے جسم پر پانی ڈالا گیا۔ افطاری کے وقت اس نے اتنا زیادہ پانی پی لیا کہ بے سدھ ہو کر سو گیا اور نمازِ عشاء کا بھی ہوش نہ رہا۔ تہجد کے وقت اسے ہوش آیا تو اگلے روز اس نے حضرت کی خدمت میں یہ ماجرا سنایا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ خود اس بڑھاپے میں روزہ رکھتے ہیں' وہ کیوں نہیں رکھ سکتا؟ اس نے عرض کیا کہ وہ تقلیلِ طعام کے اصول پر کاربند ہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اس سے بھی روزے کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے[۳]۔

شیخ کا پاسِ ادب

حمید قلندر نے ایک روز حضرت چراغ دہلیؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ موصوف اس کے

۱۔ ایضاً" ص ۲۴۱۔

۲۔ ایضاً" ص ۴۷۔

۳۔ ایضاً" ص ۷۱۔

استاد' مربّی اور مخدوم ہیں اِس لئے وہ اس کی قوتِ حافظہ میں اضافے کے لئے دُعا فرمائیں۔ وہ ان سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جو شخص اس کے مرشد کا محب و معتقد نہ ہو گا' اس کے ساتھ دوستی نہ رکھے گا بلکہ اس کے کوچے سے بھی نہ گذرے گا۔

ایک اہم انکشاف

دکن میں قیام کے دوران میں حمید قلند نے حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات جمع کرنا شروع کئے تھے۔ اس نے اس کا نام "اَخبارُ الاخیار" رکھا تھا اور اس میں بیس مجالس کے ملفوظات قلبند کئے تھے۲۔ حضرتِ موصوف کے ملفوظات کے دو مجموعے "نفائس الانفاس" اور "احسن الاقوال" ہم تک پہنچے ہیں، لیکن اَخبارُ الاخیار اب نایاب ہو گئی ہے۔ عبداللہ خویشگی نے معارج الولایت میں لکھا ہے کہ "نفائس الانفاس" حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات کا وہی مجموعہ ہے جو حمید قلندر نے مرتب کیا تھا۳۔ یہاں عبداللہ خویشگی کو سہو ہوا ہے۔ "نفائس الانفاس" کے مرتب عماد کاشانی تھے۔ اس تصنیفِ دل پذیر کا ایک مخطوطہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی پر منگولوں کا حملہ

حضرت چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ جب کبھی وہ اَودھ سے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تو دہلی میں چالیس روز قیام فرماتے۔ اس زمانے میں سلطان المشائخ کی خانقاہ میں زیادہ مسافر نہیں ٹھہرا کرتے تھے۔ بعد ازاں ان کا معمول دہلی میں بیس روز رہنے کا ہو گیا اور پھر وہ بھی گھٹ کر دس روز رہ گیا۔ ایک بار جناب اَودھ سے اپنے مرشد کی خدمت میں آئے ہوئے تھے تو ایک روز انہوں نے فرمایا کہ انہیں ان کو اپنے ہاں ٹھہرانا گراں نہیں گذرتا لیکن مسافر بہت زیادہ آئے ہوئے ہیں۔ ابھی انہیں دہلی آئے ہوئے چھٹا یا ساتواں روز تھا کہ سلطان المشائخ کا خادمِ خاص خواجہ اقبال آیا اور ان سے کہنے لگا کہ اپنا رَخت سفر تیار کریں۔ حضرت نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو خواجہ اقبال نے کہا کہ ملاعین (منگول) کی آمد آمد کا شور ہے اور ہر طرف تشویش بڑھ رہی ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے ایک معتمد کے ذریعے سلطان المشائخ کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ کل یا پرسوں تک شہر کے اندر تشریف لے آئیں۔ ان دنوں سلطان نے قُرب و جوار کی آبادیوں سے لوگوں کو شہر میں لانے کے لئے بار برداری کے جانور مہیا کر دیئے ہیں۔ لوگوں نے دیہات نذرِ آتش کر کے اپنی فصلیں اُجاڑ دی ہیں

---

۱ - ایضاً" ص ۳۱۔
۲ - ایضاً" ص ۲۰۹۔
۳ - عبداللہ خویشگی' کتابِ مذکور' ورق ۴۷ الف۔

تاکہ منگولوں کو رسد نہ مل سکے۔ حضرت چراغ دہلیؒ کا گھوڑا مولانا فخرالدین زرادیؒ کے رشتہ داروں کے گاؤں میں تھا۔ انہوں نے رقعہ لکھ کر اپنا گھوڑا منگوایا اور دوسری جانب مولانا برہان الدین غریبؒ کو پیغام بھیجا کہ موصوف کو کل سلطان المشائخ سے وطن جانے کی اجازت ملے گی۔ شیخ سے رخصت ہونے کے بعد ان سے ملنا صوفیوں کے طریقے کے خلاف ہو گا۔ اس لئے اس رقعے کو الوداعی ملاقات تصور کر لیں۔ حضرت برہان الدینؒ نے قاصد کے ذریعے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ کل کیلو کھڑی میں انہیں وداع کرنے آئیں گے[۱]۔

عہدِ علائی کی برکتیں

ایک روز حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ سلطان المشائخؒ کے زمانے میں بیس بیس درویش ان کے ہاں آتے اور سلطان المشائخؒ تین روز تک انہیں مہمان رکھتے۔ اب ہمارے زمانے میں درویش کم ہو گئے ہیں اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ سلطان المشائخؒ کے زمانے میں کس قدر ارزانی تھی۔ گندم کا بھاؤ ساڑھے سات جیتل فی مَن اور شکر کا نرخ نصف درہم فی مَن تھا۔ سفید شکر بھی بڑی ارزاں تھی۔ اسی طرح کپڑے اور اشیائے صرف بڑی سستی تھیں۔ اگر کوئی شخص ضیافت کرنا چاہتا تو دو چار ٹنکوں میں اتنے کھانے تیار ہو جاتے کہ ایک بڑی جماعت سیر ہو جاتی۔ اس زمانے میں رمضان قلندر کا لنگر اور ملک یار پراں کا لنگر بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی جگہ لنگر جاری تھے۔ اب (عہدِ فیروزی میں) نہ وہ لنگر رہے اور نہ ہی ویسے باہمت درویش۔ اب تو درویشوں کی جگہ "بچّوں" نے لے لی ہے۔ اس کے بعد حضرت چراغ دہلیؒ اس بابرکت زمانے کو یاد کر کے رونے لگے[۲]۔

یہ سب عہدِ علائی کی برکت تھی۔ شیخ اس عہد کا موازنہ عہدِ فیروزی کے ساتھ کر رہے تھے۔ فیروز شاہ کا اڑتیس سالہ دَورِ حکومت بڑے امن و شانتی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود چراغ دہلیؒ اقتصادی بدحالی اور گرانی کا ذکر فرما رہے ہیں۔

ایک مجلس میں چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ سلطان المشائخؒ کا زمانہ بھی کیا اچھا زمانہ تھا۔ اس زمانے کے صوفیوں کا بھی کیا کہنا۔ وہ سب کے سب صاحبِ حال تھے۔ اس زمانے میں دعوتیں عام تھیں۔ کم و بیش ایک ٹنکے میں دعوت ہو جاتی تھی۔ اچھے موسم میں اور خاص طور پر ماہِ صفر کے آخری چہار شنبہ کو حظیروں، باغوں اور حوضوں کے کناروں پر تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اس کے بعد حضرت، سلطان علاء الدین خلجی کو یاد کر کے فرمانے لگے کہ اس کے عہد میں کس قدر ارزانی تھی۔ سردی کے موسم میں کوئی درویش بغیر لحاف کے نہ سوتا تھا اور لحاف بھی ایک سے زائد ہوا کرتے تھے۔ ایک ٹنکے کے عوض پشمینہ، دو ٹنکے اور بیس جیتل میں بُرد اور

۱ - حمید قلندر، کتابِ مذکور، ص ۲۶۰ - ۲۵۹۔
۲ - ایضاً، ص ۱۸۵۔

تیں جیتل میں ہلکی قسم کا کپڑا اور بارہ جیتل میں سوتی کپڑا مل جاتا تھا۔ اسی پر دوسری چیزوں کا تخمینہ لگا لیں۔ اس زمانے میں کافور مہرہ دار بہت سے لباس سلوا لیتا اور فقراء میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ایک بار ایک فقیر دو بار آ کر اس سے کپڑے لے گیا۔ ان دنوں چار جیتل یا ششگانی درزی اور دھنیے کی مزدوری ہوا کرتی تھی۔ اب درزی ایک ٹنکہ لئے بغیر کپڑے کو ہاتھ نہیں لگاتا۔[1]

سلطان علاء الدین خلجی کے دل میں ارزانی کا خیال کیسے آیا

حضرت چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار وہ اودھ میں تھے اور اتفاق سے ملک التجار قاضی حمید الدین بھی وہیں تھا۔ وہ سلطان علاء الدین خلجی کا معتمد علیہ تھا۔ اس نے احباب کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد جب احباب رخصت ہونے لگے تو اس نے انہیں روک لیا۔ یہ دونوں حضرات ایک جگہ بیٹھ گئے تو قاضی ان سے کہنے لگا کہ ایک روز وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت سلطان پاؤں نکالے تخت پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا اور چہرے پر تفکر کے آثار عیاں تھے۔ سلطان کو ان کے آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ یہ بھی سلطان کو اس حال میں دیکھ کر باہر چلے آئے۔ قاضی صاحب کی ملاقات سلطان کے ایک مقرب ملک قراء بیگ سے ہوئی تو انہوں نے سلطان کی حالت اس سے بیان کی۔ وہ قاضی صاحب کو ساتھ لے کر سلطان کی خدمت میں پہنچا۔ اس نے سلطان کو باتوں میں لگا کر اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کی اور اس سے کہا کہ اس کی ایک درخواست ہے۔ سلطان نے کہا جو کہنا چاہتے ہو' کہو۔ اتنے میں قاضی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے عرض کیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے حاضر ہوئے تھے اور سلطان کو فکر مند دیکھ کر دبے پاؤں واپس چلے گئے تھے۔ "بادشاہِ مسلمانان" کو ان دنوں کیا فکر لاحق ہے؟ یہ سن کر سلطان نے جواب دیا "سنئے! مجھے چند روز سے یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر حاکم بنایا ہے۔ اب کچھ ایسا کام کرنا چاہیے کہ میری ذات سے تمام خلق کو فائدہ پہنچے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کونسا کام کروں جس سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچے۔ اگر میں اپنا تمام خزانہ عوام میں تقسیم کر دوں' بلکہ اس طرح کے سو خزانے بھی لٹا دوں' تو بھی تمام مخلوق کو فائدہ نہ ہو گا۔ اگر گاؤں اور پرگنے تقسیم کرنے بیٹھوں تو بھی سب کا فائدہ نہ ہو گا۔ میں اسی فکر میں تھا کہ کوئی ایسا کام کروں جس سے عوام کو فائدہ پہنچے۔ اس وقت ایک بات میرے ذہن میں آئی' وہ میں تم سے کہتا ہوں۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اناج سستا کروں جس سے عوام کو فائدہ پہنچے۔ اناج سستا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میں ایک حکم جاری کروں اور تمام نائکوں اور اناج لانے والوں کو بلاؤں۔ اناج لانے والے بنجاروں کے پاس ہزار سے بیس ہزار تک بار برداری کے جانور ہیں۔ میں انہیں کپڑے اور گھوڑوں کا خرچ

۱۔ ایضاً' ص ۲۴۱۔

دوں اور وہ اطراف و جوانب سے غلہ لا کر میرے مقرر کردہ بھاؤ پر فروخت کریں۔"[۱]۔ (آزاد ترجمہ)

ملکُ التجار قاضی حمید الدین نے چراغ دہلیؒ کو بتایا کہ سلطان نے اسی تجویز پر عمل کیا اور اطراف و جوانب سے غلہ شہروں میں آنے لگا اور چند دن کے اندر غلے کا نرخ سات جیتل فی مَن ہو گیا۔ اسی طرح اشیائے صرف مثلاً گھی اور شکر وغیرہ سب ارزاں ہو گئیں اور اس سے تمام خلقت کو فائدہ پہنچا[۲]۔ یہ واقعہ حاضرینِ مجلس کو سنانے کے بعد چراغ دہلیؒ نے فرمایا "کیا بادشاہ تھا سلطان علاء الدین' اللہ کی رحمت ہو اس پر"[۳]۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ سلطان علاء الدین خلجی کی معاشی اصلاحات اور ضروری اشیاء کی قیمتوں کے تعین سے متعلق اس کے احکام کی تفصیل ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں دی ہے لیکن سلطان کے ذہنی محرکات کا صحیح اندازہ برنی یا اس کے کسی ہم عصر مؤرخ نے نہیں لگایا۔ یہ چیز ہمیں صرف خیر المجالس میں ملتی ہے[۴]۔

ایک شخص نے چراغ دہلیؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ لوگ سلطان علاء الدین خلجی کے مزار کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ وہ اس کے مزار کے ساتھ دھاگے باندھتے ہیں تو ان کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس کی یہ بات سن کر حمید قلندر کی اگرچہ کوئی خواہش نہ تھی' پھر بھی اس نے لوگوں کی دیکھا دیکھی اپنی دستار سے ایک دھاگا نکال کر مزار سے باندھ دیا۔ رات کو اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص آواز لگا رہا ہے کہ وہ کون تھا جس نے سلطان کی قبر سے دھاگا باندھا تھا؟ جب اس نے کئی بار آواز لگائی تو حمید قلندر آگے بڑھا اور کہنے لگا کہ وہ دھاگا اس نے باندھا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کی کیا خواہش ہے؟ حمید قلندر نے جواب دیا کہ اس کی کوئی خواہش نہیں ہے[۵]۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان شمس الدین التتمش[۶] کے مزارات آمنے سامنے ہیں اور دونوں کے درمیان بمشکل تیس میٹر کا فاصلہ ہو گا۔ سلطان شمس الدین التتمش وہ شخص ہے جو حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں رات رات بھر بزرگوں

---

۱ - ایضاً" ص ۲۴۱۔
۲ - ایضاً"۔
۳ - چہ بادشاہے بُود سلطان علاء الدین رحمۃ اللہ علیہ۔
۴ - خلیق احمد نظامی' مضمون مشمولہ "نذرِ عرشی" دہلی: ۱۹۶۵ء' ص ۴۳۸۔
۵ - حمید قلندر' کتابِ مذکور' ص ۲۴۲ - ۲۴۱۔
۶ - شہرۂ آفاق مُستشرق ڈاکٹر جان اینڈریو بُوئل نے اپنے ہاتھ سے راقم کو یہ لکھ کر دیا تھا :
Now it is certain that his name was ILETMISH.

کی خدمت میں دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔ یہ وہ بابرکت زمانہ تھا جب بغداد میں حضرت سہروردیؒ[۲] کی خانقاہ میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ اوحد الدین کرمانیؒ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ جیسے بزرگ مقیم تھے[۱]۔ شمس الدین التمش وہ شخص تھا جس کی نماز عصر کی سنتیں کبھی قضاء نہ ہوئی تھیں۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ شرط لگائی تھی کہ ان کی نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے کبھی نماز عصر کی سنتیں قضاء نہ کی ہوں اور یہ شرط صرف سلطان شمس الدین التمش ہی پوری کرتا تھا[۲]۔ یہ مزید تعجب کی بات ہے کہ اس کے مزار پر کوئی شخص دھاگا باندھنے نہیں جاتا اور لوگوں کا رجوع اس سلطان علاء الدین خلجی کے مزار کی جانب تھا' جو بقول ضیاء الدین برنی بڑا بیدین تھا اور وہ الحمد' سورۂ اخلاص' التحیات اور دعائے قنوت کے علاوہ کچھ نہ جانتا تھا بلکہ جائز اور ناجائز میں بھی فرق روا نہ رکھتا تھا۔ برنی یہ بھی لکھتا ہے کہ وہ ایک بار نبوّت کا دعویٰ کرنے لگا تھا تو اس موقع پر علاءُ الملک کوتوال نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ خیرالمجالس کے ایک ہی ملفوظ نے سلطان علاء الدین خلجی کا امیج (IMAGE) بدل کر رکھ دیا ہے۔

چراغ دہلیؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ اگر سلطان کا کوئی مصاحب یا درباری امیر کسی نیک شخص کے بارے میں سفارش کرتا تو سلطان علاء الدین خلجی اس کا رُوزینہ مقرر کر دیتا تھا۔ ایک بار ملکُ التجّار قاضی حمید الدین کے کہنے پر اس نے مولانا فخرالدین مروزی کا رُوزینہ مقرر کر دیا تھا[۳]۔

سلطان علاء الدین خلجی کا ایک مصاحب محمد کاتب حضرت چراغ دہلیؒ کا مرید تھا۔ اس نے ایک روز حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ سلطان نے اس روز پچاس ہزار ٹکے غریب عوام میں تقسیم کیے تھے[۴]۔

سلطان قطب الدین مبارک خلجی

سلطان علاء الدین خلجی کے بیٹے اور جانشین سلطان قطب الدین مبارک خلجی کے سلطان المشائخؒ کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا بڑا بھائی خضر خان جو ولی عہدِ سلطنت تھا' سلطان المشائخؒ کا مرید تھا اور ایک روایت کے مطابق درگاہ شریف کی مسجد بھی اسی نے تعمیر کرائی تھی[۵]۔ سلطان علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد ملک کافور نے خضر خان کا

۱۔ خلیق احمد نظامی' سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات' ص ۱۰۳۔
۲۔ صباح الدین عبدالرحمٰن' بزمِ صوفیہ' اسلام آباد : ۱۹۹۰ء ص ۸۶۔
۳۔ حمید قلندر' کتاب مذکور ص ۸۸۔
۴۔ ایضاً" ص ۶۹۔
۵۔ سر سید احمد خان' آثار الصنادید' نولکشور' لکھنؤ ۱۸۷۶ء ص ۳۸۔

حق پس پشت ڈال کر اسے قلعۂ گوالیار میں نظر بند کر کے اندھا کروا دیا اور سلطان کے ایک کمسن فرزند شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھا کر خود سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اراکین سلطنت نے اس کی حرکتوں سے تنگ آ کر پینتیس روز بعد ہی اسے قتل کر ڈالا اور قطب الدین مبارک کو سلطان شہاب الدین عمر کا نگران مقرر کیا۔ اس نے موقع پاتے ہی شہاب الدین عمر کو اندھا کر کے گوالیار بھیج دیا اور خود تخت پر قابض ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے خضر خان کو بھی مروا ڈالا۔[۱]

کسی لگائی بجھائی کرنے والے نے سلطان قطب الدین مبارک سے کہا کہ سلطان المشائخؒ اس کی نذر قبول نہیں کرتے لیکن اس کے امراء اور ملوک کی نذریں قبول کر لیتے ہیں۔ وہ امراء اور ملوک بھی تو سلطان ہی کے ہیں۔ چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ سلطان قطب الدین مبارک نے یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ کوئی امیر یا ملک سلطان المشائخؒ کی خدمت میں نہ جائے۔ وہ دیکھے گا کہ پھر ان کا لنگر کس طرح چلتا ہے۔ سلطان نے غیاث پور کے راستے میں اپنے جاسوس مقرر کر دیئے اور ان سے کہا کہ اگر وہ کسی امیر یا ملک کو سلطان المشائخؒ کی خدمت میں جاتے ہوئے دیکھیں، تو اسے مطلع کریں۔ جب سلطان المشائخؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے خدام سے کہا لنگر کا خرچ بڑھا دیا جائے۔ کچھ عرصے بعد سلطان نے جاسوسوں سے دریافت کیا کہ سلطان المشائخؒ کے گھر کی کیا حالت ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک کے دو ہو گئے ہیں۔ اس پر سلطان پشیمان ہوا اور اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔[۲]

چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ اودھ میں ایک دیوانہ رہتا تھا وہ جو کہتا تھا ویسا ہی ہو جاتا تھا۔ اس لئے لوگوں کو اس کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ایک صبح وہ ... اٹھ کر زور زور سے کہنے لگا: تیرا وہ ملک کہاں گیا؟ تیرے چتر کا کیا بنا؟ تیرے تخت کا کیا ہوا؟ یہ سب دوسروں کے ہاتھ لگے۔ لوگ اس کی یہ باتیں سن کر حیران ہوئے اور انہوں نے وہ تاریخ لکھ لی۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ اسی رات سلطان قطب الدین مبارک قتل ہوا تھا۔[۳]

شیخ العالم بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

خیرالمجالس میں متعدد صوفیاء کرام کا ذکر آیا ہے۔ قریب العہد ماخذ ہونے کی بنا پر ان بزرگوں کا کوئی تذکرہ نگار اس کتاب سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ حضرت چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ جب بابا فرید ہانسی کی سکونت ترک کر کے اجودھن تشریف لائے تو وہاں کے باشندے "درشت خو و بے عقیدہ" تھے۔[۴] ان پر جادو بھی کیا گیا اور یہ کام شہاب ساحر کے فرزند نے

۱ - کشوری سرن لال، خلجی خاندان، دہلی : ۱۹۸۰ء ص ۳۰۹۔
۲ - حمید قلندر، کتاب مذکور، ص ۲۵۸۔
۳ - ایضاً، ص ۲۲۷۔
۴ - ایضاً، ص ۸۹

کرایا گیا[1]۔ اجودھن میں قیام کے زمانے میں ان کے گھر میں کبھی دو وقت اور کبھی تین وقت کا فاقہ ہوا کرتا تھا۔ اگر ان کے اہل خانہ اس کا ذکر ان سے کرتے تو ان پر ان باتوں کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا اور موصوف یادِ حق میں مشغول رہتے تھے۔ چراغ دہلیؒ سے روایت ہے کہ اجودھن میں خانقاہ کے قیام کے آغاز میں قصبے میں زنبیل کھمائی جاتی تھی[2]۔ لوگ اس میں روٹی کے بچے کچھے ٹکڑے ڈال دیتے تھے' جو درویشوں کے کام آتے تھے۔ اسی طرح جب سلطان المشائخ نے غیاث پور میں خانقاہ کی بنیاد رکھی تو وہاں بھی زنبیل گھمائی جاتی تھی[3]۔ ان باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صوفیاء کرام نے کیسے کٹھن حالات میں عوام کی رشد و ہدایت کا کام کیا ہے۔

شیخ نجیب الدین متوکلؒ

موصوف بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے حقیقی بھائی تھے اور دہلی میں سکونت رکھتے تھے رہائش کے لئے ان کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اسی میں میاں بیوی گذر بسر کرتے تھے ایک بار عید گاہ میں ان کے گرد عقیدت مندوں کا ہجوم ہو گیا۔ وہاں اتفاق سے چند مسافر درویش بھی عید کی نماز ادا کرنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کے بارے میں استفسار کیا تو کسی نے بتایا کہ شیخ صاحب بڑے پہنچے ہوئے درویش ہیں۔ وہ درویش یہ سمجھے کہ پھر تو یہ بڑے آسودہ حال ہوں گے لہٰذا عید کے دن کھانا ان کے ہاں سے کھانا چاہئے۔ شیخ کے گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد درویش بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت گھر میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی جس سے درویشوں کی تواضع کرتے۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کی اوڑھنی فروخت کرنے کا ارادہ کیا تو اس میں اتنے پیوند لگے ہوئے تھے کہ اسے کوئی خریدنے کو تیار نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنا مصلیٰ بیچنے کی ٹھانی لیکن اس کی حالت بھی اوڑھنی سے بہتر نہ تھی۔ ان حالات میں موصوف درویشوں کے طریقے کے مطابق پانی کا ایک کوزہ لے کر کھڑے ہو گئے۔ درویش بھی صاحبِ حال تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ عید کے دن بھی شیخ کے ہاں فاقہ ہے۔ چنانچہ وہ تبرکاً پانی پی کر رخصت ہو گئے[4]۔ بابا فرید الدینؒ' شیخ نجیب الدین متوکلؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی والدۂ ماجدہؒ کے ہاں اتنی غربت اور فاقہ کشی کے واقعات پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان اس زمانے میں حکمران طبقہ (Ruling Class) ہونے کے باوجود معاشی طور پر اس قدر تنگ دست کیوں تھے؟

---

۱ - ایضاً" ص ۱۱۷۔
۲ - ایضاً" ص ۱۵۰۔
۳ - ایضاً"۔
۴ - ایضاً" ص ۷۵۔

حضرت برہان الدین غریبؒ

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ بہمنی سلطنت' جس نے دکن کو سیاسی' تمدّنی اور سماجی ترقی کی راہیں دکھائی تھیں' ۱۳۴۷ء میں علاء الدین بہمن شاہ کی کوششوں سے وجود میں آئی تھی۔ اس کی بنیاد پڑنے سے بیس سال قبل سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کے علماء و مشائخ کو جبراً اس علاقے میں تبلیغ و اشاعتِ علوم کے لئے بھیج دیا تھا۔ ان مشائخ کی کثیر تعداد چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی تھی۔ ان بزرگوں کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ علاقہ جہاں کبھی سلطنت دہلی کا کامیاب تسلّط نہ ہو سکا تھا' ایک ایسی سلطنت کا گہوارہ بن گیا' جس نے جنوبی ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی شمع روشن رکھی[1]۔ نظامی صاحب نے ان چشتی بزرگوں کے نام نہیں لکھے۔ ان بزرگوں میں حضرت برہان الدین غریبؒ اور ان کے برادرِ بزرگ شیخ منتجب الدین سر فہرست ہیں۔ برہان پور' جو بعد میں خاندیش کے فاروقی بادشاہوں کا دارالحکومت بنا' حضرت برہان الدین غریبؒ کی یاد میں ہی تعمیر کیا گیا تھا۔

حضرت برہان الدین غریبؒ' سلطان المشائخؒ کے جلیل القدر خلیفہ تھے۔ چراغ دہلیؒ اور ان کے درمیان بڑی مؤدت تھی۔ جب کبھی چراغِ دہلیؒ اودھ سے دہلی آتے تو حضرت برہان الدین غریبؒ ان کی دعوت کرتے اور حضرت ایک رات ان کے ہاں قیام بھی فرماتے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت چراغ دہلیؒ ان کا عرس منعقد کیا کرتے تھے[2]۔ یہ حق دوستی تھا' جو موصوف زندگی بھر نبھاتے رہے۔ حمید قلندر' چراغ دہلیؒ کی خدمت میں آنے سے پہلے حضرت برہان الدین غریبؒ کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے انہیں "درویش واصل" لکھا ہے[3]۔

شیخ سیف الدین باخرزیؒ

چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ سیف الدین باخرزیؒ کے ہاتھ پر ایک منگول حکمران مسلمان ہوا۔ پھر اس کی بیویاں' بیٹے' امراء اور مصاحب سب مسلمان ہو گئے۔ الناس علی دین ملوکھم کے مصداق تمام لشکر مشرف باسلام ہو گیا۔ اس حکمران کا نام خربندہ تھا۔ شیخ باخرزیؒ نے اس کا نام خدابندہ رکھ دیا۔ چراغ دہلیؒ نے یہاں اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ خدابندہ سلطان اولجا تیو خدابندہ نہیں' بلکہ کوئی دوسرا حکمران ہے[4]۔

---

۱ - خلیق احمد نظامی' تاریخ مشائخ چشت' دہلی : ۱۹۸۰ء ج اول' ص ۲۵۹ - ۲۵۸۔

۲ - حمید قلندر' کتاب مذکور' ص ۹۔

۳ - ایضاً" ص ۳۔

۴ - ایضاً" ص ۱۸۱۔

مولانا حمید الدین ضریر

چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ مولانا حمید الدین ضریرؒ مولانا شمس الدین گردیزی کے شاگردِ رشید تھے اور انھوں نے ہدایہ اور حسامی پر حواشی لکھنے کے علاوہ متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔ بخارا کے علماء کی ایک بڑی جماعت ان کی شاگرد تھی[۱]۔

چراغ دہلیؒ

حمید قلندر نے حضرت چراغ دہلیؒ کو علم میں ابو حنیفہؒ بتایا ہے اور زہد و طریقت میں نظام الدینؒ وقت لکھا ہے[۲]۔ ایک مجلس میں چراغ دہلیؒ نے حمید قلندر کو بتایا کہ موصوف' مولانا کمال الدین سامانوی اور مولانا فخر الدین زرّادی ایک ہی مدرسے میں پڑھا کرتے تھے[۳]۔ ایک روز چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ اگر ان کے مرشد کا یہ حکم نہ ہوتا کہ وہ شہر میں رہیں اور لوگوں کی جفائیں برداشت کریں تو وہ کسی ویرانے' جنگل یا پہاڑ میں رہتے۔ جس وقت حضرت یہ بیان فرما رہے تھے تو اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے[۴]۔ ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا کہ دہلی میں ان کی دلچسپی صرف حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے روضۂ متبرکہ کی وجہ سے ہے[۵]۔

سماع کے بارے میں انھوں نے اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ مزامیر (ساز) جائز نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص طریقت سے گرے تو وہ شریعت میں آ رہے گا اور اگر کوئی شریعت سے گرے تو پھر کہاں جائے گا[۶]؟ علماء میں سماع کے بارے میں اختلاف ہے اور انھوں نے سماع کے اہل لوگوں کے لئے اسے چند شرائط کے ساتھ مباح لکھا ہے، لیکن مزامیر کے مباح ہونے پر اجماع نہیں ہے[۷]۔ ایک اور موقع پر حضرت نے فرمایا کہ اہلِ سماع کے لئے سماع تمام دردوں کا حکم رکھتی ہے[۸]۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے سماع کی تاثیر کے بارے میں کئی حکایات بیان فرمائی ہیں' اس کے باوجود موصوف خود سماع نہیں سنتے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخؒ نے اس شخص کو اپنا جانشین

---

۱ - ایضاً" ص ۳۰-
۲ - ایضاً" ص ۴۱-
۳ - ایضاً" ص ۶۳-
۴ - ایضاً" ص ۳۶-
۵ - ایضاً" ص ۷۹-
۶ - ایضاً" ص ۴۲-
۷ - ایضاً" ص ۴۳-

مقرر کیا جو اعلانیہ سماع بالمزامیر کا منکر تھا[1]۔

اصلاح معاشرہ

حضرت چراغ دہلیؒ نے ایک روز اپنی مجلس میں ایک تاجر خواجگی نجندی کا ذکر کیا۔ وہ ہمیشہ مُوٹے جُھوٹے کپڑے فروخت کیا کرتا تھا۔ ایک بار لوگوں نے اس سے کہا کہ وہ اعلیٰ قسم کے کپڑوں کا کاروبار کیوں نہیں کرتا، حالانکہ اس میں منافع زیادہ ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ مُوٹے جُھوٹے پڑے فقیر اور درویش پہنتے ہیں اور اعلیٰ قسم کے ترک اور لشکری، اس لئے وہ کاروبار میں فقیروں اور درویشوں کا خیال رکھتا ہے۔ ایک بار اس کے کپڑوں کا ایک گٹھڑ دریا میں گر گیا۔ ملاحوں نے ہر چند تلاش کیا، مگر نہ ملا۔ خواجگی نجندی نے کہا کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے اس لئے اس کا مال ضائع نہیں ہو گا۔ ایک روز ایک غلام دریا کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک رسی پر پڑی۔ اس نے وہ رسی کھینچی تو گٹھڑ باہر آ گیا۔ خواجگی نجندی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا کہ وہ نہ کہتا تھا کہ اس کا مال ضائع نہ ہو گا[2]۔

حضرت چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ خرید و فروخت کرتے وقت جھوٹ بولنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ جھوٹ بولنے سے کاروبار میں بے برکتی ہوتی ہے۔ سچ بول کر دکاندار اگر تھوڑا منافع بھی کمائے تو اس میں برکت ہو گی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ خواجہ محمد منکدر بڑے ایماندار تاجر تھے۔ مشکل اوقات میں لوگ خدا کو ان کا واسطہ دے کر دُعا کیا کرتے تھی تو ان کی مصیبتیں ٹل جاتی تھیں[3]۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک اور موقع پر کیا خوب کہا ہے کہ صوفیاء کرام نے سماج کے صحتمند عناصر کو اُبھارنے اور اخلاقی قدروں کی فضیلت دلنشین کرنے کے سلسلہ میں جو جدوجہد کی تھی، اس کی تفصیل ملفوظات ہی میں ملتی ہے[4]۔

اولیاء اللہ

حضرت چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ وَلیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قولاً، فعلاً اور ارادۃً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے۔ اللہ تعالیٰ کی بندے کے ساتھ محبت بغیر اتباع پیغمبر نہیں ہو سکتی۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ[5]

---

۱ - شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، لاہور : ۱۹۵۲ء، ص ۲۷۵۔
۲ - حمید قلندر، کتاب مذکور، ص ۱۸۳۔
۳ - ایضاً، ص ۹۶۔
۴ - خلیق احمد نظامی، مضمون مشمولہ "نذرِ عرشی" ص ۴۴۳۔
۵ - حمید قلندر، کتاب مذکور، ص ۸۶۔

درویشوں کا مسلک

ایک روز ایک درویش چراغ دہلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے کسی نے زیادتی کی تھی۔ اس نے آنجناب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی شکایات کا دفتر کھول دیا۔ اس پر حضرت نے فرمایا "اگر انہوں نے تم سے جفا کی ہے تو تم درویشوں کے طریقے سے مطابق انہیں معاف کر دو"[۱]۔

دین فروشی کی مذمت

چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی درویش صوفیوں جیسا لباس پہن کر کسی امیر یا سلطان کے دروازے پر جائے اور ان سے کہے کہ وہ درویش ہے لہٰذا اسے کچھ دیں، تو یہ دین فروشی ہو گی[۲]۔

لقمۂ حلال پر زور

ایک مجلس میں چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ ہاتھ سے کمائی ہوئی روزی بہترین لقمہ ہے۔ جو ابدال پہاڑوں میں رہتے ہیں وہ ایندھن فروخت کر کے کھانا فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص شہر آ کر ایندھن فروخت کر کے اپنے ساتھیوں کے لئے کھانا لے جاتا ہے[۳]۔

واعظ کے لئے شرائط

ایک روز چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ واعظ کے لئے ضروری ہے کہ وہ صالح، متقی اور تارک خواہشات ہو۔ وہ کسی کے دروازے پر نہ جائے اور اسے کسی قسم کا لالچ نہ ہو وہ جو کچھ کہے خدا کی خوشنودی کے لئے کہے۔ اس کے پیش نظر دنیاوی منفعت اور شہرت نہ ہوئے۔ حضرت نے ایک اور موقع پر فرمایا کہ مولانا شہاب الدین اُوشی نے کئی سال تک جامع مسجد (مسجد قوۃ الاسلام) دہلی کے مینار (قطب مینار) کے پاس وعظ کیا۔ اس تمام مدت میں وہ لوگوں کو خدا کے خوف سے ڈراتے رہے اور ایک بار بھی اس کی رحمت کا ذکر زبان پر نہ لائے۔ ایک بار

---

۱ - ایضاً، ص ۱۷۷۔

۲ - ایضاً، ص ۸۰۔

۳ - ایضاً، ص ۲۷۷۔

۴ - ایضاً، ص ۳۱۔

سامعین نے ان سے کہا کہ وہ ہمیشہ عذاب خداوندی کے موضوع پر وعظ کرتے ہیں کبھی تو' بھولے سے ہی سہی' رحمتِ باری کا بھی ذکر کریں۔انہوں نے جواب دیا کہ اتنے عرصے تک خدا کے عذاب کا ذکر سن کر بھی ان لوگوں نے "خدائی" نہیں چھوڑی' اگر وہ رحمت کا ذکر کرتے تو پھر ان کا کیا حال ہوتا![1]

دل بدست آور کہ حج اکبراست

حمید قلندر لکھتے ہیں کہ ایک خاتون نے دو حج کئے تھے۔ اس خوشی میں اس نے ایک کنیز کے ہاتھ کھانے کا ایک خوان چراغ دہلیؒ کی خدمت میں بھجوایا۔ حضرت صوم دوام پر کار بند تھے اور اس روز بھی ان کا نفلی روزہ تھا۔ جب وہ کنیز کھانا لے کر حاضر ہوئی تو انہوں نے اس کی مالکہ کا دل رکھنے کی خاطر کھانا تناول فرمایا[2]۔ صوفیوں کے مسلک میں دل شکنی کو بڑا معیوب فعل سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے حضرت چراغ دہلیؒ نے کھانا بھجوانے والی خاتون کی دل شکنی گوارا نہ فرمائی اور روزہ افطار کر لیا۔

رسم مشائخ چشت

ایک روز ایک درویش چراغ دہلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آتے ہی زمانے کی شکایات کا دفتر کھول دیا۔ اس کی باتیں سن کر حضرت نے فرمایا یہ ہمارے خانوادے کے مشائخ کا طریقہ نہیں ہے۔

"---این رسم خانوادۂ مشائخ ما نیست---"[3]

کنگھی رکھنے کا طریقہ

حضرت چراغ دہلیؒ کنگھی رکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اس کے دندانے نیچے کی طرف ہوں۔ ایک روز انہوں نے حاضرین کو بتایا کہ دندانے بالوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ اس لئے جو چیز تفرقہ ڈالے اسے دور تر رکھنا چاہئے[4]۔

کوٹھے وال

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا آبائی وطن کوٹھے وال ہے' جو ملتان کو بودلہ سے

۱- ایضاً" ص ۱۸۰-
۲- ایضاً" ص ۲۳۳-
۳- ایضاً" ص ۸۷-
۴- ایضاً" ص ۲۰۲-

ملانے والی سڑک پر ملتان سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ بابا صاحب کے تذکرہ نگاروں نے جب کوٹھے وال کو فارسی کے قالب میں ڈھالا تو اس کی شکل اس بُری طرح مسخ ہوئی کہ لوگ اصل نام ہی بھول گئے۔ مفتی غلام سرور نے اسے کھوتوال' علامہ اخلاق حسین دہلوی نے کوتوال' شیخ جمالی نے کھولوال' مولوی محمد دین نے کھلی وال' علی اصغر چشتی نے کوتیوال' مؤرخ شہیر فرشتہ نے کوتھی' مصطفائی بیگم نے کھوتیوال' وحید احمد مسعود نے کھوتوال' طالب ہاشمی نے کھوتوال' خلیق احمد نظامی نے کہتوال' عبداللہ خویشگی نے کہتیوالہ' عبدالرحمٰن نے کھتوال' اسدیہ چشتی نے کہنی وال' پروفیسر پریتم سنگھ نے کھوتی وال' گور بخش سنگھ طالب نے کہتوال اور مولا بخش کشتہ نے کھوتوال' علم الدین سالک نے کسوتر وال' مولوی امام الدین نے کہتی وال' حیدر علی سہوانی نے کھوتوال' خواجہ حسن نظامی نے کھتوال' ڈاکٹر سرندر سنگھ نے کوٹھی والا اور میر خورد کرمانی نے کہتوال اور کہتوالہ لکھا ہے۔ صرف آصف خان نے صحیح نام کوٹھے وال لکھا ہے[۱]۔ ان فضلاء سے یہ سہو اس لئے ہوا کہ وہ کوٹھے وال کو ایرانی لباس میں نہ پہچان سکے۔ حمید قلندر نے اس موضع کا صحیح نام ہی خیر المجالس میں لکھا ہے[۲]۔ اگر یہ کتاب ان فضلاء کی نظروں سے گذری ہوتی تو وہ اتنی بڑی غلطی کا ارتکاب نہ کرتے۔

درویشی ورثے میں نہیں ملتی

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ ابوالغیث یمانی ایک بزرگ تھے۔ جب وہ بیمار ہوئے تو ان کے بیٹوں اور مریدوں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان کا جانشین فیروز ہو گا۔ اگلے روز شیخ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مریدوں اور بیٹوں میں کسی کا نام فیروز نہ تھا۔ تلاش بسیار کے باوجود پُورے علاقے میں اس نام کا کوئی نیک انسان نہ ملا۔ اس علاقے میں ایک شراب خانہ تھا وہاں اس نام کا ایک شخص ملازم تھا۔ شیخ کے مریدوں کو یہ جان کر بڑا افسوس ہوا کہ ان کے مرشد نے کس قماش کے انسان کو اپنا جانشین نامزد کیا ہے۔ اس موقع پر بعض مریدوں نے کہا کہ وہ ایسے شخص کو ہرگز شیخ کا جانشین تسلیم نہ کریں گے۔ مریدوں کی اکثریت نے یہ فیصلہ کیا کہ جب شیخ نے اسے نامزد کیا ہے تو پھر اسے ہی مسند پر بٹھانا چاہیے۔ چنانچہ عمائدین کا ایک وفد فیروز کے پاس گیا۔ وہ اس وقت شراب کا مٹکا اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ اس کا انتظار کریں' یہ آخری مٹکا ہے۔ عمائدین فیروز کو لے کر خانقاہ پہنچے اور اسے نہلا دھلا کر شیخ کی مسند پر بٹھایا۔ اس موقع پر شیخ کے بعض مریدوں نے اس کی تعظیم کی اور بعض نے طعن کیا۔ فیروز نے ان سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ شیخ کی قبر پر چلیں اور ان سے اس کے بارے میں استفسار کریں۔ اگر قبر

۱- زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے راقم الحروف کا مضمون بعنوان "حضرت بابا فریدؒ کا آبائی وطن" ماہنامہ المعارف لاہور' بابت ماہ جولائی ۱۹۸۳ء۔

۲- حمید قلندر' کتاب مذکور' ص ۲۱۹۔

سے جواب آئے تو اسے قبول کر لیں بصورتِ دیگر اسے خانقاہ سے نکال باہر کریں۔ فیروز کے کہنے پر شیخ کے جملہ مرید اس کی معیّت میں شیخ کی قبر پر حاضر ہوئے۔ اس موقع پر فیروز نے کہا "شیخ! آپ نے میرے حق میں وصیت کی ہے لیکن یہ لوگ نہیں مانتے۔ اب کیا حکم ہے؟ اب آپ کی مسند پر کون بیٹھے گا"؟ چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ قبر سے تین بار آواز آئی۔ فیروز' فیروز' فیروز۔ مسند نشینی کے بعد اس نے دن رات تسبیح کی اور نوافل ادا کئے اور وہ واصل ہو گیا[1]۔

امیر حسن علاء سجزی نے فوائد الفواد میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کی زبانِ مبارک سے ایک ایسا ہی واقعہ نقل کیا ہے جس میں ایک شیخ طریقت نے اپنے چار بیٹوں کو پس پشت ڈال کر زیرک نامی ایک غلام کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے سلطان المشائخؒ نے فرمایا تھا کہ اس راہ میں آقائی اور غلامی حائل نہیں ہوتی۔ جو بھی عالمِ محبت میں کمال کو پہنچا' اس کا کام بن گیا[2]۔

حضرت اخی جمشید راجگیریؒ کے ملفوظات میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ نقل ہوا ہے کہ ایک شیخ کا وقتِ آخر آیا تو اس کے فرزندوں نے اس سے پوچھا کہ ان میں سے کون اس کی مسند پر بیٹھے گا؟ شیخ نے کہا کہ اس شہر میں ایک ہندو غلام ہے جو آبکاری کا کام کرتا ہے۔ اسے اس کے مالک سے خرید کر اس کے پاس لائیں وہ اسے مشرف باسلام کر کے اپنے سجادہ پر بٹھائے گا۔ بیٹے باپ کی بات سن کر ناراض ہوئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک مسند پر بیٹھنے کا آرزو مند تھا۔ اس موقع پر ان کے والد نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ہم اللہ تعالیٰ کی امانت کے امین ہیں۔ اگر کوئی اس کا اہل نہ ہو اور ہم اسے امانت سونپ دیں تو خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خائنوں کو پسند نہیں فرماتا۔ ثانیاً"۔ سجادۂ درویشی میراث نہیں ہے۔ اگر کوئی باپ مرتے وقت مال و دولت چھوڑے تو بیٹے اس کے وارث ہوتے ہیں لیکن "کارِ عشق و محبت" میراث نہیں ہوتا۔ بیٹے باپ کی وصیت کے مطابق اس ہندو غلام کو خرید کر باپ کی خدمت میں لائے۔ شیخ نے اسے کلمۂ توحید پڑھا کر مسلمان کیا اور ایک ہی توجہ میں مسِ خام کو زرِ خالص بنا کر اپنے سجادے پر بٹھا دیا[3]۔ صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ایسی توجہ کو "توجۂ قسری" کہتے ہیں جس میں سالک کی تمام رُوحانی منازل طے ہو جاتی ہیں۔

جعلی کتابیں

حضرت نظام الدین اولیاء نوّر اللہ مرقدہٗ کی حیاتِ طیّبہ میں کسی جعل ساز نے ان کے نام

۱۔ ایضاً' ص ۱۲۷۔ ۱۲۶۔

۲۔ امیر حسن علاء سجزی' فوائد الفواد' لاہور: ۱۹۶۶ء' ص ۵۔

۳۔ یحییٰ بن علی اصغر' ملفوظاتِ حضرت اخی جمشید راجگیریؒ' مخطوط مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری' نمبر ۴/۶۲ فارسیہ مذہب و تصوف؛ ورق ۵۹ ب۔

سے ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک روز کسی نے حضرتِ والا کی خدمت میں عرض کیا کہ اس نے ایک شخص کے پاس ان کی تصنیف کردہ کتاب دیکھی ہے۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا "من ہیچ کتابے تصنیف نکردہ ام و خواجگان ما نیز نکردہ۔" (میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی اور ہمارے بزرگوں نے بھی یہ کام نہیں کیا) [1]۔ تذکروں کی ورق گردانی سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں کے نام سے کتابیں لکھنے کا مرض عام تھا۔ شیخ عبدالحق محدِث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت بُو علی قلندرؒ کے نام پر "حکم نامہ شیخ شرف الدین" کے نام سے ایک رسالہ تیار کر لیا ہے جو ظاہر ہے کہ "مخترعاتِ عوام" کے ضمن میں آتا ہے[2]۔

فوائد الفواد سے پہلے وجود میں آنے والے ملفوظات کی حقیقت

ایک روز کسی شخص نے حضرت چراغِ دہلیؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات میں ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پر چراغِ دہلیؒ نے فرمایا کہ یہ ملفوظات ان کے نہیں ہیں۔ ان میں بہت سی ایسی باتیں مرقوم ہیں جو ان کے اقوال سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ اس موقع پر چراغِ دہلیؒ نے فرمایا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی' نیز حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ' خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور خواجگانِ چشت میں سے کسی بزرگ نے کوئی کتاب نہیں لکھی[3]۔ حضرت چراغِ دہلیؒ کے اصل الفاظ یہ ہیں: "ہیچ شیخی تصنیف نہ کردہ است۔" ان کے اس قول کی روشنی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات فوائد السالکین "مرتبہ" بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ' اسرار الاولیاء ملفوظاتِ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ "مرتبہ" بدر الدینؒ اسحٰق' راحتُ القلوب ملفوظاتِ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ "مرتبہ" حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی کیا تاریخی حیثیت رہ جاتی ہے؟ مجھے اس پر تعجب ہے کہ ہمارے ایک فاضل بزرگ علّامہ اخلاق حسین دہلوی نے ان کتابوں کو صحیح مانتے ہوئے "آئینۂ ملفوظات" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے اور اس میں اپنا سارا زور ان کے GENUINE (صحیح) ہونے پر لگا دیا ہے۔

خضر آباد

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ موجودہ جامعہ مِلّیہ اِسلامیہ دہلی کے نزدیک خضر آباد سیّد خاندان کے بانی سیّد خضر خان کا آباد کردہ قصبہ ہے۔ ممّاس خان نے نواب نجف خاں اور

---

۱ - حمید قلندر' کتابِ مذکور' ص ۵۳۔
۲ - عبدالحق محدّث دہلوی' اخبار الاخیار' دہلی : ۱۳۳۲ھ' ص ۱۲۹۔
۳ - حمید قلندر' کتابِ مذکور' ص ۵۲۔

مرہٹوں کے درمیان جنگ کے ضمن میں باغ خضر آباد اور گومٹی خضر آباد کا ذکر کیا ہے[۱]۔ مرزا سنگین بیگ نے بھی سیرالمنازل میں گمٹی خضر آباد کا ذکر کیا ہے جس کے نواح میں مہابت خان کی حویلی تھی[۲]۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی میں مولوی بشیرالدین احمد نے "خضر کی گمٹی" کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ خضر خان کا مقبرہ ہے جو سلطان مبارک شاہ (۱۴۳۳ء --- ۱۴۲۱ء) نے تعمیر کیا تھا[۳]۔ خیرالمجالس ۷۵۴ھ ر ۱۳۵۳ء میں مرتب ہونا شروع ہوئی تو اس وقت خضر آباد موجود تھا اور ایک بار حمید قلندر نے وہاں مستقل قیام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس سے راقم کے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ خضر آباد کا بانی سلطان علاء الدین خلجی کا فرزند اور ولی عہد شہزادہ خضر خان تھا جو حضرت نظام الدین اولیاء نور اللہ مرقدہٗ کا مرید تھا۔

اُردو زبان کی ابتداء

خیرالمجالس میں اُردو زبان کے متعدد الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان میں کئی الفاظ تو خالص پنجابی الاصل ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مشائخ عظام کی مجالس میں فارسی بول چال میں مقامی زبانوں کے الفاظ بلا تکلف استعمال ہوتے تھے۔ حضرت حمید الدین سوالی ناگوریؒ خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ ان کے گھر میں فارسی کی بجائے "ہندوی" زبان بولی جاتی تھی[۴]۔ حضرت شیخ احمد کھٹو کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ موصوف گوجری زبان جانتے تھے[۵]۔ حضرت قطب عالمؒ مخدوم جہانیاںؒ کے پوتے تھے، مولوی عبدالحق نے ان کا ایک مکمل اُردو فقرہ نقل کیا ہے[۶]۔ حضرت قطب عالمؒ کے فرزند شاہ عالمؒ تمام عمر احمد آباد میں رہے، وہ سرائیکی زبان میں بات چیت کر لیتے تھے[۷]۔ شیخ احمد نہروالیؒ ہندوی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے[۸]۔ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ نے سنسکرت زبان جاننے کا اعتراف کیا ہے[۹]۔ ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشائخ عظام وعظ و نصیحت کرتے وقت بلاتکلف مقامی زبانوں کے الفاظ

---

۱ ۔ طہماس خان، طہماس نامہ، لاہور : ۱۹۸۶ء ص ۲۹۳۔

۲ ۔ مرزا سنگین بیگ، سیرالمنازل، دہلی : ۱۹۸۲ء ص ۷۶۔

۳ ۔ مولوی بشیرالدین احمد، واقعاتِ دارالحکومت دہلی، دہلی : ۱۹۹۰ء ج ۲، ص ۳۳۔

۴ ۔ سرور الصدور، مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، نمبر فارسی تصوف ۲۱ ر ۲۱۱، ورق ۸۔

۵ ۔ خلیق احمد نظامی، تذکرہ عرشی، ص ۳۴۴۔

۶ ۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، کراچی : ۱۹۵۳ء، ص ۲۷۔

۷ ۔ عبدالحی لکھنوی، گل رعنا، اعظم گڑھ : ۱۳۷۰ھ، ص ۱۵۔

۸ ۔ حمید قلندر، کتابِ مذکورہ، ص ۲۷۶۔

۹ ۔ محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۱۹۔

استعمال کرتے تھے اور انہوں نے زبان کو ذریعہ اظہار سے زیادہ وقعت نہیں دی- خیرالمجالس میں کھُھڑی، ڈُولہ، پالکی، پنڈت، کھَٹ، گھڑی، (چھوٹا گھڑا) ہٹ (پٹسن) بُدھنی، کڑاہی، چھپر، رہ رہ، سادھہ (سادھو) ڈیلہ، ارے مولانا یہ بُڈھا ہوی، مجھ اس تاپ تھیں چھُڈا، جو منڈاسا باندھے سوپائن پسرے اور تو میرا گسائیں تو میرا کرتار اور تو مرا کرتار نہیں جیسے اردو اور پنجابی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اس خیال کو تقویت بخشتے ہیں کہ اُردو زبان کی ابتداء اور نشوونما صوفیاء کرام کی خانقاہوں میں ہوئی ہے-

✪✪✪

جوامع الکلم

حضرت سید محمد الحسینی المعروف بہ سید بندہ نواز گیسودرازؒ کا شمار برعظیم پاک و ہند کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔ آپ ۴ رجب ۷۲۰ھ کو خسرو خان کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کے چند سال بعد جب سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کی بجائے دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور دہلی کے باشندوں کو وہاں جانے کا حکم دیا تو حضرت گیسو درازؒ اپنے والد بزرگوار سید محمد یوسف المعروف بہ راجو قتالؒ کی معیت میں دولت آباد تشریف لے گئے۔[1]

آپ نے ابتدائی تعلیم دولت آباد میں اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ حضرت گیسودرازؒ ابھی دس برس کے تھے کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی تربیت کا بار ان کے ماموں ملک الامراء سید ابراہیم کے کندھوں پر پڑا اور وہ پانچ سال تک ان کی کفالت کرتے رہے۔

جب حضرت گیسو درازؒ پندرہ برس کے ہوئے تو ان کی والدہ اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے بیٹے سمیت دہلی چلی آئیں۔[2] دہلی اس زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور ان دنوں وہاں شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے نامور مرید قاضی عبدالمقتدر کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ قاضی صاحب اپنی فصاحت و بلاغت اور دانشمندی کے لئے ضرب المثل تھے اور ان کے قصائد اور غزلیات علمی و ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔[3] حضرت گیسو درازؒ کو دہلی میں قاضی عبدالمقتدر کی صحبت میسر آئی اور آپ نے ان کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی۔

سید گیسودرازؒ پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ سے متعارف ہوئے[4] اور آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں ہی ۱۶ رجب ۷۳۶ھ کو ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

۱۔ شیخ محمد اکرام۔ آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۴۱۷۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۱۳۳۔

۴۔ حضرت گیسودرازؒ، جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۲۹۳۔

۔ بیعت کے بعد سید گیسودرازؒ نے مرشد کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ ان کا جذبہ اور ذوق و شوق دیکھ کر حضرت چراغ دہلیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ستر برس کے بعد ایک لڑکے نے پھر مجھ میں شوریدگی پیدا کر دی ہے اور پہلے زمانے کے واقعات مجھے یاد دلا دیئے ہیں۔[۲]

حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ کو وفات پائی اور وفات سے تین روز پہلے انہوں نے حضرت گیسو دراز کو خلافت عطا فرمائی۔ حضرت گیسودرازؒ نے چوالیس برس تک دہلی میں مسندِ ارشاد کو زینت بخشی اور جب ۸۰۱ھ میں امیر تیمور کے حملہ کا غلغلہ بلند ہوا تو حضرت گیسو دراز نے ۸۰ برس ہی عمر میں دہلی کو خیر باد کہا اور گجرات کے راستے دولت آباد تشریف لے گئے۔ دولت آباد میں چندے قیام کے بعد آپ شاہانِ بہمنی کے دارالحکومت گلبرگہ تشریف لے گئے اور سلطان تاج الدین فیروز کی درخواست پر آپ نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۸۲۵ھ میں ۱۰۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔[۳] آپ کا مزار گلبرگہ میں مرجع خلائق ہے۔

سید گیسودرازؒ نے متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے شرح فصوص الحکم، معارف شرحِ عوارف، شرح فقہء اکبر، رسالۂ سیرۃ النبی، شرح آدابُ المریدین، اسماء الاسرار، مکتوبات اور اُن کا مجموعۂ کلام انیس العشاق خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے ملفوظات کے دو مجموعے سیر محمدی مرتبہ محمد علی سامانی اور جوامع الکلم مرتبہ سید محمد اکبر حسینی طبع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے آخرالذکر مجموعہ ملفوظات بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت گیسو درازؒ نے ۱۰۵ برس کی عمر پائی اور ان کی زندگی میں تیرہ بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ موصوف برعظیم پاک و ہند میں ایک صدی میں پیش آنے والے واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ اس لئے ان کے ملفوظات کا مطالعہ تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے بیحد ضروری ہے۔ میں نے جوامع الکلم پر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے اور مجھے اس گراں قدر کتاب میں سے جو مواد دستیاب ہوا ہے' وہ پیش خدمت ہے۔

جوامع الکلم حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو ان کے فرزند سید محمد

---

۱ ۔ صباح الدین عبدالرحمن۔ بزمِ صوفیہ' مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء' ص ۴۸۵۔
۲ ۔ محمد علی سامانی' سیرِ محمدی' مطبوعہ الہ آباد ۱۳۴۷ھ' ص ۱۴۔
۳ ۔ خلیق احمد نظامی' دیباچہ خیرالمجالس' مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء' ص ۶۱۔
۴ ۔ محمد اسحٰق' انڈیاز کونٹری بیوشن ٹو دی سٹڈی آف حدیث لٹریچر' مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۵۵ء۔ ص ۹۴۔

اکبر حسینی نے جمع کئے ہیں۔ جن ایام میں فاضل مرتب نے ملفوظات جمع کرنے شروع کئے ان دنوں حضرت گیسو دراز دہلی سے براہ گجرات دکن جا رہے تھے۔ فاضل مرتب نے ملفوظات نویسی کا آغاز ۱۸ رجب ۸۰۲ھ / ۱۵ مارچ ۱۴۰۰ء کو کھمبائت میں کیا اور نو ماہ بعد ۲۲ ربیع الثانی ۸۰۳ھ / ۱۰ دسمبر ۱۴۰۰ء کو جوامع الکلم مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں فاضل مرتب نے حضرت گیسو دراز کی ۱۳۸ مجالس کے ملفوظات قلمبند کئے ہیں۔

سید محمد اکبر حسینی رقمطراز ہیں کہ انہوں نے یہ ملفوظات لکھ کر حضرت گیسودرازؒ کی خدمت میں پیش کئے اور انہوں نے لفظاً" لفظاً" اور حرفاً" حرفاً" ان کا مطالعہ کر کے ان کی تصحیح فرمائی۔ حضرت گیسودرازؒ نے ملفوظات پڑھ کر فرمایا کہ مرتب نے جس تحقیق اور تدقیق کے ساتھ یہ ملفوظات جمع کئے ہیں اسے مدِنظر رکھتے ہوئے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے خود ہی اپنے ملفوظات جمع کئے ہیں۔ؔ

تاریخی ماخذ

جوامع الکلم چشتی بزرگوں کے متعلق معلومات کی ایک کان ہے اور ہماری ناقص رائے میں اگر کوئی شخص چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے حالات لکھتے وقت اس کتاب سے استفادہ نہیں کرتا تو وہ محض جھک مارتا ہے۔ اس کتاب میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ اور ان کے خلفاء اور مریدوں کے حالات اس کثرت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ ان بزرگوں کا کوئی سوانح نگار اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

اردو کی ابتداء

جوامع الکلم کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر زبان کے بارے میں بڑے بے تعصب واقع ہوئے تھے، وہ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں ہندی زبان کے الفاظ بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرنے لگے تھے۔ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کے ملفوظات میں بھات، چھپر کھٹ، کھاٹ، کنارہ، لنگوٹہ، دھکہ، چنڈال، پول، ڈھیر، پوٹلہ، کھل، پہاڑ، ڈولہ، جٹ، چوترہ، کروڑ، کھڑی، چرائتہ، پلپل (فلفل) موڑہ، چھجہ، چھکہ اور چنپا جیسے الفاظ عام ملتے ہیں۔ اسی طرح اس کتاب میں کئی ہندی فقرے بھی ملتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مشائخ عوام کی زبان استعمال کرنے لگے تھے۔

ا۔ جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۲۷۱۔

گیسودرازؒ کا علمی ذوق

جوامع الکلم حضرت گیسودرازؒ کے بارے میں معلومات کی ایک کان ہے۔ اس کتاب میں فصوص الحکم، فتوحاتِ مکیہ، مشارق الانوار، مقاماتِ حریری، پنج گنج، بزدوی، رسالۂ قشیریہ، کشف المحجوب، تاریخ فیروز شاہی، کنز، مبسوط خواہر زادہ اور شرح مشارق الانوار کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اکثر حضرت گیسودرازؒ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔

جوامع الکلم میں صاحبزادہ محمد اکبر حسینی رقمطراز ہیں کہ ہمارے والد بزرگوار فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے سنسکرت زبان کی کتابیں پڑھی ہیں اور وہ ہندوؤں کی دیومالا سے بخوبی واقف ہیں۔[1]

گیسودرازؒ کا عقیدہ

حضرت گیسودرازؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ صحابہ کرامؓ میں حضرت ابوبکرؓ سب سے افضل تھے اور ان کے بعد حضرت عمرؓ کا مقام ہے اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کا درجہ ہے اور ان کے بعد حضرت علیؓ کا نمبر آتا ہے۔[2] یہی اہلِ سنت کا عقیدہ ہے۔

حضرت گیسودرازؒ صحابہ کرام کے بارے میں اتنے محتاط تھے کہ ان کے صاحبزادے سید محمد اکبر حسینی جوامع الکلم میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت گیسودرازؒ اختلافاتِ صحابہ پر گفتگو کرنے سے ہمیشہ پرہیز فرماتے تھے۔

گیسودرازؒ اور ہندو

جوامع الکلم کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اکثر ہندو جوگی اور ہندو اسکالرز حضرت گیسودرازؒ سے مناظرے کرنے کے لئے آیا کرتے تھے اور موصوف اس شرط پر بھی مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے کہ جو شخص مناظرہ میں ہار جائے وہ جیتنے والے کا مذہب قبول کر لے۔ ایک بار ایک ہندو کے ساتھ مناظرہ کی یہی شرط ٹھہری اور جب وہ مناظرہ ہار گیا تو اس نے عرض کیاکراس کے بیوی اور بچے سامانہ میں ہیں۔ وہ انہیں لینے جا رہا ہے اور واپس آ کر معہ اہل و عیال اسلام قبول کرے گا' لیکن وہ ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ نظر نہیں آیا۔

سہروردی اور نقشبندی بزرگوں کے مسلک کے برعکس چشتیہ سلسلہ کے بزرگ ہندوؤں کے ساتھ بڑی رواداری کے قائل تھے اور ان کی ہمیشہ یہی خواہش ہوا کرتی تھی کہ ان کی کسی طرح

۱۔ جوامع الکلم، ص ۴۹۔ "من کتاب سنسکرت ایشان خوانده ام و افسانہائے ایشان ہی دانم۔"
۲۔ جوامع الکلم، ص ۲۰۔ "افضل صحابہ ابوبکرؓ ثم عمرؓ ثم عثمانؓ ثم علیؓ"۔

دل آزاری نہ ہو۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت گیسودرازؒ مولانا جمال الدینؒ مولانا علاء الدین اور مولانا صدرالدین ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک ہندو طبیب بھنو نامی مولانا جمال الدین سے ملنے آیا اور گفتگو کے دوران مولانا صدر الدین نے اسے "ابے بھنو" کہہ کر مخاطب کیا تو مولانا جمال الدین نے انہیں ٹوکا اور ان سے پوچھا کہ بھلا یہ "ابے" کیا ہوتا ہے؟ اس پر مولانا صدرالدین نے کہا کہ وہ چونکہ ہندو ہے اس لئے انہوں نے اسے "ابے" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ان کی یہ بات سن کر مولانا جمال الدین نے کہا کہ یہ مانا کہ وہ ہندو ہے لیکن تم اپنی زبان کیوں خراب کر رہے ہو۔ تمہیں یہ چاہئے تھا کہ اسے "برادر بھنو" کہہ کر پکارتے اور اگر تم اسے بھائی کہہ کر مخاطب کرتے تو تمہارا اس میں کیا بگڑتا تھا۔[۱]

حضرت گیسودرازؒ نے جس انداز میں یہ واقعہ بیان کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں کی تذلیل اور خواری کے قائل نہ تھے بلکہ انہیں اپنی سوسائٹی میں اچھا مقام دلانے کے خواہش مند تھے۔

بندہ نوازؒ کے زمانے کی دہلی

حضرت گیسودرازؒ نے اپنے ملفوظات میں ایک موقع پر "خانۂ ما نزدیک دروازۂ پالم درون دہلیٔ کہنہ" کا ذکر کیا ہے۔[۲] اس سے دو باتیں مترشح ہوتی ہیں۔ اولاً یہ کہ حضرت گیسودرازؒ کی رہائش اندرون دروازۂ پالم میں تھی۔ ثانیاً یہ کہ ملفوظات کی نگارش کے وقت نئی دہلی آباد ہو گئی تھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت "دہلیٔ کہنہ" کا ذکر نہ فرماتے۔

جوامع الکلم میں ایک دوسرے موقعہ پر حضرت گیسودرازؒ نے "نزدیک دروازۂ بداؤں" اپنی رہائش گاہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اندرون دروازۂ پالم کے علاوہ آپ کی رہائش دروازۂ بداؤں کے نزدیک بھی رہی ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ پرانی دہلی کے چودہ دروازے تھے۔ راقم الحروف کی یہ بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح ان دروازں کے نام معلوم ہو جائیں۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی کی اصلاحات کے ضمن میں قدیم دہلی کے صرف دو دروازوں یعنی دروازہ بداؤں[۳] اور دروازۂ بھندر کال[۴] کا ذکر کیا ہے۔ راقم الحروف نے دو بار بغور جوامع

---

۱ - ایضاً،" ص ۱۷۲۔

۲ - ایضاً،" ص ۱۳۔

۳ - ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ج ۲، ص ۱۱۳، ۱۴۰۔

۴ - ایضاً،" ص ۱۱۰، بھدر کالی ہندوؤں کی ایک دیوی ہے، یہ دروازہ غالباً اسی کے نام سے منسوب تھا۔

الکلم کا اول تا آخر مطالعہ کیا تو گیارہ دروازوں کے نام مل گئے لیکن اس سے راقم الحروف کی تشفی نہ ہوئی اور تیسری بار جوامع الکلم کے مطالعہ کے دوران مزید دو دروازوں کے نام مل گئے۔ حضرت گیسودرازؒ نے اپنے ملفوظات میں دروازۂ پالم' دروازۂ شکار' دروازۂ بزرگ' دروازۂ تشمیر' دروازۂ غزنین' دروازۂ بھیدہ' دروازۂ مندہ' دروازۂ کمال' دروازۂ دہلی' دروازۂ بداؤں' دروازۂ سیری' دروازۂ حاجب عطار اور دروازۂ حوض رانی کا ذکر کیا ہے۔ عام طور پر دہلی میں تین حوض' حوض شمسی' حوض علائی اور حوض رانی مشہور ہیں۔ حضرت گیسودرازؒ نے جوامع الکلم میں ایک موقع پر حوض قتلغ خان کا ذکر کیا ہے جسے علاء الدین کے نامور جرنیل اور مصاحب قتلغ خان نے تعمیر کروایا تھا۔ ۱؎ حضرت گیسو درازؒ نے ایک موقع پر "بازار خواجہ جہان" کا ذکر کیا ہے جہاں سے ان کے بھائی "دکانِ گاہندیاں" سے چراتہ خرید کر لائے تھے۔ ۲؎

حضرت گیسودرازؒ۳؎ نے بارہویں پشت میں اپنے جد امجد ابوالحسن جندیؒ کا ذکر کرتے ہوئے دروازۂ شکار کے قریب فصیل کے نزدیک ان کے مزار کی نشاندہی کی ہے۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ آس پاس کے لوگ اس بات پر گواہ ہیں کہ ہر شب جمعہ وہاں انوار کا نزول ہوتا ہے۔ ان کے مزار پر اناروں کے درخت ہیں، جہاں حاجت مند دھاگے باندھ جاتے ہیں۔ ۔ محمد بن تغلق نے دہلی میں بے شمار مزارات تباہ و برباد کر دیئے تھے' ۴؎ تاہم سید ابوالحسن جندیؒ کا مزار حضرت گیسودرازؒ کے زمانے تک محفوظ تھا۔ اب اس مزار کا محل وقوع تلاش کرنا بے حد دشوار ہے۔

دہلی کارپوریشن کی حدود میں وزیر آباد ایک مشہور بستی ہے۔ یہ بڑی قدیم آبادی ہے اور جوامع الکلم میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت گیسودرازؒ کے زمانے میں یہ دہلی سے آٹھ کوس کی مسافت پر تھی۔ ۵؎

ملفوظاتِ خواجگانِ چشت

موجودہ صدی کے آغاز میں لاہور کے ایک ناشر نے فوائدالسالکین' راحت المحبین' خلاصتہ العارفین' دلیل العارفین اور افضل الفوائد کے عنوانات سے خواجگانِ چشت کے ملفوظات شائع کئے

---

۱ - جوامع الکلم' ص ۲۲۱۔
۲ - ایضاً" ص ۲۹۳۔
۳ - ایضاً" ص ۳۱۳۔
۴ - ایضاً" ص ۱۳۳۔ "قدیم الایام در دہلی زیارت گاہہا بسیار بود بعد خرابی دہلی کہ سلطان محمد تغلق کرد آن زیارتہا بکلی مضمحل شد جز زیارت شیخ الاسلام قطب الدینؒ و خدمت شیخ الاسلام نظام الدینؒ و چند بیری۔" ۵ - ایضاً" ص ۱۸۸۔

ہیں اور ضعیف الاعتقاد اور خوش عقیدہ لوگ انہیں حرزجان بنا چکے ہیں۔ اسی طرح انیس الارواح، راحت القلوب اور اسرارالاولیاء کے عنوانات سے بھی چشتی بزرگوں کے ملفوظات کے مجموعے موجود ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک ملفوظات کے یہ تمام مجموعے جعلی اور وضعی ہیں کیونکہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ ان کے اکابر میں سے کسی بزرگ نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ [1] حضرت چراغ دہلیؒ کے اس قول کی تصدیق جوامع الکلم کے ایک اندراج سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ اجودھن میں قیام کے دوران کسی شخص نے انہیں بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ دکھایا جس کے مرتب کا نام بدرالدین اسحٰق بتایا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ مجموعہ سراسر جعلی ہے اور اسی طرح فوائدالفواد کے علاوہ جتنے مجموعے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف منسوب ہیں وہ سب جعلی ہیں۔[2]

چشتیوں میں احترام مرشد

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ ماہِ رمضان میں علیل ہو گئے اور وہ روزے قضاء کرنے لگے۔ ایک روز دن کے وقت بابا صاحب نے خربوزہ تناول فرماتے ہوئے ایک قاش حضرت نظام الدین اولیاء کو مرحمت فرمائی۔ حضرت نظام الدینؒ اولیاء نے دل میں سوچا کہ خدا جانے اس طرح کی دولت پھر کبھی انہیں میسر بھی آئے گی کہ نہیں۔ اس لئے انہوں نے فی الفور قاش کھانے کا ارادہ کیا اور اپنے دل میں کہا کہ بعد ازاں بطور کفارہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھ لیں گے۔ جونہی ان کے دل میں یہ خیال گزرا تو بابا صاحبؒ نے فرمایا:

"نظام الدین ہمیں شریعت کی رعایت کرنی چاہئے۔ اس لئے اسے افطار کے وقت کھا لینا۔"[3]

شمس الدین التمش

حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ سلطان شمس الدین التمش نے ایک ترکی کنیز خریدی اور اسے اس کے ساتھ بڑی محبت ہو گئی۔ سلطان نے جب اس کی طرف رجوع کیا تو اسے خون جاری ہو گیا اور وہ مباشرت کے قابل نہ رہی۔ سلطان نے یہ سمجھا کہ یہ شرعی عذر ہے اس

۱۔ حمید قلندر، خیرالمجالس، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء ص ۵۲۔

۲۔ جوامع الکلم، ص ۱۳۴۔ "سربسر ہمہ افتراءاست"۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۵۲۔

ے اس نے چند دنوں تک توقف کیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان نے اس کنیز سے اس کی حالت کے متعلق دریافت کیا تو اس نے سلطان کو بتایا کہ یہ عذر معمول کے مطابق نہ تھا اور جونہی وہ واپس گیا' توں ہی جریان خون بند ہو گیا۔ سلطان نے جب دوبارہ اس کنیز کی طرف رجوع کا ارادہ کیا تو اچانک ہی اسے خون آنے لگا۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ جب بھی سلطان اس کنیز کی طرف متوجہ ہوتا اسی وقت اسے خون آنے لگتا۔ سلطان نے اطباء کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے دریافتِ حال کے بعد جواب دیا کہ اگر یہ مرض ہوتا تو وہ اس کا علاج کرتے لیکن امرِ غائب کے معاملے میں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا کسی صاحبِ دل سے رجوع کرنا چاہیے۔ ان دنوں لاہور میں خواجہ زکی تختیان گرؒ نامی ایک ولی اللہ رہتے تھے' سلطان نے سارا ماجرا ان کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ خواجہ صاحب نے کچھ دیر مراقبہ کیا اور جب مراقبہ سے سر اٹھایا تو فرمانے لگے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التتمش اولیائے اللہ میں سے ہے اور اللہ تعالٰی یہ نہیں چاہتا کہ وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو اور انہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کنیز سلطان کی حقیقی بہن ہے۔ جب خواجہ زکی تختیان گرؒ کا پیغام سلطان کو پہنچا تو اس نے اس کنیز کو طلب کیا اور اس کی جائے ولادت اور والدین کے نام دریافت کئے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ کنیز دراصل اس کی حقیقی بہن ہے۔[1]

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ سلطان شمس الدین التتمش ہر شبِ جمعہ بوڑھی اور غریب عورتوں کے گھروں میں جاتا اور ان میں سے ہر ایک کے سامنے چار پانچ تنکے اور چند سیر مٹھائی رکھتا اور ان کے قدموں میں گرتا اور کہتا کہ وہ ان کا غلام ہے اور وہ اس کی بی بیاں ہیں۔[2]

سلطانہ رضیہ

جوامع الکلم کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عصامی جیسے لوگوں نے سلطانہ رضیہ کے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا تھا وہ کامیاب ہو چکا تھا' اور حضرت گیسودرازؒ بھی اس سے متاثر ہو چکے تھے چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے سلطانہ رضیہ کے "ظلم و تعدی و بی ہنجاری" کا ذکر کیا ہے۔[3] حضرت گیسودرازؒ نے سلطانہ رضیہ کا عہد حکومت سات سال بتایا ہے جو صحیح نہیں۔[4] اس کا ہمعصر مورخ منہاج سراج جوزجانی لکھتا ہے کہ رضیہ کا عہدِ حکومت تین سال تھا۔[5]

---

۱ - ایضاً" ص ۲۶۸' ۲۶۹۔

۲ - جوامع الکلم' ص ۲۶۹۔ "وگفتی کہ من بندۂ شما ام و غلامِ شما ام' شما بیبیاں مائید"

۳ - ایضاً" ص ۲۰۸۔

۴ - ایضاً"۔

۵ - منہاج سراج جوزجانی' طبقاتِ ناصری' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء' ص ۹۹۔

سلطان علاء الدین

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں منگولوں نے دہلی پر حملہ کیا اور سلطان نے ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ انہی ایام میں سلطان نے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں ایک قاصد بھیجا اور ان سے التجا کی کہ وہ سلطان کی کامیابی کے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت نظام الدین نے سلطان کا پیغام ملتے ہی صوفیوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ آئیں مل کر خدا تعالیٰ سے مسلمانوں کی فتح کے لئے دعا کریں۔ حضرت نظام الدینؒ کے ارشاد کے مطابق تمام صوفی دعا میں مشغول ہو گئے۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت نظام الدینؒ بالا خانہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک صوفی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اس نے مسلمانوں کے لشکر میں ایک نوجوان کو گھوڑے پر سوار دیکھا ہے اور اسے یہ بتایا گیا ہے کہ اس لشکر کی کمان اس نوجوان کو سونپی گئی ہے اور اسی کی برکت سے مسلمانوں کو منگولوں سے نجات ملے گی۔ حضرت سلطان المشائخ نے اس صوفی سے پوچھا کہ اگر وہ اس نوجوان کو دیکھے تو کیا اسے پہچان لے گا؟ صوفی نے حضرت نظام الدینؒ کے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ اسی اثناء میں سلطان علاء الدین کا کاتب میاں ضیاء الدین فتح کی خوشخبری لے کر بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے حضرت نظام الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت سلطان المشائخ نے اس صوفی سے دریافت فرمایا کہ کیا یہ وہی نوجوان ہے؟ صوفی نے اسے دیکھ کر اثبات میں جواب دیا۔[1] یہ ضیاء الدین وہی شخص ہے جس نے حضرت نظام الدینؒ کی خانقاہ میں جماعت خانہ تعمیر کروایا تھا۔[2]

سلطان علاء الدین کے عہد میں ملک کمال الدین گرگ جالور کا مقطع تھا۔ وہ خود تو دربار میں رہتا تھا لیکن جالور میں اس کی نیابت ایک متصرف کرتا تھا۔ ایک بار سلطان علاء الدین اس متصرف سے کسی بات پر ناراض ہوا اور اس نے اس کی آنکھیں نکلوانے کا ارادہ کیا۔ سلطان نے اپنے ارادے کا اظہار ملک کمال الدین سے کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ جو اس کے جی میں آئے کرے۔ سلطان نے ایک شخص کو متصرف کی آنکھیں نکالنے پر مامور کیا اور اسے اس کا فرمان دے کر جالور روانہ کیا۔

سلطان کا قاصد جب جالور پہنچا تو متصرف نے حسبِ دستور شاہی فرمان کی تعظیم کی اور قاصد کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ جب قاصد نے سلطان کے حکم کے مطابق اس کی آنکھیں نکالنے کا ارادہ کیا تو اچانک اس کی نظر متصرف کی ٹوپی پر پڑی۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ

---

۱ ۔ جوامع الکلم، ص ۱۶۰۔

۲ ۔ [illegible]

اب تو خراسانیوں نے ایک قدیم رسم توڑ دی ہے۔ لیکن اس زمانے میں دہلی والوں کی یہ عادت تھی کہ جب تک وہ کسی بزرگ کے مرید نہیں ہو جاتے تھے اس وقت تک سر پر ٹوپی نہیں پہنتے تھے۔ قاصد نے متصرف سے اس ٹوپی کے متعلق استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ حضرت سلطان المشائخ کا مرید ہے اور یہ انہیں کی ٹوپی ہے۔ اتفاق سے قاصد خود بھی حضرت سلطان المشائخ کا مرید تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ جس شخص کے سر پر اس کے مرشد کی ٹوپی ہو وہ اس شخص کے ساتھ ایسا ناروا سلوک نہیں کر سکتا۔ ادھر وہ شاہی حکم کے تحت متصرف کی آنکھیں نکالنے پر مامور تھا۔ اسی ذہنی کشمکش میں اس کی پریشانی روزبروز بڑھتی جاتی تھی کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایک دن متصرف نے اس کی پریشانی کا سبب پوچھا تو اس نے سلطان کا فرمان اسے دکھایا۔ فرمان دیکھ کر متصرف نے پوچھا کہ پھر دیر کس بات کی ہے؟ اسے چاہئے کہ سلطان کے حکم کی تعمیل کرے ورنہ وہ اس کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر ڈالے گا۔ قاصد نے کہا کہ جس شخص کے سر پر اس کے شیخ کی ٹوپی ہو وہ اس کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک نہیں کر سکتا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ آئیے ہم مل کر دہلی چلتے ہیں۔

حضرت گیسودراز فرماتے ہیں کہ ادھر وہ دہلی کی طرف روانہ ہوئے ادھر سلطان علاء الدین کے دل میں یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ متصرف بے گناہ ہے۔ اس کی آنکھیں نہیں نکالنا چاہئیں تھیں۔ اس نے ملک کمال الدین گرگ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ وہ اس مصیبت سے بچ گیا ہو گا اور ایک دو روز میں حاضرِ خدمت ہو جائے گا۔

ادھر وہ دونوں دہلی پہنچے اور سیدھے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قاصد نے سارا ماجرا ان کے گوش گزار کیا تو وہ بے حد مسرور ہوئے اور متصرف کی سلامتی کے لئے فاتحہ پڑھی' یہ دونوں برادرانِ طریقت حضرت سلطان المشائخ سے رخصت لے کر دربار کی طرف روانہ ہوئے اور جب دربار کے قریب پہنچے تو ان کی مڈبھیڑ ملک کمال الدین گرگ سے ہوئی۔ ملک کمال الدین گرگ انہیں دیکھتے ہی سلطان کی خدمت میں پہنچا اور کہنے لگا کہ سلطان کی کرامت ظاہر ہو گئی ہے اور وہ متصرف صحیح سلامت یہاں پہنچ گیا ہے۔ سلطان نے ان دونوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے پوری کیفیت سنی اور بے حد خوش ہوا۔ حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ سلطان نے متصرف کو خلعت سے نوازا اور قاصد کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔[۱] اس واقعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سلطان کے دل میں حضرت سلطان المشائخ کی بڑی عزت تھی ورنہ وہ حکم عدولی کی بنا پر قاصد کو ضرور سزا دیتا۔

حضرت چراغ دہلیؒ کے ملفوظات خیرالمجالس میں سلطان علاء الدین کے بارے میں بڑے اچھے

۱۔ جوامع الکلم' ص ۱۳۶' ۳۷۔

ریمارکس ملتے ہیں۔[1] لیکن ان کے برعکس جوامع الکلم میں اس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ وہ مروان کی طرح بادشاہ کو نبی سے افضل سمجھتا تھا لیکن مسلمانوں کے خوف سے اس خیال کا اظہار صرف اپنے خواص میں ہی کرتا تھا۔[2] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت گیسودرازؒ کے عہد میں علاء الدین کے خلاف ضیاء الدین برنی کا پراپیگنڈہ کامیاب ہو چکا تھا اور وہ خواص کو یہ باور کرا چکا تھا کہ سلطان علاء الدین بڑا بے دین بادشاہ تھا اور وہ اپنے چار یاروں کی مدد سے نیا دین جاری کرنا چاہتا تھا۔[3] حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات میں کئی موقعوں پر برنی کی تاریخ فیروز شاہی کا ذکر آیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کے مطالعہ میں رہتی تھی۔ اس لئے برنی انہیں اس بات کا یقین دلا چکا تھا کہ سلطان علاء الدین بڑا بدعقیدہ شخص تھا۔

خسرو خان

خسرو خان نومسلم سلطان قطب الدین مبارک خلجی کا منظور نظر تھا اور اس نے رفتہ رفتہ اختیار حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر سلطان کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ خسرو خان چونکہ غاصب اور خواجہ کش تھا اس لئے اس نے دارالحکومت کے صوفیاء اور مشائخ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں بڑی بڑی رقمیں بطور نذر پیش کیں۔ حضرت گیسو درازؒ کی روایت ہے کہ خسرو خان نے اس موقعہ پر ایک لاکھ تنکے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں بھجوائے اور ان کے کمترین خادموں کو فی کس دس ہزار تنکے دیئے۔[4]

محمد بن تغلق

سلطان محمد بن تغلق نے تخت نشینی کے بعد اس طرح کی حکمتِ عملی اختیار کی کہ اس کے ہمعصر مشائخ اس سے ناراض ہو گئے۔ سلطان یہ چاہتا تھا کہ انہیں خانقاہوں سے نکال کر اہم عہدوں پر فائز کرے لیکن مشائخ کرام سرکاری ملازمت اختیار کرنے پر کسی صورت بھی رضامند نہ ہوتے تھے۔ مشائخ کے انکار پر سلطان نے ان پر بیجا سختی برتنا شروع کی اور بعض مشائخ کو چار و ناچار بعض عہدے سنبھالنے پڑے۔ حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشائخ سلطان کے خوف سے اپنی خانقاہوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے تھے اور کسی میں یہ ہمت اور جرأت باقی نہ رہی تھی کہ وہ دعوئ شیخی کرتا۔[5]

---

۱ ۔ حمید قلندر، خیرالمجالس، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء، ص ۲۴۱ - ۲۴۲۔
۲ ۔ جوامع الکلم، ص ۱۷۵۔
۳ ۔ ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، حصہ دوم، ص ۹۳۔
۴ ۔ جوامع الکلم، ص ۲۴۱۔
۵ ۔ جوامع الکلم، ص ۲۴۹۔ "دران ایام ہرجاکہ صالحی است درے بستہ و لبے بستہ درخانہ افتادہ است۔"

حضرت گیسودرازؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ظلم کی وجہ سے ملک تباہ و برباد ہو جاتے ہیں[1] اور اس ضمن میں غالباً" آپ کا اشارہ سلطان محمد بن تغلق کی طرف تھا کیونکہ اس نے اپنے عہد میں مشائخ اور عوام پر بڑے بڑے مظالم ڈھائے اور اسی وجہ سے ملک تباہ و برباد ہوا۔

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مرشد خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے بھانجے مولانا کمال الدین نے یہ واقعہ بیان کیا کہ نصف شب کا وقت تھا کہ وہ قتلغ خان کے بھائی قاضی شمس الدین سے بزدوی کا سبق لے رہے تھے کہ اچانک ہی قاضی صاحب کو قتلغ خان نے بلا بھیجا۔ قاضی صاحب نے چلتے وقت انہیں مخاطب کر کے کہا کہ وہ وہیں ان کا انتظار کریں بقیہ سبق وہ آ کر پڑھائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد جب قاضی صاحب واپس تشریف لائے تو انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ انہوں نے فرمایا کہ قتلغ خان کو سلطان محمد بن تغلق نے بے وقت اپنے حضور میں طلب کیا اور جب وہ شاہی محل میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ سلطان تاریکی میں بیٹھا ہوا ہے۔ قتلغ خان معمول کے مطابق آداب بجا لایا اور تاریکی میں ہی بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ سلطان غالباً" اس کے کسی بھائی یا رشتے دار کو قتل کرنا چاہتا ہے اور وہ یکایک اس پر یہ بات ظاہر کرنا نہیں چاہتا' اس لئے آغاز گفتگو میں تأمل کر رہا ہے۔ اچانک ہی سلطان نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر نہ تھے بلکہ وہ خود پیغمبر ہے تو وہ اسے کس دلیل سے جھٹلائے گا۔ قتلغ خان نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر اس نے کوئی حجت پیش کی تو سلطان بھی جواب میں حجت پیش کرے گا اور یوں بات طول پکڑ جائے گی اور اس فن میں جو قدرت سلطان کو حاصل ہے وہ اسے میسر نہیں۔ لہٰذا اس نے عرض کیا کہ ایسے حرام زادے' دیوانے' احمق' بدبخت اور بے دولت کے لئے کسی حجت کی ضرورت نہیں۔ سلطان کے اقبال سے دہلی میں اسلام اس قدر قوی ہے کہ بھٹیاروں کے غلام پاپوں کے ساتھ ہی اس کا تیاپانچا کر دیں گے۔ سلطان نے قتلغ خان کی بات سن کر سر جھکا لیا اور اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ قاضی شمس الدین فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بھائی سے سوال کیا کہ اگر واقعی وہ بدبخت ایسا دعویٰ کرتا تو پھر وہ کیا کرتا؟ قتلغ خان نے جواب دیا کہ سب سے پہلے وہ سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا۔[2]

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ سلطان محمد بن تغلق' قتلغ خان' ملک منصور اور ملک سعد منصور کے والد کا بڑا احترام کیا کرتا تھا اور ایک بار ان کی موجودگی میں کہنے لگا کہ ابوبکرؓ' عمرؓ' عثمانؓ اور علیؓ نے ایسا کیا کام کیا ہے جو وہ نہیں کر سکتا؟ ملک منصور نے جواب دیا کہ وہ پاک

---

۱ - ایضاً" ص ۲۲۔
۲ - ایضاً" ص ۱۷۵۔

لوگ تھے' حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ ملک منصور دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ پلید ہے۔ سلطان نے اس روز ملک منصور کو بہت بُرا بھلا کہا اور وہ خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔ حضرت گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ سلطان ایسے ہی خیالات کی بنا پر علماء' مشائخ' سادات اور دیندار لوگوں کو قتل کروا دیتا تھا' اس سے سلطان کا دراصل یہ مقصد تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو' جن کے دل میں دین کی عظمت ہے' ختم کر دے اور ہندوؤں اور ان کے غلاموں کو اپنے گرد جمع کر لے اور پھر جو کچھ وہ کہے وہ اس پر صاد کر دیا کریں۔[۱]

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ وہ ایسے ہی منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے جہنم رسید ہوا۔[۲] جب سلطان کا وقت آخر آیا تو ملک الموت نے خدا کے حضور میں عرض کی۔ "اے خداوندا! میں نے بڑے بڑے کافروں' فاسقوں اور بدبختوں کی رُوحیں قبض کی ہیں لیکن جو بُو اس بدبخت کے منہ سے آ رہی ہے وہ مجھے اس کے نزدیک جانے سے روک رہی ہے۔" ملک الموت کی درخواست سن کر خدا تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ اس کی رُوح قبض کرے۔[۳]

حضرت گیسودرازؒ کی زبانی یہ واقعہ سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ مشائخ کرام کے دل میں سلطان محمد بن تغلق کے خلاف بڑے شدید جذبات پائے جاتے تھے اور جب تک وہ اپنی مجالس میں اس کی مذمت نہیں کر لیتے تھے اس وقت تک چین نہیں لیتے تھے۔

ایک بار حضرت گیسودرازؒ نے باتوں باتوں میں یہ فرمایا کہ سلطان محمد بن تغلق نے حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کو بہت ایذا پہنچائی اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ اس کا ذکر ملال کا موجب ہو گا۔[۴]

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ حضرت برہان الدین غریبؒ فرمایا کرتے تھے کہ سلطان محمد بن تغلق نے حضرت چراغ دہلیؒ کی بڑی بے ادبی کی اور وہ ہمیشہ خاموش رہے۔ بعدازاں انہوں نے فرمایا کہ مولانا نصیرالدین چراغ دہلیؒ بڑے حلیم اور کریم تھے ورنہ اگر وہ چاہتے تو سلطان کا تمام لشکر اور ہاتھی گھوڑے زمین نگل جاتی اور ڈکار بھی نہ لیتی۔[۵]

مشہور سیاح ابن بطوطہ سلطان محمد بن تغلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسے گنگا جل بڑا مرغوب تھا اور دولت آباد میں قیام کے دوران اسے بذریعہ ڈاک چوکی گنگا جل برابر ملتا رہتا

۱۔ ایضاً"" ص ۱۷۶۔
۲۔ ایضاً" "در دوزخ رفت۔"
۳۔ ایضاً"۔
۴۔ ایضاً" ص ۱۰۶۔
۵۔ ایضاً"۔ ص ۲۴۰۔

تھا۔ راقم الحروف ابن بطوطہ کا یہ بیان پڑھ کر حیران ہوا کہ سلطان محمد بن تغلق جیسے علوم اسلامیہ کے ماہر' ہدایہ اور قرآن مجید کے حافظ[۲] اور صوم و صلوٰۃ کے پابند شخص کو بھلا گنگا جل کے ساتھ کیا عقیدت ہو سکتی ہے؟ راقم الحروف کئی سال تک اسی شش و پنج میں رہا اور یہ گتھی کسی طرح سے بھی سلجھنے میں نہ آتی تھی۔ گزشتہ سال جب راقم الحروف نے جوامع الکلم کا مطالعہ شروع کیا تو اسے ایک ایسی روایت مل گئی جس سے اس کی مکمل تشفی ہو گئی۔

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے احباب کے ساتھ چہل قدمی کے لئے دریائے جمنا کی طرف نکل گئے۔ آپ احباب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ اچانک آپ کی نظر ایک خاتون پر پڑی جو دریا کے قریب ایک کنوئیں سے بمشکل پانی کا ڈول کھینچ رہی تھی۔ حضرت سلطان المشائخ نے دیکھا کہ اس عورت کے چہرہ پر مردنی سی چھائی ہوئی ہے اور وہ بڑی کمزور اور بیمار نظر آتی ہے۔ انہوں نے اس عورت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تو جو اتنی محنت اور تکلیف کے ساتھ کنوئیں سے پانی نکال رہی ہے' دریا سے پانی کیوں نہیں بھر لیتی؟ ان کی گفتگو سن کر اس عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے عرض کیا کہ اس کا خاوند بیمار ہے اور کافی عرصہ سے بے کار ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور گھر میں کھانے کے لئے کوئی چیز موجود نہیں۔ اگر وہ انہیں دریا کا پانی پلاتی ہے تو انہیں بھوک زیادہ ستانے لگتی ہے۔ اس لئے وہ اس کنوئیں کا پانی بھر کر لے جاتی ہے کیونکہ اس کے پینے سے انہیں بھوک نہیں لگتی۔ اس عورت کی باتیں سن کر حضرت سلطان المشائخ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ جب تک اس کا خاوند صحت یاب اور برسر روزگار نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہر ماہ اس کے گھر میں کھانے پینے کا سامان دے آیا کرے۔[۳]

جوامع الکلم کی اس روایت کو پڑھ کر یہ معلوم ہوا کہ دریائے جمنا اور گنگا کا پانی بڑا ہاضم ہے اور سلطان محمد بن تغلق چونکہ ایک ماہر طبیب بھی تھا اس لئے وہ صرف طبی نقطۂ نظر سے ہی گنگا جل پیتا اور اسے اتنی دور سے منگوانے کا انتظام کرتا تھا' ورنہ اس جیسے عالم اور متدین شخص کو بھلا گنگا جل سے کیا عقیدت ہو سکتی تھی؟

ایک بار حضرت گیسودرازؒ علم نجوم کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے کہ باتوں باتوں میں انہوں نے فرمایا کہ جب سلطان محمد بن تغلق آخری بار دہلی سے نکلا تو نجومیوں نے یہ پیش گوئی کی کہ وہ زندہ دہلی نہیں لوٹے گا۔[۴]

۱۔ ابن بطوطہ۔ رحلہ' مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۲ھ' ج ۲ ص ۳۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سرمایہ عمر' ص ۶۴۔

۲۔ شہاب الدین العمری' مسالک الابصار' انگریزی ترجمہ' مطبوعہ علی گڑھ' ص ۳۷۔

۳۔ جوامع الکلم' ص ۱۲۳۔ ۴۔ ایضاً' ص ۲۱۔

سلطان فیروز تغلق

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں سلطان فیروز تغلق جاج نگر کی جانب گیا تو کاہنوں اور درویشوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ وہ زندہ واپس نہیں آئے گا۔ حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ سلطان تک ان کا یہ پیغام پہنچا دیں کہ رات کو سوتے وقت چار من روٹیاں اپنے سرہانے رکھ لیا کرے اور علی الصبح انہیں فقیروں اور محتاجوں میں بانٹ دیا کرے۔ انشاء اللہ وہ بخیر و سلامت دارالحکومت پہنچ جائے گا۔[1]

جوامع الکلم کی روایت ہے کہ ایک بار سلطان فیروز شاہ تغلق، تاتار خان کی معیت میں حضرت چراغ دہلیؒ سے ملنے آیا۔ اس وقت حضرت اپنے بالاخانہ میں قیلولہ فرما رہے تھے، سلطان ان کے انتظار میں صحنِ خانقاہ میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں بارش برسنے لگی لیکن سلطان اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کچھ دیر بعد مولانا زین العابدین[2] ادھر آ نکلے اور انہوں نے حضرت چراغ دہلی کو سلطان کی آمد سے مطلع کیا۔ حضرت نے وضو کر کے دوگانہ ادا کیا اور پھر نیچے اترے۔ اس تمام عرصے میں سلطان صحن میں کھڑا رہا۔ حضرت کی بے نیازی دیکھ کر سلطان نے تاتار خان سے کہا کہ ہم بادشاہ نہیں ہیں۔ بادشاہ تو یہ بزرگ ہیں، اتنی دیر میں بارش تھم چکی تھی۔ خدام نے صحن میں فرش بچھا دیا اور حضرت نے اسی پر سلطان کو بٹھایا۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ سلطان تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر رنجیدہ خاطر ہو کر واپس چلا گیا۔[3]

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان کا فرزند فیروز خان، اپنے باپ سے شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کی زیارت کی اجازت لے کر ان سے ملنے آیا۔ جب شہزادہ حضرت کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس کے ایک معتمد حاتم نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ شہزادہ ان کا مرید ہونا چاہتا ہے۔ حضرت نے استفسار فرمایا کہ وہ اس کی اجازت بھی لے آیا ہے یا نہیں؟ حاتم نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت نے شہزادے کو مرید کر لیا۔ اتنے میں خادموں نے فردا فردا'' شہزادے کے کان میں چند باتیں کیں اور وہ ایک عورت کو جس کے ساتھ وہ عشق میں مبتلا تھا، لے کر ایک بوسیدہ چھپر کے نیچے چلا گیا اور وہاں اس کے ساتھ نازیبا حرکت کی۔ جب شام ہو گئی اور شہزادہ واپس نہ لوٹا تو سلطان نے اس کی تلاش شروع کی اور شہزادے کی تلاش

---

۱ - ایضاً''۔

۲ - ہمارے خیال میں یہاں زین العابدین کی بجائے زین الدین ہونا چاہیے۔

۳ - ایضاً'' ص ۲۲۰۔

میں ایک شخص حضرت چراغ دہلیؒ کی خانقاہ میں بھی آیا۔ حضرت نے اسے بتایا کہ شہزادہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں آیا تھا پھر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ شہزادے کی گمشدگی کی خبر سے خانقاہ میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ سلطان نے جب حاتم اور ایک خواجہ سرا کو پڑوایا تو انہوں نے اپنی جانیں بچانے کے ئے حضرت پر یہ الزام عائد کیا کہ انہوں نے شہزادے کو ایک تعویذ دیا ہے اور اسے یقین دلایا ہے کہ وہ بادشاہ ہو جائے گا۔ اتفاق سے تین دن کے بعد شہزادہ مل گیا تو سلطان نے اسے مہانہ بھیج دیا اور بعد ازاں اسے زہر دلوا دی۔[۱]

امنِ عامہ

عہدِ سلطنت کے تاریخ دان لکھتے ہیں کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد تک دہلی میواتیوں کی دستبرد سے محفوظ نہ تھی اور ان کے خوف سے نمازِ عصر کے بعد ہی شہر کے دروازے بند کر دیئے جاتے تھے۔ سلاطینِ دہلی نے کئی بار میواتیوں کی سرکوبی کے لئے مہمیں بھیجیں لیکن وہ شہر کے گردونواح میں موجود جنگلوں میں جا چھپتے اور جب شاہی لشکر واپس لوٹ جاتے تو وہ دوبارہ اپنی سرگرمیاں تیز کر دیتے۔

ضیاء الدین برنی نے بلبن کا ایک کارنامہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے میواتیوں کو سخت سزائیں دیں اور دہلی کے گردونواح میں جن جنگلوں میں ان کی کمین گاہیں تھیں' انہیں صاف کروا دیا اور اس طرح ان کے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہ رہی اور یوں اہالیانِ دہلی نے میواتیوں کے حملوں اور لوٹ مار سے نجات پائی۔[۲]

حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں بھی دہلی کے لوگ میواتیوں کے حملوں سے محفوظ نہ تھے اور ان کے خوف سے کوئی شخص نمازِ عصر کے بعد شہر سے باہر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔[۳]

جوامع الکلم کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کی خدمت میں مریضوں کے خویش و اقارب دعائے صحت کرانے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بیماریاں عام تھیں اور خاص طور پر نچلے طبقے کے لوگ متعدد قسم کی امراض میں مبتلا تھے۔ حضرت گیسودرازؒ نے ایک موقعہ پر دِق کی ایک مریضہ کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے گھر کے نزدیک ہی قیام پذیر وہ گئے

---

۱ - ایضاً" ص ۲۱۹- ۲۲۰-
۲ - ضیاء الدین برنی' تاریخِ فیروز شاہی' مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء' حصہ اول' ص ۶۶-
۳ - جوامع الکلم' ص ۲۴۹- "دران ایام میواں می آمدند میزدند میبردند بعد نمازِ دیگر بالای حوضِ سلطان کسی نمی باشد' ہمہ درون شہر می آیند-" ۴ - ایضاً" ص ۱۳-

ایک موقعہ پر حضرت گیسودرازؒ اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دہلی میں ایسی وبا پھوٹی کہ غسال مردوں کو غسل دیتے دیتے تھک جاتے تھے اور انہیں مردوں کے اتنے کپڑے، استعمال کی چیزیں اور چارپائیاں ملتی تھیں کہ انہوں نے بالآخر تنگ آ کر انہیں ہاتھ لگانا ہی چھوڑ دیا تھا۔[۱]

جوامع الکلم سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خُلّہ نامی ایک بیماری عام تھی۔ اس مرض میں مبتلا مریض کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے جسم میں سوئیاں چبھوئی جا رہی ہوں۔

قحط سالی

جوامع الکلم میں کئی موقعوں پر امساکِ باراں کا ذکر آیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بارش کی کمی کی وجہ سے زراعت پر بُرا اثر پڑ رہا تھا اور اشیائے خورونوش گراں ہو گئی تھیں۔

حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات میں کئی موقعوں پر گرانیٔ غلہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ بات تو عام فہم ہے کہ امساکِ باراں کی وجہ سے فصلوں پر بُرا اثر پڑتا تھا جس کی وجہ سے پیداوار میں کمی ہو جاتی تھی اور اس کے نتیجے میں غلہ گراں ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی ملک میں اس طرح کے سیاسی واقعات بھی رُونما ہو جاتے تھے جن کی وجہ سے اناج کا بھاؤ تیز ہو جاتا تھا۔

سلطان محمد بن تغلق کے آخری ایامِ حکومت میں اس کے کئی گورنروں نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور سلطان کے آخری ایامِ حیات ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں ہی صرف ہوئے۔ جب طغی نامی ایک باغی کا تعاقب کرتے ہوئے سلطان محمد بن تغلق نے ٹھٹھہ کے نواح میں وفات پائی تو اس کے لشکر میں موجود علماء، صوفیاء اور عمائدینِ سلطنت نے باہمی مشورے سے سلطانِ مرحوم کے چچازاد بھائی فیروز تغلق کو تخت پر بٹھا دیا۔[۲] سلطان محمد بن تغلق کی وفات کی خبر جب دہلی پہنچی تو سلطان مرحوم کے وزیر خواجۂ جہاں نے ایک کمسن بچے کو سلطانِ مرحوم کا بیٹا ظاہر کر کے تخت پر بٹھا دیا اور تمام اختیاراتِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیے۔[۳] خواجۂ جہاں نے اپنا اقتدار محفوظ رکھنے کی خاطر فیروز تغلق کی مخالفت شروع کر دی لیکن سلطان فیروز تغلق کے وفادار سرداروں نے خواجۂ جہاں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ سلطان اور وزیر کے درمیان چپقلش کا اثر ملک کی اقتصادیات پر بھی پڑا اور حضرت گیسودرازؒ اس کے راوی ہیں کہ

---

۱ - ایضاً، ص ۲۹۳۔
۲ - شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۳۸ء، ص ۳۷۔
۳ - ایضاً، ص ۴۲۔

اس چپقلش کے دوران اناج کا بھاؤ بڑھ گیا تھا اور ایک سیر غلہ چھ جیتل کے عوض فروخت ہونے لگا تھا۔[۱] حضرت گیسودرازؒ نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ ان کے زمانے میں سیر تینتیس تنکوں کے برابر ہوتا تھا۔[۲]

غلاموں کی خرید و فروخت

حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ دہلی میں غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کے کئی مراکز موجود تھے اور سوداگر دُور دُور سے لونڈی، غلام لا کر دہلی میں فروخت کیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے گھر کے نزدیک "اندرونِ دروازۂ پالم" ایک ایسے ہی مرکز کا ذکر فرمایا ہے جہاں ایک بردہ فروش لونڈیوں اور غلاموں کی تجارت کیا کرتا تھا۔[۳] اگرچہ ازرُوئے شریعت کنیزوں کے ساتھ مباشرت جائز ہے لیکن حضرت گیسودرازؒ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ کنیزیں بچے جنیں۔ آپ نے ایک مجلس میں جو ۲۴ ماہ شعبان ۸۰۲ھ کو منعقد ہوئی اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔[۴] حضرت گیسودرازؒ سے پہلے سلطان فیروز تغلق بھی اس پر ناگواری کا اظہار کر چکا تھا اور اس نے "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں اپنی جن اصلاحات کا فخر کے ساتھ اظہار کیا ہے ان میں ایک اصلاح یہ بھی تھی کہ مالک فقط انہی لونڈیوں سے اولاد پیدا کریں جو جائز طریقے سے ان کے قبضہ میں آئی ہوں۔[۵]

تصوف کا انحطاط

جوامع الکلم کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت گیسودرازؒ کے زمانہ میں برعظیم پاک و ہند میں تصوف کا زوال شروع ہو چکا تھا اور نحو پر سُکر غالب آنے لگا تھا۔ جوامع الکلم سے ملک میں مجاذیب کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔[۶]

جوامع الکلم کے مطالعہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ علماء نے وحدت الوجود کے سیلاب کو روکنے کے لئے جو بند باندھے تھے، ان میں اب دراڑیں پڑنے لگیں تھیں اور خواص و عوام

---

۱ - جوامع الکلم، ص ۱۰۳۔
۲ - ایضاً، ص ۸۷۔
۳ - ایضاً، ص ۱۳۔
۴ - ایضاً، ۱۰۷۔
۵ - فیروز تغلق، فتوحاتِ فیروز شاہی، مشمولہ تاریخی مقالات، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۱۸۶۔
۶ - جوامع الکلم، ص ۵۳۔

وَحدتُ الوجود کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات میں کئی موقعوں پر شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کا ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت گیسودرازؒ ان کے خیالات سے بے حد متاثر تھے اور ان کے زیرِ اثر ہی آپ نے فصوص الحکم کی شرح قلبند کی تھی۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ برِعظیم پاک و ہند میں وَحدتُ الوجود کے نظریہ کو عام کرنے میں حضرت گیسودرازؒ نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

جوامع الکلم کے اندراجات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شیخ جمال الدین مغربی نام کے ایک بزرگ کو، جو جامع ملفوظات کے پرنانا تھے، فصوص الحکم پر بڑی دسترس تھی اور انہوں نے بھی اس کی ایک شرح لکھی تھی۔ا

پیرزادوں کی مذمت

حضرت گیسودرازؒ ایسے پیروں کے سخت خلاف تھے جو اپنی دکانداری چلانے کے لئے آباؤ اجداد کی مَسندوں پر براجمان ہو جاتے تھے۔ آپ نے ان پیرزادوں کی بڑی مذمت کی ہے جو اپنے والد کی آنکھیں بند کرتے ہی اُن کی مَسند پر بیٹھ کر شیخ بن جاتے ہیں اور لوگوں سے ٹکے وصول کرتے ہیں۔۲

دہلی میں جُوگیوں کی مَوجودگی

جوامع الکلم میں کئی موقعوں پر جوگیوں کا ذکر آیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت گیسودرازؒ نے بڑی دلچسپ حکایتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ دہلی کے ابتدائی دور میں برِعظیم میں جادو ٹونے کا بڑا رواج تھا اور لوگ اپنے مخالفین کو تنگ کرنے کے لئے جوگیوں اور جادوگروں سے کئی طرح کے عمل کروایا کرتے تھے۔ حضرت گیسودرازؒ بیان فرماتے ہیں کہ اَجودھن میں شہاب ساحر کے بیٹے نے حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ پر جادو کر دیا جس کی وجہ سے انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے جسم میں سوئیاں چھبوئی جا رہی ہوں۔ بابا صاحب نے حضرت نظام الدین اولیاء کو بلا کر اَجودھن کے قبرستان میں شہاب ساحر کی قبر کا پتہ دیا اور انہوں نے وہاں جا کر جب ایک عمل کیا تو ایک رُوح متمثل ہو کر ان کے سامنے آئی اور اس نے ایک جگہ کی نشاندہی کی اور جب حضرت نظام الدینؒ نے وہاں سے مٹی ہٹائی تو وہاں سے آٹے کا بنا ہوا ایک پُتلا برآمد ہوا جس میں جا بجا سوئیاں پیوست تھیں۔ حضرت نظام الدین وہ پُتلا اٹھا کر بابا صاحب کے پاس لے آئے اور جوں جوں وہ پُتلے میں سے سوئیاں نکالتے گئے توں توں بابا صاحب کو آرام آتا گیا۔۳ حضرت نظام الدین نے بھی بابا صاحب پر جادو کرنے کا واقعہ بیان

---

۱ - ایضاً، ص ۱۴۳۔

۲ - ایضاً، ص ۳۶۔

۳ - جوامع الکلم، ص ۳۹۔

فرمایا ہے۔[۱]

حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر بھی کسی ساحر نے جادو کر دیا تھا اور انہیں بھی اپنے جسم میں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنے خدام کو بلا کر ایک جگہ نشاندہی کی اور جب ان کے خدام نے وہاں جا کر مٹی ہٹائی تو ایک پتلا برآمد ہوا جس میں جابجا سوئیاں پیوست تھیں۔ خدام وہ پتلا لے کر حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جوں جوں وہ پتلے سے سوئیاں نکالتے جاتے تھے، حضرت کو آرام آتا جاتا تھا۔ جوامع الکلم کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گیسودرازؒ پر بھی کسی نے جادو کر دیا تھا۔[۲] جب اس پایہ کے بزرگ بھی جادوگروں کے عمل سے محفوظ نہ تھے، تو غریب عوام کی کیا حالت ہوگی؟

حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عوام جوگیوں کے گرویدہ ہو رہے تھے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ رقمطراز ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کو بھی جوگیوں کی صحبت بے حد مرغوب تھی اور وہ اپنا کافی وقت ان کی صحبت میں گذارتا تھا۔[۳] الناس علی دین ملوکھم کے مصداق عوام بھی فرمانرواؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جوگیوں سے مسائل دریافت کرنے اور خاص طور پر کیمیا گری سیکھنے کے لئے رجوع کیا کرتے تھے۔[۴]

علم نجوم

سلطان فیروز تغلق نے جب کانگڑہ فتح کیا تو وہاں سے سنسکرت کی اندازاً" تیرہ سو کتابیں اس کے ہاتھ لگیں۔ سلطان فیروز تغلق کو علم نجوم سے کافی دلچسپی تھی۔ اس نے علم نجوم پر سنسکرت کی چند کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا جس سے مسلمانوں میں علم نجوم کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ حضرت گیسودرازؒ کی اہلیہ کے نانا مولانا جمال الدین علم نجوم میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور وہ پیش گوئیاں کرتے رہتے تھے۔[۵]

۱۔ امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۲۹۹۔

۲ ۔ جوامع الکلم، ص ۱۳۸۔

۳ ۔ ابن بطوطہ، رحلہ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۲ھ، ص ۱۲۳۔ "والسلطان یعظمھم و یجالسھم۔"

۴ ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، سرمایہ عمر، ص ۶۳۔

۵ ۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۹۹۔

حضرت گیسودرازؒ اور شعر و شاعری

حضرت گیسودرازؒ بڑے اچھے شاعر تھے اور ان کا دیوان اُنیسُ العشاق کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود وہ شاعری کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ جوامع الکلم میں صاحبزادہ محمد اکبر حسینی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بلند مرتبہ شخص کے لئے شعر گوئی سے زیادہ خوار کرنے والی اور کوئی چیز نہیں۔[۱]

جمعِ مال

چشتیہ سلسلہ کے بزرگ خود کو علائق دنیاوی سے حتی الوسع آزاد رکھتے تھے۔ تاریخ کے صفحات اس بات پر شاہد ہیں کہ سلاطین نے متعدد موقعوں پر ان بزرگوں سے التجا کی کہ وہ جاگیر یا وظیفہ قبول کر لیں۔ لیکن ان بزرگوں نے ہمیشہ شاہی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے مسلک کے برعکس سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ مال و دولت سے بڑی رغبت رکھتے تھے اور یہ بات چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی نظروں میں ہمیشہ کھٹکتی رہتی تھی۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ مشائخ ملتان نے مال جمع کرنے پر کمرِ ہمت باندھی ہوئی ہے اور وہ تجارت اور سوداگری میں دلچسپی لیتے ہیں لیکن ہمارے (چشتی) بزرگ دنیاوی اسباب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔[۲]

حضرت سلطان التارکین صوفی حمیدالدین ناگوریؒ کو حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے مال جمع کرنے اور پاس رکھنے پر بڑا اعتراض تھا اور ان دونوں بزرگوں میں اس موضوع پر باقاعدہ خط و کتابت رہتی تھی۔[۳] اتفاق سے یہ خط و کتابت ایک مخطوطہ کی صورت میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ جب حضرت سلطان التارکینؒ نے حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے مال جمع کرنے پر اعتراض کیا تو انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے دنیا کے تمام مال و دولت کے متعلق فرمایا ہے۔ قل متاع الدنیا قلیل، اب اس قلیل میں سے جو تھوڑا بہت میرے حصہ میں آیا ہے، آپ کو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔[۴] اس کے بعد حضرت زکریاؒ نے ان کے خطوں کے جواب لکھنے بند کر دیئے۔

---

۱ - جوامع الکلم، ص ۱۷۲۔ "ہیچ چیز مرد بلند مرتبہ را خوار کنندہ تر از گفتن شعر نیست۔"
۲ - ایضاً، ص ۲۱۳۔
۳ - شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۷ - ۲۳۶۔
۴ - رسائل سلطان التارکین، مخطوط مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، نمبر ۲۱ / ۱۲۱ فارسی تصوف، ورق ۸۶۔

حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ بڑے مالدار تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے ایک کروڑ اسی لاکھ ٹنکے ترکہ میں چھوڑے۔[۱] ایک دوسرے موقع پر حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی وفات کے بعد ان کے گھر سے نومن سونا نکلا تھا۔[۲] حضرت بہاء الدین زکریا کے پوتے حضرت رکن عالمؒ کی امارت کا یہ عالم تھا کہ ان کی اہلیہ محترمہ جو جوتا پہنتی تھیں اس کی مالیت اسی ہزار ٹنکوں سے کم نہیں ہوتی تھی اور اگر کوئی شخص اس پر اعتراض کرتا تو حضرت رکن عالمؒ جواب میں فرماتے۔[۳]

"عورات رامباح است باکی نیست"

حضرت گیسودرازؒ مشائخ ملتان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ بڑے معزز تھے اور بہت کم کسی کے احترام کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔[۴]

یہ عجیب بات ہے کہ آج تک لوگ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کو مال اکٹھا کرنے کا طعنہ دے رہے ہیں لیکن وہ اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ موصوف جُود و بخشش میں بھی بڑے دریا دل واقع ہوئے تھے حضرت گیسودراز فرماتے ہیں کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے ایک شخص کو غلے کا ایک انبار مرمت فرمایا تو جب وہ شخص غلہ اٹھانے لگا تو اس میں سے ٹنکوں سے بھرا ہوا ایک برتن برآمد ہوا۔ وہ شخص برتن اٹھا کر حضرت کی خدمت میں لے گیا تو انہوں نے فرمایا کہ انہیں معلوم تھا کہ اناج کے اس ڈھیر میں ٹنکوں سے بھرا ہوا برتن موجود ہے' یہ کہتے ہوئے آپ نے وہ برتن بھی اسے ہی بخش دیا۔[۵] جوامع الکلم کے ایک اندراج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے گوداموں میں لاکھوں من غلہ موجود رہتا تھا اور قحط کے ایام میں موصوف ان گوداموں کے دروازے عوام کے لئے کھول دیا کرتے تھے۔[۶]

حضرت گیسودرازؒ کی روایت ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں سات سو سے زیادہ درویش رہتے تھے[۷] اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے خور و نوش کی ذمہ داری موصوف پر ہی تھی۔

---

۱ - جوامع الکلم' ص ۶۰۔

۲ - ایضاً" ص ۳۳۵۔ "بعد نقل شیخ بہاء الدین نُہ من زر از میراث او آمدہ خارج اجناس و اشیاء۔"

۳ - ایضاً" ص ۶۰۔

۴ - ایضاً" ص ۲۳۵۔ "مشائخ ملتان را تعززی عظیم باشد البتہ بدیدن کسی بر نخیزند۔"

۵ - ایضاً" ص ۶۰۔

۶ - ایضاً" ص ۵۹۔

۷ - ایضاً" ص ۳۳۵۔

حضرت بہاء الدین کی علم دوستی

حضرت گیسودرازؒ حضرت سلطان المشائخ نظام الدینؒ کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت بہاء الدین زکریاؒ اپنے گھر میں تشریف لائے تو اس وقت ان کا ایک بیٹا اپنے استاد سے سبق لے رہا تھا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ استاد کی کارکردگی سے اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے حکم دیا کہ اس کا منہ چاندی سے بھرا جائے۔[۱]

حضرت برہان الدین غریبؒ

حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ اُن کے مُرشد حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ اور مولانا برہان الدین غریب میں بڑی دوستی اور محبت تھی اور مؤخرالذکر بزرگ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر وہ حضرت سلطان المشائخ کے دامنِ ارادت سے وابستہ نہ ہوتے تو خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ حضرت گیسودرازؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مُرشد اور مولانا برہان الدین غریبؒ سالہا سال تک اکٹھے رہے اور مؤخرالذکر بزرگ اوّل الذکر بزرگ کا اتنا احترام کیا کرتے تھے کہ وہ ان کی طرف کبھی پُشت نہیں کرتے تھے۔[۲]

نبیسۂ امیر خسروؒ

امیر خسروؒ کی اولاد کے بارے میں ان کے سوانح نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی تصانیف' ہشت بہشت' مطلع الانوار' غرۃ الکمال اور اعجازِ خسروی کے حوالوں سے ان کی دو بیٹیوں عفیفہ اور میمونہ اور دو بیٹوں محمد اور یمین الدین مبارک کا ذکر کیا ہے۔[۳] حضرت گیسودرازؒ نے ان کے ایک نواسے کا ذکر کیا ہے جو" خسرو ثانی" کے لقب سے مشہور تھا۔[۴]

---

۱ - "ایضاً" ص ۵۹۔
۲ - "ایضاً" ص ۲۴۰۔
۳ - وحید مرزا' دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو' مطبوعہ لاہور' ۱۹۶۲ء ص ۱۶۲' ۱۹۵' ۲۰۲-۲۱۹۔
۴ - جوامع الکلم' ص ۲۰۳۔ "نبیسۂ امیر خسرو شاعر کہ "خسرو ثانی" میگفتند در مجلس حاضر بُود۔"

حضرت گیسودرازؒ اور سماع

حضرت گیسودرازؒ کو سماع بڑی مرغوب تھی اور وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے سلوک کی منزل تلاوتِ قرآن پاک اور سماع سے طے کی ہے۔[۱]

✪✪✪

۱- محمد علی سامانی، سیر محمدی، مطبوعہ الہ آباد ۱۳۴۷ھ، ص ۷۱۔ "میفرمودند فتح کارِ من بیشتر در تلاوت و سماع بود۔"

لطائفِ اشرفی

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا شمار برِعظیم پاک و ہند کے ان اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنھوں نے ہماری مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں اپنی سیرت اور کردار کے اَن مِٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اودھ کے مشرقی علاقے میں تبلیغ اسلام اور تعمیرِ ملت کے اہم فریضہ کو جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے موصوف نے انجام دیا ہے اس کی مثال برِعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

حضرت اشرف جہانگیرؒ کے ملفوظات ان کے ایک مرید حاجی نظام غریب یمنیؒ نے "لطائفِ اشرفی" کے عنوان سے جمع کئے تھے جو ۱۲۹۸ھ میں دہلی سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب کمیاب ہو گئے ہیں۔

راقم الحروف کو ۱۹۸۱ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی لائبریری میں "لطائفِ اشرفی" کا ایک مطبوعہ نسخہ اور دو قلمی نسخے مل گئے تھے اور زیرِ نظر مضمون اسی مطبوعہ نسخے پر مبنی ہے۔

صاحبِ ملفوظات

صاحبِ ملفوظات حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے والد بزرگوار سلطان محمد ابراہیم غزنہ کے حاکم سبکتگین (م ۹۹۷ ء) کی اولاد سے تھے اور موصوف کی والدہ ماجدہ خدیجہ بیگم شیخ احمد یسویؒ کی اولاد سے تھیں[1]۔ "لطائفِ اشرفی" میں حضرت اشرف جہانگیرؒ نے اپنا نسب بیان کرتے ہوئے خود کو سامانی النسب اور سبکتگین کی اولاد بتایا ہے[2]۔ عبداللہ خویشگی نے "معارج الولایت" میں ان کو نور بخشی سید لکھا ہے[3]، جو حضرت کے اپنے بیان کی روشنی میں غلط معلوم ہوتا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ان کی تین بڑی بہنیں تھیں۔ ان کی ولادت سے موصوف کے والد بڑے تنگ دل ہوئے۔ انھیں تخت کا وارث چاہئے تھا، اس لئے انھوں نے ابراہیم نامی ایک مجذوب سے بیٹے کی ولادت کے لئے دعا کرائی[4]۔ اس بزرگ کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے سلطان

---

۱ - حاجی نظام غریب یمنی، مرتب، "لطائفِ اشرفی" (مطبوعہ دہلی ۱۲۹۸ھ)، ۱ : ۱۰۸

۲ - ایضاً: این فقیر نیز از آل سامانست۔

۳ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوط پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۲۵ ـ ۱۱، ورق ۲۰۱ الف۔

۴ - یمنی، کتاب مذکورہ، ۲ : ۹۰۔

ابراہیم کو ۱۳۰۶ء میں ایک بیٹا عطاء فرمایا جو آگے چل کر اشرف جہانگیر کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور ہوا۔

سلطان ابراہیم نے اپنے لاڈلے فرزند اور ولی عہد کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ حضرت اشرف جہانگیر نے سات برس کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کیا اور اپنے زمانے کے نامور قراء سے ساتوں قرأتوں کی تعلیم پائی۔ چودہ برس کی عمر میں موصوف نے مروّجہ علوم میں مہارت حاصل کر لی اور جلد ہی ان کی علمیت کا ڈنکا عراق تک بجنے لگا[1]۔

والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد موصوف تخت نشین ہوئے اور اس عالم میں بھی نماز، روزہ، فرائض، واجبات اور وظائف پر کاربند رہے[2]۔ کچھ عرصہ بعد موصوف نے ایک غیبی اشارہ پا کر تخت و تاج اپنے چھوٹے بھائی محمد کے حوالے کر کے درویشی اختیار کر لی اور سیر و سیاحت کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

حضرت اشرف جہانگیر سمنان سے ماوراء النہر شریف لے گئے اور گھومتے پھرتے افغانستان کے راستے اُوچ پہنچے اور حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہاں گشت بخاریؒ (م ۱۳۸۴ء) سے ملے۔ مخدوم صاحب نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا کہ مدت کے بعد ایک طالب آیا ہے۔ مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ پنڈوہ میں شیخ علاء الدین ان کا انتظار کر رہے ہیں، لٰہذا وہ فوراً وہاں پہنچیں[3]۔

موصوف اوچ سے دہلی تشریف لے گئے اور وہاں سے پنڈوہ کا رخ کیا۔ یہاں روایات میں خاصی الجھن پائی جاتی ہے۔ جامع ملفوظات نظام غریب یمنی[4]، عبداللہ خویشگی[5] اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی[6] تحریر فرماتے ہیں کہ جب آپ بہار شریف پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ (م ۱۳۷۱ء) کا انتقال ہوا ہے اور ان کی نمازِ جنازہ تیار ہے۔ مخدوم صاحب کی وصیت کے مطابق حضرت اشرف جہانگیر نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنی منزل مقصود کی طرف چل پڑے۔ پنڈوہ پہنچ کر موصوف شیخ علاء الدین کے مرید ہو گئے اور عبداللہ خویشگی کی تحقیق کے مطابق، اس وقت ان کی عمر ستائیس برس تھی[7]۔

---

۱ - ایضاً" ۲ : ۹۱۔

۲ - ایضاً" ۲ : ۹۲۔

۳ - ایضاً" ۲ : ۱۹۴۔

۴ - ایضاً"۔

۵ - عبداللہ خویشگی، مخطوطہ مذکورہ، ورق ۲۰۲ الف۔

۶ - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، "تاریخ دعوت و عزیمت" (لکھنؤ، ۱۹۸۳ء)، ۳: ۲۳۷۔

۷ - عبداللہ خویشگی، مخطوطہ مذکورہ، ورق ۲۰۲ الف۔

راقم الحروف کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے سوانح نگاروں نے دو اسفار کے واقعات کو خلط ملط کر دیا ہے۔ حضرت اشرف جہانگیر ۱۳۰۶ء میں پیدا ہوئے اور مخدوم شرف الدین احمد یحیٰ منیری ۱۳۸۱ء میں فوت ہوئے۔ اس وقت حضرت اشرف جہانگیر کی عمر پینسٹھ برس تھی اور اتنی عمر تک ایک درویش کا بغیر بیعت کے رہنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔ عبداللہ خویشگی نے بیعت کے وقت ان کی عمر ستائیس برس لکھی ہے[1]۔ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو موصوف ۱۳۳۳ء میں شیخ علاء الدین کے مرید ہوئے اور اس واقعہ کے اڑتیس برس بعد مخدوم شرف الدین احمد فوت ہوئے۔ ۱۳۳۳ء میں ستائیس برس کی عمر میں شیخ علاء الدین کے ہاتھ پر بیعت سے ایک اور الجھن پیدا ہوتی ہے کہ اس وقت ان کے مرشد آئینہ ہندوستان اخی سراجؒ (م ۱۳۵۷ء) ہنوز بقید حیات تھے اور پورے ہندوستان میں ان کی ولایت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ حضرت اشرف جہانگیر کو ان کی بیعت کرنی چاہئے تھی۔

حضرت اشرف جہانگیر چار سال اپنے مرشد کی خدمت میں رہے۔ نظام غریب یمنی رقم طراز ہیں کہ ایک بار حضرت نے ایک مجلس میں اپنی نسبت کے بارے میں حاضرین کو بتایا کہ انہیں چشتی سلسلہ میں خرقۂ خلافت شیخ علاء الدینؒ سے ملا تھا اور انھیں اخی سراج سے خلافت ملی تھی اور وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔

حضرت علاء الدین کی وفات (۱۳۹۸ء) کے بعد حضرت اشرف جہانگیر نے ان کے فرزند اور جانشین حضرت نور قطبِ عالمؒ (م ۱۴۱۹ء) سے بھی رابطہ قائم رکھا تھا۔

حضرت اشرف جہانگیر کو اپنے مرشد کی خدمت کرتے ہوئے جب چار سال گزر گئے تو شیخ علاء الحق نے انھیں جون پور میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ جون پور میں قیام کے دوران میں سلطان ابراہیم شرقی (۱۴۰۰ء تا ۱۴۴۰ء) نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی صاحبِ تفسیر "بحرِمتواج" کے توسط سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ جب قاضی صاحب ان سے ملنے آئے تو انھوں نے ان کے علم و فضل کی بنا پر آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ قاضی صاحب نے سلطان کی درخواست پیش کی تو حضرت نے فرمایا کہ قاضی صاحب سلطان سے بہت بہتر ہیں۔

اگلے روز قاضی صاحب کے مشورے پر سلطان تن تنہا ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تعظیم دی۔ ان دنوں شاہی لشکر قلعہ جنادہ کی طرف گیا ہوا تھا اور سلطان کو لشکر کی طرف سے بڑی تشویش تھی۔ حضرت نے چند تسلی آمیز اشعار پڑھے اور سلطان کو رخصت کرتے وقت ایک 'مسند' جو آپ ولایت سے اپنے ساتھ لائے تھے' بطور تحفہ دی۔ سلطان اس ملاقات سے بڑا خوش

۱۔ ایضاً۔

ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا کر کہنے لگا کہ اب ایسے بزرگ بھی ہندوستان میں آ گئے ہیں۔ تین روز بعد سلطان قلعہ جنادہ کی فتح[۱] کا مژدہ لے کر حضرت کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور نان و شربت بھی اپنے ساتھ لایا۔ اس موقع پر چند شہزادے بھی حضرت سے بیعت ہوئے۔

جون پور میں قیام کے دوران میں بہت سے لوگ آپ سے بیعت ہوئے۔ قاضی شہاب الدین بھی دوسرے تیسرے دن آ کر ملتے رہے اور اپنی تصانیف ان کی خدمت میں پیش کیں[۲]۔

سیر و سیاحت

حضرت اشرف جہانگیر نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ موصوف تیس سال تک پرکار کی طرح دنیا میں گھومتے رہے ہیں اور اس عرصے میں انہوں نے بہت سے مشائخ سے فیض حاصل کیا[۳]۔ ایک دوسری مجلس میں انہوں نے حاضرین کو بتایا کہ انہیں ایک سو چودہ مشائخ سے فیض ملا ہے[۴]۔ انہوں نے مختلف مجالس میں اپنے سفر کے واقعات بیان کئے ہیں۔ انہیں اگر یکجا کر لیا جائے تو اس زمانے کے مسلم ممالک کی تہذیب و ثقافت کا ایک بہترین مرقع تیار ہو جائے۔

قونیہ میں قیام

حاجی نظام غریب یمنی رقم طراز ہیں: "قونیہ میں قیام کے دوران میں مخدوم صاحب کی مولانا جلال الدین رومی کے فرزند سلطان ولد سے بھی صحبت رہی۔ سلطان ولد نے ان سے اپنے والدِ بزرگوار کے بہت سے واقعات بیان کئے۔ ایک دن انہوں نے مخدوم صاحب سے کہا کہ مولانا نے ایک بار ان سے فرمایا کہ پرندے کو چاہئے کہ زمین سے بلند ہو کر اڑے۔ اگر وہ آسمان تک بھی نہ پہنچے تو کم از کم زمین پر بچھے ہوئے دام میں گرفتار ہونے سے ضرور بچ جائے گا۔[۵] حاجی نظام غریب کو یہاں سہو ہوا ہے۔ مخدوم صاحب کی سلطان ولد سے ملاقات ممکن نہیں۔ سلطان ولد نے ۱۳۱۲ء میں وفات پائی تھی۔ اس وقت مخدوم صاحب چھ برس کے تھے۔ یہ ملاقات سلطان ولد کے فرزند چلپی عابد سے ممکن ہے۔

مولانا جلال الدین رومی اور صدر الدین قونوی کی نسبت سے صوفیہ کرام کے دلوں میں

۱۔ نظام غریب یمنی، کتاب مذکورہ، ۱: ۳۵۴۔
۲۔ ایضاً: ۲: ۱۰۶۔
۳۔ ایضاً، ۱: ۳۸۹: این فقیر مدت سی سال در دائرہ روزگار پرکار وار گردیدہ و بملازمت مشائخ اعصار رسیدہ۔
۴۔ ایضاً، ۱: ۳۲۷۔
۵۔ ایضاً، ۱: ۴۰۰۔

قونیہ کا بڑا احترام تھا۔ حضرت بھی اپنی مجالس میں اس کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا کرتے تھے[1]۔

حافظ شیرازی سے ملاقات

جس زمانے میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانی شیراز میں مقیم تھے، ان کی حافظ شیرازی سے اکثر ملاقات رہا کرتی تھی۔ حضرت نے ایک مجلس میں حافظ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"خواجہ حافظ شیرازی یکی از مجذوبانِ درگاہِ عالی و محبوبانِ بارگاہِ متعالی است۔ بایں فقیر نیاز مندی داشت و مدتی بہمدیگر صحبت داشتیم"[2]۔

(خواجہ حافظ شیرازی درگاہِ عالی کے مجاذیب میں سے ایک مجذوب اور بارگاہِ عالی کے محبوبوں میں سے ایک محبوب ہیں۔ وہ اس فقیر کے نیاز مند تھے اور مدت تک ہماری ملاقات رہی۔)

موصوف نے حاضرین کو یہ بھی بتایا کہ انہیں حافظ سے خود اس کے اشعار سننے کا موقع ملا ہے۔ اس کے اشعار میں بڑے معارف اور حقائق ہیں اور ان سے بڑے عقدے حل ہوتے ہیں۔ ایک بزرگ نے اسے لسان الغیب کہا ہے۔ بڑے بزرگوں کے خیال میں "دیوانِ حافظ" سے بہتر اور کوئی دیوان نہیں ہے لیکن اس کا ادراک صرف ایک صوفی کو ہی ہو سکتا ہے۔ انہیں حافظ سے مل کر یہ اندازہ ہوا کہ وہ اویسی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا عالی مشرب ہے۔ موصوف کی خواجہ حافظ کے ساتھ صحبت بڑی محرمانہ ہوا کرتی تھی[3]۔

کاشان

حضرت اشرف جہانگیر اثنائے سفر کاشان میں شیخ عبدالرزاق کاشی سے ملے۔ ان کی خانقاہ میں "فصوص الحکم" کا باقاعدہ درس ہوا کرتا تھا جس میں لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوا کرتے تھے۔ حضرت نے شیخ اکبر کی دو تصانیف "فتوحاتِ مکیہ" اور "اصلاحِ کبیرہ" ان کی خدمت میں پیش کیں[4]۔

سمنان

دورانِ سفر حضرت اشرف جہانگیر نے سمنان میں حضرت علاء الدولہ سمنانی (م ۱۳۳۶ء) کی

۱۔ ایضاً" ۱ : ۲۰۳۔
۲۔ ایضاً" ۱ : ۸۱۔
۳۔ ایضاً" ۱ : ۳۵۴۔
۴۔ ایضاً" ۱ : ۲۱۳۔

خانقاہ میں بھی کچھ عرصہ قیام کر کے اخذِ فیض کیا[1]۔ مؤخرالذکر بزرگ سمنان کے شاہی خانوادے کے فرد اور حضرت اشرف جہانگیر کے قریبی رشتہ دار تھے[2]۔

سبزوار

حضرت اشرف جہانگیر نے سبزوار کی جامع مسجد کی بڑی تعریف کی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں: "وہاں کی مسجد بڑی خوبصورت ہے اور اس کے صحن میں پھولوں کے تختے اور پودوں کی کیاریاں عجب بہار دکھاتی ہیں"[3]۔

شروان

شروان اپنے نفیس قالینوں کے لئے پورے عالم میں مشہور ہے۔ حضرت اشرف جہانگیر ایک بار شدید برف باری کے ایام میں وہاں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں کے باشندے سرحدی علاقے میں کفار سے برسرِ پیکار ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں: اہل شروان مدتوں سے جہاد میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ چند جنگی قیدیوں کو گرفتار کر کے شروان لائے تو لوگوں نے ان سے پوچھا: اسلحہ کی فراوانی کے باوجود وہ جنگ میں کیونکر ہار گئے؟ قیدیوں نے جواب دیا: جب مسلمان مجاہدین نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے تو اس کی ہیبت سے ان کے دلوں پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ ہمت ہار بیٹھتے تھے[4]۔

بخارا

بخارا میں قیام کے دوران میں حضرت اشرف جہانگیر اکثر خواجہ بہاء الدین نقشبند کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ جامع ملفوظات نے حضرت کی زبان سے "لطائفِ اشرفی" میں خواجہ بزرگ کی بہت سی باتیں درج کی ہیں[5]۔

سمرقند

سمرقند ماوراء النہر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ نظام غریب یمنی نے سمرقند میں حضرت اشرف جہانگیر کے قیام کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی تفصیل نہیں دی[6]۔

---

۱ - ایضاً" ۱ : ۸۷۔

۲ - ایضاً" ۱ : ۸۴۔

۳ - ایضاً" ۱ : ۲۹۴۔

۴ - ایضاً" ۱ : ۶۵۔

۵ - ایضاً" ۲ : ۹۴۔

۶ - ایضاً" ۲ : ۹۴۔

مشہد

"لطائفِ اشرفی" میں حضرت نے مشہد میں اپنے قیام کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی تفصیل بیان نہیں کی۔[۱] عبداللہ خویشگی نے یونہی اٹکل پچو سے لکھ دیا ہے کہ وہاں حضرت علی رضاؑ کے مزار پر چند روز مقیم رہے تھے۔[۲]

ہرات

قرونِ وسطیٰ میں ہرات کی عالمِ اسلام میں بڑی شہرت تھی اور لوگ اسے رُبعِ مسکوں کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ حضرت اشرف جہانگیر بھی ہرات تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاری کی خانقاہ میں قیام فرمایا۔[۳] ہرات میں علماء و مشائخ کے ساتھ بھی ان کی صحبت رہی۔

بلخ

بلخ میں قیام کے بارے میں حضرت اشرف جہانگیر نے صرف اتنا ہی بتانے پر اکتفا کیا ہے کہ وہاں اہلِ علم کے ساتھ ان کی نشست و برخاست رہی تھی۔[۴]

بنارس

ماوراء النہر اور افغانستان کی سیاحت کے بعد حضرت جہانگیر برِعظیم پاک و ہند میں وارد ہوئے۔ اُوچ شریف میں مخدوم جہانیاں سے مل کر دہلی تشریف لے گئے اور وہاں سے بنگال کی جانب روانہ ہوئے۔ اثنائے سفر موصوف بنارس پہنچے اور وہاں قیام فرمایا۔ "لطائفِ اشرفی" میں مرقوم ہے کہ حضرت نے وہاں کے بُت کدوں کی سیر کی اور ان کی سعی و تبلیغ سے ایک ہزار ہندو مشرف باسلام ہوئے۔[۵]

۱۔ ایضاً" ۱ : ۲۸۴۔

۲۔ عبداللہ خویشگی، مخطوطہ مذکورہ، ورق ۲۰۴ ب۔

۳۔ نظام غریب یمنی، کتاب مذکورہ، ۱ : ۱۶۳۔

۴۔ ایضاً" ۱ : ۲۶۸۔

۵۔ ایضاً" ۱ : ۳۱۲۔

گلبرگہ میں قیام

ملفوظات کے مطالعے سے یہ مترشح ہوتا ہے حضرت اشرف جہانگیر نے ایک سے زائد بار عالمِ اسلام کی سیاحت کی ہے۔ ایک سفر میں حضرت بدیع الدین شاہ مدار ان کے ہم سفر تھے اور ایک سفر میں حضرت اشرف جہانگیر سیّد علی ہمدانی (م ۱۳۸۵ ء) کے ہم رکاب تھے۔[۲]

ایک بار حضرت اشرف جہانگیر سمنانی حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر ترکیہ تشریف لے گئے اور وہاں سے ایران ہوتے ہوئے بحری راستے سے گجرات آئے۔ گجرات میں کچھ عرصہ قیام کے بعد موصوف گلبرگہ تشریف لے گئے۔ ان دنوں سیّد یداللہ بن محمد اصغر بن حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ اپنے جدِ امجد کی مسند پر رونق افروز تھے۔ حضرت اشرف جہانگیر نے ایک مجلس میں ان کے جذبۂ عالی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ سید یداللہ سو من وزنی لوہے کی زنجیریں اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں ڈال کر ایک پتھر پر بیٹھا کرتے تھے اور اس حال میں شطحیات کہا کرتے تھے۔[۳] سلاطین دکن اپنی بیٹیاں ان کے عقد میں دینا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ سید یداللہ نے خانقاہ کے ارد گرد ان کے لئے گھر بنوا دیے تھے اور باری باری ان کے ہاں قیام کرتے تھے۔[۴] حضرت نے چار ماہ گلبرگہ میں قیام فرمایا۔

اَودھ میں قیام

"لطائفِ اشرفی" میں اَودھ (فیض آباد) میں بھی حضرت کے قیام کا ذکر آیا ہے۔ وہاں موصوف کے ایک لاڈلے مرید اور خلیفہ شمس الدین اَودھی رہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار ان کی بڑی پُر تکلف دعوت کی تھی۔[۵]

لکھنؤ

جامع ملفوظات نے لکھنؤ کی جامع مسجد میں حضرت کے قیام کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی تفصیل نہیں دی۔[۶] حالانکہ اس زمانے میں مخدوم شاہ مینا لکھنویؒ (م ۱۴۷۰ ء) وہاں مقیم تھے اور دُور دُور تک ان کی بزرگی کا شہرہ پھیلا ہوا تھا۔

۱- اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۶) ج ۲، زیرِ ذیل "اشرف جہانگیر"۔

۲- نظام غریب یمنی، کتاب مذکور، ۱: ۷۵۔ "این فقیر کہ اشرف است بر کاب او چون ذرہ میگردید۔"

۳- اس زمانے میں [illegible] A.K.S. Lambton [illegible] Landlord and Peasant in Persia [illegible] ص ۱۰۷۔

۴- نظام غریب یمنی، کتاب مذکور، ۲: ۲۰۔ ۵- ایضاً ۱: ۲۰، ۱۲۲۔ ۶- ایضاً ۱: ۲۰۷۔

منیر

بہار میں منیر ایک تاریخی اور رُوحانی مقام ہے، جہاں مخدوم شرف الدین احمد کے والد بزرگوار شیخ یحییٰ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ملفوظات میں ایک موقع پر منیر میں قیام کا ذکر بھی مرقوم ہے[۱]۔

عبداللہ خویشگی نے حضرت کے اسفار میں قندھار، غزنہ، کابل اور دمشق کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اول الذکر تینوں شہروں کا ذکر "لطائفِ اشرفی" میں نہیں ہے۔ ملفوظات کے دوسرے حصے میں سمندری سفر کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ سفر انہوں نے ایران کی کسی بندرگاہ سے گجرات کی کسی بندرگاہ (کھمبائت یا سورت) تک کیا تھا۔

آغازِ ملفوظات

"لطائفِ اشرفی" کے آغاز میں حاجی نظام غریب یمنی ملفوظات جمع کرنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سید الطائفہ جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے: "حکایت المشائخ جند من جنود اللہ"۔ اس لئے وہ حضرت اشرف جہانگیر کے ملفوظات جمع کر رہے ہیں[۲]۔

آدابِ مسجد

حضرت اشرف جہانگیر فرماتے ہیں کہ شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ ایک مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص ان سے ملنے آیا۔ اس نے بے دھیانی میں پہلے اپنا بایاں پاؤں مسجد کے اندر رکھا تو شیخ موصوف نے دور ہی سے فرمایا: "باز گرد۔ ہرکہ درخانۂ دوست ادب آمدن نداند مارا کہ باوی صحبت داریم"[۳]۔

خدمتِ خلق

صوفیائے کرام عبادات کے بعد خدمتِ خلق پر ہی زور دیتے ہیں۔ مخدوم صاحب خدمتِ خلق کو بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اپنے ملنے والوں کو عوام کی خدمت کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے[۴]۔

---

۱ - ایضاً، ۲ : ۱۰۱۔

۲ - ایضاً، ۱ : ۳۰۔

۳ - ایضاً، ۱ : ۳۹۔

۴ - ایضاً، ۱ : ۸۹۔ "خدمتِ مخلوق نشان سعادتست۔"

مشربِ شطار

حضرت فرماتے ہیں: "شطاری سلسلہ اگرچہ قدیم سلاسلِ تصوف میں شمار نہیں ہوتا لیکن فوائد اور مقاصد کا حصول اس سلسلے میں زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں اسمِ ذات کا وِرد بہت فائدہ دیتا ہے۔ تین سال تک سالک کو اسمِ ذات کا وِرد کراتے ہیں پھر اس کے فوائد اور ثمرات مرتب ہوتے ہیں"[1]۔

وَحدتُ الوجود

قرونِ وسطیٰ میں توحید سے وَحدتُ الوجود مراد لی جاتی تھی۔ "لطائفِ اشرفی" کے آغاز میں حضرت اشرف جہانگیر نے اس موضوع پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ موصوف کے دل میں شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی کا بڑا احترام تھا اور سفر میں بھی ان کی تصانیف اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ عبداللہ خویشگی کی روایت ہے کہ حضرت اشرف جہانگیر نے دمشق کی خانقاہِ صالحیہ میں ابنِ عربی سے ملاقات کی تھی[2]۔ "لطائفِ اشرفی" میں صالحیہ میں ماہ رمضان گزارنے کا ذکر آیا ہے[3]۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز (م ۸۲۲ ھ) نے "فصوص الحکم" کی ایک سے زائد شرحیں لکھ کر نظریہ وَحدتُ الوجود کو خواص کے حلقے سے نکال کر عوام تک پہنچا دیا تھا۔ اس لئے اس دور کے ملفوظات میں بار بار وَحدتُ الوجود کا ذکر آتا ہے۔

حضرت اشرف جہانگیر نے ایک بار جامع ملفوظات نظام غریب یمنی سے فرمایا: "آپ نے شیخ محی الدین ابن عربی کی کتابوں سے خوب استفادہ کیا ہے"[4]۔ "لطائفِ اشرفی" کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آپ شیخ اکبر کی تصانیف سفروحضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

پیر اور مرید

حضرت فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہئے کہ وہ دل و جان سے اپنے شیخ کی خدمت کرے اور اس نیک کام میں اپنی جان یا مال کی پروا نہ کرے۔ ایک مرید کے لئے اپنے شیخ کی خدمت سے بڑھ کر اور کوئی سعادت نہیں[5]۔

---

۱ - ایضاً" ۱ : ۲۹۸۔
۲ - عبداللہ خویشگی، مخطوط مذکورہ ورق ۲۰۴ الف۔
۳ - نظام غریب یمنی، کتاب مذکورہ، ۱ : ۷۸۔
۴ - ایضاً" ۱ : ۲۴۳۔
۵ - ایضاً" ۱ : ۱۷۷۔

ایک روز انہوں نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ مرید کو اپنے پیر کی عادات اپنانا چاہئیں[1] اور اپنے پیر کے قول کو عین خدا کا قول سمجھنا چاہئے[2]۔ ایک روز حضرت نے فرمایا کہ مرید کو اتنا بلند ہمت ہونا چاہئے کہ وہ اپنے پیر کو اپنی روح تصور کرے اور خود اس کا وجود یا قالب بن جائے[3]۔ پیر کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے ایک روز انہوں نے فرمایا کہ اسے مرید کے مال کی حرص سے مبرا ہونا چاہئے[4]۔

صفاتِ شیخ

ایک بار مخدوم صاحب نے اپنی مجلس میں سورہ الکہف کی یہ آیت پڑھی: فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ قدرے توقف کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس آیت سے شیخ کی صفات مترشح ہوتی ہیں[5]۔

احترامِ مرشد

حضرت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اودھ کی طرف سے "بوئے دوستی" آتی ہے۔ آپ ایک بار اودھ گئے تو شمس الدین اودھی ملنے آئے۔ آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: "فرزند شمس الدین ما از برای تو آمدہ ام"۔ یہ الفاظ سنتے ہی ان کے دل میں آتشِ شوق بھڑک اٹھی اور ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی۔ حضرت نے انہیں مرید کیا۔ شمس الدین نے سفر میں ہم رکابی کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا کہ اودھ میں ان کے بہت سے مرید ہیں' اس لئے وہ وہیں قیام کریں۔ اس موقعہ پر انہوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا: "اشرف شمس و شمس اشرف ازہم جدا نہ اند[6]۔"

حضرت اشرف جہانگیر کو اپنے مشائخ سے جو تبرکات ملے تھے وہ انہوں نے شمس الدین کے سپرد کر دیے تھے۔ ایک بار حضرت نے حاضرین مجلس کو بتایا: شمس الدین ان کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ وہ کچھوچھہ شریف کی طرف پشت نہیں کرتے اور سفر میں بھی اس کا احترام

---

۱ - ایضاً" ۱ : ۱۷۴۔
۲ - ایضاً" ۱ : ۱۷۵۔
۳ - ایضاً" ۱ : ۱۷۳۔
۴ - ایضاً" ۱ : ۱۸۵۔
۵ - ایضاً" ۱ : ۲۵۵۔
۶ - ایضاً" ۱ : ۳۰۲۔

کرتے ہیں[۱]۔

ایک بار شمس الدین نے سفر کے دوران میں ایک کتے کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس پر سگِ اصحابِ کہف کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ شاید یہ وہی کتا ہے جو ان کے مرشد کے آستانہ پر آیا کرتا تھا۔ انہوں نے اس کتے کی اتنی تکریم کی کہ اپنا پیرہن زمین پر بچھا کر اس پر کھانا رکھا اور اسے کھلایا[۲]۔

احترامِ مرشد کے ضمن میں حضرت نے ایک مجلس میں فرمایا کہ شاہ شجاع کرمانی (۱۳۵۷ء تا ۱۳۸۴ء) مدت تک چشت میں مقیم رہا لیکن جب اسے بول و براز کی حاجت ہوتی تو اس مقدس قصبے کی حدود سے باہر چلا جاتا تھا[۳]۔

حضرت نے ایک مجلس میں یہ فرمایا کہ والدین، استاد اور پیر کے چہروں پر بے وضو نگاہ نہیں ڈالنی چاہئے۔ اسی طرح وضو کے بغیر آسمان کی طرف دیکھنا بھی منع ہے۔ اکابر کے سامنے حتی الوسع کم بولیں اور ان کی مجلس میں بیٹھ کر دائیں بائیں نہ دیکھیں۔ کوئی مرید بے وضو اپنے پیر کے گھر نہ جائے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنے پیر کی چوکھٹ کو بوسہ دے اور جب تک وہ پیر کی صحبت میں رہے نفلوں کی ادائیگی اور اوراد و وظائف سے مجتنب رہے' کیونکہ صوفیاء کے ہاں پیر کے مشاہدہ سے بڑھ کر اور کوئی وظیفہ نہیں ہے۔ حضرت کے اصل الفاظ یہ ہیں: "ہیچ وردے بالا تر از مشاہدۂ پیر نیست"[۴]۔

صفاتِ ولی

حضرت فرماتے ہیں: ایک ولی کے تمام افعال و حرکات پسندیدہ ہونے چاہئیں کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ ولی کی کیا پہچان ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ لطافتِ زبان' حسن اخلاق' تازہ روئی' سخاوتِ نفس' قلتِ اغراض' عذر پذیری' شفقت بر خلق' ہر برے بھلے شخص سے نیکی اور آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ جیسی سیرت سے پہچانا جاتا ہے۔ حضرت یہ بھی فرماتے ہیں کہ ولی ہر اعتبار سے نبی ﷺ کے تابع ہوتا ہے[۵]۔ انہوں نے ایک مجلس میں یہ بھی فرمایا کہ گروہ صوفیاء میں سے اگر کوئی صوفی نبی کریم ﷺ کی روش چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ منزل

۱۔ ایضاً' ۱ : ۲۱۔

۲۔ ایضاً' ۱ : ۲۱۲۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً' ۲ : ۲۳۔

۵۔ ایضاً' ۱ : ۶۴۔

مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔[1] ایک دوسرے موقع پر انہوں نے فرمایا کہ سلوک میں اگر کوئی سالک نبی کریمؐ کی متابعت اور طریقے سے ذرا سا بھی انحراف کر جائے تو پھر اس کے لئے منزل پر پہنچنا ممکن نہیں۔[2]

کھانے کی تاثیر

مخدوم صاحب کے دستر خوان پر حاضرین کو کھانا کھلانے کی خدمت بابا حسین کے سپرد تھی۔ حضرت نے ایک روز حاضرینِ مجلس سے فرمایا: یہ خدمت اس لئے اس کے سپرد کی ہے کہ وہ کھانا کھلاتے وقت بھی ذکر سے غافل نہیں رہتا۔ بدیں وجہ کھانا پیٹ میں جا کر بھی پُر تاثیر رہتا ہے۔[3]

سماع کے آداب

سماع کے بارے میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ فقہاؒ کا اس پر اجماع ہے کہ جس سماع میں فسق اور لہو و لعب نہ ہو' وہ مباح ہے۔ اس لئے سماع کو مطلق حرام نہیں کہنا چاہئے۔ ایسا کہنے سے گناہ لازم آتا ہے۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں: سماع سننے کے لئے ریاضت شرط ہے۔ ریاضت سے نفسانی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے دورانِ سماع کوئی سفلی خواہش پیدا نہیں ہو گی۔[4]

حاجی نظام غریب یمنی لکھتے ہیں: حضرت اشرف جہانگیر اپنے احباب کے ساتھ عموماً رات کے وقت سماع سنا کرتے تھے۔ حضرت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ سماع سننے کے لئے سب سے بہترین جگہ مسجد ہے۔ سماع چونکہ عبادت ہے اور عبادت کے لئے مسجد سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟[5]

تصوف کا زوال

حضرت فرماتے ہیں کہ اثنائے سفر ان کی ملاقات ایسے بہت سے ملحدوں سے ہوئی جو

۱۔ ایضاً'' ۱ : ۲۶۔
۲۔ ایضاً'' ۱ : ۲۵۹۔
۳۔ ایضاً'' ۱ : ۳۰۳۔
۴۔ ایضاً'' ۲ : ۲۸۔
۵۔ ایضاً'' ۲ : ۲۹۔

شریعت کے منکر ہونے کے ساتھ مناہی اور معاصی کا ارتکاب کرتے تھے اور وہ ان خرافات کو ہی طریقت سمجھے بیٹھے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ دریائے توحید میں غرق ہو چکے ہیں۔ مخدوم صاحب نے انہیں دلائل سے سمجھایا کہ ان کا طریقہ زندیقوں جیسا ہے۔ [۱]

حضرت اشرف جہانگیر فرماتے ہیں کہ اثنائے سفر قونیہ میں ان کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو مہدی ہونے کا مدعی تھا۔ [۲] ترکیہ میں سفر کے دوران بھی انہیں ایک مہدی ملا تھا۔ [۳] جب موصوف گلبرگہ تشریف لائے تو یہاں بھی ایک ایسا ہی دعوے دار موجود تھا۔ [۴]

سلطان فیروز شاہ تغلق کی خود نوشت "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں ایسے کئی سر پھروں کا ذکر آیا ہے جو مہدی، نبی یا خدا ہونے کے دعوے دار تھے۔ [۵]

سید علی ہمدانیؒ

حضرت اشرف جہانگیرؒ کو سید علی ہمدانیؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ایک موقع پر انہوں نے ان کے ساتھ سفر میں شریک ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"این فقیر کہ اشرف است برکاب اُو چون ذرّہ میگردید، بس فوائدِ سلوک و فوائدِ معلوک مواجید و اذواق کہ از حضرتِ سید یافتم اگر ہرسرِمُوی لسان گردد شکرِ اُو از ہزاریکی نتوانم گزرانید۔" [۶]

صفی ردولویؒ

شیخ صفی ردولوی حضرت اشرف جہانگیر کے خلیفہ تھے۔ موصوف ایک جیّد عالم تھے اور ان کے مرشد بھی ان کی علمیت کے قائل تھے۔ حضرت اشرف جہانگیرؒ جو تیس سال تک پورے عالمِ اسلام کی سیاحت کر چکے تھے اور دورانِ سیاحت بڑے بڑے علماء اور مشائخ سے مل چکے تھے، یہ فرمایا کرتے تھے: ہندوستان میں اگر کوئی شخص تمام علوم و فنون کا ماہر ہے، تو وہ شیخ صفیؒ ہیں۔ [۷] موصوف حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے دادا تھے۔

۱۔ ایضاً، ۱: ۴۔

۲۔ ایضاً، ۱: ۳۔

۳۔ ایضاً، ۱: ۱۱۔

۴۔ ایضاً، ۱: ۵۴۔

۵۔ فیروز شاہ تغلق، "فتوحاتِ فیروز شاہی" مشمولہ تاریخی مقالات (مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰)، ص ۱۸۸۔ ۱۸۹۔

۶۔ نظام غریب یمنی، کتاب مذکورہ ۱: ۵۴۔

۷۔ ایضاً، ۱: ۴۔

عبداللہ یافعیؒ

چودھویں صدی عیسوی میں حرمین شریفین میں امام عبداللہ یافعیؒ ایک بڑے نامور عالم اور صاحبِ دل بزرگ ہوئے ہیں۔ مخدوم جہانیاںؒ کی بھی ان کے ساتھ حرم مکہ میں ملاقات رہی تھی جس کا ذکر انہوں نے "الدرالمنظوم" میں کیا ہے۔ اشرف جہانگیر بھی حرم شریف کے قیام کے دوران میں ان سے ملتے رہے تھے۔"[۱]

قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ

مولانا شہاب الدین دولت آبادی صاحبِ تفسیر "بحرِ مواج" اپنے زمانے کے ایک نامور عالم تھے اور سلاطین شرقی دل و جان سے ان کا احترام کیا کرتے تھے۔ ایک بار موصوف بیمار ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو آیا۔ اس نے پانی کا ایک پیالہ ان پر تصدق کر کے پیا اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ اگر ان کی عمر پوری ہو گئی ہے تو اللہ اس کی عمر انہیں لگا دے۔[۲]

جن دنوں حضرت اشرف جہانگیر جونپور میں قیام پذیر تھے' ایک دن مولانا شہاب الدین دولت آبادی ان سے ملنے آئے۔ حضرت نے ان کے علم و فضل کی بڑی تکریم فرمائی اور آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔[۳]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "اخبار الاخیار" میں حضرت اشرف جہانگیر کا قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام ایک طویل خط نقل کیا ہے۔ شیخ محدث لکھتے ہیں کہ ان دونوں بزرگوں کے مابین ایمانِ فرعون کے موضوع پر گفتگو ہوئی تھی۔[۴]

صوفی کا لقب

ایک روز کسی شخص کے استفسار پر حضرت نے فرمایا کہ سب سے پہلے ابوالہاشم نے صوفی کہلانا شروع کیا تھا۔[۵]

---

۱ - ایضاً' ۱ : ۳۰۔
۲ - محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ' "تاریخ فرشتہ" (مطبوعہ بمبئی ۱۸۳۲ء)' ۲ : ۵۹۵۔
۳ - نظام غریب یمنی' کتاب مذکورہ' ۱ : ۳۵۴۔
۴ - شیخ عبدالحق' "اخبار الاخیار" (مطبوعہ دہلی' ۱۳۳۲ھ)' ص ۱۶۶۔
۵ - لطائفِ اشرفی' ۱ : ۱۲۰۔

علمی انکشاف

نظام غریب یمنی لکھتے ہیں کہ حضرت کے ایک خلیفہ ابوالمکارم کے کسی مرید نے ان کے ملفوظات جمع کئے تھے۔ صاحب ملفوظات ابوالمکارم خاندانی رئیس اور امیر تیمور کے درباری امیر تھے۔ بعد ازاں وہ شاہی منصب ترک کر کے درویش ہو گئے تھے۔[۱]

حضرت اشرف جہانگیر کی شاعری

"لطائفِ اشرفی" کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ نظام غریب یمنی نے ایک موقع پر ان کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں:

دلی کان انور است از جامِ جمشید
روان روشن تر از خورشید باشد
چہ حاجت عرض کردن بر ضمیرش
کسی کو را یقین اُمید باشد[۲]

حضرت اشرف کو جہانگیر کا لقب ان کے مرشد حضرت علاء الدینؒ نے دیا تھا۔ اس کا ذکر "لطائفِ اشرفی" میں انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

مرا از حضرت پیر جہان بخش
خطاب آمد کہ اے اشرف جہانگیر
کنون گیرم ہمہ جہان معنوی را
کہ فرمان آمد از شاہم جہانگیر[۳]

تصانیف

جامع ملفوظات نے حضرت کی دو تصانیف "اشرف الفواید" اور "فواید الاشرف" کا ذکر کیا ہے۔[۴] ان کے علاوہ ان کے مکتوبات کا مجموعہ جو "مکتوباتِ اشرفی" کے نام سے موسوم ہے' ان

---

۱ - ایضاً" ۱ : ۳۰۴۔
۲ - ایضاً" ۲ : ۱۰۵۔
۳ - ایضاً" ۲ : ۹۹۔
۴ - ایضاً" ۱ : ۳۱۔

کی تعلیمات کا مرقع سمجھا جاتا ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے "خزینۃ الاصفیا" میں ان کی ایک اور تصنیف "بشارت المریدین" کا بھی ذکر کیا ہے۔[1]

وفات

حضرت اشرف جہانگیر نے ۲ جولائی ۱۴۰۵ء کو کچھوچھہ شریف میں وفات پائی۔[2] وفات سے قبل انہوں نے قوالوں کو بلا کر قوالی سنی اور فرمائش کر کے شیخ سعدی کا کلام سنا۔ سماع کے دوران میں انہیں وجد ہو گیا اور ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد موصوف ہوش میں آ گئے اور دوبارہ ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی عالم میں ان کی رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔[3]

مزار مبارک

حضرت اشرف جہانگیر کا مزارِ مبارک موضع کچھوچھہ شریف تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ہے۔ فیض آباد سے اکبر پور تک ٹرین کا سفر ہے اور اکبر پور سے بسکھاری تک پندرہ میل کا سفر بس سے طے کرتے ہیں۔ بسکھاری ایک معمولی سا گاؤں ہے، وہاں سے درگاہ شریف کا فاصلہ دو میل کے قریب ہے اور عام طور پر بسکھاری سے درگاہ شریف تک جانے کے لئے سائیکل رکشا مل جاتا ہے۔

حضرت کا مزار ایک بلند ٹیلے پر ہے اور اُس پر ایک شان دار گنبد ہے۔ گنبد سے باہر ان کے جانشینوں کی قبریں ہیں۔ درگاہ شریف سے قریب ہی ایک دینی مدرسہ ہے۔

سجادہ نشین صاحب جس گاؤں میں رہتے ہیں وہ درگاہ سے میل بھر کے فاصلہ پر ہے۔ حضرت اشرف جہانگیر کی زندگی میں یہ جگہ رُوح آباد کہلاتی تھی۔[4] بعد ازاں اس کی املا روحا آباد ہو گئی۔[5] شیخ عبدالحق محدث کے زمانے میں اسے کچھونچہ کہنے لگے تھے۔[6] اب اسے کچھوچھہ کہتے ہیں۔

۱۔ مفتی غلام سرور۔ "خزینۃ الاصفیاء" مطبوعہ کانپور (۱۹۱۴) ۱ : ۳۷۷۔

۲۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (لاہور، ۱۹۶۶) ج ۲، آرٹیکل "اشرف جہانگیر۔"

۳۔ مفتی غلام سرور، کتاب مذکورہ، ۱ : ۳۷۷۔

۴۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ج ۲، آرٹیکل "اشرف جہانگیر"۔

۵۔ نظام غریب یمنی، کتاب مذکورہ، ۱ : ۳۰۱۔

۶۔ شیخ عبدالحق، کتاب مذکورہ، ص ۱۲۶۔

فیض آباد اُتر پردیش کا واحد ضلع ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ سب حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی سعی و تبلیغ کا ثمرہ ہے۔

جانشینی

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی وفات کے بعد ان کی مسند پر سیّد عبدالرزاق بن سیّد الغفور حسن جیلانیؒ رونق افروز ہوئے۔

احسن الاقوال

مولانا آزاد لائبریری مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات پر مشتمل احسن الاقوال کے عنوان سے ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے۔[1] اس مخطوطہ کے ۷۹ ورق ہیں۔ اسے ۷۳۸ھ / ۱۳۳۷ء میں حضرت برہان الدین غریبؒ کے ایک مرید حماد بن عماد کاشانی نے مرتب کیا تھا۔ موجودہ دَور کے تاریخ دانوں کو قدیم مؤرخین سے یہ گلہ رہا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی تاریخیں صرف سلاطین اور بادشاہوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان میں سے بعض تاریخیں تو شاہی دربار کا رُوزنامچہ بن کر رہ گئی ہیں۔ ان مؤرخین نے عوام کی مذہبی اور سماجی حالت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کمی کو صوفیاء کرام کی خانقاہوں میں مرتب ہونے والے ملفوظات نے کافی حد تک پورا کیا ہے۔ احسن الاقوال میں قرونِ وسطیٰ کے خانقاہی نظام اور صوفیہ اور عوام کی معاشرتی اور سماجی زندگی پر جس انداز سے قلم اٹھایا گیا ہے، اس کی نظیر اور کسی بزرگ کے ملفوظات میں نہیں ملتی۔

صاحبِ ملفوظات

حضرت برہان الدین غریبؒ سلطان المشائخ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے انہیں "صاحبِ شوق و ذوق" لکھا ہے۔[2] اس عہد کے اہلِ علم اور مشائخ کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ امیر خسرو اور امیر حسن علا سجزی جیسے باکمال حضرات ان کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔[3] حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات تھے۔

حضرت برہان الدین کو حضرت سلطان المشائخ کے ساتھ اس قدر عقیدت تھی کہ انہوں نے مدت العمر کبھی غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین) کی طرف پشت نہیں کی۔[4]

---

۱ - یونیورسٹی کلکشن فارسیہ، مذہب، تصوف نمبر ۳۱۸۔

۲ - عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۹۳۔

۳ - عبدالحق محدث، ص ۹۳ - ۹۴ "فضلائے زمانہ مثل امیر خسرو و امیر حسن و خوش طبعان دیگر اسیرِ محبت او بودند"۔

۴ - ایضاً، ص ۹۴۔

ایک بار موصوف حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جماعت خانہ میں بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے کمبل تہ کر کے اس پر ٹانگیں پھیلا کے بیٹھ گئے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے اعزاء میں سے ملک نصرت اور علی زنبیلی نے حضرت سلطان المشائخ سے اس کا ذکر کیا تو حضرت سب حد ناراض ہوئے۔ انہوں نے فوراً اپنے خادمِ خاص اقبال سے کہا کہ برہان الدین سے کہو کہ وہ فوراً یہاں سے چلا جائے۔ حضرت برہان الدین پریشان ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔ جب ان کے احباب کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو وہ ان کے پاس اظہارِ افسوس کے لئے جانے لگے۔ کئی روز بعد امیر خسرو اپنے گلے میں دستار ڈال کر سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں معافی دلوائی۔[۱]

حضرت برہان الدین غریب سات صد درویشوں کے ہمراہ دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ درویش انہیں پالکی میں بٹھا کر دکن لے گئے۔ دکن کی تاریخ میں "پالکی کی آمد" بڑی اہمیت لی حامل ہے۔[۲] حضرت برہان الدین کے نام نامی کی مناسبت سے برہان پور کی بنیاد رکھی گئی اور یہ شہر مدتوں تک خاندیش کے فاروقی سلاطین کا پایہ تخت رہا۔

حضرت برہان الدین اور ان کے ساتھیوں نے دکن کی سرزمین میں اسلام کی تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ ان کا انتقال ۷۳۸ھ / ۱۳۳۷ء میں ہوا۔[۳] "نورِ عشق بُود" اور "اولیاء خاص" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ حضرت کا مزار اورنگ آباد سے سترہ اٹھارہ میل کے فاصلہ پر خلد آباد میں واقع ہے۔ سڑک کے بائیں ایک چار دیواری کے اندر حضرت برہان الدینؒ محو خوابِ ابدی ہیں۔ اسی احاطۂ قبور میں ریاست حیدر آباد کا بانی نظام الملک آصف جاہ اوّل اور ناصر جنگ شہید مدفون ہیں۔ حضرت برہان الدینؒ کی درگاہ کے بالمقابل ایک ایسی ہی چار دیواری کے اندر شیخ زین الدینؒ کا مزار ہے اور وہیں اورنگ زیب عالمگیر، شہزادہ اعظم اور امیر حسن علاء سجزی کی قبریں ہیں۔

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات نے متن میں دو جگہ اپنا نام حماد بن عماد کاشانی تحریر کیا ہے۔ ایک جگہ اس نے اپنے ایک بھائی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

---

۱ - ایضاً۔
۲ - شیخ محمد اکرام، آب کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۳۴۳۔
۳ - ایضاً، ص ۳۴۳۔

برادرم مجمع الادب قدوۃ الاکتساب خواجہ رکن الدین کاشانی[1]

ایک موقع پر اس نے اپنے دوسرے بھائی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

برادرم صدر الافاضل خواجہ برہان الدین کاشانی[2]

اس کا ایک تیسرا بھائی بھی تھا جس کا نام خواجہ مجدالدین کاشانی تھا۔ جامع ملفوظات نے اس کے نام سے پہلے "قدوۃ البلغاء" لکھا ہے[3] متوخر الذکر دونوں بھائی حضرت برہان الدین غریبؒ سے بیعت تھے۔[4]

احسن الاقوال کی اہمیت

حماد کاشانی نے جس محنت اور کاوش کے ساتھ احسن الاقوال کو مرتب کیا ہے' اس کی مثال ملفوظات نویسی کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس عہد میں مرتب ہونے والے ملفوظات میں قصے کہانیوں کی بھرمار ہے لیکن حماد کاشانی نے اس پرانی ڈگر سے ہٹ کر قلم اٹھایا ہے اور اس نے اسے خانقاہی نظام کا دستور العمل بنا دیا ہے۔

حضرت برہان الدین غریبؒ کی عمر کا بیشتر حصہ حضرت سلطان المشائخؒ کی صحبت میں گزرا تھا' اس لئے احسن الاقوال میں سلطان المشائخؒ کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان المشائخؒ کے سوانح نگاروں میں سے کسی نے بھی اس تصنیف سے استفادہ نہیں کیا' حالانکہ حضرت برہان الدین غریبؒ بہت سے واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ اسی طرح انہوں نے سلطان المشائخؒ سے بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے بارے میں کئی باتیں سنی تھیں' انہیں بھی سند کا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے بابا صاحبؒ کا کوئی سوانح نگار احسن الاقوال سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

اگر کسی شخص نے اس عہد کی چشتی خانقاہ میں رہنے والے درویشوں کے شب و روز کے آداب و مشاغل کا مطالعہ کرنا ہو' تو اسے احسن الاقوال سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی۔

حماد کاشانی نے احسن الاقوال میں حضرت برہان الدین غریبؒ کے ۲۹ اقوال مختلف عنوانات کے تحت نقل کئے ہیں۔ جہاں کہیں حضرت کا ذکر آتا ہے' فاضل مرتب ان کے نام کے بعد

۱۔ احسن الاقوال' ورق ۱۰ الف۔
۲۔ ایضاً' ورق ۷ الف۔
۳۔ ایضاً' ورق ۷ ب۔
۴۔ ایضاً۔

"طاب اللہ قبرہ باحسن الطیب" کے دعائیہ کلمات ضرور لکھتا ہے۔

قول اول: حمّاد کاشانی نے قول اوّل پر "رو شمائے اصحاب طریقت و سنن ارباب طریقت" کا عنوان لگایا ہے۔ اس کے تحت موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب مرید پیر کے پاس موجود ہو تو اس کے لئے پیر کے مشاہدہ سے بڑھ کر اور کوئی مشغولت نہیں ہونی چاہئے۔ اُسے اِسے ہی سب سے بڑا شغل سمجھنا چاہئے۔ اگر مرید کہیں دُور رہتا ہو اور اسے پیر کی صحبت میسر نہ ہو تو اسے چاہئے کہ وہ تصوف کی کسی کتاب کے چند صفحات روز پڑھ لیا کرے۔[1]

حضرت برہان الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص دن میں ۷۵ بار سورہ الم نشرح پڑھے گا' اللہ تعالیٰ اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دے گا۔

قرونِ وسطیٰ میں مسافر عموماً" سراؤں یا خانقاہوں میں قیام کیا کرتے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مسافر کا حق لنگر میں تین دن تک ہے۔ اس کے بعد اسے کوئی کام کرنا چاہئے۔ وہ یا تو ہمہ تن عبادت میں مشغول ہو جائے یا لنگر میں ہاتھ بٹائے یا وہاں سے رخصت ہو جائے۔[2]

حضرت اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص کسی درویش کی ملاقات کو جائے تو جیسا وہ درویش کرے ویسا ہی ملاقاتی بھی کرے۔ اگر وہ عبادت میں مشغول ہو تو یہ بھی وہاں جاتے ہی عبادت میں مشغول ہو جائے۔ اسی طرح اگر درویش عمارت تعمیر کر رہا ہو تو زائر بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے۔[3]

اگر کوئی درویش کسی کو گھڑا' کوزہ یا لوٹا دینا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ خالی نہ دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی درویش کے لئے طشت یا چھاگل لے جائے تو اس میں کوئی چیز ضرور ڈال لے۔ اگر کوئی چیز میسّر نہ ہو تو تازہ پھل' خربوزہ یا کھیرہ ہی رکھ لے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر ان میں ایک سکّہ ہی رکھ کر لے جائے۔[4]

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش کو کسی سے دستانے اور سونے یا چاندی کی انگوٹھی قبول نہیں کرنی چاہئے۔ جب حماد کاشانی کے دو بھائی حضرت سے بیعت ہوئے تو انہوں نے اپنی طلائی انگوٹھیاں حضرت کی خدمت میں پیش کیں۔ حضرت نے فرمایا کہ انہیں بیچ کر جو رقم ملے اسے حضرت سلطان المشائخؒ کے ایصالِ ثواب کے لئے خرچ کر دیں۔[5]

---

۱ - احسن الاقوال' ورق ۷ الف۔
۲ - احسن الاقوال ورق ۷ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۶ ب۔
۴ - ایضاً" ورق ۶ ب۔
۵ - ایضاً" ورق ۷ ب۔

درویش کو چاہئے کہ وہ کسی کی امانت نہ رکھے اور نہ ہی کسی کا ضامن بنے۔ اسی طرح وہ کسی دستاویز پر اپنی گواہی نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ نیکی کرے تو احسان مند جواب میں جزاک اللہ ضرور کہے۔ ایک روز خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مجاور سلطان المشائخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا کہ لوگ اسے چیزیں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں کیا کرے؟ سلطان جی نے فرمایا کہ اگر وہ جزاک اللہ کہہ دیا کرے تو حق ادا ہو جائے گا[1]۔

حضرت برہان الدین غریبؒ فرماتے ہیں کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پیر اپنے مرید کے اور اُستاد اپنے شاگرد کے سامنے کھڑا نہ ہو۔

دہلی میں عماد الدین تیرگر نام کا ایک شخص رہتا تھا اور اسے حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ایک روز ایک شخص دہلی سے ملتان جا رہا تھا۔ عماد الدین نے اس کے ہاتھ حضرت زکریاؒ کے لئے نقدی روانہ کی۔ جب وہ شخص اجودھن پہنچا تو بابا فرید الدینؒ سے بھی ملا۔ اس نے بابا صاحب سے کہا کہ عماد الدین نے جو نقدی اسے دی ہے، وہ بابا صاحب لے لیں۔ وہ حضرت زکریاؒ کی خدمت میں کوئی اور چیز پیش کر دے گا۔ اس پر بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ راستے میں رہزن بن کر نہیں بیٹھے۔ جب وہ کسی دوسرے کو نقدی دینے کی نیت کر کے چلا ہے تو وہ اسے کیوں کر قبول کر لیں[2]۔

حضرت برہان الدینؒ کے زمانے میں درویش کے لئے سب سے معتبر قسم یہ تھی کہ وہ اپنے شیخ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے[3]۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک مرید جب سفر سے واپس آئے تو پہلے اپنے شیخ سے ملے جائے، پھر اپنے گھر جائے۔ اسی طرح جب سفر پر روانہ ہو تو اپنے اہل خانہ سے وداع ہو کر شیخ کی خدمت میں حاضری دے اور وہیں سے سفر پر روانہ ہو جائے[4]۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت نظام الدینؒ نے شیخ نصیر الدین محمود اودھیؒ کو اودھ جانے کے لئے وداع کیا تو انہوں نے کسی سے کہا کہ ان کی قیام گاہ پر جو گھوڑا بندھا ہوا ہے اسے فلاں جگہ پہنچا دے کیونکہ شیخ سے وداع ہونے کے بعد اپنی قیام گاہ پر جانا ادب کے منافی ہے[5]۔

---

۱ - احسن الاقوال، ورق ۸ ب۔
۲ - احسن الاقوال، ورق ۸ ب۔
۳ - ایضاً" ورق ۹ الف۔
۴ - ایضاً"
۵ - ایضاً"۔

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر دو آدمی مل کر ایک ہی برتن میں کھانا تناول کر رہے ہوں اور ان میں سے کوئی کسی کام کے لئے اٹھ جائے تو دوسرے کو چاہئے کہ وہ بھی اتنی دیر کے لئے کھانے سے ہاتھ کھینچ لے[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ کو مرید کی تربیت صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر کرنی چاہئے۔ شیخ میں لالچ اور بخل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر خدا اسے القا کرے کہ فلاں نعمت فلاں مرید کو دے دے تو اس میں بخل سے کام نہ لے[2]

اگر شیخ کی خانقاہ میں مسافر آ کر ٹھہرے تو خادم کو چاہئے کہ اسے پانی کی جگہ اور قدمچا (بیت الخلاء) دکھا دے۔ ادب کا یہ تقاضا ہے کہ مسافر خانقاہ سے بازار جائے تو واپسی پر خالی ہاتھ نہ آئے۔ اگر اور کچھ میسر نہ ہو تو ایک کھیرا یا ککڑی ہی لیتا آئے[3] حضرت فرماتے ہیں کہ ملک قنبر جب بھی سلطان جی کی خدمت میں آتا تو ایک کدو خانقاہ کے لئے ضرور ساتھ لاتا اور سلطان جی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ساتھ لاتا۔ حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ یہ روش لازم نہیں ہے لیکن مستحب ہے[4]

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جی شہر سے غیاث پور کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ ایک خالی خوانچہ سر پر رکھے سلطان جی کی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ درویشوں کے پاس خالی ہاتھ نہیں جاتے، اگر اور کچھ نہیں تو دو جیتل کے نان خرید کر خوانچہ میں رکھ لے۔ اسی طرح خالی پیالے میں شربت یا مصری ڈال لینی چاہئے۔ اگر کوئی شخص باندان شیخ کی خدمت میں پیش کرنا چاہے تو اس میں پان رکھ لے[5]

حضرت فرماتے ہیں کہ درویشوں کے لئے چھری یا استرا نہیں لے جانا چاہئے۔ اگر کوئی شخص یہ دونوں چیزیں درویش کے لئے لاے تو اسے چاہئے کہ ایک سوئی بھی ساتھ لائے۔ اس لئے کہ چھری اور استرا کاٹنے کے اوزار ہیں اور سوئی جوڑنے کے کام آتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی درویش کی خدمت میں صرف چھری پیش کرنا چاہے تو وہ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی ساتھ لائے۔ اسی طرح سوئی کے ساتھ دھاگا بھی ہونا چاہئے[6]

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۰ ب۔

۲ - ایضاً"۔

۳ - کھیرا اور ککڑی ان دنوں بڑے گراں ہیں۔ اُس زمانے میں یہ کوڑیوں کے بھاؤ فروخت ہوا کرتے تھے۔

۴ - احسن الاقوال' ورق ۱۱ الف۔

۵ - ایضاً" ورق ۱۱ ب۔

۶ - ایضاً" ورق ۱۳ الف۔

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک مسافر شیخ جمال الدین ہانسویؒ سے ملنے آیا۔ شیخ اس وقت مسجد میں تھے۔ وہ انہیں تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچا۔ شیخ نے نماز سے فارغ ہوتے ہی نفلوں کی نیت باندھ لی۔ مسافر نے اپنا مُصلّا لپیٹا اور چلنے لگا۔ شیخ نے جلدی سے سلام پھیرا اور معذرت چاہی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مسافر کو زیادہ دیر تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہئے۔ مقیم پر واجب ہے کہ مسافر کو انتظار کی زحمت نہ دے[1]

اگر کوئی شیخ کسی شخص کو کسی کے ہاں بھیجے اور صاحبِ خانہ اس کے ہاتھ شیخ کے لئے کپڑے، نقدی یا شیرینی وغیرہ بھیجے تو شیخ انہیں قبول نہ کرے۔ اسے چاہئے کہ ان پر فاتحہ پڑھ کر واپس لوٹا دے[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش کو باریک کپڑے نہیں پہننے چاہئیں۔ درویش کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی خلوتی ہوتا ہے اور کبھی جلوتی۔ اس زمانے میں نیلا لباس زیبِ تن کرنا یا کسی مجلس میں بلند آواز سے قرآن پڑھنا' لوگوں سے سوال کرنے کے مترادف تھا۔ اس لئے ان دونوں کاموں سے احتراز کرنا چاہئے[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے ہاں مسافر آئے تو صاحبِ خانہ اسے دو گرم چیزیں فوراً فراہم کرے۔

۱۔ ہاتھ منہ دھونے کے لئے گرم پانی۔ ۲۔ گرم شوربا۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ درویشوں کے پاس تین اوقات میں نہیں آنا چاہئے۔

۱۔ نماز اشراق سے قبل۔

۲۔ دوپہر کو قیلولہ کے وقت۔

۳۔ نماز عصر کے بعد[4]

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روز شیخ داؤد حسن شیرازی حضرت برہان الدین غریبؒ سے کہنے لگے کہ ان کے پاس لوگ آتے ہیں تو ان کے اوراد و وظائف فوت ہو جاتے ہیں۔ ان کی بات سن کر حضرت نے فرمایا:

اذا جاء الاخوان سقطت النوافل

---

۱ ۔ احسن الاقوال' ورق ۸ الف۔

۲ ۔ ایضاً۔

۳ ۔ ایضاً' ورق ۱۳ الف۔

۴ ۔ ایضاً' ورق ۱۲ الف۔

شیرازی نے دوبارہ وہی جملہ دہرایا تو حضرت نے جواب دیا کہ اگر کوئی شخص ملنے آئے تو اس کے سامنے کلمہ حق کہنا چاہئے اور کلمہ حق کہنے سے اگر اوراد فوت ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کام کے لئے آئے تو اسے کام میں لگا دے اور اوراد و وظائف فوت نہ کرے[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسافر نماز عصر کے بعد شہر میں داخل ہو تو وہ سیدھا لنگر میں نہ جائے۔ وہ رات کو کسی دوسری جگہ قیام کرے اور اگلی صبح اشراق کے بعد لنگر میں داخل ہو۔[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص نئے کپڑے پہنے تو اسے مبارکباد دینی چاہئے۔ درویش کا مہمان اگر بیمار ہو جائے تو جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائے، اسے اپنے ہاں سے جانے نہ دے۔ ایک بار خواجہ مبارک معروف، جنہیں حضرت شیخ کامل کہا کرتے تھے، حضرت کے ہاں آ کر ٹھہرے۔ چند دن بعد ان کی آنکھ میں تکلیف ہو گئی۔ انہوں نے حضرت سے اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک صحت نہ ہو جائے اس وقت تک اجازت نہیں ملے گی۔ تکلیف چونکہ ان کے گھر میں شروع ہوئی ہے اس لئے صحت بھی یہیں ہونی چاہئے۔[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ قبرستان سے سیدھا کسی مریض کی عیادت کو نہ جائے۔ یہ امر مریض کے حق میں باعث برکت نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کی تعزیت کے بعد شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے یا کسی مریض کی عیادت کے لئے نہ جائے۔ راستے میں اگر کوئی مسجد نظر آئے تو تھوڑی دیر کے لئے وہاں رُک جائے یا تھوڑی دیر کے لئے کسی جگہ بیٹھ جائے، پانی پئے اور پھر جائے۔[4]

قول اول: جس میں آداب مجلس منقول ہیں، بڑا طویل ہے اور یہ دس ورقوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے اس عہد کی مجلسی زندگی کا مرقع سمجھنا چاہئے۔

قول دوم: "در رعایت آداب مجلس مشائخ برجادہ و اولیای صاحب سجادہ۔"

اس عنوان کے تحت حضرت برہان الدین غریبؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی شیخ کی مجلس میں

---

۱ - احسن الاقوال ورق ۱۴ الف۔
۲ - ایضاً" ورق ۱۴ ب۔
۳ - ایضاً" ورق ۱۵ الف۔
۴ - ایضاً"۔

دستر خوان بچھایا جائے تو خادم کو چاہئے کہ وہ پہلے حاضرین کے ہاتھ دُھلائے اور پھر اپنے ہاتھ دُھوئے۔ دستر خوان پر شیخ کے سامنے نمک دان رکھنا چاہئے اور دستر خوان کے کونوں پر زیادہ روٹیاں رکھنی چاہئیں۔ جب خادم بسم اللہ کہے تب حاضرین کھانا شروع کریں۔ سب سے پہلے ایک چٹکی نمک کی اپنے منہ میں ڈالیں' پھر شوربا استعمال کریں۔ اگر کوئی شخص چمچے سے کھانا تناول کرے تو آدابِ مجلس کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنا چمچ مشترکہ پیالے میں نہ ڈالے تاکہ لوگ کراہیت محسوس نہ کریں۔ لقمہ ہمیشہ دائیں جبڑے سے چبانا چاہئے اور بائیں جبڑے سے لقمہ چبانے سے احتراز کرنا چاہئے۔[1]

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک درویش کی مجلس میں کوئی شخص بائیں طرف کے دانتوں سے لقمہ چبا رہا تھا۔ درویش نے اس سے پوچھا کہ وہ کس بزرگ کا مرید ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے بائیں طرف کے دانتوں میں تکلیف ہے اس لئے وہ مجبوراً بائیں جبڑے سے لقمہ چبا رہا ہے۔[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ کسی شخص سے یہ نہیں پوچھنا چاہئے کہ وہ کس کا مرید ہے' کیونکہ اس سے اس کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ ایک بار امیر خسروؒ سے کسی نے پوچھا کہ وہ کن کے مرید ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ان سے کون سی بے ادبی ہوئی ہے جو وہ ایسا سوال کر رہا ہے۔[3]

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ہر لقمہ منہ میں رکھتے وقت بسم اللہ کہنی چاہئے۔ جب کھانا ختم ہو جائے تو الحمدُ للہ کہے۔ کھانے کے دوران میں پانی نہ پیا جائے کیونکہ داہنا ہاتھ آلودہ ہوتا ہے اور اس سے گلاس بھی خراب ہو جائے گا اور اس میں کھانے کے ریزے بھی گر جائیں گے۔ بائیں ہاتھ سے پانی پینا منع ہے۔ درویشوں کے ہاں یہ رواج ہے کہ وہ دستر خوان پر شوربا پیش کرتے ہیں تاکہ حلق خشک نہ ہو اور پانی پینے کی نوبت نہ آئے۔ اگر کسی شخص کو ضرورت پڑے تو وہ شوربا پی لے' پانی نہ پئے۔ کھانے کے دوران میں سلام کا جواب نہ دے' کیونکہ درویشوں کے ہاں کھانا بھی عبادت سمجھا جاتا ہے اور عبادت میں مخل ہونا مناسب نہیں۔[4]

ایک بار ایک شخص حضرت برہان الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت موصوف کھانا

---

۱ - احسن الاقوال' ورق ۱۶ الف۔

۲ - ایضاً۔

۳ - ایضاً۔

۴ - احسن الاقوال' ورق ۱۷ الف۔

تناول فرما رہے تھے۔ اس نے سلام کیا۔ حضرت خاموش رہے۔ وہ شخص بھی کھانے میں شریک ہو گیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد حضرت نے اس کی تعظیم کی اور فرمایا کہ درویشوں کا یہی طریقہ ہے جو اس نے اختیار کیا تھا۔[1]

درویش کے لئے لازم ہے کہ وہ دستر خوان پر ہی روٹی توڑے اور جب تک ایک روٹی ختم نہ ہو جائے' دوسری روٹی نہ اٹھائے۔ دستر خوان پر روٹیوں کے ٹکڑے کرنے مناسب نہیں ہیں اور نہ کوئی ٹکڑا باقی چھوڑنا مناسب ہے۔ دستر خوان سے ٹکڑے اٹھا کر کھانے میں بڑی فضیلت ہے۔[2]

ایک بار خواجہ شمس الملک حضرت برہان الدین غریبؒ کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اتنے میں ایک بلی کے بولنے کی آواز آئی۔ شمس الملک نے بلی کی آواز سن کر روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے آگے ڈال دیا۔ شیخ نے کہا کہ تمہیں اس کی اجازت ہے لیکن یہ کام خادم کو کرنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ کسی کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ میزبان کی اجازت کے بغیر کسی کو لقمہ دے۔[3]

اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ خادم اور شیخ کو پھل اور کھانے کا دوگنا حصہ دیا جاتا تھا' تاکہ اگر کوئی شخص بعد میں آئے تو اسے بھی دے سکیں۔

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش بے وضو کھانا نہ کھائیں کیونکہ ان کے نزدیک اس سے زیادہ بری اور کوئی بات نہیں ہے۔ اگر کسی کے حصے میں کھانے کی کوئی کڑوی چیز آ جائے تو اسے چاہئے کہ اسے بلا کراہت کھا لے' کیونکہ وہ اس کے حصے میں آئی ہے۔ مولانا یُوسف چندیری مجلس میں کڑوا کھیرا اس طرح مزے سے کھایا کرتے تھے جیسے حلوہ کھا رہے ہوں۔[4]

درویشوں کی مجلس میں کوئی شخص کُلی کرتے وقت آواز نہ نکالے ورنہ پانی دستر خوان پر گرے گا اور اس سے کراہیت پیدا ہو گی۔ کھانے کے بعد حاضرین کو خلال مہیا کئے جائیں' جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدینؒ کے ہاں خلال دینے کی خدمت لطیف الدین کے ذمے تھی۔[5]

کھانے کے بعد ہاتھ دُھلانے کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے خادم اپنے ہاتھ دھوئے اور پھر دوسروں کے ہاتھ دھلائے۔ حضرت برہان الدینؒ ہاتھ دھوتے وقت دو بار سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے

---

۱ - ایضاً۔
۲ - ایضاً۔
۳ - ایضاً" ورق ۱۷ ب۔
۴ - احسن الاقوال ورق ۱۷ ب۔
۵ - ایضاً" ورق ۱۹ ب۔

تھے۔ ایک بار حضرت نصیر الدین محمودؒ کے استفسار پر انہوں نے فرمایا کہ موصوف ایک بار فاتحہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسری بار سلطان جیؒ کی روح کو ایصال ثواب کے لئے پڑھتے ہیں[۱]

ہاتھ دھونے کے بعد پان پیش کیا جاتا تھا۔ پان کھانے کے آداب یہ تھے کہ خالی پان مُنہ میں رکھے اور پان مُنہ میں ڈالتے وقت منہ زیادہ نہ کھولے تاکہ دوسروں کی نظر نہ پڑے۔ پان مُنہ میں رکھنے کے بعد چھالیہ مُنہ میں ڈالے اور اس بات کا خیال رکھے کہ ایک دم ساری چھالیہ مُنہ میں نہ ڈال لے بلکہ ایک ایک ٹکڑا کر کے ڈالے[۲]

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مجلس میں مخلوق اور مجد دو طرح کے لوگ جمع ہوں تو مجد کو مخلوق پر فضیلت دی جائے[۳]

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدینؒ کے ہاں نمک دان کو "اَبُو الفتح" اور دستر خوان کو "بساط الرحمت" کہا کرتے تھے۔ اسی طرح روٹی کو بقیہ بساط الرحمت' کسرہ یا فضلہ کا نام دیا گیا تھا۔[۴]

حماد کاشانی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حضرت کے سامنے سلطان جیؒ کی مریدی کا دعویٰ کرتا تھا تو حضرت فرماتے کہ اس پر گواہ لاؤ یعنی سلطان جیؒ کے اخلاق میں سے کوئی چیز پیش کرو۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان لوگوں کو خلال دیا جائے تو انہیں خلال کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے اور دعویٰ کرتے ہیں سلطان جیؒ کی مریدی کا[۵] (اس سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ شیخ اپنے مریدوں کی کس انداز سے تربیت کیا کرتے تھے۔)

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو چاہئے کہ جب وہ پیر کی خدمت میں آئے تو بائیں طرف سے نہ آئے' سامنے سے آئے اور سلام عرض کرے۔ وہ جتنی دیر وہاں رہے' اپنی نظریں نیچی رکھے اور زیادہ باتیں نہ کرے۔ شیخ جو بات پوچھے صرف اسی کا جواب دے اور واپسی پر شیخ کی طرف پشت نہ کرے[۶]

قول سوم: در حُسن عقیدۂ اصحاب اعتقاد

---

۱ - ایضاً" ورق ۲۰ الف۔

۲ - ایضاً"۔

۳ - احسن الاقوال' ورق ۱۸ الف۔

۴ - ایضاً" ورق ۱۹ الف۔

۵ - ایضاً" ۱۹ ب۔

۶ - ایضاً" ورق ۲۰ ب۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جیؒ نے آئینہ دیکھا تو ریش میں ایک سفید بال نظر آیا۔ اسے دیکھ کر سلطان جیؒ نے فرمایا "الحمدُ للہ میں نے ایک سیاہ بال بابا صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔"ؔا

ایک روز مولانا فرید الدین' حضرت کے دستر خوان پر موجود تھے۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور کھانے سے فراغت کے بعد کہنے لگے "آپ کا کھانا "محی دل" ہے اور جنت کا کھانا "محی نفس" ہو گا۔ اس لئے یہ اس سے افضل ہے۔"ؔ۲

جامع ملفوظات حمّاد بن عمّاد کاشانی کے حقائی رکن الدین کو سلطان نے دہلی سے دولت آباد جانے کا حکم دیا۔ وہ ڈاک کے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ حمّاد لکھتے ہیں کہ دوران سفر وہ ہر صبح نمازِ فجر کے بعد دہلی کی طرف رخ کر کے اپنا چہرہ زمین پر ملا کرتے تھے۔ حمّاد کاشانی اس پر شاہد ہے کہ جب کبھی خواجہ قطب الدین دبیر، سلطان جیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے جاتا تو گنبد پر نظر پڑتے ہی اپنا چہرہ زمین پر ملتا۔ اس نے کبھی غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین) کی طرف مُنہ کر کے نہیں تھوکا تھا۔ؔ۳

قول چہارم: در آداب آمدن مرید در خدمتِ پیر و رعایتِ آداب در وقتِ تقریر۔ ایک بار حضرت برہان الدین غریبؒ، سلطان جیؒ کی زیارت کے لئے دہلی سے غیاث پور کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کا ایک واقف کار انہیں زبردستی اپنے گھر لے گیا اور ناشتہ کرایا۔ حضرت ناشتے سے فارغ ہو کر غیاث پور کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ بھول گئے ان دنوں دہلی اور غیاث پور کے درمیان رہزن مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ حضرتؒ کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ان کے کپڑے ہی نہ اتروا لیں۔ حضرت اس طرف سے کئی بار گزرے تھے' اس کے باوجود راہ گم کر بیٹھے اور باوجود کوشش کے انہیں راستہ نہ ملتا تھا۔ معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے گھر سے سلطان جیؒ سے ملنے کی نیت سے نکلے تھے لیکن راستے میں کسی واقف کار کے ہاں چلے گئے۔ یہ اسی بدنیّتی کا ثمر ہے۔ انہوں نے فوراً توبہ کی تو انہیں راستہ مل گیا۔ؔ۴

حضرت فرماتے ہیں کہ جب کبھی خواجہ شمس الدین' سلطان جیؒ کی زیارت کو جاتے تو دونوں ہاتھ آگے باندھ کر چلتے۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۲۲ الف۔
۲ - احسن الاقوال' ورق ۲۲ ب۔
۳ - ایضاً" ورق ۲۳ ب۔
۴ - ایضاً" ورق ۲۵ الف۔

قول پنجم: در آدابِ بیعت

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ بیعت کے دن عقیدت مند روزہ رکھے، صدقہ دے اور نماز ادا کرے۔ شیخ عقیدت مند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے:

عہد کردی باین شکستہ و خواجۂ این شکستہ و خواجۂ خواجۂ این شکستہ و خواجگان چشت و تابعین و تبع تابعین و با رسولِ رب العلمین و با حاملانِ عرش و باحضرتِ پاک جل و علا چشم نگاہداری و زبان نگاہداری، بد کسے را نگوئی بد کسے را نہ اندیشی و کسی را مضرت نرسانی و گرد مناہی نگردی و بر جادۂ شرع باشی، ہمبرین جملہ عہد کردی و ہمبرین شرط باشی۔[۱]

ترجمہ: کیا تو اس شکستہ، اس شکستہ کے مرشد اور اس شکستہ کے مرشد کے شیخ، خواجگانِ چشت، تابعین، تبع تابعین، رسولؐ رب العلمین، حاملانِ عرش اور اللہ جل شانہٗ سے یہ عہد کرتا ہے کہ اپنی نگاہ اور زبان پر قابو رکھے گا۔ کسی کی بدگوئی نہیں کرے گا، کسی کا بُرا نہیں سوچے گا، کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا، بُرے کاموں سے اجتناب کرے گا اور جادۂ شرع پر قائم رہے گا۔ تو ان سب باتوں کا عہد کرتا ہے اور ان شرائط پر قائم رہے گا۔

مرید کہے کہ وہ ان سب باتوں پر عمل کرنے کا عہد کرتا ہے۔

اس کے بعد شیخ قینچی لے کر اس کے سر کے دائیں جانب سے اور پھر بائیں جانب سے تھوڑے سے بال کاٹے اور سر پر ٹوپی پہنا دے۔ ٹوپی پہناتے وقت شیخ کہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہذااللباس التقویٰ و لباس العافیۃ۔

مرید اپنا سر شیخ کے قدموں پر رکھ دے اور اس کے بعد دوگانہ ادا کرے۔ دوگانہ ادا کرنے کے بعد مرید حاضرینِ مجلس کے ساتھ مصافحہ کرے۔ بعد ازاں شیخ اسے اس کی قابلیت کے مطابق تلقین کرے۔[۲]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ بیعت کے لئے تین چیزیں شرط ہیں:

---

۱ - احسن الاقوال، ورق ۲۶ الف، ۲۶ ب۔

۲ - احسن الاقوال، ورق ۲۶ ب۔

۱- حلق یا قصر- ۲- کُلاہ- ۳- اقرار بیعت-

اگر ان میں سے ایک بھی رہ جائے تو بیعت نہ ہو گی[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ جس روز سلطان جیؒ نے انہیں بیعت کیا تھا اس روز انہیں حفظِ ایمان اور اَوّابین کی تلقین کی تھی- حضرت نے بیعت ہوتے وقت سلطان جیؒ سے پوچھا کہ وہ حلق کرائیں یا قصر؟ سلطان جی نے فرمایا کہ ہر بال کی جڑ میں شیطان کا محل ہے' اس لئے وہ حلق کروائیں بابا فرید الدین مسعودؒ نے سلطان جیؒ کو بھی حلق کا حکم دیا تھا اور اس وقت یہ حدیث پڑھی تھی:

ان الشیطان تحت کل شعرہ[2]

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے سر پر مقراض چل جائے اس کے لئے بال رکھنے حرام ہیں- ایک مجلس میں خواجہ غوری نے حضرت سے پوچھا کہ کتنے عرصہ بعد حلق کروانا چاہئے؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہفتے میں دو بار-[3]

حماد بن عماد کا شانی تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے والد حضرت برہان الدینؒ سے بیعت ہونا چاہتے تھے لیکن وہ شرفِ بیعت حاصل کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے- ایک روز حماد نے حضرت سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی نیت چونکہ نیک تھی' اس لئے وہ مرحوم کو اپنی فرزندی میں قبول کرتے ہیں-[4]

قول ششم: دربیانِ لباس

قول ششم کے تحت جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک بار لکھنوتی سے کسی عقیدت مند نے سلطان جی کے لئے لباس تیار کروا کے بھیجا تو انہوں نے اسے دیکھتے ہی فرمایا کہ انہوں نے بابا صاحبؒ کو کبھی ایسے لباس میں نہیں دیکھا' اس لئے وہ کیوں کر اسے پہن سکتے ہیں- اتفاق سے اسی مجلس میں بابا صاحبؒ کا ایک مرید بھی موجود تھا- اس نے کہا کہ اس نے بابا صاحبؒ کو اس لباس میں دیکھا ہے- سلطان جی نے فرمایا "پھر میں یہ لباس پہن لیتا ہوں- اب تم ذمہ دار ہو[5]

۱- ایضاً" ورق ۲۶ الف-

۲- ایضاً" ورق ۲۷ الف-

۳- ایضاً" ورق ۲۷ ب- مخدوم جہانیاںؒ الدرالمنظوم میں فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی کی رضا مندی کے بغیر حلق نہ کروائے- الدرالمنظوم مطبوعہ ملتان ۷۷-۱۳۷۶ھ ص ۲۲۱)-

۴- احسن الاقوال' ورق ۲۸ الف-

۵- ایضاً" ورق ۲۹ ب- اس کپڑے کا نام جمر کی لکھا ہے-

قول ہفتم: دربیانِ محافظتِ خلعت و غائیں پیر

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ جب وہ دہلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے تو ان کے ساتھیوں نے چارپائی کو ڈولی میں تبدیل کر کے انہیں اس میں بٹھا لیا۔ اس کے پاس سلطان جیؒ کا ایک عصا تھا۔ انہوں نے اس کو ڈولی کے ایک طرف باندھ لیا اور اسے ہی بدرقہ سمجھتے رہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ موصوف دورانِ سفر اسی کی پناہ میں رہے۔[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر مرید کے پاس اپنے پیر کے جُوتے ہوں تو دوران سفر انہیں اپنے سر پر دھر لے اور رات کو سوتے وقت انہیں سینے پر رکھ لے۔ حضرت نظام الدینؒ نے خواجہ قطب الدین دبیر کو اپنا شب خوابی کا لباس عطا فرمایا تھا، خواجہ نے اسے سقف میں لٹکا لیا اور رات کو اسی کے نیچے سونے لگا۔[2]

قول ہشتم: دربیان معاملہ نفس امارہ و فضائل ناہموارہ

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ قبرستان سے گزرے۔ وہاں ایک عورت ایک قبر کے پاس بیٹھی رُو رہی تھی۔ موصوف بھی اس کے پاس بیٹھ کر رُونے لگے۔ کسی راہ گیر نے ان سے کہا کہ وہ عورت تو اپنے کسی عزیز کی یاد میں رُو رہی ہے۔ حضرت کس کو رُو رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ وہ اپنے مُردہ دل کو رُو رہے ہیں۔[3]

حضرت برہان الدینؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا وجیہہ الدین یُوسف فرمایا کرتے تھے کہ وہ جب بھی نفس کے کسی عیب کو ختم کرتے ہیں تو دوسرے عیب سر اٹھاتے ہیں۔

قول نہم: در بیان حسن معاملہ

حضرت برہان الدینؒ کے زمانے میں ایک چادر دس گیارہ جیتل میں آ جاتی تھی اور بیچنے والا ایک جیتل نفع کماتا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اس سے زیادہ نفع کمانا جائز نہیں سمجھتے تھے۔[4]

قول دہم: در بیانِ فضیلتِ محاسن

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک بچے نے بایزیدؒ کو بلایا۔ موصوف اس کیطرف بڑھے۔ اتفاق سے دروازے پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا، اس نے انہیں واپس کر دیا۔ بچے نے کئی بار

---

۱ ۔ ایضاً، ورق ۳۲ الف۔

۲ ۔ ایضاً۔

۳ ۔ احسن الاقوال، ورق ۳۳ الف۔

۴ ۔ ایضاً، ورق ۳۵ الف۔

انہیں بلایا اور موصوف ہر بار اس کے بلانے پر اس کی طرف متوجہ ہوتے لیکن دروازے تک جا کر واپس لوٹ جاتے۔ ایک شخص نے' جو یہ منظر دیکھ رہا تھا' ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ وہ بچے کے بلانے پر اسے خوش کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھتے ہیں اور معمّر بزرگ کے فرمان کا خیال کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جیؒ نماز ادا کر رہے تھے کہ شیطان نے ان کا کان کھجایا۔ حضرت نے اسے مخاطب کر کے کہا "اے جوانمرد بس کر"۔ حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ یہ سلطان جیؒ کا اخلاق تھا کہ موصوف شیطان کو بھی جوانمرد کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔[2]

قول یاز دہم: در بیانِ اظہارِ عقیدت اصفیا و اخبارِ کرامتِ اولیاؒ

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جیؒ نے امیر خسروؒ کو کیلوکھڑی کے کوتوال کے نام ایک سفارشی خط دیا۔ امیر وہ خط لے کر کوتوال کے پاس گئے۔ اتفاق سے اس وقت وہ دریا کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس نے وہ خط پڑھ کر دریا میں پھینک دیا۔ امیر خسروؒ نے واپس آ کر سارا واقعہ سلطان جی کے گوش گزار کیا۔ انہوں نے فرمایا "او خود را درآب رَوان کرد"۔ اگلے روز شیطان (سلطان؟) نے کوتوال کو قلعے کی دیوار سے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔[3]

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ سلطان علاء الدین کا فرزند خضر خان' سلطان جیؒ کا مرید ہو گیا۔ ایک روز اس کے ساتھیوں نے مجلسِ طرب آراستہ کی اور شراب کا ایک جام اس کی طرف بڑھایا۔ خضر خان اس جام کو لبوں سے لگایا ہی چاہتا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سلطان جیؒ انگشت بدنداں وہاں کھڑے ہیں۔ خضر خان نے جام صراحی پر دے مارا اور مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت فرمانے لگے "خواجگانِ ما فرزندانِ خود را در معصیت افتادن نگزارند۔ اگر در معصیت باشند از جہان نروند تا طاب نشوند۔"[4]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک بار کسی شخص نے سلطان جیؒ کی محفل میں بایزید بسطامیؒ کی بزرگی کا ذکر کیا۔ اس پر سلطان جی نے فرمایا "ہمارے ہاں بھی بایزیدؒ ہے۔" حاضرین نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ سلطان جی نے فرمایا "اس وقت وہ جماعت خانہ میں ہے۔" ان کا خادمِ خاص اقبال فوراً" جماعت خانہ پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اتنے میں حضرت برہان الدینؒ وہاں پہنچ گئے۔ اقبال نے ان سے کہا کہ سلطان جی نے ابھی ابھی ان کے

---

۱ - ایضاً" ورق ۳۶ الف۔

۲ - احسن الاقوال' ورق ۳۶ ب۔

۳ - ایضاً" ورق ۳۷ ب۔

۴ - ایضاً" ورق ۳۹ ب۔

بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔[1]

قول دوازدہم: در فضیلتِ صایم و صَوم

حمّاد کاشانی سے روایت ہے کہ حضرت برہان الدین غریبؒ داؤدی روزہ رکھا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت نے فرمایا کہ روزے سے چار چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ روزے سے خاموشی حاصل ہوتی ہے اور خاموشی سے فکر یار پیدا ہوتا ہے۔ اسی فکر سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور معرفت کے ذریعے ہی یار تک پہنچتے ہیں۔[2]

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ روزہ دار سحری ضرور کھائے خواہ وہ پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔

قول سیزدہم: در بیانِ صدق و صفا

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص جھوٹ سے احتراز کرے گا' وہ جو بات زبان پر لائے گا ویسا ہی ہو گا۔ اس ضمن میں انہوں نے بابا فرید الدین گنج شکر اور والئی ملتان کی خط و کتابت کا بھی ذکر کیا ہے۔[3]

قول چہاردہم: در بیانِ تاثیرِ اصحاب نعمت

جامع ملفوظات' حضرت برہان الدینؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک معلّم حضرت صدر الدین ملتانیؒ کو پڑھانے پر مامور ہوا۔ ایک دن اُستاد و شاگرد کے درمیان کسی مسئلہ پر بحث ہو گئی۔ دوران بحث حضرت صدر الدینؒ نے فرمایا "این سخن از بابا (حضرت بہاء الدین زکریاؒ) شنیدہ ام"۔ اُستاد نے کہا کہ اسے اس میں کلام ہے۔ صدر الدینؒ نے فرمایا "بابا از شیخ الشیوخ (شہاب الدین عمر سہروردیؒ) شنیدہ است۔" اُستاد نے پھر کہا "الکلام فیہ"۔ صدر الدینؒ نے اپنے والد بزرگوار سے اُستاد کی شکایت کی۔ حضرت زکریاؒ نے فرمایا کہ اُستاد نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے' وہ اس سے در گذر کرتے ہیں لیکن شیخ الشیوخؒ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے' اسے معاف نہیں کر سکتے۔ حضرت زکریاؒ نے ایک خادم کو بلا کر کہا کہ اُستاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے جماعت خانہ میں لے جائے اور حاضرین کو بتا دے کہ وہ تھپڑ کھانے کے لائق ہے۔ حضرت زکریاؒ کے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ اس واقعہ کے بعد وہ معلّم جس مجلس میں جاتا وہاں سے تھپڑ کھا کر ہی اٹھتا۔[4]

---

۱ - احسن الاقوال' ورق ۴۰ الف۔
۲ - "ایضاً"۔
۳ - "ایضاً" ورق ۴۱ الف۔
۴ - احسن الاقوال' ورق ۴۳ ب۔

قول ہژ دہم: در بیانِ آدابِ توکّل و صبر و تحمّل و فاقہ و فقر

حضرت فرماتے ہیں کہ سلطان جیؒ کی خانقاہ میں ایک مسافر آیا اور چند روز وہاں رہ کر شہر چلا گیا۔ شہر میں اس کے کئی رشتہ دار رہتے تھے لیکن وہ ان میں سے کسی کے ہاں نہ ٹھہرا اور مسجد میں جا کر توکّل کی نیت کر کے بیٹھ گیا۔ کئی روز گزر گئے لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ آخر کار وہ بھوک سے نڈھال ہو کر سلطان جیؒ کی خدمت میں آیا اور ان سے سوال کرنے لگا کہ اگر متوکّل کو پہلے دن کچھ نہ ملے تو وہ کیا کرے؟ سلطان جیؒ نے فرمایا "صبر"۔ اس نے پوچھا کہ اگر دوسرے روز بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا "صبر"۔ مسافر نے کہا کہ اگر تیسرے روز بھی کچھ نہ ملے تو؟ سلطان جی نے فرمایا کہ اس کا توکّل نہیں تھا کیونکہ جو شخص خدا پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتا ہے' خدا اسے فراموش نہیں کرتا۔[1]

قول بست ویکم: در بیانِ فضیلتِ انفاق و احسان

حضرت فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے سلطان جیؒ سے سوال کیا کہ فقیر صابر اچھا ہے یا غنی شاکر؟ انہوں نے جواب دیا کہ دونوں ہی اچھے ہیں۔[2]

حضرت برہان الدینؒ نے اس ضمن میں بایزید بسطامیؒ کی کئی مثالیں دی ہیں۔ اس کے علاوہ ورد و وظائف پڑھنے اور نفلی نمازیں ادا کرنے کے کئی طریقے بیان کئے ہیں۔

قول بست و پنجم: دربیانِ وضو و نماز و نوافل و اوراد

اس قول کے تحت حضرت برہان الدینؒ نے حفظِ ایمان کے لئے دوگانہ پڑھنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ نماز مغرب کی سنّتوں کے بعد یہ دوگانہ پڑھنا چاہیے۔ اس کی ترکیب یوں ہے کہ پہلی رکعت میں سات بار سورۂ فاتحہ اور ایک بار قل اعوذ برب الناس پڑھے۔ سلام پھیرنے کے بعد تین یا سات بار "یا حي یا قیوم ثبتني علی الایمان" کہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ سلطان جیؒ کہا کرتے تھے کہ اس پر عمل کرنے والے کا ایمان سلامت رہے گا۔"[3]

قول بست و ششم: در آدابِ محفلِ سماع

حضرت برہان الدینؒ سماع بڑے ذوق شوق کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ اس قول کے تحت انہوں نے سماع سننے کے آداب بتائے ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ سماع میں فکر اور گریہ ہونا

۱۔ احسن الاقوال' ورق ۴۹ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۵۳ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۵۹ ب۔

چاہئے' ورنہ یہ فتنہ ہے۔ سماع کے دوران میں سامع با وضو رہے۔ وہ محفلِ سماع میں گوش و ہوش کے ساتھ بیٹھے اور پانی پینے یا پان کھانے سے احتراز کرےلے

حضرت فرماتے ہیں کہ بے نیت ہاتھ اٹھانے والا درویش سماع نہ سنے۔

حضرت نے ایک دن اپنی مجلس میں فرمایا کہ ایک بار سلطان جیؒ کے ہاں سماع جاری تھی اور ان کے مریدوں پر وجد طاری ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں حضرت مطبخ میں تشریف لے گئے۔ انہیں اس وقت بڑی سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ مطبخ میں موجود کسی شخص نے شربت کا گلاس پیش کیا تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرید تو محفلِ سماع میں اپنا خون پئیں اور وہ شربت نوش کریںٹلہ

حماد کاشانی اس پر شاہد ہے کہ ایک بار سخت گرمی کے موسم میں حضرت برہان الدینؒ کے ہاں محفلِ سماع جاری تھی اور لوگوں کو وجد آ رہا تھا۔ حضرت نے دیکھا کہ محمود تُرک ایک حوض کے کنارے کھڑا ہوا کھا رہا ہے۔ حضرت نے اسے مخاطب کر کے فرمایا "اے بے ذوق درویشان در خونابہ اند تو باد بکوری۔"سلہ

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ سماع میں شیخ پہلے کھڑا نہ ہو۔ اسے چاہئے کہ جب تک حاضرین میں سے کسی کو وجد نہ آئے' وہ خود پر وجد طاری نہ کرے۔ ایک روز محفلِ سماع میں حضرت برہان الدینؒ کی حالت غیر ہو گئی۔اس کے باوجود انہوں نے آدابِ محفل کا خیال رکھا اور اپنے ایک ساتھی خواجہ مبارک معروف سے کہا کہ وہ پہلے اٹھے جب وہ اٹھا تو حضرت بھی اٹھ کر وجد کرنے لگےسکہ

حضرت فرماتے ہیں کہ جب بابا فرید الدین گنج شکرؒ کو حال آتا تو موصوف اپنے ایک مرید محمود سے کہتے "کیا تو زندہ ہے؟" محمود کھڑا ہو جاتا تو پھر بابا صاحبؒ بھی کھڑے ہو جاتےھ حضرت فرماتے ہیں کہ دورانِ وجد شیخ کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ اس کی دستار نہ کھلنے پائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ فوراً اسے درست کر لے ورنہ شہر پر آفت آ جائے گی۔ ایک بار دورانِ وجد سلطان جی کی دستار کھل گئی تو انہوں نے فوراً اسے درست کر لیا۔ ان

---

۱ - احسن الاقوال ورق ۷۰ ب
۲ - ایضاً' ورق ۷۱ ب
۳ - ایضاً۔
۴ - احسن الاقوال۔
۵ - ایضاً۔

کے کسی مخالف نے کہا کہ اگر ان پر حالت طاری تھی تو پھر انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ان کی دستار کھل گئی ہے' اور اگر انہیں معلوم ہو گیا تھا تو پھر حالت کیسی تھی؟ سلطان جی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ انہیں شہر کی پریشانی پسند نہ تھی' اس لئے انہوں نے حال چھوڑ کر اپنی دستار سنبھال لی۔[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ سماع کے دوران میں علیک سلیک نہ کی جائے اور شور و شغب سے بھی اجتناب کیا جائے اس لئے سماع کے لئے کوئی دن مقرر کرنا چاہئے' ورنہ وہ جگہ تباہ ہو جائے گی۔[2]

حضرت برہان الدینؒ کے ملفوظات میں کل ۲۹ اقوال ہیں۔ میں نے ان سب کا ذکر نہیں کیا اور بعض اقوال کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ جو اقوال میں نے چھوڑے ہیں ان میں فضیلتِ تجرید از خلایق' فضیلتِ اصحابِ قامت' مذمتِ طمع' علومت' قمرِ حرام' مذمتِ حرص و شہوت' فضیلتِ صدقہ' وضو و نماز' قبولِ فتوحات از مردمان اور کراماتِ مخدوم شامل ہیں۔

اُردو کی ابتداء

حضرت برہان الدینؒ کے ملفوظات میں کھٹ' ڈولہ' کھرٹی اور چجّ جیسے ہندوی الفاظ ملتے ہیں جو رُوزمرہ کی گفتگو میں شامل تھے۔ ایک جگہ انہوں نے ایک شعر بھی نقل فرمایا ہے۔

ایک علمی انکشاف

حضرت برہان الدینؒ کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ جامع ملفوظات کے بھائی خواجہ مجد الدین کاشانی نے حضرت برہان الدینؒ کے حالات میں "غرایب الکرامات و عجایب المکاشفات" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی۔[3]

پنجاب اور دہلی میں اَمن و امان کی غیر تسلّی بخش صورتِ حال

حضرت کے ملفوظات میں جانور یا سامان گم ہونے کے کئی واقعات ملتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب میں امن و امان کی صورت تسلّی بخش نہ تھی۔ پنجاب تو خیر ایک دُور افتادہ علاقہ تھا' خود دارالحکومت دہلی کی یہ حالت تھی کہ شہر اور غیاث پور کے درمیان مسافر لُٹ جاتے تھے۔ حضرت گیسودرازؒ کے ملفوظات اس کے بعد قلمبند ہوئے ہیں۔ ان میں یہ مرقوم ہے

---

۱ - ایضاً" ورق ۷۲ الف۔
۲ - ایضاً" ورق ۷۲ ب۔
۳ - احسن الاقوال' ورق ۷۲ الف۔

"کہ میواتی لوٹ مار کرتے ہوئے دہلی کی فصیل تک آ جاتے تھے اور ان کے خوف سے لوگ نمازِ عصر کے فوراً" بعد شہر میں آ جاتے تھے[1] سلطان غیاث الدین بلبن نے میواتیوں کی روک تھام کے لئے جو اقدامات کئے تھے' اس کے جانشین انہیں برقرار نہ رکھ سکے۔

✪✪✪

۱۔ محمد اکبر حسینی' جوامع الکلم' مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ' ص ۲۴۹ — دران ایّام میوان می آیند میزنند میروند۔ بعد نمازِ دیگر بالای حوضِ سلطان کسی نمی باشد ہمہ درونِ شہر می آیند۔

نفائس الانفاس

صاحبِ ملفوظات: حضرت برہان الدین غریبؒ کا شمار برِعظیم پاک و ہند کے ان اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنہوں نے ہماری دینی، روحانی اور معاشرتی تاریخ میں اپنی سیرت و کردار کے اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

حضرت برہان الدینؒ، شیخ العالم فرید الدین گنج شکرؒ کے خلیفۂ اوّل شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے بھانجے تھے۔ موصوف ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں ہانسی میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن ہانسی کے پاکیزہ روحانی ماحول میں گزرا۔ جوانی کے عالم میں موصوف اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر دہلی تشریف لے گئے۔[1] دہلی کا شمار اس زمانے میں اسلامی دنیا کے عظیم علمی مراکز میں ہوتا تھا۔ منگولوں کے حملوں کی وجہ سے وسطِ ایشیاء سے سینکڑوں کی تعداد میں علماء و فضلاء ہجرت کر کے برِعظیم پاک و ہند چلے آئے تھے اور ان میں سے بیشتر بزرگوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔

مؤرخِ شہیر ضیاء الدین برنی نے تاریخِ فیروز شاہی میں ایسے علماء کی طویل فہرست دی ہے جس کے علم کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بجتا تھا۔[2] برنی کا بیان ہے کہ ان علماء میں سے ہر ایک علامۂ وقت تھا اور اپنے فن کا ایسا امام سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت کی اسلامی دنیا یعنی بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان، رے اور روم میں بھی اس کا ثانی نہیں مل سکتا تھا۔ علم کا کوئی شعبہ ہو، منقولات و معقولات کا کوئی گوشہ ہو، تفسیر ہو یا فقہ اور اُصولِ فقہ، اُصولِ دین ہو یا نحو و لغت کلام ہو یا منطق، ہر فن میں کامل دستگاہ رکھنے والے یہاں موجود تھے۔ بعض علماء تو امام غزالیؒ اور امام رازیؒ کی علمی وجاہت اور تبحر کے مالک تھے۔ فقہ کے ایسے ایسے ماہرین موجود تھے کہ ابو یوسفؒ اور محمد شیبانیؒ کا مرتبہ ان کو حاصل تھا۔ مولانا جمال

۱۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء ج ۴، مقالہ "برہان الدین غریبؒ"

۲۔ ضیاء الدین برنی، تاریخِ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، حصہ دوم، ص ۱۸۴۔

الدین شاطبیؒ، مولانا علاء الدین مقریؒ و خواجہ زکی ایسے ماہرین قرأت تھے کہ خراسان اور عراق میں بھی ان کے مرتبہ کا کوئی قاری نہیں مل سکتا تھا۔ اسلامی دنیا کے دُور دراز خطوں سے علماء دہلی آتے تھے اور ان بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا اپنے لئے باعث عزت و سعادت سمجھتے تھے۔ جس علمی تصنیف پر یہاں کے عالم مُہر توثیق ثبت کر دیتے وہ علمی دنیا میں معتبر سمجھی جاتی تھی۔[1] دہلی کے اسی علمی ماحول میں حضرت برہان الدینؒ نے علوم مروّجہ کی تکمیل کی اور اپنی سیرت و کردار کو ایک خاص قسم کے دینی سانچے میں ڈھالا۔ ۳۷ سال کی عمر میں انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور اپنے مرشد کے وصال تک ان سے جدا نہ ہوئے۔

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بیعت ہونے سے پہلے انہوں نے خواب دیکھا کہ موصوف ایک خندق میں گرے پڑے ہیں اور کوشش کے باوجود باہر نہ نکل سکے۔ سلطان المشائخ نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر خندق سے باہر نکالا۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد موصوف نے سلطان جی کی مریدی کا شرف حاصل کیا۔[2]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ موصوف چھ سات سال کے تھے کہ عید آگئی۔ وہ اس روز شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی خانقاہ کے احاطے میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ بچوں کے ساتھ نماز عید ادا کی جائے۔ انہوں نے اپنے ہمجولیوں سے کہا کہ آئیں مل کر عید کی نماز ادا کریں۔ امامت کے لئے حضرت نے اپنا نام پیش کیا۔ حضرت برہان الدین نے بیعت ہونے کے بعد یہ واقعہ سلطان المشائخ کو سنایا اور یہ بھی عرض کیا وہ اسی خانقاہ کی زمین کی برکت سے درویش بنے ہیں۔ اب ان کی یہ خواہش ہے کہ وہ خطیب بنیں۔ سلطان جی نے فرمایا کہ وہ خطیب نہیں بنیں گے کچھ اور بنیں گے۔[3]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ موصوف صاحبِ شوق و ذوق تھے۔ اس زمانے کے فضلاء، خصوصاً امیر خسروؒ اور امیر حسن علاء سجزی ان کے دامِ محبت میں اسیر تھے۔[4] حضرت برہان الدین کا ذوقِ سخن بھی کسی سے کم نہ تھا۔ عماد کاشانی لکھتے ہیں کہ ایک مجلس میں انہوں نے نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنون اور خاقانی کی تحفۃ العراقین سے اشعار پڑھ کر سنائے تھے۔[5] ان کے اور حضرت نصیر الدین چراغِ دہلیؒ کے مابین بڑی محبت تھی، چراغ دہلیؒ

۱۔ خلیق احمد نظامی، "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۲۲۷۔

۲۔ عماد کاشانی، نفائس الانفاس "مخطوطہ کتابخانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ" نمبر ۳۳۳، ص ۵۳۔

۳۔ عماد کاشانی، نفائس الانفاس، ص ۱۵۰ (مخطوطہ پر اوراق کی بجائے صفحات کے نمبر درج ہیں)

۴۔ عبدالحق محدث دہلویؒ "اخبار الاخیار" مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۹۳ - ۹۴۔

۵۔ عماد کاشانی، نفائس الانفاس، ص ۷۰۔

اودھ سے دہلی تشریف لاتے تو ان کے ہاں قیام فرماتے۔ حضرت غریبؒ چراغ دہلیؒ کا اتنا احترام فرماتے تھے کہ ان کی طرف پشت نہ کرتے تھے۔

ایک بار حضرت برہان الدین اور چراغ دہلی نے رمضان اکٹھے گزارا۔ ایک روز حضرت غریبؒ نے ان سے کہا کہ وہ تراویح کے بعد دعا میں ہمیشہ یہ بیت پڑھتے ہیں:

ہر کس ز در تو حاجتی میخواہد
من آمدہ ام از تو ترا میخواہم

حضرت غریبؒ کے استفسار پر حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ وہ تراویح کے بعد اکثر یہ دعا مانگا کرتے ہیں:

اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی و عن جمیع المخلوقین[1]

ایک دن حضرت برہان الدین اپنے مرشدِ گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے یہ درخواست کی کہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے ان پر جو نظر ڈالی تھی اسی نظر کے صدقے میں ان پر بھی ایک نظر ڈال دیں۔[2]

سلطان المشائخ کو دکن میں اسلام کی تبلیغ کا بڑا خیال تھا۔ انہوں نے اپنے ایک خلیفہ شیخ منتجب الدین زری زربخش ہانسویؒ کو دولت آباد بھیجا تھا۔ ان کی وفات کے چند سال بعد سلطان جی نے ان کے بھائی شیخ برہان الدین غریبؒ کو اپنی دستارِ خاص، پیراہن، مصلّٰی اور شانِ خلافت دے کر دکن کی طرف روانہ کیا۔[3]

شیخ موصوف کو دکن میں قبولِ عام کا درجہ ملا۔ ان کے ایک عقیدت مند سلطان ناصر خان فاروقی والیٔ خاندیش نے ان کے نام پر بُرہان پُور آباد کیا جو دکن میں اسلامی علوم و فنون اور ثقافت کا اہم مرکز سمجھا جاتا ہے۔

حضرت برہان الدین کی سعی و کاوش سے دکن میں اسلام کی روشنی دُور دُور تک پہنچ گئی۔ ان کا انتقال ۸ ستمبر ۱۳۳۷ء کو ہوا، اور موصوف خلد آباد میں دفن ہوئے۔ ان کے احاطۂ مزار میں نظام الملک آصف جاہ اول اور ناصر جنگ شہید کی قبریں ہیں۔ حضرت کی درگاہ کے بالمقابل

۱۔ ایضاً ص ۶۸

۲۔ عماد کاشانی، نفائس الانفاس، ص ۳۔

۳۔ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ص ۳۴۔

ان کے خلیفۂ خاص شیخ زین الدینؒ کی درگاہ ہے۔ اسی درگاہ کے احاطے میں اورنگ زیب عالمگیرؒ، شہزادہ محمد اعظمؒ اور امیر حسن علاء سجزی جامع فوائد الفواد محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

حضرت برہان الدینؒ کے ایک عالم و فاضل مرید عماد کاشانی نے نفائس الانفاس کے عنوان سے ان کے ملفوظات جمع کیے۔ اسی بزرگ نے احسن الاقوال کے عنوان سے خانقاہی نظام کا ایک دستور العمل بھی تحریر کیا تھا جو حضرت برہان الدینؒ کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ احسن الاقوال کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔[1]

اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ میں حضرت برہان الدین غریبؒ پر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے ایک عالمانہ مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ ماخذ کی فہرست سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نفائس الانفاس اور احسن الاقوال فاضل مقالہ نگار کی دسترس سے دُور رہیں۔ اس لئے انہوں نے انہیں دو مختلف مصنفین کی تصانیف بتایا ہے۔ حالانکہ نفائس الانفاس میں عماد کاشانی نے شمائل الاتقیا اور احسن الاقوال قلمبند کرنے کا اعتراف کیا ہے۔[2]

جامع ملفوظات

نفائس الانفاس کے آغاز میں جامع ملفوظات نے اپنا پورا نام عماد کاشانی المعروف بالدبیر لکھا ہے۔[3] انہوں نے ایک موقع پر اپنی بیعت کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ چار بھائی تھے اور چاروں ہی حضرت برہان الدینؒ سے بیعت تھے۔[4] نفائس الانفاس کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت برہان الدینؒ نے اپنا مصلّی، مسواک اور ٹوپی جامع ملفوظات کو عطا کئے تھے۔[5]

ملفوظات جمع کرنے کا خیال

عماد کاشانی لکھتے ہیں کہ ایک روز ان کے دل میں یہ بات آئی کہ جس طرح امیر حسن علاء سجزی نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کے ملفوظات جمع کئے ہیں، کیوں نہ اسی طرح حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات جمع کر لئے جائیں۔ اس خیال کے دل میں آتے ہی انہوں نے حضرت برہان الدینؒ سے اجازت طلب کی۔ حضرت نے فرمایا ان کی بھی مدت سے یہی خواہش تھی کہ کاش کوئی ان کے ملفوظات قلمبند کر لے۔ عماد الدین کاشانی نے اجازت ملتے ہی نفائس الانفاس کے عنوان سے اپنے مرشدِ گرامی کے ملفوظات جمع کرنا شروع کر دیئے۔ جامع

---

۱ - احسن الاقوال، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، نمبر مذہب تصوف ۳۱۸۔

۲ - ایضاً" ۱۴۳، ۱۶۷، علامہ اخلاق حسین دہلوی کے خیال میں شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیا ہے ملاحظہ ہو: آئینۂ ملفوظات، مطبوعہ دہلی ۱۹۸۳ء ص ۲۵۔

۳ - عماد الدین کاشانی، احسن الاقوال، ص ۲۔

۴ - عماد کاشانی، احسن الاقوال، ص ۱۳۶۔

۵ - ایضاً" ص ۹۷۔

ملفوظات نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ملفوظات تو جمع کر رہے ہیں لیکن عقل مخدوم صاحب کی باتیں سمجھنے سے قاصر اور عاجز ہے۔[1] ملفوظات کے آغاز میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا:

این عقدِ منثور تا یوم النشور بر دلہائی جمہور صاحب دلان عالم قبول و مقبول و مطبوع و مرغوب خواہد گردانید۔[2]

آغازِ ملفوظات

عماد کاشانی نے امیر حسن علاء سجزی کی طرح ہر مجلس کی تاریخ نفائس الانفاس میں درج کی ہے۔ سب سے پہلی مجلس بروز یکشنبہ ماہِ رمضان ۷۳۴ھ کو منعقد ہوئی۔ اس روز حضرت برہان الدین علیل تھے اور سلطان المشائخ کے متعلقین ان کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، نمازِ چاشت کا وقت تھا۔ حضرت نے حاضرین سے کہا کہ موصوف علالت کی وجہ سے نمازِ چاشت ادا نہیں کر سکتے۔ اسی ضمن میں انہوں نے قاضی حمید الدین ناگوری کے حوالے سے یہ روایت بیان کی کہ حوضِ قتلغ خان کے کنارے ایک دیوانہ رہتا تھا۔ وہ رات کے وقت طویل قیام کیا کرتا تھا۔ اسی سبب سے اس کے پاؤں متورم ہو گئے اور مجبوری کی بنا پر وہ بیٹھ کر نوافل ادا کرنے لگا۔ اس عالم میں وہ کہا کرتا تھا کہ اب قدرے آسودگی ملی ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز ادا کرنے لگا ہے۔[3]

ایک روز عماد کاشانی حضرت برہان الدین کی خدمت میں پہنچے تو شہر کے بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ کاشانی نے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت برہان الدین نے غسل صحت فرمایا ہے اور لوگ ان کی صحت یابی پر ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرنے آئے ہیں۔[4]

نفائس الانفاس کے مطالعہ سے پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ حضرت برہان الدین غریبؒ کا اصل نام محمد محمود ناصر (تھا) برہان الدین اور غریب ان کے القابات تھے۔[5] عماد الدین کاشانی نے ملفوظات کے آغاز میں ان کا نام نامی اور القابات یوں تحریر کئے ہیں:

---

۱ - احسن الاقوال، ص ۳۔
۲ - ایضاً، ص ۶۔
۳ - ایضاً، ص ۶۔
۴ - ایضاً، ص ۱۲۔
۵ - ایضاً، ص ۳۔

وافر کرامت ختم المشائخ و العاشقین ملجاء الاوتاد و المجتہدین برہان الحق و الشرع والدین حجت الاسلام والدین زبدۃ الاتقیاء زین الاولیاء کاشف اسرار المعانی شارح رموز سبع المثانی معلم الہدیٰ علامت الوریٰ غوث الثقلین....[1] الحافظین الجنید فی زمانہ والفضیل فی اوانہ الشبلی فی عبادتہ و النوری فی زہادتہ کہف الصدق والیقین ملاذ الاقطاب و المحققین محمد محمود ناصر المدعو بہ غریب۔[2]

خواجہ قطب الدین بختیارؒ

حضرت برہان الدین سے روایت ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیارؒ کاکی ہر وقت مراقب رہتے تھے۔[3]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ بیماری کے عالم میں بھی حضرت نظام الدین اوراد و نوافل ترک نہ کرتے تھے۔ موصوف چند رکعتیں ادا کر کے لیٹ جاتے اور تھوڑی دیر بعد کھڑے ہو کر نوافل شروع کر دیتے۔[4]

ایک بار حضرت نظام الدین کی آنکھوں میں تکلیف ہو گئی۔اس سے بصارت میں ضعف آ گیا' یہ بات ہر کسی کو معلوم نہ تھی۔ ایک دن حضرت برہان الدین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا "برہان الدین آگے آؤ اور اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔" اس دن انہیں معلوم ہوا کہ حضرت کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ حضرت برہان الدینؒ واپس لوٹے تو بڑے فکر مند تھے۔ معاً ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ جو شخص کسی مہم کے لئے ۷۵ بار ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاہ ویرزقہ من حیث لایحتسب و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ' ان اللہ بالغ امرہ قدجعل اللہ لکل شئی قدراہ[5] پڑھے تو اس کی مراد بر آتی ہے۔ انہوں نے جماعت خانے میں بیٹھ کر اپنے شیخ کی صحت کے لئے یہ آیت پڑھنا شروع کی۔ ادھر ان کا ورد مکمل ہوا' ادھر کسی نے آ کر اطلاع دی کہ شیخ صحت یاب ہو گئے ہیں۔[6]

حضرت برہان الدین نے ایک روز حاضرین مجلس کو بتایا کہ اگر کسی کی آنکھ میں حجاب ہو

---

۱ - کاغذ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے ایک لفظ پڑھا نہ جا سکا۔

۲ - عماد کاشانی' احسن الاقوال' ص ۳

۳ - ایضاً' ص ۳۹ - خواجہ قطب الدین مدام در مراقبہ بودی۔

۴ - ایضاً' ص ۷۔

۵ - قرآن حکیم۔ سورہ الطلاق' آیت ۲/۳۔

۶ عماد کاشانی' نفائس الانفاس' ص ۷

تو اسے پانچ صد مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھنی چاہیے۔[۱]

جامع ملفوظات اپنے شیخ طریقت برہان الدین غریبؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جس زمانے میں حضرت نظام الدین بداؤں میں رہتے تھے کوئی شخص انہیں ملنے آیا۔ اس نے باہر سے "نظام الدین" کہہ کر انہیں آواز دی۔ حضرت نے سوچا کہ یہ ان کا نام نہیں ہے۔ (حضرت کا نام محمد بن احمد بخاری تھا) لیکن گھر میں اس نام کا کوئی دوسرا شخص بھی موجود نہیں ہے۔ حضرت باہر نکلے تو اب جو شخص بھی ادھر سے گزرتا وہ انہیں دیکھ کر "السلام علیکم مولانا نظام الدین" کہتا۔ اسی دن سے ان کا لقب نظام الدین پڑ گیا۔[۲]

ایک بار کسی نے حضرت نظام الدینؒ سے پوچھا کہ جو بھی ان کا مرید ہونے آتا ہے موصوف اسے بلا حیل و حجت مرید کر لیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جیسے آسانی سے انہیں فیض ملا ہے ایسے ہی آسانی سے دے دیتے ہیں۔[۳]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ جب ان کے مرشد حضرت نظام الدینؒ دوسری بار اجودھن تشریف لے گئے تو اثنائے سفر انہوں نے ایک گلیم دیکھی جو راستے میں پڑی تھی۔ حضرت وہیں رک گئے تاکہ مالک کے علاوہ اسے کوئی دوسرا شخص نہ اٹھا لے جائے اور حق، حقدار کو نہ ملے۔[۴]

حضرت برہان الدینؒ راوی ہیں کہ ایک بار حضرت نظام الدینؒ نے ان سے کہا کہ ایک زمانہ تھا کہ نیم تنکہ دامن گیر ہو گیا تھا۔ اب اگر روئے زمین کے خزانے بھی انہیں مل جائیں تو وہ ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔[۵]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ اگرچہ بابا فرید گنج شکرؒ کی خانقاہ میں بھی لنگر تقسیم ہوتا تھا لیکن نظام الدینؒ کے ہاں تقسیم لنگر میں غلو کیا جاتا تھا۔[۶] حضرت ہی سے روایت ہے کہ ایک بار سلطان المشائخ کی علالت کے زمانے میں موصوف ان کی عیادت کے لئے گئے۔ اس وقت ان کے قدموں کے قریب ایک تنکہ پڑا تھا۔ سلطان المشائخ نے اپنے خادم سے کہا کہ وہ تنکہ اور عصا، جو ان کے پلنگ پر پڑا تھا، برہان الدینؒ کو دے دے۔[۷]

---

۱ - ایضاً" ص ۸

۲ - ایضاً" ص ۹۷۔

۳ - ایضاً" ص ۳۴۔

۴ - ایضاً" ص ۸۰۔

۵ - ایضاً" ص ۵۱۔

۶ - ایضاً" ص ۳۹۔

۷ - ایضاً" ص ۱۰۔

نفائس الانفاس میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس لئے اس تصنیفِ دلپذیر کو ان کے بارے میں معلومات کی کان سمجھنا چاہئے۔ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ سلطان المشائخ کے سوانح نگاروں نے اس تصنیف سے استفادہ نہیں کیا۔

چراغِ دہلیؒ: حضرت برہان الدین غریبؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مابین بڑی محبت تھی۔ یہ دونوں بزرگ خواجہ تاش تھے۔ اس کے باوجود حضرت برہان الدینؒ ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کی طرف پشت نہ کرتے تھے۔ عماد کاشانی لکھتے ہیں کہ ایک مجلس میں حضرت برہان الدینؒ نے امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم کی بڑی تعریف کی اور اس کے بعد چراغِ دہلیؒ کے علم اور کرم کا تذکرہ کرنے لگے۔[۱]

امیر خسروؒ: حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار امیر خسرو حضرت نظام الدینؒ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جناب امیر تھوڑی دیر کے بعد مجلس سے اٹھ کر باہر چلے جاتے اور کچھ دیر بعد واپس آ جاتے۔ حضرت برہان الدینؒ کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ مجلس میں ان کی مسلسل موجودگی شیخ پر گراں گزرے۔ ثانیاً، جتنی دیر وہ شیخ کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں ان پر لرزہ طاری رہتا ہے اس لئے بھی وہ باہر چلے جاتے ہیں۔[۲]

دہلی میں معین الدین نام کا ایک دیوانہ (مجذوب؟) رہتا تھا۔ ان دنوں امیر خسرو ابھی بچے تھے اور ابتدائی سبق پڑھنے کے لئے مسجد میں جایا کرتے تھے۔ ایک دن معین الدین نے ان کے منہ میں کچھ ڈالا اور اس کی برکت سے انہیں بڑی نعمتیں ملیں۔[۳]

نفائس الانفاس کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر خسروؒ بھی حضرت برہان الدینؒ سے ملنے آیا کرتے تھے۔[۴]

مشائخِ ملتان: نفائس الانفاس میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ اور شاہ رکن عالمؒ کا کئی بار ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ چشتی بزرگوں کے حلقوں میں یہ حضرات بڑے مقبول تھے اور ان کی مجالس میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ حضرت زکریا اور شاہ رکن عالم کے کسی بھی سوانح نگار نے اس تصنیف سے استفادہ نہیں کیا۔

حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت بہاء الدین زکریاؒ، شیخ الشیوخ شہاب

---

۱ - ایضاً" ص ۱۴۴۔
۲ - عماد الدین کاشانی، نفائس الانفاس ص ۳۔
۳ - ایضاً" ص ۲۱۔
۴ - ایضاً" ص ۱۳۱۔

الدین عمر سہروردیؒ کی طرف منہ کئے بیٹھے تھے اور ان کی پُشت قبلہ کی جانب تھی کہ کسی قلندر نے ان پر اعتراض کیا تو شیخ الشیوخؒ نے یہ جواب دیا:

قبلۂ مرید پیر است۔ اُو روی مقبلہ آوردہ است۔[1]

نفائس الانفاس میں کئی جگہ ذکر آیا ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے متوسلین سلطان المشائخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

حضرت جلال الدین تبریزیؒ: حضرت جلال الدین تبریزیؒ شیخ ابو سعید تبریزیؒ کے مرید تھے[2] لیکن ان کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی خدمت میں گزرا تھا اور موصوف انہیں مرشد کا درجہ دیتے تھے۔ صوفیوں کے حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ ان جیسی خدمت کوئی مرید اپنے شیخ کی نہیں کر سکتا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے دل میں اپنے برادرِ طریقت کا اتنا احترام تھا کہ انہوں نے وہ رَسّی محفوظ کر لی تھی جس پر حضرت تبریزی کے کپڑے سوکھا کرتے تھے۔

حضرت برہان الدینؒ سے روایت ہے کہ حضرت زکریاؒ کبھی کبھی وہ رسّی منگوا کر اس کی زیارت کیا کرتے تھے۔[3]

ایک بار حضرت برہان الدین غریبؒ نے حاضرینِ مجلس کو حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے بارے میں بتایا کہ وہ پانچوں نمازوں کے لئے وضو کی جگہ غسل فرمایا کرتے تھے۔[4]

نفائس الانفاس میں کئی مرتبہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کا ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چشتی بزرگوں کے حلقوں میں وہ بڑے مقبول تھے اور ان کا ذکر باعثِ خیر و برکت سمجھا جاتا تھا۔

سَب سِدّی کا اُصول: حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار کسی ملک میں سخت قحط پڑا۔ وہاں کا حاکم مہنگے داموں بیوپاریوں سے غلہ خرید کر سستے داموں عوام کے ہاتھ فروخت کیا کرتا تھا۔ ایک دن خزانچی نے اسے یہ اطلاع دی کہ خزانہ بالکل خالی ہو گیا ہے۔ حاکم نے اسے کہا کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر خزانہ سونے چاندی سے خالی ہو گیا ہے تو خیر و برکت سے بھر گیا ہے۔[5]

---

۱ - ایضاً" ص ۱۵۷۔
۲ - شیخ محمد اکرام' آبِ کوثر' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء' ص ۳۳۶۔
۳ - عماد کاشانی' نفائس الانفاس' ص ۱۵۳۔
۴ - ایضاً" ص ۱۵۳۔
۵ - ایضاً" ص ۱۵۶۔

غرائب الانفاس میں کئی جگہ گرانیٔ غلہ کا ذکر آیا ہے۔ حضرت برہان الدینؒ کے ہمعصر بزرگ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات خیر المجالس میں بھی گرانیٔ غلہ کا ذکر آیا ہے۔[۱] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان دنوں عہدِ علائی کی ارزانی قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔

وسوسۂ شیطانی: حضرت برہان الدین غریبؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان ناصر الدین محمود ملتان اور لاہور کی طرف گیا۔ اسی سفر میں وہ اجودھن سے بھی گزرا۔ سلطان کے سپاہی بڑی تعداد میں بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی زیارت کو گئے اور انہوں نے مجموعی طور پر پندرہ سو ٹنکے ان کی نذر کئے۔ رات کے وقت سلطان اور اس کا امام بھی زیارت کو گئے۔ اس وقت امام کے پاس صرف پانچ ٹنکے تھے۔ اس نے سوچا کہ لوگ اتنی بڑی رقم ہدیہ کر گئے ہیں' اس کے پاس تو صرف پانچ ہی ٹنکے ہیں۔ اس نے شرمندگی سے بچنے کے لئے ہدیہ پیش نہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ دوران گفتگو امام صاحب نے بابا صاحبؒ سے پوچھا کہ وسوسۂ شیطانی کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وسوسہ یہ ہے کہ کوئی شخص پانچ ٹنکے ہدیہ دینے کو لائے اور واپس لے جائے۔[۲]

چشتی تعلیمات کا محور

حضرت برہان الدینؒ سے روایت ہے کہ ایک بار کسی شخص نے بابا فرید الدینؒ کی خدمت میں چھری (قینچی؟) پیش کی۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ یہ کاٹنے کے کام آتی ہے' اس لئے انہیں اس کی ضرورت نہیں۔ انہیں سُوئی درکار ہے کیونکہ وہ پیوند لگانے کے کام آتی ہے۔[۳]

بساط الرحمت: درویشوں کے ہاں دستر خوان کو "بساط الرحمت" کہتے تھے[۴]۔ ایک دن حضرت برہان الدینؒ نے بساط الرحمت پر بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کھانے کی تین اقسام ہیں۔

ا۔ عدل ۲۔ احسان ۳۔ ظلم

عدل یہ ہے کہ سب برابر برابر کھائیں اور احسان یہ ہے کہ اپنا حصہ بھی کسی دوسرے کو دے دیں۔ یہ دونوں قسمیں ظلم سے ماوراء ہیں[۵]۔ حضرت نے ظلم کی تعریف نہیں کی' شاید

ا ۔ حمید قلندر' خیر المجالس' مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء' ص ۲۴۰۔

۲ ۔ ایضاً' ص ۸۱۔

۳ ۔ ایضاً' ص ۷۵۔

۴ ۔ عماد کاشانی' احسن الاقوال' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ' نمبر مذہب تصوف ۳۱۸' ورق ۱۵ الف۔

۵ ۔ عماد کاشانی' غرائب الانفاس' ص' ۳۸۔

ظلم سے مراد دوسروں کا حصہ کھانا ہے۔[1]

مہمان بلائے جان: جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک بار کوئی مہمان حضرت برہان الدینؒ کے ہاں کئی روز تک مقیم رہا۔ جس دن وہ رخصت ہوا تو حضرت نے جامع ملفوظات سے کہا کہ وہ ایک کاغذ پر مہمان کی تکریم اور اعزاز کے موضوع پر حدیثیں لکھ کر لئے پھرتا ہے۔ حضرت کے دل میں آیا کہ وہ اس کا جواب لکھیں لیکن یہ سوچ کر باز رہے کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے گا۔[2]

محروم صحبت: ایک بار حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ اور قاضی محمود بازار سے گزر رہے تھے۔ دوسری جانب سے ایک شخص خچر پر کچھ سامان لادے چلا آ رہا تھا۔ خچر پہلی بار شہر آیا تھا۔ لہٰذا وہ ہجوم دیکھ کر گھبرا گیا اور سامان پھینک کر ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ قاضی صاحب نے سلطان جی سے پوچھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ حضرت نے جواب دیا:

"ایں در صحبتو کسی نبود و ریاضت نیافتہ است۔"[3]

قدیم دہلی: عماد کاشانی رقمطراز ہیں کہ ابتداء میں حضرت برہان الدینؒ مسجد دروازۂ پل میں امامت فرمایا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے بڑی تگ و دو کے بعد قدیم دہلی کے چودہ دروازوں کے نام تلاش کئے تھے[3] نفائس الانفاس کے مطالعہ سے پندرھویں دروازے کا بھی علم ہو گیا جو "دروازۂ پل" کے نام سے موسوم تھا۔[4]

عورت کا مقام: حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں بابا فرید الدین گنج شکرؒ ایک عورت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ مرد ہے لیکن خدا نے اسے عورت کی صورت میں دنیا میں بھیجا ہے۔[5] حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ نے ایک مجلس میں خدا رسیدہ عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا "جب شیر جنگل سے باہر آتا ہے تو کوئی نہیں پوچھتا کہ شیر نر ہے یا مادہ۔ فرزندِ آدم کو طاعت و تقویٰ میں معروف ہونا چاہئے، خواہ مرد ہو یا عورت۔"[6]

---

۱ - عماد کاشانی، نفائس الانفاس، ص ۷۲۔
۲ - ایضاً" ص ۷۰۔
۳ - محمد اسلم، سرمایۂ عمر، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۶۔
۴ - نفائس الانفاس، ص ۶۵۔
۵ - نفائس الانفاس، ص ۴۵۔
۶ - فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۳۵۔

ہدیۂ سلطانی: چشتیہ سلسلہ کے بزرگ سلاطین کے ساتھ تعلقات رکھنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ تو اس بارے میں دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی سخت تھے۔ حضرت برہان الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے اپنے بھانجے حضرت تقی الدین نوحؒ سے کہا کہ اگر وہ سلطان سے زرعی اراضی نہ لے اور امراء کے گھروں پر نہ جایا کرے تو آنجناب اسے اپنا جانشین بنا دیں۔ حضرت کے اصل الفاظ یہ تھے:

"اگر تو دیہہ و اورار از سلطان نستانی و درخانۂ ملوک و امراء نہ رَوی بعد از من تو باشی۔" [۱]

اختتام

آخری ملفوظ بروز جمعہ چار ماہ صفر ۷۳۴ھ کو قلبند ہوا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نفائس الانفاس میں حضرت برہان الدینؒ کے اندازاً" ساڑھے پانچ سالوں کے ملفوظات درج ہیں۔ نفائس الانفاس کی ضخامت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہے کہ ساڑھے پانچ سالوں کے دوران میں جامع ملفوظات کو اپنے مرشد کی خدمت میں زیادہ حاضری کا موقع نہیں ملا۔ اگر وہ باقاعدگی کے ساتھ حاضری دیتے تو نفائس الانفاس کی ضخامت بہت زیادہ ہوتی۔

✪✪✪

---

۱ - عماد کاشانی، نفائس الانفاس ص ۱۰۶۔

خوانِ پُر نعمت

مخدوم شرف الدین بن شیخ یحییٰ منیریؒ کا شمار اُمتِ مرحومہ کے اُن مُصلحین اور مجدّدین میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ و ثقافت میں اپنی سیرت و کردار کے اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

مخدوم کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے متعدد مجموعے مرتب کئے ہیں۔ اس وقت ان کے ملفوظات کا مجموعہ "خوانِ پُرنعمت" مرتبہ زین بدر عربی میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ کتاب مطبع احمدی پٹنہ سے ۱۳۲۱ھ میں طبع ہو چکی ہے، لیکن اب اس کے مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہو گئے ہیں۔

سینٹ زیویر سکول پٹنہ کے ایک آسٹریلین نژاد اُستاد فادر پال جیکسن نے "خوانِ پُرنعمت" کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سے قبل وہ مخدوم صاحب کے مکتوباتِ صدی کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ فادر پال جیکسن کے توجہ دلانے پر ہی میں نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اب میں اس کتاب کا حاصلِ مطالعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

صاحبِ ملفوظات

صاحبِ ملفوظات کا اصل نام احمد تھا، لیکن علمی و دینی حلقوں میں ان کی شہرت اپنے لقب مخدوم شرف الدین سے ہے۔ اُن کے والدِ بزرگوار شیخ یحییٰ منیر کے رہنے والے تھے۔ مخدوم صاحب کا شجرۂ نسب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تایا اور کفیل زبیر بن عبدالمطلب سے جا ملتا ہے۔[1] ان کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہؒ موضع الخلیل[2] (فلسطین) سے ترکِ سکونت کر کے منیر

---

۱ - ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ج ۳، ص ۱۷۷۔

۲ - الخلیل کو حبرون بھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ قصبہ اردن میں شامل تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اس پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا۔ الخلیل میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے مزارات ہیں۔

میں آ بسے۔ ان کی ہمت اور کاوش سے اس علاقے میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی۔ کچھ عرصے بعد مولانا محمد تاج فقیہ اپنے اہلِ خانہ کو منیر میں چھوڑ کر اپنے آبائی وطن کی طرف لوٹ گئے۔

مخدوم صاحب کے نانا حضرت شہاب الدین جگجوت کاشغر کی سکونت ترک کر کے بہار چلے آئے اور پٹنہ کے قریب جٹھلی میں مقیم ہو گئے۔ ان کے دو نواسوں، مخدوم شرف الدین اور شیخ احمد چرم پوش نے دینی اور روحانی حلقوں میں بڑا نام پایا ہے۔ مخدوم شرف الدین ۶۶۰ھ (۱۲۶۳ء) میں ماہِ شعبان کے آخری جمعہ کو منیر میں پیدا ہوئے۔[۱] ان کی ابتدائی تعلیم منیر میں ہوئی اور یہیں انہوں نے متوسطات تک نصابی کتب کا مطالعہ کیا۔ ایک بار برِعظیم پاک و ہند کے نامور عالمِ دین مولانا شرف الدین ابوتمامہ دہلی سے سنار گاؤں جاتے ہوئے منیر سے گزرے۔ مخدوم صاحب ان کی شخصیت اور علمیت سے اِس قدر متأثر ہوئے کہ اپنے والد سے اجازت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر ان کے ساتھ سنار گاؤں چلے گئے۔[۲] مولانا شرف الدین ابوتمامہ کی نگرانی میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ استاد نے ان کی علمی استعداد اور خاندانی شرافت دیکھ کر اپنی بیٹی سے ان کا نکاح کر دیا۔ سنار گاؤں میں قیام کے دوران میں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ذکی الدین تجویز ہوا۔

مخدوم صاحب اپنے والد کی علالت کے پیشِ نظر منیر واپس آئے اور ۱۱ شعبان ۶۹۰ھ (۱۲۹۱ء) کو شیخ یحییٰ فوت ہوئے۔ والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد انہوں نے اپنا بیٹا اپنی والدۂ ماجدہ کے سپرد کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ اسے ان کا بدل سمجھیں اور یہ سمجھ لیں کہ آج سے شرف الدین فوت ہو گیا ہے۔ والدہ صاحبہ سے اجازت اور دعائیں لے کر مخدوم صاحب دہلی روانہ ہوئے۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ اور پانی پت میں شرف الدین بو علی قلندرؒ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں، لیکن جیسا پیر وہ چاہتے تھے، ویسا نہ ملا۔ ایک دن مخدوم صاحب اپنے بھائی کے اصرار پر حضرت نجیب الدین فردوسیؒ کی زیارت کو گئے۔[۳] ان کی قیام گاہ کے قریب جاتے ہی ان کے پسینے چھوٹ گئے اور انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ انہیں جس مرشد کی مدت سے تلاش تھی، وہ مل گیا ہے۔ مخدوم صاحب نے حضرت نجیب الدینؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی اور مرشد نے انہیں اجازت نامہ دے کر بہار کی طرف رخصت کیا۔ حضرت نے چلتے وقت انہیں وصیت کی کہ اگر وہ راستے میں کوئی خبر سنیں تو واپس نہ لوٹیں۔ مخدوم صاحب ابھی دو منزل ہی گئے تھے کہ انہیں اپنے شیخ کی وفات کی اطلاع ملی۔ انہوں نے

۱۔ شیخ محمد اکرام نے آبِ کوثر میں ان کی تاریخِ ولادت ۵ جولائی ۱۲۶۳ء لکھی ہے۔

۲۔ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ص ۲۹۹۔

۳۔ حضرت نجیب الدین فردوسیؒ مہرولی میں فردوسیہ پہاڑی پر دفن ہیں۔

حسبِ ارشاد اپنا سفر جاری رکھا۔ مخدوم صاحب جب بہیا[1] (ضلع آرہ) کے جنگل سے گزر رہے تھے تو ایک مور کی آواز سن کر ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے اپنا اجازت نامہ اور سامان اپنے بھائی کے سپرد کیا اور خود جنگل میں غائب ہو گئے۔ بارہ سال بہیا اور راج گیر کے جنگلوں میں جنگلی پھل اور درختوں کے پتے کھا کر گزارے۔ ایک بار چند لوگوں نے راج گیر کے جنگل میں ان کے مسکن کا کھوج لگا لیا اور وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان دنوں جنگل کا راستہ پُرخطر تھا' اس لئے مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ وہ ان کے پاس آنے کا خطرہ مُول نہ لیا کریں' وہ خود جمعہ کے روز شہر چلے آیا کریں گے۔[2] پھر وہ ہر جمعے کو راج گیر جانے لگے۔ ان کے معتقدین نے ان کے آرام کے لئے ایک جگہ چھپر ڈال دیا۔ موصوف نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر وہاں آرام فرماتے اور لوگوں سے ملتے۔ کبھی کبھی وہاں دو تین روز کے لئے رک بھی جاتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے وہاں خانقاہ بنا لی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدوں نے اصرار کر کے انہیں مسند پر بٹھا دیا۔[3] یہ ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) کا واقعہ ہے۔ خانقاہ میں قیام کے بعد انہوں نے عوام کی رشد و ہدایت اور تصوف کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور چھپن برس تک یہ ہنگامہ جاری رکھا۔ مخدوم صاحب ۶ شوال ۷۸۲ھ (۵ جنوری ۱۳۷۱ء) کو ۱۰۸ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ اگلے روز مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

مخدوم صاحب کے مریدوں اور خلفاء کی تعداد کافی ہے۔ ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے کئی مجموعے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کئے ہیں' جن سے اس دور کے رسم و رواج' تہذیب و تمدن' خانقاہی زندگی اور عوام کے رُجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ ملفوظات' جو "خوانِ پُرنعمت" کے نام سے مشہور ہے حضرت کے ایک مرید زین بدر عربی نے مرتب کیا ہے۔ فاضل مرتب یمن کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زندگی اپنے مرشد کے آستانے پر ہی گزر گئی۔

ما نقدِ عمر صرفِ رہِ یار کردہ ایم
کارے کہ کردہ ایم ہمین کار کردہ ایم

"خوانِ پُرنعمت" کے علاوہ زین بدر عربی نے "معدن المعانی" کے عنوان سے بھی مخدوم صاحب کے ملفوظات جمع کئے تھے' جو مطبع اشرف الاخبار بہار شریف سے ۱۸۸۴ء میں طبع ہو چکے

---

۱ - بہیا (Bihiya) آرہ سے بکسر کی طرف جاتے ہوئے آرہ سے اکیس کلو میٹر کے فاصلے پر ای آئی ریلوے کا اسٹیشن ہے۔

۲ - ابوالحسن علی ندوی۔ تاریخِ دعوت و عزیمت' ج ۳' ص ۱۹۹۔

۳ - ایضاً۔

ہیں، لیکن اب اس کے مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مرشد کے مکاتیب بھی جمع کئے تھے۔ مخدوم صاحب اپنے وقت کے مجدد تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا تمام تر کارنامہ یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے باشندوں کو خدا کا راستہ دکھایا، معرفت الٰہی اور تعلق مع اللہ کی ضرورت و اہمیت دل نشین کی، ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں عشقِ الٰہی اور خدا طلبی کی حرارت پیدا کر دی اور سلوک و معرفت کے اسرار و نکات اور لطیف و بلند علوم کا اظہار فرمایا بلکہ بعض دوسرے مُصلحینِ اُمت اور محققین کی طرح ان کا یہ بھی عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے بروقت دین کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ مسلمانوں کے دین و ایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالی، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت و زندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھا اور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا جو بداعتقاد صوفیوں، جاہل مشائخ اور فلسفہ و باطنیت سے متأثر اشراقیین کی دعوت سے ہندوستان جیسے دُور افتادہ ملک میں، جہاں اسلام بہت چکر کاٹ کر پہنچا تھا" اور جہاں کتاب و سنت سے براہِ راست واقفیت پیدا کرنے کے وسائل شروع سے کمزور اور محدود رہے، سحر کا اثر رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں ان سب عقاید و خیالات پر ضربِ کاری لگائی، جس کے پردے میں یہاں الحاد و زندقہ پھیل رہا تھا اور عقاید متزلزل ہو رہے تھے اور اسلام کے عقاید صحیحہ اور اہلِ سنّت کے مسلک کی نہایت مؤثر و طاقتور وکالت اور تبلیغ کی"۔[۱]

ملفوظات

"خوانِ پُرنعمت" کے آغاز میں زین بدر عربی نے "معدن المعانی" مرتب کرنے کا ذکر کیا ہے۔[۲] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "معدن المعانی" "خوانِ پُرنعمت" سے پہلے مرتب ہوئی۔ خوانِ پُرنعمت میں ۱۵ شعبان ۷۴۹ھ سے لے کر شوال ۷۵۱ھ تک کے ملفوظات درج ہیں۔ اس مجموعے میں کل ۷۴ مجالس کے ملفوظات ہیں۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی ولی بے علم نہیں ہوتا اگر کسی بے علم کو ولی بنایا گیا تو پہلے اسے علم دیا گیا، پھر اسے ولایت ملی۔[۳]

مخدوم صاحب جس زمانے میں سنار گاؤں میں مقیم تھے، ان دنوں لوگوں نے چُونا بکثرت

---

۱ - سید ابوالحسن علی ندوی۔ تاریخ دعوت و عزیمت، جلد ۳، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص ۲۹۸۔

۲ - خوانِ پُر نعمت، مطبوعہ پٹنہ ۱۳۲۱ھ، ص ۲۔

۳ - ایضاً۔ ص ۶۔

کھانا شروع کر دیا۔ مذہبی طبقوں میں اس کے خلاف ایک شور مچ گیا۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چونا صدف کے اجزا سے بنتا ہے اور صدف حشراتِ بحر میں سے ہے اور حشراتِ بحر کی شریعت میں حُرمت آئی ہے' اس لئے اس کا استعمال حرام ہے۔ چند سمجھ دار لوگوں نے مفتیوں کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے کہا کہ ہزاروں لوگ چونا کھا رہے ہیں' اس لئے اگر وہ اسے حرام کہیں تو ہزاروں لوگوں کو حرام خور کہنا پڑے گا اور لوگ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لئے کسی مفتی نے بھی اس کی حرمت کا فتویٰ نہ دیا۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ لوگوں کو دشواری میں نہ ڈالا جائے۔[۱] اس لئے فقہا نے فتویٰ دینے سے احتراز کیا۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ ایک درویش ملتان میں ایک مدت تک حضرت صدر الدین عارفؒ کی خانقاہ میں مقیم رہا۔ ایک روز اس نے حضرت عارف سے کہا کہ وہ دہلی کے مشائخ کی زیارت کرنا چاہتا ہے اس لئے اسے وہاں جانے کی اجازت دیں۔ حضرت نے اسے بخوشی رخصت کیا۔ اس درویش نے ایک رات بمشکل دہلی میں گزاری اور ملتان لوٹ آیا۔ حضرت عارف نے اتنی جلدی واپس آنے کا سبب پوچھا تو اس نے وہاں کے مشائخ کے بارے میں کہا:

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّ قُلُوبُهُمْ شَتّٰى [۲]

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک روز ممن ملتانی مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ کسی نے مخدوم صاحب سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے بڑے کام کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا' بہت اچھا' بہت ہی خوب۔ سو نمازوں اور سو روزوں کا اتنا اجر نہیں ملتا جتنا اجر ایک مومن کا کام کرنے سے ملتا ہے۔ مسلمانوں کے کام انجام دینے اور مخلوقِ خدا کی خدمت کرنی سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ پیغمبروں کا شیوہ ہے' وہ لوگوں کے کام آتے تھے اور ان کی بلائیں اپنے سر لیا کرتے تھے۔[۳]

ایک زمانے میں لوگ مخدوم صاحب سے سفارشی خط لکھوا کر حکام کے پاس لے جایا کرتے تھے۔ آپ ان کے لئے سفارشی خط لکھتے لکھتے تنگ آ گئے۔ ایک روز شیخ زادہ چشتی ان کے پاس بیٹھے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ اب وہ اس کام سے تنگ آ گئے ہیں۔ شیخ زادہ نے کہا "تنگ آئیں یا تھک جائیں' لوگوں کی بلائیں اپنے سر لیا

---

۱ - خوانِ پُر نعمت' ص ۱۴۔

۲ - سورہ حشر' آیت نمبر ۱۴۔ ترجمہ "تو جانے کہ وہ اکٹھے ہیں اور ان کے دل پھوٹ رہے ہیں۔"

۳ - خوانِ پُر نعمت' ص ۳۹ - ۴۰۔

کریں۔[۱]

بعض سلاسلِ تصوف کے مشائخ بادشاہوں کے ہاں جانا بڑا معیوب سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ مشائخ بلا طلب کسی بادشاہ کے ہاں نہیں جاتے لیکن وہ کسی مسلمان بھائی کا کام کرنا اہم ترین کام سمجھتے ہیں۔[۲]

مخدوم صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ سے تین اہم مسئلے حل ہوئے: (۱) اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو مالِ غنیمت کے احکام کیا ہوں گے؟ (۲) بغاوت کے احکام (۳) طرفین کے مقتولین کے احکام۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اسی طرح نمازِ جمعہ اور خطبے کے احکام بھی اسی جنگ سے واضح ہوئے ہیں۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ جنگِ صفین کا ایک راز یہ بھی تھا کہ مسائل سامنے آئیں اور صحابہ کرام ان کا حل تلاش کریں۔ مخدوم صاحب، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کا برابر احترام کرتے تھے۔[۳]

مخدوم صاحب نے ایک بار امیر فاضل بلخی کو قرآنِ حکیم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے سنا تھا۔ اسی روز سے موصوف علمائے بلخ کی علمیت کے قائل ہو گئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ علمائے بلخ تفسیر و حدیث خوب بیان کرتے ہیں اور وہ بڑے ثقہ محدث اور مفسّر ہوتے ہیں۔[۴]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ مشائخ نے تصوف کے موضوع پر جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں قوۃ القلوب سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ تمام مشائخ اس کتاب پر اعتماد کرتے ہیں اور یہ کتاب بڑی مقبول ہے۔ قوۃ القلوب کا مصنف ابو طالب مکی بڑا بزرگ اور عقل مند شخص تھا۔ اس کے زمانے میں اور عہدِ رسالت میں زیادہ بُعد نہیں تھا، اس لئے سبھی مشائخ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔[۵]

ایک روز مخدوم صاحب نے قاضی سراج الدین سے تفسیر کبیر مطالعہ کے لئے مستعار لی۔ اس کی پہلی جلد پڑھ کر ہی ان کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی اور انہوں نے تفسیر واپس لوٹا دی۔ کسی

---

۱ ۔ خوانِ پُر نعمت، ص ۴۰۔
۲ ۔ ایضاً، ص ۴۱۔
۳ ۔ خوانِ پُر نعمت، ص ۶۵۔
۴ ۔ ایضاً، ص ۷۶۔
۵ ۔ ایضاً، ص ۸۵۔

کے استفسار پر حضرت نے فرمایا کہ اس میں دلائل بہت ہیں۔ امام رازی پہلے خود اعتراض کرتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں۔ انہیں ایسی بحثیں ناگوار گزرتی ہیں اسی لئے اس تفسیر کا مطالعہ ترک کر دیا۔[۱] اس موقع پر مخدوم صاحب نے تفسیرِ زاہدی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں دین کے ضروری مسائل مل جاتے ہیں۔ امام زاہد نے دورانِ تصنیف کوئی مسئلہ بیان کرنے میں نہ ہی اختصار سے کام لیا ہے اور نہ ہی غیر ضروری تفصیل دینا مناسب سمجھی ہے' جسے پڑھ کر ملال ہو۔ تمام ضروری مسائل اس تفسیر میں موجود ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مولانا شمس الدین یحییٰ کو جب کسی آیت کی شرح دیکھنی ہوتی تھی تو وہ تفسیرِ زاہدی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے حالانکہ ان کے پاس قرآن حکیم کی کئی تفسیریں موجود تھیں۔ تفسیرِ زاہدی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ فارسی زبان میں ہے۔ حضرت مخدوم نے ایک بار مولانا شمس الدین یحییٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ اس تفسیر پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

"در تفسیر ہای عربی فصاحت بسیار است و بلاغت بیحد و معانی بے شمار۔ اما این لذت و شیرینی کہ درین تفسیرِ پارسی است درہیچ تفسیرے نیافتم۔"[۲]

راقم السطور نے سلاطینِ دہلی کے عہد میں مرتب ہونے والے بہت سے ملفوظات کا مطالعہ کیا ہے۔ شاید ہی ملفوظات کا کوئی مجموعہ ہو گا جس میں تفسیرِ زاہدی کا ذکر نہ آیا ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں صوفیوں کے حلقوں میں یہ تفسیر بڑی مقبول تھی۔

دہلی میں مولانا علاء الدین جون پوری نام کے ایک صحیح النسب سید رہتے تھے۔ وہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا۔ وہ ہفتے کے مختلف دنوں میں تفسیر' حدیث' فقہ' نحو' منطق اور اُصول وغیرہ کا درس دیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ دہلی میں رہتے تھے' اس زمانے میں شہر میں منادی ہوا کرتی تھی کہ تمام علماء و مشائخ شاہی محل میں حاضر ہوں۔ منادی سن کر سبھی علماء و مشائخ محل کی جانب چل پڑتے تھے' لیکن مولانا علاء الدین نہ جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جو ہو سو ہو' وہ ہرگز شاہی محل میں نہ جائیں گے۔[۳] یہ بزرگ شیخ نجیب الدین فردوسی کے بہنوئی تھے اور شیخِ موصوف نے ان سے تفسیر و حدیث کا درس لیا تھا۔ مزید برآں حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ اور سید علاء الدینؒ نے ایک ہی استاد سید شرف الدین سے حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار پڑھی تھی۔[۴]

---

۱ - خوانِ پُر نعمت' ص ۹۷۔
۲ - ایضاً" ص ۹۸۔
۳ - خوانِ پُر نعمت' ص ۱۰۳۔
۴ - ایضاً" ص ۱۰۴۔

مخدوم صاحب سے روایت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ معمول تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے استاد کے پاس خالی ہاتھ نہ جاتے' خواہ دن میں پانچ بار جانے کا اتفاق ہوتا۔[1]

✪✪✪

۱۔ "ایضاً" ص ۱۵۲۔

معدن المعانی

مخدوم شرف الدین احمد بن شیخ یحییٰ منیریؒ کا شمار ان مشاہیر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنہوں نے برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت میں اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

مخدوم صاحب کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے متعدد مجموعے مرتب کئے ہیں۔ اس وقت ان کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی مرتبہ زین بدر عربی میرے پیش نظر ہے۔ یہ کتاب مطبع اشرف الاخبار بہار شریف میں ۱۸۸۴ء میں چھپی تھی لیکن اب اس کے مطبوعہ نسخے کمیاب ہو گئے ہیں۔

راقم الحروف کو بھارت کے سفر میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں اس دُرِّ نایاب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اب میں اس کتاب کا حاصلِ مطالعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

صاحبِ ملفوظات

صاحبِ ملفوظات کا اصل نام احمد تھا لیکن علمی و دینی حلقوں میں ان کی شہرت اپنے لقب مخدوم شرف الدین سے ہے۔ ان کے والدِ بزرگوار شیخ یحییٰ منیر کے رہنے والے تھے۔

مخدوم صاحب کا شجرۂ نسب آنحضرتؐ کے تایا اور کفیل زبیر بن عبدالمطلب سے جا ملتا ہے۔[1] ان کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہؒ الخلیل[2] (فلسطین) سے ترک سکونت کرکے منیر آ بسے۔ ان کی سعی و کاوش سے اس علاقے میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا محمد تاج فقیہ اپنے اہلِ خانہ کو منیر چھوڑ کر اپنے آبائی وطن کی طرف لوٹ گئے۔

۱۔ ابوالحسن علی ندوی۔ تاریخِ دعوت و عزیمت مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء ج ۳، ص ۱۷۳۔

۲۔ الخلیل کو حبرون بھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ اُردن میں تھا ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ الخلیل میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے مزارات ہیں۔

مخدوم صاحب کے نانا حضرت شہاب الدین جگجوت کاشغر کی سکونت ترک کر کے بہار چلے آئے اور پٹنہ کے قریب جٹھلی میں مقیم ہو گئے۔ ان کے دو نواسوں' مخدوم شرف الدین اور شیخ احمد چرم پوش نے دینی اور روحانی حلقوں میں بڑا نام پایا ہے۔

مخدوم شرف الدین ۶۶۰ھ ر ۱۲۶۳ء میں شعبان کے آخری جمعہ منیر میں پیدا ہوئے۔[۱] ان کی ابتدائی تعلیم منیر میں ہوئی اور یہیں انہوں نے متوسطات تک نصابی کتب کا مطالعہ کیا۔

ایک بار برِعظیم پاک و ہند کے نامور عالم شرف الدین ابوتمامہ دہلی سے سنار گاؤں جاتے ہوئے منیر سے گزرے۔ مخدوم صاحب ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے والد سے اجازت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر ان کے ساتھ سنار گاؤں چلے گئے۔[۲]

مولانا شرف الدین ابو تمامہ کی نگرانی میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ استاد نے ان کی استعداد اور خاندانی شرافت دیکھ کر اپنی بیٹی سے ان کا نکاح کر دیا۔ سنار گاؤں میں قیام کے دوران میں ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ذکی الدین تجویز ہوا۔

مخدوم صاحب اپنے والد کی علالت کے پیشِ نظر منیر واپس آئے اور ۱۱ شعبان ۶۹۰ھ ر ۱۲۹۱ء کو شیخ یحییٰ فوت ہو گئے۔ والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد انہوں نے اپنا بیٹا اپنی والدہ ماجدہ کے حوالے کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ اسے ان کا بدل سمجھیں اور یہ سمجھ لیں کہ شرف الدین فوت ہو گیا ہے۔

والدہ سے اجازت اور دعائیں لے کر مخدوم صاحب دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ اور پانی پت میں شرف الدین بوعلی قلندر سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن وہ جیسا مرشد چاہتے تھے' ویسا نہ ملا۔ ایک دن مخدوم صاحب اپنے بھائی کے اصرار پر حضرت نجیب الدین فردوسی کی زیارت کو گئے۔[۳] ان کی قیام گاہ کے قریب جاتے ہی ان کے پسینے چھوٹ گئے اور انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ انہیں جس مرشد کی مدت سے تلاش تھی وہ مل گیا ہے۔

مخدوم صاحب نے حضرت نجیب الدین فردوسی کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی اور

---

۱ - شیخ محمد اکرم نے آبِ کوثر میں ان کی تاریخ ولادت ۵ جولائی ۱۲۶۳ء لکھی ہے۔
۲ - شیخ محمد اکرم' آبِ کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء' ص ۴۹۹۔
۳ - حضرت نجیب الدین فردوسی مہرولی میں فردوسیہ پہاڑی پر دفن ہیں۔

مرشد نے انہیں اجازت نامہ دے کر بہار کی طرف رخصت کیا۔ حضرت نے چلتے وقت انہیں وصیت کی کہ اگر وہ راستے میں کوئی خبر سنیں تو واپس نہ لوٹیں۔ مخدوم صاحب ابھی دو منزل ہی گئے تھے کہ انہیں اپنے شیخ کی وفات کی اطلاع ملی انہوں نے حسب الحکم اپنا سفر جاری رکھا۔

مخدوم صاحب جب بہیا[1] (ضلع آرہ) کے جنگل سے گزر رہے تھے تو ایک مُور کی آواز سن کر ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے اپنا اجازت نامہ اور سامان اپنے بھائی کے سپرد کیا اور خود جنگل میں غائب ہو گئے۔

مخدوم صاحب نے بارہ سال بہیا اور راجگیر کے جنگلوں میں جنگلی پھل اور پتے کھا کر گزارے۔ ایک بار چند لوگوں نے راجگیر کے جنگل میں ان کے مسکن کا کھوج لگا لیا اور وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان دنوں جنگل کا راستہ پُرخطر تھا اس لئے مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ وہ ان کے پاس آنے کا خطرہ مول نہ لیا کریں، وہ خود جمعہ کے روز شہر آ جایا کریں گے۔[2]

مخدوم صاحب ہر جمعہ کو راجگیر جانے لگے۔ ان کے معتقدین نے ان کے آرام کے لئے ایک جگہ چھپر ڈال دیا۔ موصوف نماز جمعہ سے فراغت کے بعد وہاں دو تین دن کے لئے رک بھی جاتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے خانقاہ بنا لی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدوں نے انہیں زبردستی مَسند پر بٹھا دیا۔[3] یہ ۷۲۴ھ ر ۱۳۲۴ء کا واقعہ ہے۔

خانقاہ میں قیام کے بعد انہوں نے عوام کی رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا اور چھپن برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مخدوم صاحب ۶ شوال ۷۸۲ھ ر ۵ جنوری ۱۳۸۱ء کو بعمر ۱۰۸ سال فوت ہوئے۔ اگلے روز مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

مخدوم صاحب کے مریدوں اور خلفاء کی تعداد کافی ہے۔ ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے کئی مجموعے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کئے ہیں، جن سے اس دور کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن، خانقاہی زندگی اور عوام کے رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔

زیر نظر مجموعۂ ملفوظات، جو معدن المعانی کے نام سے مشہور ہے، حضرت کے ایک مرید زین بدر عربی نے مرتب کیا ہے۔ فاضل مرتب یمن کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زندگی اپنے شیخ کے آستانے پر ہی گزری۔

۱۔ بہیا (BIHIYA) آرہ سے مغل سرائے کی طرف جاتے ہوئے آرہ سے اکیس کلو میٹر کے فاصلہ پر ای۔ آئی۔ ریلوے کا اسٹیشن ہے۔

۲۔ ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت ج ۳، ص ۱۹۹۔

۳۔ ایضاً۔

صدیقِ اکبرؓ کا خواب

مخدوم صاحب نے ایک روز حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بغرض تجارت شام گئے ہوئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند اتر کر ان کی گود میں آ گرا ہے۔ انہوں نے کسی معبر سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی تو اس نے بتایا کہ خاتم النبیینؐ مبعوث ہو چکے ہیں اور سب سے پہلے وہی ان پر ایمان لائیں گے۔[1]

دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ مشرق سے مغرب تک تمام بنی نوعِ انسان اسلام قبول کر لے گی، لیکن ہنوز یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔[2] حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ وعدہ ایفا ہونا باقی ہے۔

علماء کے ساتھ صحبت

زین بدر عربی فرماتے ہیں کہ مخدوم صاحب کی مجلس میں قاضی منہاج الدین درون حصاری، مولانا آدم، قاضی اشرف الدین، مولانا کریم الدین اور مولانا نظام الدین درون حصاری جیسے فضلاء موجود رہتے تھے اور ان کے ساتھ ان کی علمی موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ایک روز علماء سُوء کا ذکر کرتے ہوئے مخدوم صاحب نے فرمایا کہ ان کا رُخ دنیا کی جانب اور پشت عقبیٰ کی جانب ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک تحصیلِ علم کا مقصد حصولِ دنیا ہوتی ہے نہ کہ آخرت۔[3]

سلطان شمس الدین الیاس شاہ

سلاطینِ بنگال میں سلطان شمس الدین الیاس شاہ بڑا نامور سلطان ہو گزرا ہے۔ اس نے ۱۳۴۵ء سے ۱۳۵۸ء تک بنگال پر حکومت کی ہے۔ وہ نماز و روزے کا بڑا پابند تھا۔ اسے مولانا زین الدین کی قربت بہت پسند تھی۔ سلطان کے یوں تو کئی امام تھے جو مختلف مقامات پر نماز کی

۱۔ معدن المعانی، ص ۱۳۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۳۔ ایضاً، ص ۲۸۔

امامت کرتے تھے لیکن جب مولانا زین الدین موجود ہوتے تو پھر کسی امام کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ امامت کرواتا۔[۱]

مخدوم صاحب کا مسلک

مخدوم صاحب اپنے ملاقاتیوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر انہیں کوئی مسئلہ پیش آئے تو وہ سب سے پہلے قرآن حکیم سے رجوع کریں۔ اگر اس مسئلے کا حل قرآن حکیم میں موجود نہ ہو تو پھر سنت میں تلاش کریں۔ اگر اس مسئلے کی نظیر سنت میں موجود نہ ہو تو پھر اجماع صحابہ میں تلاش کریں۔ اگر وہاں بھی اس کا حل نہ ملے تو پھر مجتہدین سے رجوع کریں۔[۲]

جمعِ قرآن

مخدوم فرماتے ہیں کہ قرآنِ حکیم جس صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اس کی ترتیب لوحِ محفوظ کے مطابق ہے۔ اسے نزولِ آیات کے مطابق جمع نہیں کیا گیا۔ جب کوئی ضرورت پیش آتی تھی تو آیات نازل ہو جاتی تھیں۔[۳]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہی قرآن کی ترتیب درست ہو گئی تھی۔

حضرت اپنے احباب کو یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ قرآن حکیم کے بوسیدہ اوراق دفن کر دینے چاہئیں۔

فیروز شاہ تغلق کے بارے میں نادر روایت

حضرت مخدوم صاحب سلطان فیروز تغلق (۱۳۸۸ء --- ۱۳۵۱ء)) کے ہم عصر تھے۔ سلطان ان کی ولایت کا قائل تھا۔ مخدوم صاحب کے ایک مرید حسین نے "ارشاد السالکین" کے عنوان سے آٹھ صفحوں کا ایک رسالہ قلمبند کیا تھا جو معدن المعانی کے ساتھ ہی مطبع اشرف الاخبار سے شائع ہوا ہے۔ اس میں یہ مرقوم ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق جذام میں مبتلا ہوا۔ اس نے ہر طرح کی دوا استعمال کی اور بزرگوں سے دعائیں کرائیں لیکن شفا نہ ہوئی۔ وہ چاروں جانب سے

۱۔ ایضاً ص ۴۵۔
۲۔ ایضاً ص ۴۷۔
۳۔ ایضاً ص ۵۳۔

مایوس ہو کر مخدوم صاحب کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ عندالملاقات انہوں نے بادشاہ کے لئے کھانا منگوایا۔ حضرت کے خادم خاص و محرم راز مولانا مظفر نے پرند کا گوشت اور نان سلطان کے سامنے لا رکھے۔ سلطان نے سالن دیکھ کر اپنے دل میں کہا کہ اسی سے تو اطباء نے پرہیز بتایا ہے اور یہی چیز مخدوم صاحب نے کھانے کے لئے پیش کی ہے۔ اس نے اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ اس کی قسمت میں شفاء نہیں لکھی۔ جونہی اس کے دل میں یہ خیال آیا تو مولانا مظفر نے بھنے ہوئے گوشت کو مخاطب کر کے فرمایا "این شکی است نخواہد خورد چرا ہستید بپرید۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ پرندہ زندہ ہو کر اڑ گیا۔ مخدوم صاحب نے ناراضگی کے عالم میں مولانا مظفر سے کہا کہ وہ کرامت دکھاتے ہیں تاکہ سلطان معتقد ہو جائے۔ مولانا مظفر پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ ایک ندی میں جا کر چھپ گئے۔ مخدوم صاحب عصاء لے کر ان کی تلاش میں گئے اور پانی میں تلاش کرتے ہوئے انہیں زخمی کر دیا۔ ان کے جسم سے خون بہتا دیکھ کر مخدوم صاحب نے انہیں گلے لگا کر فرمایا: "تن مظفر جانِ شرف الدین و تن شرف الدین جانِ مظفر۔ شرف الدین مظفر، مظفر شرف الدین۔" اس کے بعد دوبارہ سالن اور نان سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ کھانا تناول کرنے سے اُسے شفاء ہو گئی۔ یہاں مولانا مظفر کی کرامت بیان کرنا مقصود نہیں، صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ سلطان فیروز تغلق کے جذام میں مبتلا ہونے کا ذکر اور کسی تذکرے میں نہیں آیا۔

صحابۂ کرامؓ

مخدوم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ صحابۂ کرامؓ پر زبان دراز کرنی روا نہیں ہے۔ اسی طرح کفر یا بدعت کو ان کی طرف منسوب کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ علم و فضل، زہد و ورع، توکل اور ہر لحاظ سے تمام مسلمانوں سے افضل ہیں۔ ان میں یہ صفات نبی کریمؐ کی نظر سے پیدا ہو گئی تھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ

مخدوم صاحب اُم المومنین عائشہ صدیقہ کو "فقیہ اُمت" کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ حضرت نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ان سے آدھا دین ہمیں ملا ہے۔ وجوب غسل کے مسئلہ پر ان کا فتویٰ تمام صحابہؓ نے تسلیم کیا ہے۔ ان کے اس فتویٰ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے کہ اب اگر کوئی وجوب غسل کا قائل نہ ہو گا تو وہ اسے سزا دیں گے۔[1]

---

[1] زین بدر عربی، معدن المعانی، مطبوعہ بہار شریف، ص ۸۷۔

عاشقِ رسولؐ کی وصیت

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ کسی بزرگ نے اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کی کہ اسے گنبد خضرا سے باہر آں حضورؐ اور شیخین کریمینؓ کے قدموں میں دفن کریں اور اس کی قبر پر جو کتبہ لگائیں اس پر یہ عبارت کندہ کرائیں۔

راَبِعھم کلبھم باسط ذراعیہ بالوصید[1]

اِمامت کی اُجرت

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اب یہ رواج ہو گیا ہے کہ آئمۂ مساجد تنخواہ لینے لگے ہیں اور وہ ہر ماہ ایک مقررہ رقم اُجرت کے طور پر وصول کرتے ہیں، لیکن حق بات یہ ہے کہ "امامت بأجرِ معین مکروہ ہست۔"[2]

حضرت رکن عالمؒ کا امتحان

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ جب حضرت رکن عالم پہلی بار دہلی تشریف لائے تو علماء نے ان کی قابلیت جانچنے کے لئے بزدوی سے پانچ مشکل سوال دریافت کئے۔ حضرت نے ان کا تسلی بخش جواب دیا اور رونے لگے۔ حاضرین نے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ زمانۂ طالب علمی میں جب وہ بزدوی پڑھ رہے تھے تو استاد نے ان ہی پانچ مسائل پر تقریر کی لیکن موصوف کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ حضرت نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ان کے والدِ بزرگوار حضرت صدر الدین عارف ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ حضرت صدر الدین نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور ایک جگہ لے جا کر وہ مسائل انہیں اچھی طرح سمجھائے۔ اس کے بعد حضرت عارف فرمانے لگے کہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح یاد کر لیں۔ ایک روز ان کی ضرورت پڑے گی۔ حضرت رکن عالم فرماتے ہیں کہ وہ مدت سے اس موقع کے منتظر تھے، تیس برس انتظار کے بعد یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔[3]

---

۱ - سورہ کہف میں اس مضمون کی جو آیت ہے وہ یوں ہے: وکلبھم باسطٌ ذراعیہ بالوصید۔

۲ - معدن المعانی، ص ۳۴۵

۳ - ایضاً، ص ۱۶۴۔

اشاعتِ اسلام

ایک دن ایک درویش نے مخدوم صاحب سے کہا کہ ان کی برکت سے یہاں (بہار میں) اسلام کا غلبہ ہو جائے گا اور مسلمان قوت پکڑ لیں گے۔ حضرت نے فرمایا:

ہر چہ از زبانِ درویشاں رَود ہمچناں شودا

مخدوم صاحب کا ذوقِ مطالعہ

ملفوظات میں تذکرۃ الاولیاء، ترغیب الصلوٰۃ، شرح تعرّف، لوامع قاضی حمید الدین ناگوری، آداب المریدین، وصیت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی، مختصر عقیدۂ نسفی، قوتِ القلوب، عوارف المعارف، تمہیداتِ عین القضاۃ، کنز المسائل، فوائد الفواد، روضۃ العلماء، احیاء العلوم، مکتوباتِ عین القضاۃ، رُوح الارواح اور تفسیرِ امام زاہد کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابیں مخدوم صاحب کے مطالعہ میں رہتی تھیں اور بہار جیسے دُور افتادہ علاقے میں موجود تھیں۔

اسی طرح ملفوظات میں جا بجا اشعار ملتے ہیں، جن سے مخدوم صاحب کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ معدن المعانی کی ابتداء میں مخدوم صاحب نے جس انداز سے صفاتِ باری تعالیٰ پر گفتگو فرمائی ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔

✪✪✪

---

۱ - معدن المعانی، ص ۴۷۲۔

الدُّرُ المَنظُوم

حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت بخاریؒ کے مُریدوں نے ان کے سوانح حیات اور ملفوظات کے کئی مجموعے تیار کئے تھے۔ ان میں سے جامع العلوم، تاریخِ محمدی، مناقبِ قطبی، خزانۂ جلالی اور جواہرِ جلالیہ[1] خاص طور پر مشہور ہیں۔

جامع العلوم کا اردو ترجمہ الدّرالمنظوم فی ترجمہ ملفوظ المخدوم کے عنوان سے ۱۳۷۷ء میں ملتان سے طبع ہو چکا ہے۔ ان ملفوظات کے مطالعہ سے سلطان فیروز تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) کے عہد کی مذہبی، سماجی اور ثقافتی زندگی پر ایک نئے زاویے سے روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے برِعظیم پاک و ہند میں مُسلم دَور کی تاریخ کے طالب علم کے لئے مخدوم جہانیاں کے ملفوظات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

صاحبِ ملفوظات: صاحبِ ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت بخاریؒ کا اصل نام حسین تھا[2]۔ موصوف اُوچہ شریف کے مشہور رُوحانی پیشوا حضرت جلال الدین سُرخ پوش بخاریؒ (م ۱۲۹۱ء) کے پوتے اور سید احمد کبیرؒ کے فرزندِ رشید ہیں۔

جامع العلوم کے مرتب سید علاء الدین نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی زبانِ فیض ترجمان سے یہ سنا تھا کہ موصوف ۷۰۷ھ (۱۳۰۷ء) میں شبِ برات میں پیدا ہوئے تھے[3]۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اُوچہ شریف میں پائی اور نوعمری ہی میں اپنے چچا سید صدر الدینؒ کے مرید ہو گئے۔ عالمِ جوانی میں مخدوم صاحب ملتان تشریف لے گئے جہاں انہوں نے حضرت اَبُو الفتح رُکن الدین سہروردیؒ (م ۱۳۳۴ء) کی نگرانی میں علومِ ظاہری اور باطنی کی تعلیم حاصل کی۔

۱ - جواہرِ جلالیہ مرتبہ فضل اللہ (ضخامت ۱۲۵ ورق) کا ایک نادر مخطوطہ ڈاکٹر وارث علی ترمذی ساکن ناظم آباد کراچی کے ذاتی کتابخانے میں محفوظ ہے۔

۲ - محمد جعفر بدر عالم، ملفوظاتِ شاہ عالم، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ، یونیورسٹی کلکشن نمبر ۳۴، ورق ۱۵۳ ب۔

۳ - سید علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۷۵۔

الدر المنظوم میں مخدوم صاحب نے بعض موقعوں پر اپنے اساتذہ کا ذکر فرمایا ہے اور اس ضمن میں اُوچہ کے قاضی بہاء الدین کا ذکر بھی کیا ہے جن سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔[1] قاضی بہاء الدین کی وفات کے بعد شیخ رکن الدینؒ نے اپنے پوتے شیخ موسیٰ اور مولانا مجد الدین کو ان کا اُستاد مقرر کیا۔ مؤخر الذکر اُستاد سے مخدوم صاحب نے بزدوی اور ہدایہ کا درس لیا تھا۔[2]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں موصوف ملتان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کے مرشد شیخ رکن الدینؒ کی اہلیہ محترمہ شیخ موصوف کے حکم سے دُودھ میں میوے اُبال کر انہیں بھیجا کرتی تھیں۔[3]

مخدوم جہانیاں نے کچھ عرصہ دہلی میں حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ (م ۱۳۵۶ء) کی خدمت میں بھی گزارا اور ان کی نگرانی میں منازلِ سلوک طے کیں۔

مخدوم صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ حصولِ علم اور سیر و سیاحت میں گزرا تھا۔ مکہ مکرمہ میں قیامؒ کے دوران میں انہوں نے بہت سا وقت امام عبداللہ یافعیؒ کی صحبت میں گزارا۔ انہوں نے زمانۂ طالب علمی میں حدیث اور تصوّف کی جو کتابیں ملتان اور اُوچہ میں پڑھی تھیں وہ آپ نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں دوبارہ پڑھیں اور ان کی باقاعدہ سند حاصل کی۔ الدّرالمنظوم کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب نے حجاز میں قیام کے دوران میں صحیح بخاری، صحیح مُسلم، موطأ امام مالک، جامع ترمذی، مُسند احمد ابنِ حنبل، سُنن بیہقی اور المستدرک کا مطالعہ کیا تھا۔[4] موصوف نے شیخ الشیوخ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردیؒ کی عوارف المعارف حرمِ نبویؐ میں شیخ عبداللہ مطریؒ سے پڑھی۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ عوارف المعارف کا جو نسخہ ان کے زیرِ مطالعہ تھا وہ شیخ الشیوخؒ کی نظر سے گزرا ہوا تھا۔[5] حرمین شریفین میں قیام کے دوران میں انہیں معلوم ہوا کہ عراق کے ایک دُور افتادہ گاؤں میں شیخ الشیوخؒ کے ایک معمّر خلیفہ شیخ محمود تستریؒ مقیم ہیں اور انہوں نے عوارف المعارف شیخ الشیوخؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔ مخدوم صاحب نے فوراً رختِ سفر باندھا اور شیخ محمود تستریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے عوارف المعارف لفظاً لفظاً سُنی۔ مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ اس وقت شیخ

---

۱ - ایضاً، ص ۴۳۵۔

۲ - ایضاً، ص ۴۳۸۔

۳ - ایضاً، ص ۷۹۷۔

۴ - سید علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۶۵۱۔

۵ - ایضاً، ص ۵۶۵۔

موصوف کی عمر ۱۳۲ برس تھی اور ان کی صحت کا یہ عالم تھا کہ وہ عصاء کے سہارے چل پھر لیتے تھے[1]

مخدوم جہانیاں نے سیر و سیاحت کے دوران چھتیس حج کئے اور رُبع مسکون کی سیر کرنے کے بعد بالآخر اُوچہ شریف میں مقیم ہو گئے۔

تغلق سلاطین ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔ سلطان محمد بن تغلق نے انہیں شیخ الاسلام کا منصب پیش کیا اور ۴۰ خانقاہیں ان کی تحویل میں دیں۔ ایک رات انہوں نے خواب میں اپنے مرشد شیخ ابو الفتح رُکن الدینؒ کی زیارت کی اور انہوں نے مخدوم صاحب کو حکم دیا کہ منصب اور خانقاہوں کی نگرانی چھوڑ کر حج بیت اللہ کے لئے چلے جائیں۔ مخدوم صاحب اپنے مرشد کا اشارہ پاتے ہی مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ موصوف اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان کے مرشد نے انہیں کیچڑ سے نکالا تھا ورنہ منصب اور خانقاہوں کی نگرانی ان میں تکبّر پیدا کر دیتی اور وہ "غرق" ہو جاتے[2]

محمد بن تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ تغلق کو مخدوم جہانیاں کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ اس نے ٹھٹھہ کی فتح کے موقع پر مخدوم صاحب کی سفارش پر سندھیوں کا قصور معاف کر دیا اور ان کے زیر اثر اپنی مملکت میں بہت سی مفید اِصلاحات نافذ کیں جن کی تفصیل "فتوحاتِ فیروز شاہی" اور "سیرتِ فیروز شاہی" میں موجود ہے۔

مخدوم صاحب ہر دوسرے تیسرے سال دہلی تشریف لے جاتے تھے۔ سلطان فیروز شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کرتا اور بڑی عزت اور عقیدت کے ساتھ انہیں شہر میں لاتا۔ مخدوم صاحب ہفتہ عشرہ بعد سلطان کو ملنے جاتے تو راستے میں ضرورت مند اپنی عرضیاں ان کی پالکی میں ڈال دیتے اور موصوف ملاقات کے وقت وہ عرضیاں سلطان کے سامنے رکھ دیتے اور وہ ان پر احکام صادر کر دیتا تھا[3]

مخدوم جہانیاں کی سعی و تبلیغ سے جنوب مغربی پنجاب اور سابق ریاست بہاولپور کے کئی غیر مسلم قبیلے مشرف باسلام ہوئے۔ انہوں نے گجرات اور کاٹھیاواڑ کی طرف خصوصی توجہ دی اور احمد آباد میں ان کے پوتے حضرت قطب عالمؒ (م ۱۴۵۳ء) اور پڑپوتے حضرت شاہ عالمؒ (م ۱۴۷۵ء) نے سلاطین گجرات کی سرپرستی قبول فرمائی۔ منگرول میں مخدوم جہانیاں کے مشن کو ان کے ایک خلیفہ سیّد سکندر ترمذیؒ نے آگے بڑھایا۔

۱۔ ایضاً، ص ۷۰۰، ۸۸۱، ۷۱۰۔

۲۔ سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۳۱۸، ۳۱۷۔

۳۔ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۳۴۳۔

مخدوم جہانیاں نے ۱۳۸۴ء میں ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی اور ان کے بھائی حضرت صدرالدین ابو الفضل محمد المعروف بہ راجو قتالؒ ان کے سجادہ پر بیٹھے۔

مخدوم جہانیاں نے بقول حضرت شاہ عالم بخاریؒ ۲۰۱۱۷۳ افراد کو بیعت کیا اور ان میں سے ۱۲۷۵۰ مریدوں کو خلافت عطاء فرمائی[1] ان کے خلفاء میں ان کے بھائی راجو قتال کے علاوہ سید سکندر ترمذیؒ، شیخ قوام الدین عباسی لکھنویؒ اور اخی جمشید را بگیریؒ خاص طور پر مشہور ہیں۔

ملفوظات کا آغاز: ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء میں جب مخدوم جہانیاں، سلطان فیروز شاہ تغلق سے ملنے دہلی تشریف لے گئے تو اس زمانے میں سلطان کے انتظار میں کئی ماہ تک دہلی میں رکنا پڑا۔ اس زمانے میں جامع ملفوظات سید علاء الدین علی بن سعد حسینی دس ماہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے اور ان کے ملفوظات جمع کرتے رہے[2] سید علاء الدین رقمطراز ہیں کہ مخدوم صاحب نے اپنے ملفوظات کو اپنے مریدوں تک پہنچانے کا حکم دیا تھا تاکہ جو مرید ان کی صحبت میں نہیں بیٹھ سکتے وہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں[3]

مخدوم صاحب کے ملفوظات بادی النظر میں کسی فقیہ کے ملفوظات معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے فقہ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی مجلس میں بھی اکثر فقہی مسائل زیر بحث رہتے تھے۔ الدّرالمنظوم کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کی حدیث پر گہری نظر تھی اور موصوف بار بار صحاح ستہ کے حوالے دیا کرتے تھے۔

مخدوم صاحب کی مجالس میں قُوتُ القلوب، قصیدہ لامیہ، مشارق الانوار، عوارف العارف، مشکوٰۃ المصابیح، شرح جامع صغیر اور فتاویٰ کامل جیسی کتابوں کا اکثر ذکر رہتا تھا۔

الدّرالمنظوم میں ایک چیز قابل توجہ ہے کہ فوائد الفواد، خیر المجالس، جوامع الکلم اور تحفۃ المجالس کی نسبت اس کتاب میں مشائخ کے قطع مسافت (طی الارض) تصرفات اور کشف و کرامات کا ذکر بہت زیادہ ہے۔

ظن المومنین خیرا: ایک روز کسی شخص نے مخدوم صاحب سے کہا کہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ رمضان کے آخری عشرہ میں معتکف نہیں ہوتے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اعتکاف تزکیۂ نفس کے لئے کیا جاتا ہے اور غالباً انہوں نے تزکیۂ نفس کر لیا ہے۔ ان کے بارے میں ہمیں نیک گمان رکھنا چاہیے[4]

چلہ کشی: چشتیہ سلسلہ کے بزرگ چلہ کشی کے قائل نہ تھے۔ اس ضمن میں حضرت بندہ

۱- محمد جعفر بدر عالم، ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۱۵۴ الف۔
۲- علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۵۹۵۔
۳- ایضاً، ص ۳۸۳۔
۴- سید علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۴۵۹۔

نواز گیسو درازؒ فرماتے ہیں:

"خواجگانِ ما در اربعین نہ نشستہ اند"[1]

چشتی بزرگوں کے عمل کے برعکس سہروردی بزرگ چلّہ کشی کے قائل تھے اور الدّرالمنظوم کی روایت ہے کہ مخدوم جہانیاں چلّہ کاٹا کرتے تھے[2]

مخدوم جہانیاں کے معمولات: ملفوظات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب نمازِ عشاء کے بعد صلوٰۃ التوبہ ادا کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی صلوٰۃ التسبیح بھی پڑھ لیا کرتے تھے[3] سید علاء الدین لکھتے ہیں کہ موصوف حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت کے لئے نماز ظہر کے بعد "دس رکعت ظہریہ" ادا کیا کرتے تھے[4] اسی طرح موصوف صلوٰۃ حرز' صلوٰۃ اوّابین' صلوٰۃ اشراق' صلوٰۃ الحاجۃ' نمازِ احزاب اور نماز چاشت پر بھی کاربند تھے۔ جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ مخدوم جہانیاں ۷۵ سال کی عمر میں بھی سو رکعت نفل روزانہ ادا کیا کرتے تھے[5]

مخدوم صاحب کا مسلک: مخدوم صاحب نے ایک مجلس میں حاضرین کو بتایا کہ ان کے آبا و اجداد حنفی المذہب تھے[6]

درس و تدریس: دہلی میں قیام کے دوران میں لوگ مخدوم جہانیاں سے مشارق الانوار اور عقائد نسفی کا درس لیا کرتے تھے[7] الدّرالمنظوم کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ موصوف لوگوں کو شرح نود و نہ اور فقہ اکبر پڑھایا کرتے تھے۔ اسی طرح مخدوم صاحب اسرار الدعوات اور قرآنِ حکیم کا درس بھی دیا کرتے تھے۔

قرآن خوانی: سہروردیوں کے ہاں قرآن خوانی پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ موصوف ساتوں قرأتوں سے قرآن پڑھا کرتے تھے[8] ان کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے ایک رات اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو دو نفلوں میں پورا قرآن ختم کر دے۔ جب حاضرین میں سے کسی نے

---

۱ - محمد اکبر حسینی: جوامع الکلم' مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ ' ص ۲۳۱۔
۲ - سید علاء الدین' الدّر المنظوم' ص ۸۴۔
۳ - ایضاً' ص ۵۶ ' ۵۸۔
۴ - ایضاً' ص ۷۷۔
۵ - ایضاً' ص ۱۱۷۔
۶ - سید علاء الدین' الدّر المنظوم' ص ۲۵۳۔
۷ - ایضاً' ص ۴۵۔
۸ - نور احمد خان فریدی' بہاء الدین زکریاؒ ' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء ص ۹۰۔

اس بات کی ہامی نہ بھری تو موصوف خود آگے بڑھے اور پہلی رکعت میں ایک قرآن اور چار پارے تلاوت فرمائے اور دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھ کر دوگانہ مکمل کیا[1] حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ نے اپنے جانشین صدر الدین عارفؒ کو یہ وصیت کی تھی کہ وہ مجذوبوں کو قرآن پڑھا کر ہوش میں لایا کریں[2] حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا قرآنِ حکیم سے لگاؤ ان کے مریدوں کو بھی ورثہ میں ملا تھا۔ مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار سید احمد کبیرؒ ایک قرآن دن میں اور ایک رات میں ختم کیا کرتے تھے اور آں جنابؒ خوفِ خدا کے مارے کبھی بستر پر نہ سوتے تھے[3]

شاہی خاندان سے تعلقات: ایک روز شہزادہ محمود خان مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اسے کلاہ پہنائی اور کچھ تبرک دے کر رخصت کیا۔ رخصتی کے وقت موصوف نے شہزادہ سے فرمایا کہ وہ سلطان کو ان کا سلام پہنچا دے[4] دو روز بعد شہزادہ ظفر خان' ان کا بیٹا' شہزادہ تغلق شاہ اور چند ارکینِ سلطنت سلطان کا پیغام لے کر مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے یہ التجا کی کہ سلطان کی یہ خواہش ہے کہ جناب شاہی محل میں قدم رنجہ فرمائیں۔ مخدوم صاحب اسی وقت ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ شہزادہ تغلق شاہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں پالکی میں بٹھایا اور شاہی محل میں لائے۔ نمازِ جمعہ کے بعد سلطان اپنے عمائدین کے ساتھ مخدوم صاحب کی زیارت کو آیا[5] اگلے روز سلطان فیروز شاہ کا پوتا شہزادہ مبارک خان، مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے اپنے سر پر "نامشروع" ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ جونہی مخدوم صاحب کی اس پر نظر پڑی انہوں نے فوراً" اعتراض کیا۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مخدوم جہانیاں بڑے سے بڑے شخص کے سامنے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے نہیں چُوکتے تھے۔

شاہی محل میں قیام کے دوران میں سلطان فیروز تغلق اشراق کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان کی آمد کے وقت موصوف نمازِ اشراق ادا فرما رہے تھے۔ سلطان ان کے قریب احتراماً" کھڑا رہا اور جونہی انہوں نے سلام پھیرا' خادم نے سلطان کی آمد کی اطلاع دی۔

---

۱ - اعجاز الحق قدوسی' صوفیائے پنجاب' مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء' ص ۱۹۹۔

۲ - محمد قاسم فرشتہ' تاریخ فرشتہ' مطبوعہ بمبئی ۱۸۳۲ء ج ۲' ص ۷۷۰۔

۳ - سید علاء الدین' الدر المنظوم' ص ۳۰۰۔

۴ - ایضاً' ص ۹۰۸۔

۵ - ایضاً' ص ۹۱۳۔

مخدوم صاحب نے سلطان سے ملاقات کی اور تھوڑی دیر بعد مولانا سراج الدین کو امام بنایا اور اس کی اقتدا میں مخدوم جہانیاں اور سلطان نے دوگانہ ادا کیا۔ بعد ازاں مخدوم صاحب نے سلطان کو بزرگوں کے واقعات سنائے اور ان کی سفارش پر سلطان نے مستحقین کے وظائف مقرر کئے[1] اس واقعہ کے بارہ دن بعد سلطان سہ بارہ مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے لوگوں کی عرضیاں اس کی خدمت میں پیش کیں۔ سلطان نے ان عرضیوں پر فوراً احکام صادر کر دیئے۔ جب تک مخدوم صاحب دہلی میں مقیم رہے شہزادہ ظفر خان اکثر ان کی ملاقات کو آتا رہا[2]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک روز شہزادہ محمود خان سلطان کا پیغام لایا کہ اگر مخدوم صاحب چند روز فیروز آباد کے محل میں قیام فرمائیں تو سلطان کو ان کی زیارت کرنے میں سہولت رہے گی اور وہ جلد جلد زیارت سے مشرف ہوتا رہے گا۔ مخدوم صاحب نے جواب میں فرمایا کہ فیروز آباد کے محل میں قیام مناسب ہے لیکن ان کے ساتھ بہت لوگ ہیں اور موصوف جہاں قیام پذیر ہیں وہاں جگہ کافی کشادہ ہے۔ محل میں انہیں تکلیف ہو گی۔ اس عذر کے باوجود انہوں نے ارشاد فرمایا کہ موصوف وہاں ضرور جائیں گے[3]

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روز خانِ جہاں، سلطان فیروز تغلق کی طرف سے مخدوم صاحب کے لئے کپڑے لایا تو انہوں نے انہیں قبول کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ مشروع ہوں گے تو موصوف خود انہیں استعمال کریں گے اور اگر نامشروع ہوئے تو اپنی اہلیہ کو دے دیں گے[4]

ہدیۂ شاہی کے بارے میں سہروردی مشائخ کا مسلک چشتی بزرگوں کے مسلک کے خلاف تھا۔ چشتی بزرگ عموماً بادشاہوں کے ہدیئے قبول نہیں کرتے تھے لیکن سہروردی بزرگ بطیبِ خاطر قبول کر لیتے تھے۔ ایک موقع پر سلطان نے خانِ جہاں کی معرفت کپڑوں کے چونتیس جوڑے مخدوم صاحب کی خدمت میں بھیجے، جو انہوں نے قبول فرما لئے۔ خانِ جہاں کی روانگی کے بعد موصوف نے ایک جوڑا زیبِ تن فرمایا اور یہ آیت پڑھی:

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم[5]

---

۱ - سید علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۳۵۔
۲ - ایضاً، ص ۳۶۔
۳ - ایضاً، ص ۷۰۔
۴ - سید علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۴۱۔
۵ - ایضاً، ص ۴۳۔

مخدوم جہانیاں کے جانشین اور برادرِ اصغر شیخ راجو قتالؒ کے ساتھ بھی سلطان فیروز تغلق کے بڑے اچھے مراسم تھے اور سلطان نے انہیں ایک گاؤں بطورِ جاگیر، دو ہزار ٹنکے اور خلعت بطورِ نذر پیش کئے تھے[۱] الدّرالمنظوم کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مخدوم جہانیاں کی زندگی میں راجو قتال، سلطان فیروز تغلق اور مخدوم صاحب کے درمیان قاصد کے فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے۔

امراء سے تعلقات: سید علاء الدین لکھتے ہیں کہ مخدوم جہانیاں امرائے سلطنت سے میل ملاپ رکھنے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک روز خانِ جہاں ان سے ملنے آیا تو انہوں نے اسے شریعت کے مطابق عدل و انصاف کرنے کی تلقین فرمائی[۲]

شیخ محمد اکرام "آبِ کوثر" میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں خاں جہاں، مخدوم جہانیاں سے ناخوش تھا۔ اس نے ان کے کسی معتقد کے بیٹے کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا تھا۔ مخدوم صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو موصوف سفارش کے لئے خانِ جہاں کے گھر پہنچے لیکن اس نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ مخدوم صاحب اُنیس بار بغرضِ سفارش خانِ جہاں کے گھر گئے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور آخری بار اس نے کہلا بھیجا کہ اب تو انہیں شرم آنی چاہیے۔ مخدوم صاحب نے جواباً" کہلا بھیجا کہ موصوف جتنی بار اس بے گناہ کی سفارش لے کر آتے ہیں، انہیں اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔ ان کے ان الفاظ کا اس پر بڑا اثر ہوا اور اس نے اپنے کئے پر معافی مانگی۔ اس کے بعد وہ ان کا معتقد ہو گیا[۳] جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک بار خانِ جہاں، فیروز شاہ کی طرف سے کپڑوں کا تحفہ لے کر مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اگرچہ وہ دیر بعد قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتا ہے لیکن وہ دل و جان سے ان کا غلام ہے۔ اتنے میں مخدوم صاحب کا ایک خادم مصری لے کر حاضر ہوا تو مخدوم صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے مصری کی ایک ڈلی خانِ جہاں کے منہ میں ڈال دی[۴]

سید علاء الدین لکھتے ہیں کہ ایک روز مخدوم جہانیاں نے سلطان فیروز تغلق کے درباری امیر خانِ جہاں کا بھیجا ہوا کھانا تناول فرمایا۔ اتفاق سے اسی شب مخدوم صاحب کی نمازِ تہجد فوت ہو گئی۔ اگلے روز انہوں نے اپنے معتقدین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ اسی کھانے کا اثر تھا[۵]

۱۔ ایضاً، ص ۴۲۲۔
۲۔ ایضاً، ص ۵۹۔
۳۔ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۳۸۵۔
۴۔ سید علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۴۱۔
۵۔ ایضاً، ص ۳۳۵۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ مخدوم صاحب بادشاہ کے گھر کا کھانا تناول نہیں فرماتے تھے اور اس بارے میں ان کا یہ قول تھا کہ بادشاہوں کا مال مشتبہ ہوتا ہے۔ بادشاہ کے گھر کا کھانا صرف اسی صورت میں جائز ہوتا ہے جب وہ قرض لے کر کھلائے۔ فیروز شاہ تغلق جب کبھی قرض لے کر انہیں کھانا کھلاتا تھا تو موصوف ضیافت قبول کر لیتے تھے[1]

شیخ ابو الفتح رُکن الدین کا تصرف: مملوک سلاطین کے عہد میں برِعظیم پاک و ہند پر منگولوں کے حملے شروع ہو گئے تھے جو خلجی اور تغلق سلاطین کے عہد میں بھی جاری رہے۔ ملتان چونکہ سرحدی شہر تھا اس لئے منگول بلا رُوک ٹوک وہاں تک پہنچ جاتے اور شہر کا محاصرہ کر لیتے۔ حضرت مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ ایک بار منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کیا تو شیخ رُکن الدین نے اپنے تصرف سے حملہ آوروں کو ملتان سے "دفع" کیا[2]

حضرت مخدوم جہانیاں، شیخ رُکن الدینؒ کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ ان سے یہ روایت ہے کہ ان کے مُرشد ملتانی زبان جانتے تھے[3]

حضرت بہاء الدین زکریاؒ: حضرت بہاء الدین زکریاؒ بڑے مالدار تھے اور یہ بات چشتی بزرگوں کی نظروں میں بُری طرح کھٹکتی تھی۔ سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوریؒ کو حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے مال جمع کرنے پر بڑا اعتراض تھا اور دونوں بزرگوں کی اس موضوع پر باقاعدہ خط و کتابت بھی ہوئی تھی[4] حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ نے اپنی ایک مجلس میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ مشائخ ملتان نے مال جمع کرنے پر کمر ہمت باندھی ہوئی ہے اور وہ تجارت اور سوداگری میں بھی دلچسپی لیتے ہیں لیکن ہمارے (چشتی) بزرگ دنیاوی اسباب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے[5] حضرت گیسو درازؒ کے ملفوظات میں یہ بھی مرقوم ہے کہ جب حضرت بہاء الدین زکریاؒ فوت ہوئے تو انہوں نے ایک کروڑ اسّی لاکھ ٹنکے ترکہ میں چھوڑے تھے[6] ایک دوسرے موقع پر حضرت گیسو درازؒ نے فرمایا کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی وفات کے بعد ان کے گھر سے ۹ من سونا نکلا تھا[7] حضرت مخدوم جہانیاں اس بات پر شاہد ہیں کہ ساٹھ ستّر گاؤں حضرت زکریاؒ کی ملک تھے اور ان میں سے کچھ گاؤں ان کے زر خرید تھے اور باقی بطورِ جاگیر

۱۔ ایضاً، ص ۳۴۴۔
۲۔ سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ۳۶۳۔
۳۔ ایضاً، ص ۳۱۷۔
۴۔ عبدالحق محدّث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۳۰۔
۵۔ سیّد محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۲۱۳۔
۶۔ ایضاً، ص ۴۰۔
۷۔ ایضاً، ص ۳۳۵۔

انہیں ملے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مخدوم صاحب نے فرمایا کہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے پاس کوئی گاؤں نہ تھا۔[1]

حضرت مخدوم جہانیاں حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے پوتے حضرت ابُو الفتح رُکن الدینؒ کے مرید تھے اور ان کے والد بزرگوار سیّد احمد کبیرؒ حضرت رُکن الدینؒ کے والد بزرگوار حضرت صدر الدین عارفؒ سے بیعت تھے اور ان کے جدِ امجد سیّد جلال الدین سرخپوش بخاریؒ کو حضرت زکریاؒ سے خرقۂ خلافت ملا تھا۔ اس لئے اس عظیم خاندان کے بارے میں موصوف دوسروں کی نسبت زیادہ اور صحیح معلومات رکھتے تھے۔ ان ہی سے روایت ہے کہ حضرت زکریاؒ کا انتقال منگل کے روز ہوا تھا۔[2]

بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ: مخدوم جہانیاں نے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے بھی فیض اخذ کیا تھا اور موصوف ان کی طرف سے چشتیہ سلسلہ میں بیعت لینے کے مجاز تھے۔[3] مخدوم صاحب چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے بارے میں بھی بڑی معلومات رکھتے تھے۔ ان سے یہ روایت ہے کہ بابا صاحب منگل کے روز فوت ہوئے تھے۔[4]

شیخ جمال اُچویؒ: شیخ جمال اُچوی بڑے اونچے پایہ کے درویش ہو گزرے ہیں اور ایک عالم ان کی ولایت کا قائل ہے۔ موصوف بڑی سادہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ ان کی چادر، تہمد، کرتہ اور عمامہ ایک ٹنکے کی مالیت کا ہوتا تھا۔[5]

ایک خدا رسیدہ سندھی خاتون: مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ سندھ میں ایک خدا رسیدہ خاتون رہتی تھی جو بڑی کامل ولیہ تھی۔ جب مخدوم صاحب اس سے ملے تو اس نے انہیں بتایا کہ وہ عرش، کرسی، لوح، قلم، بہشت اور دوزخ دیکھتی ہے۔ اس نے ایک بار خدا تعالیٰ کو مخاطب کر کے یہ کہا "میں تو تیرے جمالِ لایزال کی شیفتہ ہوں اور تو مجھے یہ تماشا دکھاتا ہے۔" اس نے مخدوم جہانیاں سے درخواست کی کہ وہ خدا سے دعا کریں کہ اسے حجاب ہو جائے تاکہ وہ صرف خدا کو دیکھ سکے۔[6]

---

۱ - سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۵۴۲۔
۲ - ایضاً، ص ۳۱۵۔
۳ - ایضاً، ص ۳۱۶۔
۴ - ایضاً، ص ۳۱۶۔
۵ - سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۲۰۸۔
۶ - ایضاً، ص ۱۱۳۔

مخدوم صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک بار سیوستان (موجودہ سیہون شریف) سے محبوبہ نامی ایک خاتون ان سے ملنے اُوچ آئی۔ وہ بڑی صاحبہؒ تصرف تھی۔[1]

اسی طرح مخدوم صاحب نے اُوچ اور مدینہ منورہ میں دو ایسی خواتین کی موجودگی کی نشاندہی فرمائی جو کامل ولیہ تھیں۔[2] انہوں نے ایک ایسی خاتون کو بھی دیکھا تھا جو دو نفلوں میں قرآن مجید ختم کیا کرتی تھیں۔[3]

قاضی شمس الدین: قاضی شمس الدین برادرِ قتلغ خان تغلق عہد کے ایک نامور عالم تھے اور سلطان محمد بن تغلق کے ان کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے۔ حضرت گیسو درازؒ کے ملفوظات جوامع الکلم کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق انہیں اہم مذہبی اُمور میں مشورہ لینے کے لئے وقت بے وقت طلب کر لیتا تھا۔[4] ان کے بارے میں مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ موصوف شیخ علاء الدولہؒ کے مرید تھے اور آخر عمر میں بیت اللہ کے مجاور بن گئے تھے۔ قاضی شمس الدین ذکر و شغل میں ایسے کامل تھے کہ جب وہ سوتے تو ان کے سینہ سے ذکر کی آواز سنائی دیتی تھی۔ موصوف مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے اور مخدوم صاحب نے ان کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ ان کے جنازے سے بھی ذکر کی آواز سنائی دیتی تھی۔ قاضی شمس الدین کو اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ کی پائنتی اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کی قبر کے جوار میں اَبدی آرام گاہ ملی۔[5]

گرانیٔ غلہ: ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء میں مخدوم صاحب دہلی تشریف لائے تو امساکِ باراں کی وجہ سے غلہ گراں ہو گیا تھا۔ لوگوں نے موصوف سے گرانیٔ غلہ کی شکایت کی اور بارش کے لئے دُعا کی درخواست کی۔ مخدوم جہانیاں کی دُعا سے بارش برسی اور اس کے بعد غلہ ارزاں ہو گیا۔[6]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ سالک کو گوشت بہت کم استعمال کرنا چاہئے اور اسے چاہئے کہ وہ ہفتہ میں ایک یا دو بار سے زیادہ گوشت نہ کھائے اور گوشت کا وزن پچاس درہم (تین چھٹانک) سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔[7] موصوف فرماتے ہیں کہ ان کے مرشد شیخ رُکن الدین دُودھ

---

۱ - ایضاً، ص ۳۰۲۔
۲ - ایضاً، ص ۸۶، ۳۵۔
۳ - ایضاً، ص ۱۹۳۔
۴ - سید محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، ص ۱۷۵۔
۵ - سید علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۴۰۰۔
۶ - ایضاً، ص ۵۱۔
۷ - سید علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۶۰۵۔

کے ایک پیالے میں چند میوے ڈالتے اور انہیں جوش دے کر استعمال فرماتے۔ شیخ موصوف رُوز و شب میں اس کے علاوہ اور کوئی غذا استعمال نہ کرتے تھے۔ ان کے اہلِ خانہ کو ان کی صحت کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے ملتان کے ایک ماہر طبیب فرید کو بلا بھیجا۔ شیخ رُکن الدین کے اہلِ خانہ نے فرید کو بتایا کہ موصوف کی خوراک بہت کم ہے اور آنجناب معمولی سی خوراک پر گزارا کرتے ہیں۔ اس نے بطور نمونہ وہ غذا استعمال کی اور کہا کہ اسے ہفتہ بھر اور کسی غذا کی حاجت نہیں[1]

مکہ مکرّمہ کا دستور: مخدوم جہانیاں مدتوں تک مکہ مکرّمہ میں مقیم رہے تھے' اس لئے موصوف وہاں کے رسم و رواج سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ایک موقع پر یہ فرمایا کہ انہوں نے مکہ مکرّمہ میں یہ دیکھا کہ وہاں کی سمجھدار خواتین اپنے شوہروں کو اس بات کا "حکم" (اجازت نہیں) دیتی تھیں کہ وہ جوان کنیزوں سے مجامعت کیا کریں تاکہ وہ حرام کاری سے محفوظ رہیں[2]

الدّرّالمَنظُوم میں ایک غلط روایت: سیّد علاء الدین رقمطراز ہیں کہ مخدوم صاحب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ حسین بن منصور حلّاج کے قتل کا فتویٰ قاضی ابو یوسفؒ نے لکھا تھا[3] یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ حلّاج کو ۳۰۹ھ میں تختۂ دار پر چڑھایا گیا تھا اور قاضیٔ موصوف اس واقعہ سے ۱۲۷ سال قبل ۱۸۲ھ میں انتقال فرما چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی جاہل متصوّف نے قاضی صاحب کی دشمنی میں یہ روایت گھڑ کر مشہور کر دی اور مخدوم صاحب نے سُنی سنائی بات مجلس میں بیان کر دی۔

دہلی کے حفاظتی بند: الدّرّالمَنظُوم میں بندِ چندن دریا' بندِ فتح خان' بند نائب باربک اور "ایک اور بند" کا ذکر آیا ہے[4] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلاطینِ دہلی نے شہر کو دریائے جمنا کی طغیانی سے محفوظ رکھنے کے لئے مختلف جگہوں پر بند تعمیر کروائے تھے۔ فتح خان' سلطان فیروز تغلق کا بڑا بیٹا تھا جو اپنے باپ کی زندگی میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان فیروز شاہ نے اپنے مرحوم بیٹے کی یاد میں بندِ فتح خان تعمیر کروایا تھا۔

شاہی نوبت: مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی میں پانچوں نمازوں کے وقت اور رات کو سُونے کے وقت کا اعلان کرنے کے لئے نوبت بجائی جاتی

۱۔ ایضاً' ص ۶۰۷۔

۲۔ ایضاً' ص ۱۳۷۔

۳۔ سیّد علاء الدین' الدّر المنظوم' ص ۱۳۳۔

۴۔ ایضاً' ص ۱۳۵ ' ۴۷۔

تھی۔[1]

مخدوم صاحب کئی بار دہلی تشریف لے گئے اور کئی کئی ماہ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ موصوف اس بات کے شاکی تھے کہ دہلی والے ڈھنگ سے کسی کی دعوت نہیں کرتے۔[2]

ہندوستان کی عظمت: حضرت امیر خسرو کی طرح مخدوم جہانیاں بھی ہندوستان کی عظمت کے قائل تھے۔ موصوف اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد ہندوستان کی عظمت مسلّمہ ہے۔[3]

مخدوم جہانیاں کی وسیع المشربی: مخدوم جہانیاں اپنے ملنے والوں کو یہ تلقین کیا کرتے تھے کہ فرائض میں چاروں مذاہب کے مطابق عمل کرو تاکہ جس مذہب کا آدمی ملنے آئے وہ باسانی اس کی اقتدا کر سکے۔[4]

الدّرالمنظوم میں مرقوم ہے کہ مخدوم جہانیاں دہلی میں قیام کے دوران میں علیل ہو گئے۔ دہلی میں اس زمانے میں بہت سے مسلمان اطبا موجود تھے لیکن انہوں نے ایک ہندو طبیب سے علاج کرایا۔[5] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف غیر مُسلم طبیب سے علاج کرانا جائز سمجھتے تھے۔ اس سے ان کی وسیع المشربی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

مزامیر کے بارے میں مخدوم جہانیاں کی رائے: مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ چاروں مذاہب میں، بجز نکاح کے، دَف بجانا حرام ہے۔ اسی طرح جنگ اور قافلے کی روانگی کے وقت طبل بجانا جائز ہے۔ ان دو موقعوں کے علاوہ طبل بجانا جائز نہیں ہے۔[6] جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے مخدوم صاحب کی موجودگی میں نَے بجانا شروع کی تو موصوف نے اس سے فرمایا کہ یہ فعل جائز نہیں ہے۔ اسی طرح موصوف گانا سننا جائز نہیں سمجھتے تھے۔[7]

سیّد علاء الدین رقمطراز ہیں کہ مخدوم صاحب بغیر مزامیر کے قوّالی سننے کے قائل تھے اور کبھی کبھی سن بھی لیا کرتے تھے۔[8]

---

۱ - ایضاً، ص ۴۷۔
۲ - ایضاً، ص ۳۳۔
۳ - ایضاً، ص ۵۳۔
۴ - سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم ص ۲۰۶۔
۵ - ایضاً، ص ۱۹۱۔
۶ - سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۲۰۶، ۲۰۷۔
۷ - ایضاً، ص ۲۱۹۔
۸ - ایضاً، ص ۸۸۔

خطبۂ جمعہ میں ظالم سلاطین کا ذکر: مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ نمازیوں کو چاہئے کہ وہ خطبہ کے دوران میں حرکت نہ کریں اور اسے بالکل نماز ہی کی طرح جانیں۔ البتہ جب خطیب سلاطین کا ذکر کرے تو پھر نمازی تسبیح کرے، نماز پڑھے، تعویذ لکھے یا تلاوت شروع کر دے۔[1] ان باتوں کی اجازت دینے سے مخدوم صاحب کا مقصد یہ تھا کہ ظالم سلاطین کا ذکر نمازیوں کے کانوں میں نہ پڑے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ خطباً سلاطین کو ان صفات سے متصف کرتے ہیں جو ان میں نہیں ہوتیں۔[1]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک ہندو عورت مشرف بہ اسلام ہو کر مخدوم صاحب کی مرید ہو گئی۔ وہ ساری رات عبادت میں گزارتی تھی اور اس کی نیکی اور تقویٰ کے طفیل اس کا سارا خاندان مسلمان ہو گیا۔ سید علاء الدین تحریر فرماتے ہیں کہ مخدوم صاحب اس عورت کی ولایت کے قائل تھے۔[2]

تفسیر الکشاف کے بارے میں رائے: جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ مخدوم صاحب طالب علموں کو ہمیشہ تفسیر مدارک کا درس دیا کرتے تھے۔ موصوف الکشاف کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ علماء حجاز مقدس میں اسے پڑھانے سے منع کرتے تھے۔ الکشاف کے مصنف جار اللہ زمخشری عقیدے کے لحاظ سے معتزلی تھے اس لئے وہ تفسیر میں اپنے عقیدے کے مطابق دلائل پیش کرتے ہیں۔ صاحب مدارک چونکہ مذہباً سُنّی تھے اس لئے ان کی تفسیر میں کوئی بات خلاف عقیدہ نہیں ملتی۔[3]

حضرت فاطمہؓ کے بارے میں ایک غلط روایت: جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک روز مخدوم جہانیاں نے فرمایا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تو انہوں نے جنّت میں ایک سیب کھایا جس سے حضرت فاطمہؓ کا نطفہ بنا۔[4] سیدہ فاطمہؓ کے بارے میں یہ روایت کسی جاہل صُوفی کی وضع کردہ ہے۔ یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ مخدوم صاحب بھی اسے صحیح سمجھ بیٹھے ہیں۔

حضرت فاطمہؓ کے سوانح حیات پر ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر صاحبہ نے "الفاطمہ" کے عنوان سے ایک تحقیقی کتاب تحریر کی ہے۔ انہوں نے مختلف حوالوں سے حضرت فاطمہؓ کی ولادت

۱۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۲۔ سید علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۴۔ سید علاء الدین الدر المنظوم، ص ۹۶۷۔

آنحضرتؐ کی بعثت کے ایک سال بعد، دو سال بعد، پانچ سال بعد اور ہجرت سے آٹھ سال آٹھ ماہ اور بائیس روز قبل بتائی ہے[1] موصوف خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں۔ تاہم ان تمام تاریخوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۰ نبوت میں جب حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات ہوئی[2] تو اس وقت حضرت فاطمہؓ پانچ، آٹھ یا نو برس کی تھیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کو حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے بعد ستائیس رجب ۱۰ نبوت کو معراج ہوئی تھی[3] اس لئے شبِ معراج میں آنحضرتؐ کا سیب کھانا اور اس سے حضرت فاطمہؓ کا نُطفہ پیدا ہونا قطعاً غلط ہے۔ یہ روایت گھڑنے والے نے اتنا سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ سیدہ فاطمہؓ حضرت خدیجہؓ کی بیٹی ہیں اور حضرت خدیجہؓ واقعۂ معراج سے پہلے فوت ہو چکی تھیں۔ واقعۂ معراج سے اڑھائی سال بعد آنحضرتؐ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ تشریف لانے کے ڈیڑھ سال بعد حضرت فاطمہؓ کا نکاح ہو گیا تھا۔

چلّہ کشی: الدّرالمنظوم کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سہروردی مشائخ چلّہ میں بیٹھتے تھے[4] سہروردی مشائخ کے برعکس چشتی سلسلہ کے بزرگ چلّہ کشی کے قائل نہیں تھے۔ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار پر چلّہ کاٹنے یا بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے اُچ کے ایک کنوئیں میں چلّۂ معکوس کاٹنے اور لاہور میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے نزدیک ایک ٹیلے پر چلّہ کاٹنے کی جو روایات تذکروں میں پائی جاتی ہیں، ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کا شمار چشتیہ سلسلہ کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ موصوف جوامع الکلم میں فرماتے ہیں:

"خواجگانِ ما در اربعین نہ نشستہ اند" [5]

ملتان اور اُوچھ کے درمیان ذریعہ سفر: الدّرالمنظوم کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ ملتان اور اُوچھ کے درمیان عموماً کشتیوں میں سفر کرتے تھے۔ مخدوم صاحب نے بھی ایک بار حضرت رُکن الدین کی ذاتی کشتی میں ملتان سے اُوچھ تک سفر کیا تھا[6]

۱۔ سیدہ اشرف ظفر، الفاطمہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص ۱۵، ۱۶۔

۲۔ Watt, M, Muhammad At Mecca. London : ۱۹۵۳ p ۵۸

۳۔ قاضی سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین، مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔ ج ۱، ص ۷۷۔

۴۔ سید علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۸۳۔

۵۔ محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، ص ۲۳۱۔

۶۔ سید علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۵۹۳، ۶۳۹۔

زمانے کا شکوہ: مخدوم جہانیاں اپنے زمانے کے بے حد شاکی تھے اور ان کے عہد میں معاشرے میں جو برائیاں پیدا ہو چکی تھیں وہ ان سے اس قدر نالاں تھے کہ وہ عوام سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک روز مخدوم صاحب نے فرمایا کہ زمانہ بہت بُرا ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس زمانے میں پہاڑوں میں جا کر رہنا چاہیے[1]

فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت کو اَمن و امان کا دَور کہا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس عہد میں چوری چکاری عام تھی۔ مخدوم جہانیاں اس بات کے شاکی تھے کہ ان کی چیزیں چوری ہو جاتی ہیں[2] اگر مخدوم صاحب جیسے بزرگوں کی اشیاء بھی لوگ اُڑا لے جاتے تھے تو پھر غریب عوام کی کیا حالت ہو گی؟

نبیرۂ امیر خسرو: امیر خسرو کے نواسے خواجہ خسرو دہلوی، جو "خسرو ثانی" کے لقب سے ملقب تھے، بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ سید علاء الدین تحریر فرماتے ہیں کہ موصوف اکثر مخدوم جہانیاں کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے[3] الدّرالمنظوم کی تکمیل کے ۲۱ برس بعد جوامع الکلم مرتب ہوئی تو اس میں بھی خسرو ثانی کا ذکر ملتا ہے۔ جب تک بندہ نواز گیسو دراز دہلی میں مقیم رہے، خسرو ثانی ان سے ملتے رہے[4]

حجامت بنوانے کی اجازت: مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے سر پر اُسترا پھروانا چاہے تو اسے چاہیے کہ پہلے اپنی بیوی سے اجازت حاصل کرے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہو تو اس صورت میں اپنی والدہ سے اس اَمر کی اجازت لے لے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی یہ ہیئت کذائی اس کی بیوی یا والدہ کو اچھی نہ لگے[5] یہاں ہمیں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا قول یاد آتا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ جس طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی بن سنور کر رہے، اسی طرح اس کے دل میں بھی یہ بات آتی ہو گی کہ اس کا خاوند اپنی وضع قطع درست رکھے۔

تصوّف کا زوال: الدّرالمنظوم کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم جہانیاں کی زندگی ہی میں تصوّف کو زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں جنوب مغربی پنجاب اور سندھ

---

۱ - سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۲۵۰۔

۲ - سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ص ۲۳۲۔

۳ - ایضاً، ص ۳۶۰۔

۴ - محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، ص ۲۰۳۔

۵ - سیّد علاء الدین، الدّر المنظوم، ۲۲۱۔

میں بکثرت جاہل فقیر موجود تھے جو لوگوں کی گمراہی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ موصوف نے روہڑی کے قریب الُور کے پہاڑ میں مقیم ایک "درویش" کا ذکر کیا ہے جس کے پاس شیطان کھانا لاتا تھا[1]۔ اسی طرح اُوچہ کے قریب عثمان نامی ایک فقیر مقیم تھا جس کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے پاس جبرئیل بہشت کا کھانا لاتے تھے۔ "جبرئیل" نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ اب وہ مقرب بارگاہ الٰہی ہو گیا ہے اس لئے اسے نماز معاف ہو گئی ہے[2]۔ اسی طرح انہوں نے اُوچہ کے ایک جاہل فقیر کا ذکر کیا ہے جس کے معتقدین میں خراسانیوں کی اکثریت تھی۔ لوگوں کے اصرار پر مخدوم صاحب اس سے ملنے گئے تو اس نے ان کو بتایا کہ ابھی ابھی خدا یہاں سے اٹھ کر گیا ہے[3]۔

اُوچہ شریف بڑے عرصہ سے رُوحانیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہاں شیخ اسحاق گازرونی؟ سید جلال الدین سرخپوش بخاری؟ اور سید احمد کبیر؟ جیسے بزرگ ہو گزرے تھے جن کے انفاسِ طیبّہ سے خطۂ اُوچہ بقعۂ نُور بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہاں جاہل درویش بھی مقیم تھے جو لوگوں کو راہِ راست سے ہٹا رہے تھے۔ ایسے ہی جاہل فقیروں کے بارے میں مخدوم جہانیاں فرمایا کرتے تھے:

لَا تکُن مِن جہالِ الصُّوفیہ فانّھم لصُوص الدین وَ قطاع الطریق علی المسلمین[4]

مخدوم جہانیاں کی طرح حضرت مجدّد الف ثانیؒ بھی صُوفیائے خام کو "لصُوصِ دین" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ جب موصوف مکہ مکرّمہ سے اُوچہ آئے تو لوگوں نے انہیں بتایا کہ شہر سے باہر ایک غار میں عثمان نامی ایک فقیر رہتا ہے۔ مخدوم صاحب بڑے اشتیاق سے اسے ملنے گئے تو اس نے عند الملاقات انہیں بتایا کہ اس کے پاس جبرئیل آتے ہیں اور اسے کئی بار یہ بشارت دے چکے ہیں کہ وہ مقربِ بارگاہِ ایزدی ہو چکا ہے اور اس سے نماز موقوف ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں اس نے مخدوم صاحب کو یہ بھی بتایا کہ جبرئیل اس کے لئے جنّت سے کھانا بھی لاتے ہیں۔ مخدوم جہانیاں نے اس سے کہا "اے نادان! وہ جبرئیل نہیں بلکہ شیطان ہے اور وہ تجھے نجاست کھلاتا ہے۔ پیغمبر اتنے مقرّب ہیں پھر بھی ان سے تو نماز موقوف نہیں ہوئی بھلا تجھے کیونکر معاف ہو سکتی ہے؟ اب اگر وہ آئے تو لاحول پڑھنا۔" مخدوم صاحب کی واپسی کے بعد جب شیطان جبرئیل کے بھیس میں کھانا لے کر آیا تو عثمان نے لاحول پڑھی تو شیطان غائب ہو گیا اور جو کھانا وہ لایا تھا وہ نجاست میں تبدیل ہو گیا۔ عثمان نے دیکھا تو اس

---

۱ - سیّد علاء الدین' الدّر المنظوم' ص ۵۳۰۔

۲ - ایضاً' ص ۲۷۶۔

۳ - ایضاً' ص ۵۹۔

۴ - ایضاً' ص ۹۱۔

کے کپڑے بھی پلید ہو چکے تھے۔ عثمان نے توبہ کی اور شریعت پر عمل کرنے لگا۔[1]

لانگاہ کی بغاوت: جامع ملفوظات سید علاء الدین لکھتے ہیں کہ عالم آباد میں لانگاہ قوم کے افراد بغاوت پر آمادہ تھے۔ اہالیانِ عالم آباد نے مخدوم جہانیاں سے درخواست کی کہ اگر موصوف وہاں تشریف لے چلیں اور شہر سے باہر قیام فرمائیں تو باغی ان کو دیکھتے ہی بھاگ جائیں گے ورنہ وہ اہالیانِ عالم آباد پر شب خون ماریں گے۔ مخدوم صاحب نے ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے عالم آباد کی شہر پناہ کے باہر قیام فرمایا۔ جب باغیوں کو ان کی تشریف آوری کی اطلاع ملی تو انہوں نے شب خون مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔[2]

✪✪✪

---

۱ - سید علاء الدین، الدر المنظوم، ص ۲۷۵۔
۲ - ایضاً، ص ۹۷۔

خزانۂ جواہرِ جلالیہ

حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے مریدوں نے ان کے ملفوظات، سراج الہدایہ' جامع العلوم اور خزانۂ جواہرِ جلالیہ کے عنوانات سے جمع کئے ہیں۔ برِعظیم پاک و ہند کے نامور عالم اور محقق قاضی سجاد حسین کرتپوری نے سراج الہدایہ کو حال ہی میں مرتب کیا ہے۔ ان کی یہ رائے ہے کہ یہ مجموعۂ ملفوظات وضعی ہے۔ انہوں نے اس کے وضعی ہونے کے متعدد داخلی شواہد پیش کئے ہیں۔ جامع العلوم کا اُردو ترجمہ الدّرالمنظوم فی ملفوظ المخدوم کے عنوان سے دو جلدوں میں ملتان سے طبع ہو چکا ہے۔ خزانۂ جواہر جلالیہ' جسے شیخ عبدالحق محدّث دہلوی[1] اور شیخ محمد اکرام مرحوم خزانۂ جلالی لکھتے ہیں[1]' کے اس وقت تین مخطوطے ہمارے علم میں ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ مخدوم صاحب کی درگاہ کے سجادہ نشین کے ذاتی کتاب خانے میں محفوظ ہے' جو شیخ محمد اکرام مرحوم کی نظر سے گزر چکا ہے۔ دوسرا مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتاب خانے میں موجود ہے' جو ناقص الاول و الآخر ہے[2]۔ تیسرا مخطوطہ' جو ہر لحاظ سے مکمل ہے' ناظم آباد کراچی کے علم دوست فزیشن ڈاکٹر وارث علی ترمذی کی ملک ہے۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے اس مخطوطہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اس مخطوطہ کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس میں مخدوم صاحب کے ملفوظات کے علاوہ ان کے افادات بھی شامل ہیں۔

جامع ملفوظات

خزانۂ جواہرِ جلالیہ کے متن میں جامع ملفوظات نے اپنا نام فضل اللہ بن ضیاء العباسی لکھا ہے۔ وہ مخدوم جہانیاں کا مرید تھا۔ اس نے متن میں ایک جگہ مخدوم صاحب کے نام سے پہلے "شیخی و مخدومی و اُستادی و مرشدی" لکھا ہے[3]۔

۱۔ شیخ عبدالحق محدّثؒ' اخبار الاخیار' مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ' ص ۱۴۲۔
شیخ محمد اکرام' آبِ کوثر' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء' ص ۳۱۵۔

۲۔ ابو سعید بزمی' اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء' ج ۷ ص ۳۲۱۔ آرٹیکل: جلال الدین حسین بخاری۔

۳۔ فضل اللہ' خزانۂ جواہرِ جلالیہ' ورق دیباچہ ۶ الف۔

خزانۂ جواہر جلالیہ کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فضل اللہ کو عربی اور فارسی پر کامل دسترس تھی اور وہ "ہندوی" سے بھی کماحقہ' واقف تھا۔ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا۔ اس نے مختلف موقعوں پر اپنے اشعار نقل کئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

تا کہ مستم مقیم درگاہش
طالعم شد مساعد و مسعود
تاکہ حشتم مرید حضرت شیخ
حاسلم گشت مقصد و مقصود
گر نمی شد بحضرتش مقبول
جملہ احوالِ من بدی مردود
چاکر خادمانِ حضرتِ شیخ
قطبِ عالم جلال معدنِ جود
کمترینِ بندگانست فضل اللہ
اعرج بن ضیاء خالد بود[1]

ایک موقع پر اس نے مخدوم صاحب کی منقبت میں عربی کا یہ شعر بھی کہا تھا:

ولہ جلال لیس فوق جلالہ
الا جلال اللہ جل جلالہ[2]

اس نے آئمہ اور خطباء کے لئے جمعہ کے متعدد خطبات عربی زبان میں تیار کئے تھے جو اس کی عربی دانی پر دال ہیں۔

خزانۂ جواہر جلالیہ میں افادات کے ضمن میں زُبدۃ العارفین' فتاویٰ حجت' ینابع' آداب المریدین' منہاج العابدین' نزہت الارواح' قوتُ القلوب' فتاویٰ غیاثیہ' تفسیرِ زاہدی' مشارق الانوار' خزانۃ الفقہ' کفایہ للشعبی' عمدۃ الابرار' جامع الکبریٰ مصنفہ اُوزجندیؔ' الروضہ' نافع' شرح طحاویٰ' المحیط' سراجیہ' فتاویٰ ناصری' عمدۃ العباد و خلاصۃ الزہاد' الملتقط' عوارف المعارف' شرح قشیری' ذخیرہ' فتاویٰ قاضی خاں' فتاویٰ قنیہ' وقایہ' تفسیر الدُرر' اسرار العارفین' مصابیح' حزب البحر' جامع

---

۱ ۔ خزانۂ جواہر جلالیہ' دیباچہ ورق ۳ الف۔
آخری مصرع سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فضل اللہ کی ایک یا دونوں ٹانگوں میں نقص تھا۔

۲ ۔ ایضاً' دیباچہ ورق ٦ الف۔

الفتاوی، مجمع البحرین، الاختیار شرح المختار، صغیر خانی، مقصد الاقصیٰ، فصوص الحکم، فصول الآداب، بُستان امام نوویؒ، صلوٰۃ مسعودی، الکشّاف، مبسوط، مفاتیح المسائل، فتاویٰ خانی، فتاویٰ المسعود، خلاصہ، مختار الفتویٰ، ہدایہ اور فتاویٰ تاتار خانی جیسی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں، جس سے فضل اللہ کے وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

مخدوم صاحب نے ۱۵ رجب ۷۷۹ھ (۱۳۷۶ء) کو اسے خرقۂ خلافت پہنایا اور مرید کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی اسے اُوچ کی پرانی جامع مسجد میں قیام کا حکم دیا۔ فضل اللہ لکھتا ہے کہ وہاں اور بھی کئی بزرگ قیام پذیر تھے[1]

فضل اللہ لکھتا ہے کہ ایک روز مخدوم جہانیاںؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے فرمایا کہ انہوں نے "مکہ، مدینہ، شام، عراق، یمن، عدن، شیراز اور بغداد" میں اوتادوں اور ابدالوں سے فیوض حاصل کئے ہیں، اگر کوئی طالب ہو تو موصوف وہ باطنی نعمتیں اس کے سینے میں القاء کر دیں تاکہ یہ سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہے۔ حضرت کی بات سن کر فضل اللہ کے دل میں ان کے ملفوظات جمع کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس نے مخدوم صاحب سے اس کی اجازت چاہی، جو مل گئی۔ مخدوم صاحب کا اشارہ پاتے ہی فضل اللہ نے ہفتم ماہ رجب ۷۸۰ھ (۱۳۷۸ء) سے ان کے ملفوظات جمع کرنے شروع کر دیئے۔ مخدوم صاحب کا وصال ۱۱ ذی الحجہ ۷۸۵ھ (۱۳۸۳ء) کو ہوا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کی عمر کے آخری پانچ سالوں کے ملفوظات ہیں۔

خزانۂ جواہر جلالیہ کا بیشتر حصہ مخدوم صاحب کی زندگی ہی میں احاطہ تحریر میں آیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ متن میں جہاں کہیں بھی مخدوم صاحب کا نام آتا ہے، فاضل مصنف ان کے نام کے ساتھ "متع اللہ المسلمین بطول بقاءہ و اقر عیون المریدین بنور لقاءہ" یا پھر "مد اللہ ظلہٗ و ادام اللہ جلالہٗ" جیسے دعائیہ جملے ضرور لکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جملے صرف زندہ شخص کے نام کے ساتھ ہی لکھے جا سکتے ہیں۔

فضل اللہ کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ تاہم اتنا معلوم ہے کہ وہ مخدوم صاحب کی وفات کے وقت زندہ تھا[2]

صاحبِ ملفوظات

صاحبِ ملفوظات مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت بخاری رحمۃ اللہ کا شمار برعظیم

۱ - ایضاً، ورق ۴۷۸ ب۔

۲ - ایضاً، ورق ۲۵۷ ب۔

پاک و ہند کے ان اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنھوں نے ہماری سیاسی، مذہبی اور معاشرتی تاریخ میں اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جنوب مغربی پنجاب، راجستھان، سندھ، گجرات اور کاٹھیاواڑ میں تبلیغِ اسلام اور تعمیرِ ملت کے اہم فریضہ کو جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے مخدوم صاحب نے انجام دیا ہے، اس کی مثال برِعظیم کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

مخدوم جہانیاں کا اصل نام حسین بن احمد بن حسین[۱] ہے لیکن موصوف علمی، رُوحانی اور دینی حلقوں میں مخدوم جہانیاں جہانگشت کے لقب سے مشہور ہیں۔ موصوف اُوچ شریف میں شب برات ۷۰۷ھ (۱۳۰۸ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اُوچ شریف میں ہوئی اور یہیں انھوں نے اپنے چچا صدر الدین بخاریؒ کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کیں۔ بعد ازاں انھوں نے ملتان جا کر حضرت شاہ رکن الدین ابو الفتحؒ کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم حاصل کی اور ان سے خرقۂ خلافت پایا۔ مخدوم صاحب نے کچھ عرصہ دہلی میں حضرت نصیر الدین چراغِ دہلیؒ کی خدمت میں بھی گزارا اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے[۲]۔

سلطان محمد بن تغلق نے انھیں شیخ الاسلام کا خطاب دے کر سیوستان اور اس کے مضافات کی خانقاہوں کا انچارج بنایا لیکن انھوں نے اس میں رُوحانی خطرہ محسوس کیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مکہ مکرمہ چلے گئے[۳]۔ وہاں انھوں نے امام عبداللہ یافعیؒ کی صحبت اختیار کی اور ان سے بڑا رُوحانی فیض پایا۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں دو سال شیخ عفیف الدین عبداللہ المطریؒ کی خدمت میں رہ کر تصوّف کی کتابیں پڑھیں اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔

مخدوم صاحب ایک طویل عرصہ مشرقِ وُسطیٰ کی سیاحت میں گزار کر اُوچ شریف واپس آئے اور اپنے بزرگوں کے سجادہ پر رونق افروز ہوئے۔ یہاں ان سے بے شمار لوگوں نے فیض اخذ کیا۔ ان کے پڑ پوتے حضرت شاہ عالم بخاری احمد آبادیؒ (م ۱۴۷۵ء) کی روایت ہے کہ ان کے مریدوں کی تعداد ۲۰۱۱۷۳ تھی اور ان میں سے ۱۲۷۵۰ مرید خلافت سے سرفراز ہوئے[۳]۔

سلطان فیروز تغلق، مخدوم جہانیاں کا احترام دل و جان سے کرتا تھا۔ اسؔ نے مخدوم صاحب کی سعی و تبلیغ سے ۲۲ غیر شرعی ٹیکس معاف کئے اور اپنی سلطنت میں ۲۶ اصلاحات نافذ

۱۔ شیخ عبدالحقؒ محدث، اخبار الاخیار، ص ۱۴۲۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ محمد جعفر بدر عالم، ملفوظاتِ شاہ عالمؒ، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نمبر فارسی تصوف ۱۳۴، ورق ۱۵۴ الف۔

کیں، جن کا ذکر اس نے "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں کیا ہے۔ مخدوم صاحب نے ٹھٹھہ کی فتح کے موقع پر بڑا نمایاں کردار ادا کیا اور سلطان فیروز تغلق نے ان کی سفارش پر سندھی باغیوں کی خطاؤں سے درگذر کیا۔

مخدوم صاحب کی تبلیغ سے اُوچ کے نواح میں بسنے والے کئی غیر مسلم قبیلوں نے اسلام قبول کیا۔ منج راجپوتوں کا مورثِ اعلیٰ تلسی داس بھی مخدوم جہانیاں کے دستِ حق پرست پر مشرف باسلام ہوا تھا۔ انؒ کی اولاد احمد آباد میں جا بسی تھی۔ وہاں حضرت قطب عالمؒ (م ۱۴۵۳ء) اور حضرت شاہ عالمؒ (م۱۴۷۵ء) کا عوام و خواص پر بڑا اثر تھا اور سلاطینِ گجرات ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔

گجرات کا نامور حکمران سلطان محمود بیگڑہ حضرت شاہ عالمؒ کا سوتیلا بیٹا (ربیب) تھا۔ اسے حضرت موصوف کی سرپرستی حاصل تھی۔ مخدوم جہانیاں کے ایک مرید سیّد سکندر ترمذیؒ نے، جو ڈاکٹر وارث علی ترمذی کے جدِ امجد تھے، منگرول میں تبلیغ اسلام اور عوام کی رُشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔ لکھنؤ کے مشہور بزرگ قوام الدین عباسیؒ[1] اور ان کے نامور مرید حضرت شیخ سارنگؒ بھی مخدوم جہانیاںؒ کے فیض یافتہ تھے[2]۔ حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنویؒ شیخ سارنگ کے صحبت یافتہ اور خلیفہ تھے۔ ان کے ایک مرید شیخ سعد الدین خیر آبادیؒ سے بہت سے لوگوں نے فیض پایا۔ ان بزرگوں کی سعی و کاوش سے مخدوم جہانیاں کا فیض اودھ میں عام ہوا۔

مخدوم صاحب کا انتقال ۱۱ ذی الحجہ ۷۸۵ھ (۱۳۸۴ء) کو ۷۷ سال کی عمر میں اُوچ شریف میں ہوا[3] اور ان کے بھائی صدر الدین راجو قتالؒ ان کی مسند پر بیٹھے۔

خزانۂ جواہرِ جلالیہ کی اہمیت

موجودہ دَور کے مؤرخین کو قرونِ وُسطیٰ کے مؤرخوں سے یہ گلہ ہے کہ ان کی تاریخیں سلاطین و ملوک کے گرد گھومتی ہیں اور انہیں پڑھ کر ان پر شاہی درباروں کے رُوزناچوں کا گمان گزرتا ہے۔ اس عہد کے مؤرخوں نے اپنی تاریخوں میں اس زمانے کے لوگوں کے رہن سہن اور ان کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کیں۔ ان کا گلہ بجا ہے کیونکہ اس عہد میں تاریخ نویسی کا تصوّر مختلف تھا۔ اس عہد کے مؤرخوں سے جو کوتاہی ہوئی ہے اس کا ازالہ اسی عہد کے ملفوظات جمع کرنے والوں نے کر دیا ہے۔

---

۱ ۔ شیخ عبدالحقؒ محدث، اخبار الاخیار، ص ۱۵۴۔

۲ ۔ عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوط پنجاب یونیورسٹی لائبریری، نمبر ۲۵-۱۱، ورق ۲۴۳ ب۔

۳ ۔ فضل اللہ، خزانۂ جواہرِ جلالیہ، ورق ۲۵۷ ب۔

فوائد الفوائد، دُررِ نظامی، خیر المجالس، جوامع الکلم، نفائس الانفاس، سُرور الصُّدور، تحفتہ المجالس، احسن الاقوال، لطائفِ قدوسی، دُر المعارف، جامع العلوم اور خزانۂ جواہر جلالیہ جیسے ملفوظات میں اس دور کی تہذیب و ثقافت اور رہن سہن کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، اس سے ہمارے سامنے قرونِ وسطیٰ کے عوام کی زندگی کی صحیح تصویر اُبھرتی ہے۔ اس بات میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ ان ملفوظات کے مطالعہ کے بغیر اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ نامکمل رہتا ہے۔

خزانۂ جواہر جلالیہ اور فوائد فیروز شاہی ایک ہی زمانے میں احاطۂ تحریر میں آئی ہیں[1] ان کے مصنفین دو مختلف شہروں میں رہتے تھے اور ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ اس کے باوجود اس کے مضامین میں حیرت انگیز حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ دونوں ایک ہی معاشرے کی عکاسی کر رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے ایک مسلمان کی ولادت سے لے کر وفات تک پیش آنے والے تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے۔

ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں توہم پرستی عام تھی۔ جملہ بیماریوں اور ہر قسم کی آفات سے بچنے کے لئے عوام تعویذوں کا سہارا لیتے تھے۔ ان دونوں کتابوں میں مختلف اقسام کے درجنوں تعویذ نقل کئے گئے ہیں۔ شادی بیاہ کی رسوم، حقوق الزوجین، ازدواجی زندگی اور جنسی مسائل پر دونوں مصنفوں نے ایک ہی انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ اس سے اس عہد کے مصنفین کی سوچ کے دھارے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خزانۂ جواہر جلالیہ میں نفلی نمازوں کا ذکر بڑی کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ راقم الحروف نے چشتی اور سہروردی بزرگوں کے ملفوظات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ کسی بزرگ کے ملفوظات میں نفلی نمازوں پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا مخدوم جہانیاں کے ملفوظات میں دیا گیا ہے۔ اس سے اس زمانے کی خانقاہی زندگی کی جھلک ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

ملفوظات کا آغاز

خزانۂ جواہر جلالیہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا و ماکنا لنھتدی لولاان ھدانا اللہ والصلوٰۃ علیٰ نبیہ الذی اصطفا...

اس کے بعد دیباچہ ہے جو سات ورقوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں خزانۂ جواہر جلالیہ لکھنے کا داعیہ اور مخدوم صاحب سے اس کی اجازت کا حصول مرقوم ہے۔ اس کے علاوہ ۱۰۷ فصول

۱۔ فوائد فیروز شاہی کے بارے میں راقم الحروف کا مقالہ مطبوعہ ماہنامہ بیّنات کراچی، بابت ماہ فروری ۱۹۸۳ء ملاحظہ فرمائیے۔

کے عنوانات درج ہیں' جن پر مخدوم صاحب نے کچھ ارشاد فرمایا ہے یا فاضل مصنف نے اپنی طرف سے کچھ لکھا ہے۔

ملفوظات کا باقاعدہ آغاز توبہ اور اس کی حقیقت سے ہوتا ہے۔ توبہ کی حقیقت پر گفتگو کرتے ہوئے مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ توبہ ہی "اصل کل مقام و قوام کل مفتاح و مفتاح کلِ حال" ہے۔ منازلِ سلوک میں توبہ سب سے پہلا مقام ہے۔ توبہ سے مراد خدا تعالیٰ سے رجوع' دوامِ ندامت اور کثرتِ استغفار ہے۔ یہاں انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

التآئبون العٰبدون الحٰمدون السآئحون الرٰکعون السّٰجدون الاٰمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحٰفظون لحدود اللہ.... (توبہ: ۱۱۲)

اس آیتِ کریمہ میں عبادات سے پہلے توبہ ہی کا ذکر آیا ہے۔

مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ توبتہ النصوح سے مراد صدقِ دل سے توبہ ہے اور اس کی پہچان ترکِ اختیار ذنب اور پہلے گناہوں پر ندامت ہے۔

مخدوم جہانیاں درویش کے لئے قربِ شاہی کو سمِّ قاتل سمجھتے تھے۔ انہوں نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ فقیر کا اہلِ دنیا کے ساتھ اختلاط حرام ہے۱ اسی طرح ملوک و سلاطین اور امراء کا تقرب اہلِ طریقت کے لئے حرام ہے اور اس پر مشائخ عظام کا اجماع ہے۔

مخدوم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ درویش کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ طہارت سے مراد "جمیع المذمات و الجنایات" سے اجتناب ہے۔ ایک دن مروّت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ شیخ بہلولؒ مسجد میں معتکف تھے۔ ان کے کسی عقیدت مند نے ان سے کہا کہ اگر ان کی کوئی خواہش ہو تو موصوف بلاتکلف بتائیں' وہ تعمیلِ ارشاد کرے گا۔ شیخ بہلولؒ نے فرمایا:

لیس من مروۃ الرجل ان یسال فی بیت اللہ غیر اللہ

(یہ بات مروّت کے خلاف ہے کہ اللہ کے گھر میں غیر اللہ سے سوال کرے)۔

ایک روز مخدوم جہانیاں تقویٰ کے موضوع پر گفتگو فرما رہے تھے۔ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قصہ بیان کیا کہ انہوں نے بیت المال کا مشک دیکھ کر اپنی ناک پر کپڑا رکھ لیا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ مشک بیت المال کی ملک ہے، لہٰذا انہیں اس میں

۱۔ فضل اللہ' خزانۂ جواہرِ جلالیہ' ورق ۸ الف۔

تصرف کا حق حاصل نہیں ہے' اور اس کا تصرف اس کی خوشبو ہے۔

اسی طرح مشہور صوفی حضرت بشر حافی سلاطین کی کھدوائی ہوئی نہروں سے پانی پینا ناجائز سمجھتے تھے کیونکہ نہروں کی کھدائی کے مصارف ناجائز آمدنی سے پورے کئے جاتے تھے اور لوگوں سے بیگار بھی لی جاتی تھی۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ ایک درویش کا خادم کسی ظالم ہمسائے کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کر لایا' تو اس درویش نے وہ چراغ گُل کر دیا۔

مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فقہ کی فلاں کتاب میں رقص و سرود کی اباحت آئی ہے تو اسے کہے' "دروغ گفتہ باشد"۔ کسی بھی زمانے میں کسی فقیہ نے سماع' رقص اور پاکوبی کی حِلّت کا فتویٰ نہیں دیا۔ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ رقاص درہم و دینار اور حلوہ و طعام کے لالچ میں بدعات و منہیات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ معمولی سے لالچ میں اپنی جان اور ایمان برباد کرتے ہیں۔ وہ بدبخت حرام کو حلال سمجھ لیتے ہیں۔

سماع کے بارے میں مخدوم صاحب کی رائے بڑی وقیع ہے۔ اس سے اس زمانے کے سہروردی مشائخ کا سماع کے بارے میں طرزِ عمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ سلطان غیاث الدین تغلق (م ۱۳۲۵ء) کے عہدِ حکومت میں سماع کے بارے میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کو ایک محضر کے سامنے پیش ہونا پڑا تھا۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ تغلق سلاطین اور سہروردی مشائخ ایک ہی انداز سے سوچتے تھے۔

مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ جو صوفیاء سماع کے قائل ہیں انہوں نے اس کے لئے بڑی بڑی شرائط عاید کی ہیں۔ جس طرح نماز بے وقت اور بے وضو' روزہ بے امساک' عورت بے نکاح' زراعت بغیر تخم' درخت بے میوہ' خانہ بے دَر اور مُرغ بے پَر نہیں ہوتے ایسے ہی سماع بغیر شرائط کے نہیں ہوتی۔

اگر کوئی شخص اپنی عمرِ عزیز کا کوئی حصّہ سماع میں صَرف کرے تو اسے چاہئے کہ پہلے تین دن طے کا روزہ رکھے یعنی اس دوران میں کچھ نہ کھائے پئے۔ البتہ وہ ایک قطرۂ آب کے ساتھ روزہ افطار کر سکتا ہے۔ ان ایّام میں وہ کسی کے ساتھ بات نہ کرے اور خلوت میں بیٹھ کر مراقبہ میں مشغول رہے۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں نے صاحبِ سماع کے لئے پانچ یا سات دن کا طے کا روزہ تجویز کیا ہے۔ یہ روزہ پورا کرنے کے بعد وہ کسی عزیز یا درویش سے غزل سنے۔ قوّال کسی حال میں بھی ناآشنا یا بیگانہ نہ ہو۔ سماع سنتے وقت وہ اپنے دل میں شیطانی وسوسہ نہ لائے۔ سماع کا وقت بڑا نازک ہوتا ہے اس لئے بڑی احتیاط برتنی چاہئے۔ اگر سماع میں حضور نہ ہو تو کدورت بڑھنے کا امکان ہوتا ہے۔ سماع کے بعد کھانا تناول

نہ کرے، کھانا پینا اہلِ غفلت کی عادت ہے۔ اگر سماع کی حاجت ہو تو اسے عادت نہ بنا لے بلکہ ایک، دو یا تین اربعین کے بعد سماع سنے۔[1]

لباس کے معاملے میں مخدوم جہانیاں[2] سادگی کے قائل تھے۔ موصوف اپنے مریدوں کو سادگی کی تلقین فرمایا کرتے تھے اور انہیں بتایا کرتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس بڑا سادہ ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لباس پر پیوند لگے ہوتے تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا لباس تین درہم کی مالیت کا ہوتا تھا۔

مخدوم صاحب سے اگر کوئی شخص گھر تعمیر کرنے کے لئے اجازت مانگتا تو موصوف اسے بتاتے کہ درویش اور زاہد کے لئے تو گوشۂ مسجد ہی بہتر ہے۔ اگر کوئی شخص حجرہ تعمیر کرے تو چھت چھ سات گز اونچی ہونی چاہئے۔ حجرہ تعمیر کرتے وقت ذہن میں یہ بات رکھنی چاہئے کہ وہ اسے عبادت کے لئے تعمیر کر رہا ہے۔ اس کا مقصد گرمی، سردی اور بارش سے بچاؤ ہو۔ وہ تعمیر میں مبالغہ نہ کرے اور نقش و نگار بنانے سے احتراز کرے۔

اگر کوئی شخص مکان تعمیر کرے تو پیر کے دن اس کی بنیاد رکھے۔ اس میں مہمان کے لئے جگہ ضرور رکھے اور قضائے حاجت کے لئے بھی جگہ مختص کرے۔ مخدوم صاحب اپنے مریدوں کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ گھر ہمیشہ علماء و صلحاء کے گھروں کے پاس بنانا چاہئے۔ رات کو مکان کا دروازہ بند رکھیں۔ آگ جلا کر یا چراغ روشن کر کے نہ سوئیں۔ حرام آمدنی گھر کی تعمیر پر صرف نہ کریں اور اپنے دروازے سے درویش کو محروم نہ لوٹائیں۔ ایندھن اور اُپلے گھر کے سامنے نہ رکھیں کیونکہ یہ فقر و اندوہ کا سبب بنتے ہیں۔

مخدوم جہانیاں نے ایک بار اپنے مریدوں کی موجودگی میں حلق کروانے، مونچھیں بڑھانے، ناخن کاٹنے اور آئینہ دیکھنے کے متعلق گفتگو فرمائی۔ موصوف فرماتے ہیں کہ حلق ہونا سنت ہے، اس سے غسل میں شبہ باقی نہیں رہتا۔ مخدوم صاحب نے عرب و عراق کی اندازاً" چالیس برس تک سیاحت کی تھی۔ اس لئے اپنے مشاہدہ کی بنا پر فرماتے ہیں کہ عرب و عراق میں لوگ زلفوں والے کو مخنث سمجھتے ہیں۔ موصوف نے اپنے مریدوں کو بتایا کہ سب سے پہلے شیطان نے زلفیں رکھیں، اس کے بعد قوم لُوط نے یہ فیشن اپنایا۔ اب یہ ملحدوں کا شعار ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ایک بار حلق کرانے سے ستر شہداء کا ثواب ملتا ہے۔ مخدوم صاحب خود بھی حلق کرواتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ سردیوں میں مہینے میں ایک بار اور گرمیوں میں مہینے میں دو بار سر پر اُسترا پھرواتے تھے۔ سلطان فیروز تغلق نے بھی حلق کروانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اسے اس کی ترغیب دلانے میں مخدوم صاحب کا بھی ہاتھ ہو۔ ہم عمر مؤرخ شمس سراج عفیف کا

---

۱ - ایضاً ورق ۱۸۴ الف۔

سلطان کے مخلوق ہونے کے متعلق یہ فقرہ بڑا معنی خیز ہے:

"ظاہر ہے کہ بادشاہ کو یہ تمام برکات علماء و مشائخ کی محبت اور پیروی سے حاصل ہوئیں۔"[۱]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ مونچھیں کاٹنی سُنّت ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

من لم یاخذ شاربہ فلیس منّا

(جو شخص مونچھیں نہیں کاٹتا وہ ہم میں سے نہیں ہے)

لمبی مونچھوں والا قیامت کے دن شفاعت سے محروم رہے گا۔ مخدوم صاحب نے ناخن لینے کی ترتیب سُنّت کے مطابق بتائی ہے۔ ناخن جمع کر کے پاک زمین میں دفن کرنے چاہئیں۔ آئینہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اسی فصل میں انہوں نے پچھنے لگوانے کے فوائد بھی بتائے ہیں[۲]

اس کے بعد زکوٰۃ، سلام اور سلام کا جواب، ماہِ نو دیکھنے کے آداب اور عیدین کے خطبات کا ذکر آیا ہے۔

مخدوم صاحب نے ایک فصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے بارے میں مختص کی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت ایک "دایۂ مومنہ" کے سپرد کی تھی اور اس نیک بخت کا نام صفیہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات طاہرات کی ولادت کے بارے میں انہوں نے کئی مافوق فطرت باتیں بیان فرمائی ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ان بچیوں کے لئے بہشت سے کپڑے آیا کرتے تھے۔

مخدوم صاحب نے واقعۂ معراج کی مختصر سی کیفیت بیان کی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آسمانوں پر انبیاء کرامؑ سے ملاقات اور دوزخ میں عذاب کی کیفیت بیان کی ہے۔ واقعہ ہجرت کو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کا ذکر صرف دو سطروں میں کیا ہے۔ مدنی زندگی کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں فرمایا۔

ایک موقع پر مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی تھی کہ جو آپ کی رُوح کے لئے کھانا بھیجے گا اس کے رزق میں فراخی ہو گی اور جو پانی پلایا کرے گا، اس کے جملہ کام درست ہو جائیں گے۔

---

۱ - شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۲۵۴۔

۲ - فضل اللہ، خزانۂ جواہر جلالیہ، ورق ۱۹۲ ب۔

خلفائے راشدین کی عمریں بیان کرتے ہوئے ان سے سہو ہوا ہے۔ موصوف نے حضرت صدیق اکبرؓ کی عمر ۸۵ سال، سیدنا فاروق اعظمؓ کی عمر ۶۵ سال بتائی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔[1]

اسی طرح انہوں نے آئمہ اربعہ، قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمد الشیبانیؒ کی عمریں بھی بیان کی ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے بزرگوں کے اعراس پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

مخدوم صاحبؒ نے حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی عمر ۱۰۰ سال، حضرت صدر الدین کی عمر ۶۵ سال اور حضرت رکن عالم ابو الفتحؒ کی عمر ۸۸ سال بتائی ہے۔ اسی فصل میں انہوں نے صلوٰۃ الرغائب کا ذکر فرمایا ہے۔ اس نماز کی ۱۲ رکعتیں ہیں اور یہ ماہِ رجب میں ہر جمعرات کو روزہ رکھ کر مغرب کی نماز کے بعد ادا کرتے ہیں۔ ۳ رجب کو نماز استفتاح پڑھتے ہیں۔ اس نماز کی پچاس رکعتیں ہیں اور یہ طلوعِ آفتاب کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ جو شخص یہ نماز ادا کرے وہ تین روزے بھی رکھے۔ اسی فصل میں ایامِ بیض کے روزوں کی بھی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

رمضان المبارک کے فضائل بیان کرتے ہوئے مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ رمضان اور روزے کی چھ سنتیں ہیں۔

۱۔ صائم روزہ افطار کرنے میں تعجیل کرے۔

۲۔ سحری کھانے میں تاخیر مسنون ہے۔

۳۔ زوال کے بعد مسواک نہ کی جائے۔

۴۔ حلوہ و شیرینی کھائی اور کھلائی جائے۔

۵۔ سخاوت عام مہینوں کی نسبت زیادہ کی جائے۔

۶۔ آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھا جائے۔

عہدِ فیروزی میں مروّج خطباتِ جمعہ

فضل اللہ نے آئمہ اور خطباء کی سہولت کے لئے چند عربی خطبے بھی خزانۂ جواہر جلالیہ میں شامل کر دیئے ہیں، جو اس نے خود تیار کئے تھے۔ ان خطبات میں سلاطین کے القاب اور ان کے لئے دعائیں قابلِ توجہ ہیں۔ ایک خطبے کی دعا درج ذیل ہے:

اللّٰھم ایّد خلافۃ خلیفۃ العھد و الزمان الا و ھو الامام المتوکّل علی اللہ ابی عبداللہ محمد

---

[1] - ایضاً ورق ۲۵۵ ب۔

الامام المعتضد باللہ المنان ابی الفتح بن ابی بکر بن ابی الربیع سلیمان، اللھم طیب ضریح من طینت بہ الدین الرضی صاحب الدعوۃ ابا مسلم المروزی و اخصص من حشک من السلاطین من اعتزی بالخلفاء کیمین الدولہ السماء المحمود کاسمہ و ارحم السلطان المعظم بکرم اللہ العلام معز الدنیا و الدین محمد بن سام و ارحم السایر بسیر تم شمس الدنیا والدین، و ارحم السلطان المرحوم المغفور ناصر الدنیا والدین، و ارحم السلطان الراقد فی دار الامان غیاث الدین بلبن السلطان، و ارحم السلطان الحلیم و الکریم جلال الدنیا والدین و ارحم السلطان المعظم الاعظم علاء الدنیا والدین، و ارحم السلطان المکرم الاکرم قطب الدنیا والدین، و ارحم السلطان الغازی المجاہد فی سبیل اللہ غیاث الدنیا والدین تغلق شاہ، و ارحم السلطان السخی الارنجی ابا المجاہد محمد شاہ السلطان، اللھم اخصص انروح و الریحان بلطائف الغفران ابا المظفر فیروز شاہ السلطان۔ اللھم اخصص بلطائف الغفران ابا الفتح محمد شاہ السلطان برحمتک یا حنان یا منان۔ اللھم اید من حلبث بھامتہ تاج السلطنۃ و زینت باسمہ سریرۃ المملکتہ الا و ھو الحضرۃ الاعلی المجلس الاعلی المعلی السلطان المعظم الاعظم و القرمان المکرم الاکرم المخصوص بعنایات الرحمن الواثق بتائید الرحمن ابو المظفر فیروز شاہ السلطان[1]

اس خطبہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سلطان غیاث الدین بلبن' جو غلام خواجہ کُش کے لقب سے بدنام تھا' سلطان علاء الدین خلجی' جسے ضیاء الدین برنی نے بیدین ثابت کرنے کی اَزحد کوشش کی ہے' اور سلطان قطب الدین خلجی' جو عیّاش مشہور کیا گیا ہے' دینی حلقوں میں نیک نام تھے۔ علاء الدین خلجی کی نیکی کا ثبوت حضرت نصیر الدین چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات "خیر المجالس" میں بھی ملتا ہے۔ ایک بات اور قابلِ توجہ ہے کہ مصر کے عبّاسی خلیفہ کا نام بھی خطبہ میں لیا جاتا تھا' البتہ اَبو مُسلم کا نام قابلِ اعتراض ہے۔

شادی کی رَسمیں

خزانۂ جواہر جلالیہ میں بیاہ شادی کی رسموں کا جس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے' اس کا عشرِ عشیر بھی اس عہد کی کسی تصنیف میں نہیں ملتا۔ مخدوم جہانیاںؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

النکاح من سُنّتی فمن رغب عن سُنّتی فلیس منّی

تم میں سے اگر کوئی شخص نکاح نہ کر سکے' تو وہ روزے رکھے۔ نکاح کرتے وقت اس

---

۱ - ایضاً' ورق ۳۱۲ ب۔

کا خیال رکھے کہ جس کے ساتھ نکاح کر رہا ہے، وہ خاتون نیک، صالح، دیندار، اچھے گھرانے کی فرد اور باعصمت ہے۔ اس بات کی اچھی طرح تفتیش کر لینی چاہیے۔ جس طرح غیر عورت کو دیکھنا حرام ہے، اسی طرح اس کی آواز سننا بھی حرام ہے۔

بیاہ شادی کی رسمیں بڑی بُری ہیں۔ لوگ عموماً" امراء کو کھانا کھلاتے ہیں اور غریب ہمسایوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بیاہ شادی کے وقت گانا بجانا، باجہ تاشہ، فخر کے لئے کوئی کام کرنا اور زیب و زینت کے لئے لباسِ فاخرہ پہننا حرام ہے۔ اسی طرح کنگنہ باندھنا جاہلیت کی رسم ہے۔

مخدوم صاحب بڑے افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ دنیاوی جاہ دیکھ کر فاسق نوجوانوں کو بیٹیاں دے رہے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی فاسق کو بیٹی دیتا ہے اس پر ہر روز ہزار بار لعنت کی جاتی ہے۔

مخدوم جہانیاںؒ اپنے مریدوں کو یہ وصیت کیا کرتے تھے کہ وہ کسی بے نماز عورت سے عقد نہ کریں۔ اگر بے علمی میں نکاح ہو جائے تو اسے نماز کا حکم دیں۔ اگر وہ پھر بھی نماز نہ پڑھے تو اسے تازیانے ماریں اور اگر اس کے باوجود وہ نماز ادا نہ کرے تو اسے طلاق دے دیں تاکہ اس ملعونہ کی شومت سے بچیں[۱]

مخدوم جہانیاںؒ نے "رسمِ جلوہ" کا بھی ذکر فرمایا ہے[۲] معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ وُسطیٰ میں برِعظیم پاک و ہند میں رسمِ جلوہ منائی جاتی تھی اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی مشائخ کے گھروں میں بھی ہندوستانی معاشرت عام ہو گئی تھی[۳] لطائفِ قدوسی کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کی شادی کے موقع پر یہ رسم منائی گئی تھی اور اس وقت ڈومنیوں نے دوہڑے گائے تھے[۴]

خزانۂ جواہر جلالیہ میں مگرمچھ، ریچھ (ریچھ) اور پُودنہ جیسے ہندوی الفاظ موجود ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مشائخِ کرام کے گھروں اور عام مجالس میں مقامی الفاظ بلاتکلف بولے جاتے تھے۔ اس سے ہمارے اس دعویٰ کو تقویت ملتی ہے کہ اُردو زبان کی ابتداء صوفیاءِ کرام کی

---

۱ ۔ ایضاً، ورق ۲۱۰ الف۔

۲ ۔ ایضاً۔

۳ ۔ خلیق احمد نظامی، ملفوظات کی تاریخی اہمیت، مضمون مشمولہ "نذرِ عرشی" ، دہلی : ۱۹۶۵ء ، ص ۴۴۳۔

۴ ۔ رکن الدینؒ، لطائفِ قدوسی، دہلی : ۱۳۱۱ھ، ص ۱۱۔

خانقاہوں میں ہوئی تھی جہاں ہر طبقے کے لوگ بلا تکلف آتے تھے۔

خزانۂ جواہرِ جلالیہ کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

دانی کہ بر نگین سلیمان چہ نقش زد
دل در جہاں مبند کہ با کس وفا نکرد

خزانۂ جواہرِ جلالیہ کا ترقیمہ درج ذیل ہے:

تمت ہذا الکتاب خزانۂ جواہرِ جلالیہ بید الفقیر الحقیر المذنب العاصی ابی طالب بن سیادت و شرافت مآب سید امین اللہ مرحوم، تحریر فی التاریخ سبع عشرین شہر ذی الحجہ یوم الاثنین سنہ احدی و اربعین و مائتین بعد الف۔ اللھم اغفر لکاتبہا و قاریہا۔

ابو طالب کا شجرۂ نسب سید محمود دریا نوش اور سید نر ناصر الدین کے ذریعے مخدوم جہانیاںؒ سے جا ملتا ہے۔ اس کا ذکر اس نے ترقیمہ کے بعد ایک شذرہ میں کیا ہے۔

✪✪✪

ملفوظاتِ شاہ عالم گجراتیؒ

مولانا آزاد لائبریری' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ میں "ملفوظاتِ حضرت قدوۃ العارفین سید سراج الدین ابو البرکات ملقب بہ شاہ عالم ابن حضرت قطب العالم نبیرۂ حضرت مخدوم جہانیاں قدس سرہما و اسرار ھم" کے عنوان سے ۱۷۸ ورق کا ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے[1] کراچی کے قومی عجائب گھر میں اس کتاب کی متعدد جلدیں موجود ہیں' جو "جمعاتِ شاہیہ" کے نام سے موسوم ہیں۔ حضرت شاہ عالم بخاری (المتوفیٰ ۱۴۷۴ء) کا شمار سہروردی سلسلہ کے ان اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جن کے انفاسِ طیبّہ سے گجرات و کاٹھیاواڑ کا ذرہ ذرہ معطّر و منوّر ہو رہا ہے۔

کسی شخص نے مخطوطہ کے سر ورق پر یہ لکھ دیا ہے کہ ملفوظات شاہ عالم کا نام "کلماتِ شاہیہ" اور "رفیق العارفین" بھی پڑھنے میں آیا ہے[2] اس نے "کلمات" کچھ اس طرح سے لکھا ہے کہ اسے "لمعات" بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ مخطوطہ خطِ نسخ میں لکھا ہوا ہے اس لئے اسے پڑھنے میں ذرا سی دشواری پیش آتی ہے۔

اس مخطوطہ میں ۴ محرم ۸۷۷ھ سے لے کر آخر ماہِ ذی الحجہ ۸۷۷ھ تک کے ملفوظات درج ہیں' اس لئے اسے حضرت شاہ عالمؒ کے ایک سال کے شب و روز کا روزنامچہ سمجھنا چاہئے۔ ملفوظات میں حضرت شاہ عالمؒ کے علاوہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ' سید صدر الدین راجو قتالؒ اور حضرت قطب العالمؒ کے بارے میں بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔

ملفوظات کا آغاز بغیر کسی رسمی تمہید کے مجلس اول سے ہوتا ہے۔ مجالس میں کئی کئی دن کا وقفہ ہے۔ فاضل مرتب نے صرف بیالیس مجالس کے ملفوظات قلمبند کئے ہیں۔ وہ ہر ملفوظ کا آغاز "فرمان شد" سے کرتا ہے۔ اس مجموعۂ ملفوظات میں ایک بڑا نقص ہے کہ مرتب نے اس میں اپنے اقوال و آراء درج کر کے اُصول ملفوظ نویسی سے اعراض برتا ہے' تاہم اس کے اقوال و آراء حضرت شاہ عالمؒ کے ملفوظات سے ممیز ہیں۔ اس نقص کے باوجود اس نے حضرت شاہ عالمؒ کے ملفوظات بڑے سلیقے اور قرینے کے ساتھ قلم بند کئے ہیں۔ ہر مجلس کے آغاز میں تاریخ

۱- ملفوظاتِ شاہ عالم' مخطوطہ فارسی تصوف' یونیورسٹی گلشن نمبر ۱۳۴۔

۲- ایضاً' ورق' الف۔

درج ہے اور مجلس کے اختتام پر "و صلی اللہ علی سید العالمین محمد و آلہ وسلم" لکھا ہے۔ ملفوظات کے ایک اندراج سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ۸۷۷ھ میں جب حضرت شاہ عالمؒ کے ملفوظات جمع کیے جا رہے تھے، تو اس وقت ان کی عمر اکسٹھ برس تھی۔[1]

جامع ملفوظات کو حضرت شاہ عالمؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے متعدد مقامات پر انہیں سید الاولیاء شاہ عالم، سید المومنین شاہ عالم، سید المحبوبین شاہ عالم، موصل القاصدین الی المقصود شاہ عالم، اعتاد التائبین شاہ عالم، سید الاقطاب شاہ عالم، غوث الاعظم شاہ عالم، سید المفسرین شاہ عالم، سید الموحدین شاہ عالم، شیخ الشیوخ اللہ شاہ عالم اور سید المحققین شاہ عالم کے القاب سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر اس نے حضرتِ والا کو حضرتِ شاہیہ کے لقب سے بھی یاد کیا ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ موصوف گجرات میں اس لقب سے ملقب تھے۔

محدّثین کی اصطلاح میں جامع ملفوظات کا حضرت شاہ عالمؒ سے لقاء ثابت نہیں۔ اس کے اور حضرت شاہ عالمؒ کے درمیان سات نسبی واسطے آتے ہیں۔ وہ رشتہ کے اعتبار سے حضرت شاہ عالمؒ کے پڑپوتے سید عبدالغفور کے پڑپوتے سید محمد مقبول عالم کا پوتا ہوتا ہے لیکن جس انداز سے اس نے تاریخ وار ملفوظات جمع کئے ہیں اس سے بادی النظر میں یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرتِ والا کی مجلس کا حاضر باش فرد تھا۔ یہ ممکن ہے کہ جب اس نے یہ کتاب تصنیف کی ہو اس وقت اس کے سامنے حضرت کے ملفوظات کا کوئی نسخہ موجود ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے "جمعاتِ شاہی" یا "روضہ الشاہیہ" میں سے حضرت شاہ عالمؒ کے افکار لے کر یہ کتاب ملفوظات کی صورت میں تحریر کی ہو یا اس کے خاندان میں حضرتِ والا کے بارے میں جو معلومات سینہ بسینہ چلی آ رہی ہوں، اس نے انہیں ہی ملفوظات کی شکل دے دی ہو۔ ہماری رائے میں اس کتاب کو ملفوظات کی بجائے حضرت شاہ عالمؒ کا ایک مستند تذکرہ سمجھنا چاہئے۔

صاحبِ تصنیف

جامع ملفوظات نے متن میں کہیں بھی اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ بدقسمتی سے مخطوط کے آخر میں ترقیمہ موجود نہیں اس لئے جامع ملفوظات اور کاتب کے نام اور سن کتابت معلوم نہیں ہو سکے۔ دو موقعوں پر اس نے سید محمد مقبول عالم کو "جدّی" کہہ کر یاد کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کا پوتا تھا۔[2] صاحبِ مرأت احمدی نے ان کے اس عالم و فاضل پوتے کا نام

---

۱ - ایضاً، ورق ۹۵ ب۔

۲ - ایضاً، ورق ۵۵ الف، ۶۲ ب۔

سید محمد جعفر بدر عالم بتایا ہے۔

مصنف کے دادا

سید محمد مقبول عالم (۱۵۷۷ء۔ ۱۶۳۵ء) حضرت شاہ عالمؒ کے پڑپوتے کے پڑپوتے ہوتے ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب ان کے ساتھ اس طرح ملتا ہے: محمد مقبول عالم بن سید جلال ماہ عالم بن سید حسن بن سید عبدالغفور بن سید احمد شہید بن سید شاہ محمد راجو بن حضرت شاہ عالمؒ۔

سید محمد مقبول عالم بڑے پڑھے لکھے شخص تھے اور فارسی میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ انہوں نے دیوانِ جلالی' دین المریدین' جامع المنیٰ' اذکار الاطباء' فارسی ترجمۂ قرآن' مرقاۃ الوصول الیٰ مجبۃ الرسول' چہل حکایت شاہیہ' جمعاتِ شاہیہ اور لطائف شاہیہ کے نام سے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ آخر الذکر کتاب کراچی سے ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر سید وارث علی ترمذی نے شائع کر دی ہے۔ ترمذی صاحب نے ان کی تصانیف میں مرقاۃ الوصول الیٰ مجبۃ الرسول اور دین المریدین کا ذکر نہیں کیا۔ مجھے ان کتابوں کا سراغ ملفوظات شاہ عالمؒ میں ملا ہے[۱]۔

مصنف کے والد

سید مقبول عالم کے فرزند سید مقصود عالم (۱۵۹۵ء۔ ۱۶۴۹ء) حافظ قرآن ہونے کے علاوہ بڑے عالم اور علم دوست بزرگ تھے۔ انہوں نے شاہ جہان سے صدر الصدور کا عہدہ اور شش ہزاری منصب قبول کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود زہد و تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ موصوف شاعر بھی تھے لیکن ان کا دیوان زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا[۲]۔

فاضل مصنف

سید مقصود عالم کے فرزند سید جعفر بدر عالم ۱۲ شعبان ۱۰۲۳ھ ر ۱۷ ستمبر ۱۶۱۴ء کو جہانگیر کے عہد حکومت میں احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ "وارث شاہی" سے اس کا سن ولادت برآمد ہوتا ہے[۳]۔ اس نے ظاہری تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور پھر ان ہی کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کیں اور خرقۂ خلافت پایا۔ وہ بڑا زود نویس تھا اور ۵۴ گھنٹوں میں پورا قرآن نقل کر لیتا تھا[۴]۔ علوم اسلامیہ اور خاص طور پر قرآن و حدیث پر اس کی بڑی گہری نظر تھی اور اس فن میں وہ اپنے ہمعصروں سے ممتاز تھا[۵]۔ شاہ جہان نے اسے گجرات کی گورنری پیش کی لیکن اس

۱۔ ایضاً" ورق ۵۵ الف' ۹۱ الف۔
۲۔ وارث علی ترمذی' لطائف شاہیہ' مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء ص ۳۵۔
۳۔ ضمیمہ مرأتِ احمدی' مطبوعہ بڑودہ ۱۹۲۴ء' ص ۴۴۔
۴۔ ایضاً"۔
۵۔ رحمن علی' تذکرہ علمائے ہند' مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء' ص ۴۷۳۔

نے یہ عہدہ قبول کرنے سے معذرت چاہی اور اپنی بجائے اپنے بھائی سیّد علی رضوی خان کا نام پیش کیا۔

سیّد بدر عالم ۹ ذی الحجہ ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء کو ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہوا اور اپنے والد اور دادا کے مقبرہ میں دفن ہوا[1] اس کی تصانیف میں روضاتِ شاہی بڑی مشہور ہے۔ یہ کتاب چوبیس ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے پہلے بیس ابواب میں اس نے اپنے بزرگوں کے حالات قلمبند کئے ہیں[2] اس کی تصانیف میں کسی تذکرہ نویس نے ملفوظاتِ شاہ عالمؒ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اتنی اہم کتاب ان کی نظروں سے کیوں اوجھل رہی۔

جانشینی

سیّد بدرِ عالم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سیّد محمد محبوب عالم اس کا جانشین ہوا۔ وہ ۲ ربیع الاول ۱۰۴۷ھ / ۲۱ جولائی ۱۶۳۷ء کو پیدا ہوا اور خاندانی روایت کے مطابق اس نے اپنے والد سے ظاہری اور باطنی تعلیم حاصل کی۔ وہ بھی کئی کتابوں کا مصنّف ہے۔ اس نے عربی اور فارسی میں قرآنِ حکیم کی دو تفسیریں لکھی تھیں۔ وہ صوفی منش اور عابد و زاہد شخص تھا۔ اس نے ۱۹ جمادی الثانی ۱۱۱۰ھ / ۳ دسمبر ۱۶۹۸ء کو وفات پائی۔ "محمد بود ثانی شاہ عالم" سے اس کا سنِ وفات برآمد ہوتا ہے۔[3]

ملفوظات کا علمی رنگ

سیّد جعفر بدر عالم پر حدیث کا غلبہ تھا۔ اس لئے اس نے ملفوظات میں اپنے خیالات کی تائید میں لمبی لمبی حدیثیں نقل کی ہیں۔ وہ احمد، البزاز، الطبرانی، الحاکم، البیہقی، ابنِ حجر، ابنِ حبان، ابنِ عساکر، ابنُ القیم، ابنِ جوزی، حافظ زین الدین عراقی، قطب الدین القسطلانی، بدر الدین زرکشی، خواجہ محمد پارسا، شیخ القضاۃ نجم الدین البنبانی، حکیم سنائی، الطحاوی، امام یافعی، سلیمان بن علی قاری اور شیخ عبدالحق محدثؒ کے حوالے بلا تکلف دیتا چلا جاتا ہے۔ ان مصنّفین کے علاوہ دورانِ تصنیف اس نے درج ذیل کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے:

فتح الباری، کنوز محمدی[4] زینۃ المفاتیح، روضۃ الاحباب، رسالہ چہل حکایتِ حضرتِ شاہیہ[5] عین المعانی، رسالہ تلفیق، شرح مشکوٰۃ، حقائق سلمی، درالنظیم[6] روضۃ الشہدا[7] تفسیرِ کبیر، حلیۃ

---

۱ - ضمیمہ مرأت احمدی، ص ۴۴۔

۲ - وارث علی ترمذی، لطائف شاہیہ، ص ۳۷۔

۳ - ضمیمہ مرأت احمدی، ص ۴۶۔

۴ - مصنفہ شیخ فرید بن دولت شاہ۔

۵ - مصنفہ سید محمد مقبول عالم۔

۶ - مصنفہ امام یافعی۔

۷ - مصنفہ حسین واعظ کاشفی۔

المریدین، تفسیرِ بیضاوی، تفسیرِ قشیری،[۱] مکتوبات شرف الدین یحییٰ مُنیری، تفسیرِ حسینی، الموھب الدنیہ، کشف الاسرار، الرسالۃ المحمدیہ، صراط مستقیم،[۲] رسالہ مفاتیح خزائن اللہ، رسالہ جمیع اولیاء، احیاء العلوم، مرقاۃ الوصول الی محبۃ الرسول،[۳] مشکل الحدیث،[۴] انوارِ شافعیہ،[۵] شفاء قاضی عیاض، صحیحین، حقائق القرآن، تکثیر الفوائد،[۶] نصرۃ محمدیہ،[۷] جواہر تفسیر،[۸] تفسیر ابو سعید احمد الحنفی،[۹] کشف المحجوب، الخلاصہ،[۱۰] رسالہ باقریہ، کشف البیان، رسالہ ریاض الجنان فی قوارع القرآن، مدارک، کتاب الیواقیت، خصایص المصطفیٰ[۱۱] اور دین المریدین۔[۱۲]

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ کتابیں احمد آباد میں دستیاب تھیں۔ شیخ علی متقیؒ اور شیخ محمد بن طاہر بوھرہ پٹنیؒ کی کوششوں سے گجرات میں علومِ حدیث کا چرچا ہو چکا تھا۔ شیخ عبدالحق محدثؒ بھی وہاں ایک سال قیام کر چکے تھے۔[۱۳] بدر عالم کی بھی حدیث پر گہری نظر تھی، اس لئے اس فہرست میں حدیث کی کئی بلند پایہ کتابوں کے نام ملتے ہیں جن کا عام بزرگوں کے ملفوظات میں ذکر نہیں آیا۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ

سیّد بدر عالم رقمطراز ہے کہ حضرت شاہ عالمؒ فرمایا کرتے تھے کہ مخدوم جہانیاں کا اصل نام

---

۱ – اس کے بارے میں شاہ عالم فرمایا کرتے تھے، "تفسیر عجمی نوشتہ است۔"

۲ – تالیفِ علی بن محمد بن عراق المعروف بہ سید حسینی۔

۳ – تالیف سیّد مقبول عالم۔

۴ – تصنیفِ الطحاوی۔

۵ – اس کا اصل نام الانوار لعمل الابرار ہے۔ یہ جمال الدین اردبیلی المتوفیٰ ۷۹۹ھ کی تصنیف ہے۔

۶ – تالیفِ سلیمان علی مرید حضرت شاہ عالمؒ

۷ – مصنفہ سلیمان بن علی، قاری خاص حضرت شاہ عالمؒ

۸ – تصنیفِ حسین واعظ کاشفی۔

۹ – تالیفِ طاہر بن محمد بخاری المتوفیٰ ۵۴۲ھ۔ اس کتاب کا پورا نام خلاصہ الفتاوی حنفیہ ہے۔

۱۰ – مصنفہ امام عبدالوہاب شعرانی۔

۱۱ – تالیف امام ابی الربیع سلیمان۔

۱۲ – مصنفہ سیّد مقبول عالم۔

۱۳ – خلیق احمد نظامی، حیاتِ شیخ عبدالحق محدّث، مطبوعہ دہلی، ۱۹۵۳ء، ص ۹۶۔

"حسین" تھا اور باقی سب القاب ہیں[1] شاہ عالم مخدوم صاحب کے بھائی سید راجو قتالؒ سے روایت کرتے ہیں کہ مخدوم جہانیاں کے مریدوں کی تعداد ۲۰۱۱۷۳ تھی اور ان میں سے ۱۲۷۵۰ مرید خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ان کے ۱۵۰۰۰ مرید قطبیت اور غوثیت کے مرتبہ تک پہنچے اور تقریباً ۱۰۰۰ ابدال کے درجے کو پہنچے۔ ان کے مریدوں میں صرف ۱۵۰۰۰ کے قریب مفتی شامل تھے[2] حضرت شاہ عالم فرمایا کرتے تھے:

مخدوم جہانیاں علیہ غفران مآب ہر کرا مرید می گرفتد اولادِ او را تاہفت بطن مرید خود می کردند[3]

مخدوم جہانیاں غفران مآب جسے مرید کرتے' اس کی اولاد کو سات پشتوں تک اپنا مرید بنا لیتے تھے۔

بدر عالم نے ایک اور موقع پر حضرت شاہ عالمؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مخدوم جہانیاں کے مرید کی سات پشتیں ان کی مرید ہوا کرتی تھیں' اس لئے ان کے لئے یہ رَوا نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے شیخ سے کلاہ لیں[4]

حضرت شاہ عالمؒ فرماتے ہیں کہ مخدوم جہانیاںؒ عالم متبحر تھے اور انہیں تین لاکھ احادیث مع اسناد یاد تھیں۔ جامع ملفوظات کی اس کے متعلق یہ تحقیق ہے:

این خانہ زاد خاکسار گوید سماع دارم کہ حضرت سید الاقطاب سہ لک حدیث باسانید یاد داشتند از آنجملہ دوازدہ ہزار حدیث مفتری بود و باقی غیر مفتری[5]

اس خانہ زاد خاکسار نے سنا ہے کہ حضرت سید الاقطاب (مخدوم جہانیاں) کو تین لاکھ حدیثیں مع اسناد یاد تھیں۔ ان میں سے بارہ ہزار حدیثیں جھوٹی تھیں اور باقی صحیح۔

موجودہ زمانے میں مخدوم جہانیاںؒ کی اولاد بکثرت شیعہ مذہب اختیار کر چکی ہے۔ ان کے پڑ پوتے شاہ عالمؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ موصوف حنفی المذہب تھے اور ان کی اولاد بھی اسی مسلک پر گامزن ہے[6]

شاہ عالمؒ اپنے جدِ امجد مخدوم جہانیاںؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

در اتباع حضرت مقدسہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم بذل جہد کردہ اند[7]

انہوں نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔

شاہ عالم فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے

---

۱ - ملفوظات شاہ عالم' ورق ۱۵۳ ب۔ ۲ - "ایضاً" ورق ۱۵۴ الف۔

۳ - "ایضاً" ۱۰۱ الف۔ ۴ - "ایضاً" ورق ۸۲ ب۔ ۵ - "ایضاً" ورق ۹۷ ب۔

۶ - "ایضاً" ورق ۹۷ ب۔ "علم خانوادہ حضرت سید الاقطاب موافق اعمال اقوال آئمہ است۔"

۷ - "ایضاً" ورق ۱۰۱ الف۔

"عیدی" مانگی تو ارشاد ہوا: کیا چاہتے ہو؟ مخدوم صاحب نے عرض کیا کہ ان کے مریدوں سے در گزر فرمائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غیب سے ایک تحریر آئی جس میں ان کے تمام مریدوں کے، بشمول نظام الدین کوتوال' نام درج تھے اور اس تحریر کے آخر میں تحریر تھا' "اینہا ہمہ از عذاب آخرت و گور آزاد اندط" حضرت شاہ عالم یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو یہ بشارت ملی تھی کہ جہاں ان کے فرزند یا مرید موجود ہوں گے وہاں برکت اور دولت کی فراوانی ہو گی۔[1]

شاہ عالمؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار نمازِ عصر کے قریب حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خدمت میں کھانا چنا گیا۔ حاضرین نے ان سے دریافت کیا کہ پہلے نماز ہو گی یا کھانا تناول فرمائیں گے؟ حضرت نے فرمایا کہ پہلے کھانا ہو گا ورنہ نماز کے دوران کھانے کی طرف دھیان رہے گا اور یہ تقاضا بشری کے عین مطابق ہے۔[2]

حضرت مخدوم جہانیاںؒ سلاطینِ گجرات کے مربّی تھے۔ ان کی اولاد بھی ان سلاطین کی سرپرستی کرتی رہی۔ سلطان احمد والئی گجرات نے حضرت قطب العالمؒ کی موجودگی میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ "جدّ ما سلطان مظفر پیش حضرت سید الاقطاب مخدوم جہانیاں علیہ الرضوان ایمان آورند و مرید شد۔"[3]

سیّد راجو قتال کے بارے میں ایک اہم روایت

ایک روز ایک معمّر شخص حضرت شاہ عالمؒ سے ملنے آیا۔ اس نے کہا کہ وہ خواجہ ابو الفضل محمد بن حسین الحسینی البخاری المعروف بہ راجو قتالؒ کا مرید ہے۔ اس وقت راجو قتالؒ کو فوت ہوئے پچاس برس گزر چکے تھے' اس لئے حضرت شاہ عالمؒ کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ آپ نے اس کا امتحان لینے کے لئے اس سے کہا کہ وہ ان کا حلیہ بیان کرے۔ اس نے جواب میں ان کا سراپا یوں بیان کیا:

پُر اندام بودند' چشمہای بزرگ داشتند و سبز رنگ بودند مُصلّا برسرکردہ در خانقاہِ حضرت سید الاقطاب مخدوم جہانیاں علیہ الرحمتہ ی

ان کا جسم پُر گوشت تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ان کا رنگ سبزی مائل تھا۔ وہ اپنے سر پر مُصلّا رکھ کر مخدوم جہانیاں

---

۱ - ایضاً" ورق ۳۵ ب۔ اس روایت میں شیعی عنصر موجود ہے۔
۲ - ایضاً" ورق ۱۷۲ ب۔
۳ - ایضاً" ۹ الف۔
۴ - ایضاً" ورق ۲ ب۔

تمدند۔ران علیہ الرحمتہ کی خانقاہ میں جایا کرتے تھے۔

یہ ن ر حضرت شاہ عالمؒ نے فرمایا "راست می گوید"۔

اس روایت سے حضرت راجو قتالؒ کا اصل نام مع کنیت معلوم ہوا اور یہ بھی پتہ چلا کہ ان کے دادا حضرت جلال الدین سرخ پوش بخاریؒ کا اصل نام حسین تھا۔ اسی روایت سے سید راجو قتالؒ کا حلیہ بھی معلوم ہوا۔

حضرت قطب العالمؒ

حضرت شاہ عالم فرماتے ہیں کہ حضرت مخدوم جہانیاں نے اپنے بیٹے سید ناصر الدین محمود کو بشارت دی تھی کہ ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہو گا جس کا نام عبداللہ اور لقب برہان الدین ہو گا۔ حضرت نے اپنے تکیہ کا غلاف اپنے بیٹے کو دے کر فرمایا کہ اس سے بچے کا لباس تیار کروا لیں اور جب وہ بچہ پیدا ہو تو اسے پہنا دیں۔[1]

حضرت قطب العالم اپنے والد سید ناصر الدین محمود کے خلیفہ تھے اور اپنے ہمعصروں میں "ثانی مخدوم جہانیاں" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ موصوف اُوچ کی سکونت ترک کر کے سلطان احمد بن تاتار خان کے عہد میں گجرات چلے آئے اور یہاں انہوں نے احمد آباد کے مضافات میں موضع بٹوہ میں سکونت اختیار کر لی۔ سلاطینِ گجرات ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے اور گجرات کی حکومت کو ان کے جدِ امجد مخدوم جہانیاںؒ کی دین سمجھتے تھے[2،3] جب حضرت قطب العالمؒ احمد آباد تشریف لائے تو سلطان احمد نے ان کے سامنے مؤدبانہ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا:

قطبِ زمانہ ما برھان بس است مارا
برھانِ اُو ہمیشہ چون نامش آشکارا

اس سے سلاطینِ گجرات کے دل میں ان کی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بدر عالم رقمطراز ہے کہ غیاث الدین احمد کے زمانے میں معظم شاہ، حضرت قطب العالمؒ

---

۱ - ایضاً" ورق ۸۲ ب۔

۲ - ایضاً" ورق ۱۷۰ الف۔

۳ - (i) عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۲۵ - H، ورق ۵۰۸ الف۔

"--- سلاطینِ گجرات آن ملک از برکت انفاسِ متبرکہ مخدوم جہانیاں یافتہ اند---"

(ii) سکندر بن محمد، مرأتِ سکندری، مطبوعہ بمبئی، ۱۳۰۵ھ، ص ۱۵۸--- تفویضِ امرِ سلطنت سلاطینِ گجرات از حملۂ علیہ ایشان اند۔"

سے ملنے آیا۔ اس کا دادا ملک علاء الدولہ ابورجاء "خداوند خان" کے لقب سے ملقب تھا۔ اس نے حضرت سے درخواست کی اگر موصوف دیوان میں ملازمت اختیار کر لیں تو خداوند خان کا عہدہ انہیں دے دیا جائے گا۔ حضرت نے خدا سے دعا کی کہ وہ انہیں اس مصیبت سے بچائے رکھے[1]

بابائے اُردو مولوی عبدالحق اپنی مشہور تصنیف "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں حضرت قطب العالمؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ایک بار موصوف رات کو بیدار ہوئے تو اندھیرے میں ان کا پاؤں کسی سخت چیز سے جا ٹکرایا تو انہوں نے فرمایا' "لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے"[2] مولانا عبدالحیؒ صاحب نے گلِ رعنا میں اس کی بجائے یہ الفاظ نقل کئے ہیں' "لوہا ہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے؟"[3] میر علی شیر قانع نے یہ مصرع یوں درج کیا ہے' "یہ پتھر ہے یا لوھا ہے یا لکڑی ہے؟"[4] حضرت قطب العالم کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ موصوف اُوچھ کی زبان (سرائیکی؟) میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کے فرزند حضرت شاہ عالمؒ کی ولادت گجرات کی ہے لیکن وہ بھی یہ زبان جانتے تھے۔[5]

حضرت قطب العالمؒ ۸ ذی الحجہ ۸۵۴ھ ر ۱۴۵۳ء کو ۶۷ سال کی عمر میں راہی ملکِ بقاء ہوئے۔ ان کا مزار بَٹوہ میں مرجع خلائق اور گجرات کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے منجھلے فرزند شاہ عالمؒ ان کے جانشین ہوئے۔

حضرت شاہ عالمؒ

حضرت شاہ عالمؒ ۱۷ ذی قعدہ ۸۴۷ھ ر ۱۴۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ "وارث علی" سے ان کا سِن ولادت برآمد ہوتا ہے[6] حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سے ان کے والد بزرگوار نے ان کا نام "محمد" رکھا۔ منجھلے بیٹے ہونے کی وجہ سے ان کے اعزا انہیں "میاں منجھلے" کہہ کر پکارتے تھے[7] عوام انہیں "شاہ منجھن" کے نام سے یاد کرتے تھے[8] مفتی محمد سرور کی روایت ہے کہ صوفیوں کے حلقے میں موصوف "منجھلے پیر" کہلاتے تھے[9]

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ عالم' ورق ۴۱ الف۔

۲ - عبدالحق' اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' مطبوعہ کراچی' ۱۹۵۳ء' ص ۲۷۔

۳ - عبدالحیؒ' گلِ رعنا' مطبوعہ اعظم گڑھ' ۱۳۷۰ھ' ص ۱۵۔

۴ - میر علی شیر قانع' تحفۃ الکرام (اردو)' مطبوعہ کراچی' ۱۹۵۹ء' ص ۳۷۰۔

۵ - عبدالحیؒ' گلِ رعنا' ص ۱۵۔

۶ - علی محمد خان' مرآتِ احمدی' ص ۳۷۔

۷ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۰۹ الف۔

۸ - غوثی منڈوی' گلزارِ ابرار (اردو)' مطبوعہ لاہور' ۱۳۹۵ھ' ص ۱۶۰۔

۹ - مفتی غلام سرور' خزینۃ الاصفیاء' مطبوعہ نولکشور' ۱۹۱۴ء' ج ۲' ص ۱۷۔

شاہ عالم کی والدۂ ماجدہ بی بی آمنہ، کریم خان بن عماد الدین خداوند خان کی بیٹی تھیں۔ موصوف کے دادا خداوند خان درباری امیر تھے۔ شاہ عالم کا حلیہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک جیسا تھا۔ ان کے والدِ بزرگوار کا نام عبداللہ (برہان الدین قطب العالم)، والدہ ماجدہ کا نام بی بی آمنہ تھا، دایہ کا نام حلیمہ تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کی عمر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جتنی ہوئی[1]

تعلیم و تربیت

حضرت شاہ عالم کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے والدِ بزرگوار نے کی۔ حضرت قطب العالمؒ ان کے والد، اُستاد اور مرشد تھے[2] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان کے اساتذہ اور مشائخ میں شیخ احمد کھٹوؒ (المتوفیٰ ۱۴۴۶ء) کا نام بھی تحریر فرمایا ہے[3] غوثی منڈوی نے شیخ سراج الدین علی چشتی احمد آبادی کو حضرت شاہ عالمؒ کا استاد بتایا ہے۔ شیخ موصوف نے سرکاری ملازمت نہ کرنے کا عہد کیا ہوا تھا[4] ملفوظات کے مندرجات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ عالمؒ کو علم حدیث پر عبور کامل تھا۔ جامع ملفوظات نے متعدد موقعوں پر ان کی زبانی لمبی لمبی حدیثیں نقل کی ہیں۔ سترہ سال کی عمر میں ان کے والدِ بزرگوار نے انہیں خلافت سے نوازا اور مخدوم جہانیاںؒ کا خرقہ عنایت فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی موصوف سلسلۂ مغربیہ کی نعمت اور امانت سے بھی سرفراز ہوئے[5]

شاہ عالمؒ کی ازدواجی زندگی

بی بی مغلائی اور بی بی مرکی، جنہیں عام مؤرخین جام جونہ والئی سندھ کی بیٹیاں ظاہر کرتے ہیں، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا کی تحقیق کے مطابق جام تغلق کی بیٹیاں تھیں[6] بی بی مغلائی اپنی بہن بی بی مرکی سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی اور اس کا رشتہ شاہ عالمؒ سے اور بی بی مرکی کا ناطہ سلطان محمد ثانی والئی گجرات سے طے ہوا۔ سلطان نے قاصدوں کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس کا نکاح بی بی مغلائی سے ہو گا۔ جب شاہ عالمؒ کو اس صورت حال کا علم ہوا تو بہت رنجیدہ ہوئے۔ ان کے والدِ بزرگوار نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ

---

۱ - ایضاً" ص ۱۷۔

۲ - ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۱۷ الف۔

۳ - عبدالحق محدثؒ، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۱۶۱۔

۴ - محمد غوثی منڈوی، گلزارِ ابرار، ص ۱۴۰۔

۵ - علی محمد خان، مرأتِ احمدی، ص ۳۷۔ انہیں یہ نعمت شیخ احمد کھٹوؒ سے ملی تھی۔ وہ سلسلۂ مغربیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

۶ - عمر بن محمد داؤد پوتا، تاریخ معصومی، مطبوعہ بمبئی، ۱۹۳۸ء، تعلیقہ، ص ۳۰۱۔

وہ فکر مند نہ ہوں۔ یہ تقدیر کا فیصلہ ہے کہ دونوں بہنیں یکے بعد دیگرے ان کے عقد میں آئیں گی' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بی بی مرکی کے انتقال کے بعد حضرت شاہ عالمؒ نے سلطان محمد ثانی کی بیوہ بی بی مغلائی کے ساتھ عقد کر لیا[۱] محمد علی خان نے ان کی ایک تیسری بیوی کا بھی ذکر کیا ہے لیکن نام نہیں بتایا۔ یہ تینوں ازواج صاحب اولاد تھیں۔

عالم جذب و سُکر

حضرت شاہ عالمؒ کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ ان پر اکثر جذب و سُکر کا غلبہ رہتا تھا[۲] اس عالم میں موصوف ریشمی لباس بھی پہن لیا کرتے تھے جو علماء کی نظروں میں کھٹکتا رہتا تھا۔ ان حالات میں بعض لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ موصوف نے ملامتیہ مشرب اختیار کر لیا ہے۔

جس زمانے میں حضرت شاہ عالمؒ نہر والہ میں قیام پذیر تھے' موصوف بھمی طرز کا لباس' جیسا کہ سُورت کے لوگ پہنتے ہیں' زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا عالم پٹنی' جو بڑے متشرع' متورع اور متدین بزرگ تھے اور احتساب کے معاملے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے' آپ کا احتساب کرنے گئے۔ جب حضرت والا کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ ان کے استقبال کو تشریف لے گئے۔ جونہی مولانا عالم نے ان کا جاہ و جلال دیکھا' ان کے قدموں میں کر گئے۔ حضرت نے مولانا سے فرمایا کہ شریعت میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ مولانا نے گجراتی زبان میں کہا:

شون کچی شون کچی جانی چھی پن طاقت نتھی۔[۳]

شیخ عبدالحق محدثؒ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ حضرت شاہ عالمؒ کبھی کبھی ریشمی لباس پہن لیتے تھے اور ملامتیوں کے طور طریقے اپنا لیتے تھے[۴]

قاضی نجم الدین

قاضی موصوف سلطان محمود بیگڑھ کے عہد میں احمد آباد کے قاضی تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ حضرت شاہ عالمؒ ریشمی لباس استعمال کرتے ہیں تو وہ ایک روز غصہ کے عالم میں احتساب کی

۱۔ کمساریٹ' تاریخ گجرات (انگریزی) مطبوعہ مدراس' ۱۹۳۸ء' ج ۱' ص ۱۳۰۔

۲۔ عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۰۹ الف۔

۳۔ ملفوظات شاہ عالم' ورق ۷۰ ب' ۷۱ الف۔

۴۔ عبدالحق محدث' اخبار الاخیار' مطبوعہ دہلی' ۱۳۳۲ھ' ص ۱۶۱۔

نیت سے ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ قاضی صاحب اپنے ساتھ لباس حریر کی حرمت کے بارے میں چند احادیث لکھ کر لے گئے تھے۔ جونہی وہ حضرت کے سامنے آئے ان کا غصہ فرو ہو گیا۔ حضرت نے ان سے پوچھا کہ وہ کاغذ کیسا ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ اس پر چند حدیثیں درج ہیں۔ حضرت نے اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ جب قاضی صاحب نے وہ کاغذ آگے بڑھانا چاہا تو وہ بالکل کورا نکلا۔ حضرت کے تن میں لکڑی کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، وہ ان کی توجہ سے سونے میں تبدیل ہو گیا۔ قاضیٔ موصوف کثیر الاولاد بزرگ تھے۔ حضرت نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اسے ساتھ لے جائیں، بچوں کے کام آئے گا۔ جب قاضی صاحب واپس جانے لگے تو حضرت نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

درخانۂ من سرود است و مزامیر و لباسِ ابریشمی، ہر کہ ہمہ اینہا را قبول کند، در صحبت ما نشیند!	میرے گھر میں گانا ہے، ساز ہیں اور ریشمی لباس ہے۔ جو شخص ان سب کو قبول کرے، وہی ہماری صحبت میں بیٹھے۔

حاضرینِ مجلس

شیخ فرید بن دولت شاہ صاحبِ کنوز محمدی[1] مولانا سلیمان بن علی، قاری خاص صاحبِ رسالہ جمیع اولیاء اور میاں مخدوم خلیفۂ خاص کا شمار حضرت شاہ عالمؒ کے مصاحبوں میں ہوتا تھا۔ یہ حضرات ان کی ہر مجلس میں موجود ہوتے تھے۔ مولانا سلیمان نے کنوز محمدی کے علاوہ رسالہ تکثیر الفوائد اور رسالہ نصرۃ محمدیہ بھی قلمبند کئے تھے[2] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرتِ والا کو اہلِ علم کی صحبت مرغوب تھی۔

شیخ فرید بن دولت شاہ صاحبِ کنوز محمدی کو حضرت شاہ عالمؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ایک بار اس کا فرزند عبداللہ کھانے کے بعد طشت اور آفتابچہ اٹھا لایا۔ اس نے حضرتِ والا کے ہاتھ دُھلائے تو شیخ فرید نے وہ دھوون تبرکاً پی لیا[3]

حضرت شاہ عالمؒ عوام کے ساتھ صرف جمعہ کے دن ملاقات کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سے ملاقات ممکن نہ تھی[4] موصوف خود یہ فرمایا کرتے تھے:

من حسب الامرِ الٰہی در ہفتہ یکبار بیرون می آیم و با خلق صحبت میدارم۔ و الا مرا باخلق چہ کار؟[5]	میں خدا کے حکم کے مطابق ہفتہ میں ایک بار باہر آ کر لوگوں سے ملتا ہوں۔ ورنہ مجھے لوگوں سے کیا لینا ہے؟

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۳۳۔ ۲ - ایضاً" ورق ۴۰ الف۔ ۳۔ ایضاً" ورق ۵۹ ب۔

۴ - سکندر بن محمد، مرآتِ سکندری، مطبوعہ بمبئی، ۱۳۰۸ھ، ص ۳۳۔

۵ - ایضاً" ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۹۵ الف۔

شاہ عالم کا طریق بیعت

حضرت شاہ عالمؒ جب کسی شخص کو مرید کرتے تو پہلے اس سے سابقہ گناہوں سے توبہ کرواتے اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کرنے کا وعدہ لیتے۔ بعد ازاں اس کے سر کے بال کتر کر اسے شجرہ اور کلاہ عنایت فرماتے[1] آپ جب کسی مرید پر توجہ کرتے تو وہ بے خود ہو کر سجدہ میں سر رکھ دیتا۔ مولانا سراج الدین عالم ملتانی حضرت شاہ عالمؒ کو اس سے منع کرنے آئے لیکن ان کے سامنے آتے ہی خود بھی سربسجود ہو گئے۔ حضرت نے انہیں اس حال میں دیکھ کر فرمایا کہ مخلوق کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ سراج الدین کہنے لگے کہ بے شک شریعت کا یہی حکم ہے لیکن ان میں ضبط کی طاقت نہیں رہی تھی۔[2]

حضرت شاہ عالم اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

من درویشی نمیدانم۔ من ترکش بندم۔ شیخی و مرشدی نمی کنم۔ بپای من نخواہی افتاد۔[3]	میں درویشی نہیں جانتا۔ میں نے ترکش باندھا ہوا ہے۔ میں شیخی اور پیری نہیں کرتا۔ میرے پاؤں پر نہ گرا کریں۔

خلیفہ کی صفات

ایک دن شیخ فرید بن دولت شاہ صاحب کنوز محمدی نے حضرت والا سے درخواست کی کہ موصوف قاضی عیسیٰ کو خلافت عطا فرمائیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ "علم" بھی رکھتا ہے؟ شیخ فرید نے عرض کیا کہ "دائمی شغل عبادت" رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پہلے وہ تبحر کے ساتھ علم حاصل کرے، پھر خلافت ملے گی۔ حضرت شاہ عالم فرمایا کرتے تھے کہ خلیفہ ہونے کے لئے تین شرائط لازمی ہیں۔

۱۔ وہ مخلوق سے کسی چیز کی خواہش نہ رکھے۔

۲۔ وہ دنیا داروں کے دروازے پر نہ جائے۔

۳۔ اگر کوئی اسے ملنے آئے تو وہ اسی لباس میں جو پہنے ہوئے ہو، باہر آئے اور ملاقات کے وقت امیر و غریب میں تفریق روا نہ رکھے۔[4]

---

۱ - ایضاً، ورق ۴۹ الف۔

۲ - محمد غوثی مندوی، گلزار ابرار (اردو)، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۵ھ، ص ۱۶۰۔

۳ - ملفوظات شاہ عالم، ورق ۷۲ ب۔

۴ - ایضاً، ورق ۱۶۸ الف۔

پابندیٔ شریعت

حضرت شاہ عالمؒ احکام شریعت پر سختی کے ساتھ کاربند تھے۔ موصوف اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے:

طالب مولیٰ را باید کہ مقدار سر سوزن از فرمان تجاوز نکند۔ آنچہ در شریعت گفتہ اند، بجا آرد۔[1]

طالب مولیٰ کو چاہئے کہ وہ احکام سے سوئی کی نوک کے برابر بھی تجاوز نہ کرے۔ جو کچھ شریعت میں کہا گیا ہے، اسے پورا کرے۔

شاہ عالمؒ کا تقویٰ

حضرت شاہ عالمؒ نے ایک روز اپنے مصاحبوں سے کہا جب سے وہ دس سال کے ہوئے ہیں اس وقت سے لے کر اب تک حساب لگائیں کہ کتنی نمازیں، وتر اور روزے بنتے ہیں۔ ان کے مصاحبوں نے پچاس سال کا حساب لگایا اور ماہ کے تیس دن شمار کئے۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک نماز کا کفارہ نصف صاع گندم کے برابر ہوتا ہے اور روزے کا کفارہ بھی اسی قدر ہے۔ لوگوں نے حساب لگایا تو نمازوں کا کفارہ ۵۴۰۰۰ صاع یعنی ۲/۱ ۷۰۳ من گندم بنی۔ حضرت نے اسی قدر گندم منگوا کر فقراء میں تقسیم کر دی۔[2]

تاریخ اس پر گواہ ہے کہ سلطان سکندر لودھی نے بھی اپنی وفات سے قبل علماء سے "نماز و روزہ (ترک کردن) ریش تراشیدن و می خوردن و گوش و بینی بریدن" کا کفارہ ادا کرنے کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ جب انہوں نے حساب لگا کر بتایا تو اس نے اتنی ہی رقم خزانے سے لے کر علماء و صلحاء میں تقسیم کروا دی۔[3] ان مثالوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں علماء نے عوام کو یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ ترک صوم و صلوٰۃ اور حدود شریعت سے تجاوز کرنے کا کفارہ نقد و جنس کی صورت میں ادا کر دیں، تو ان کی نجات ہو جائے گی۔

شاہ عالمؒ کا علمی ذوق

حضرت شاہ عالمؒ صاحب تصنیف تھے۔ عبداللہ خویشگی نے ان کے ایک رسالہ کا پورا متن

---

۱ - ایضاً" ورق ۹۵ الف۔

۲ - ایضاً" ورق ۹۵ ب، ۹۶ الف۔

۳ - خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی، ۱۹۵۸ء، ص ۴۶۹۔

معارج الولایت میں نقل کر دیا ہے جو سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس رسالہ کی ابتداً ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم الوصول الی و بحک الکریم اعلم ان الوصول الی اللہ ثلثۃ انواع۔ اولھا الوصول الی اللہ ہو الخروج عن الافعال الذمیمۃ و ہی تزکیۃ النفس و ثانیھا الوصول الی اللہ ہو الانقطاع عما سوی اللہ تعالٰی ہو تصفیۃ القلب و ثالثھا الوصول الی اللہ ہو الخروج عن الصفات وہی تحلیۃ الروح.... الخ۔[1]

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عالمؒ حاضرین مجلس سے کتابیں پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ ایک بار ان کے ایک مرید نے "رسالہ زینتہ الفاتح" پڑھ کر سنایا تو آپ نے کمال توجہ کے ساتھ اسے سنا۔ جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ اس رسالہ میں یہ بھی مرقوم تھا: الا ان اولیاء اللہ لا تموتون بل ینتقلون من دار الی دار۔[2]

ملک القضاۃ صدر جہاں کا ایک شاگرد سید یوسف حضرت شاہ عالمؒ کی خلافت سے مفتخر تھا۔ آپ نے اسے "رسالۂ تلفیق" لکھنے کا حکم دیا۔ جب وہ رسالہ لکھ کر لایا تو آپ نے اس کا کچھ حصہ مصنف کی زبانی سنا۔[3]

حضرت شاہ عالمؒ امام قشیریؒ کی تفسیر کے بڑے معترف تھے' ایک بار انہوں نے علماء کی موجودگی میں امام قشیریؒ کے بارے میں فرمایا:

"تفسیر عجیبی نوشتہ است۔"[4]

سید بدر عالم لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ عالمؒ کی مجلس میں ان کے ایک مرید امام غزالیؒ کی تصنیف احیاء العلوم پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ نیز ان کی لائبریری میں "مفاتیح خزائن اللہ" نام کا ایک نادر رسالہ تھا اور مریدوں کی التماس پر آپ یہ رسالہ انہیں مطالعہ کے لئے دے دیا کرتے تھے۔[5]

شاہ عالمؒ کی سخن فہمی

ایک روز گجرات کے مشہور شاعر مولانا صدر جہاں حضرت شاہ عالمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے موصوف کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا۔ حضرت والا اس وقت اپنے دوش پر

---

۱ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۰۹ الف۔
۲ - ملفوظات شاہ عالم' ورق ۵۹ الف۔
۳ - ایضاً" ورق ۸۷ الف۔
۴ - ایضاً" ورق ۹۸ الف۔
۵ - ایضاً" ورق ۵۰ الف۔

چادر ڈالے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہ چادر صدر جہاں کے سر پر باندھ دی۔[1]

ایک روز قاضی نجم الدین بنبانی نے غسل کے مسئلہ پر اپنی تحقیق حضرت شاہ عالمؒ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ اس کی عالمانہ اور محققانہ گفتگو سن کر حیرت زدہ ہو گئے۔ آپ قاضی صاحب کو دانشمندِ حقانی و عالمِ سبحانی کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔[2]

حضرت شاہ عالمؒ کو شیخ سعدی کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور موصوف انہیں قطبِ شیراز کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔[3]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ قرآن مجید کی تلاوت سن کر حضرت شاہ عالمؒ پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور بسا اوقات ان پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ ایک بار ان کی مجلس میں سورہ والناس پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اس سورت میں لفظ "الناس" پانچ بار آتا ہے اور ہر جگہ اس کے مختلف معنی ہیں۔[4]

شاہ عالم اور اُردو

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عالمؒ گجراتی زبان میں بات چیت کر لیتے تھے۔ عبدالحی مرحوم کی روایت ہے کہ موصوف اُوچ کی زبان (سرائیکی؟) میں گفتگو کر لیتے تھے۔[5] یہ زبان انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار سے سیکھی تھی کیونکہ ان کی والدہ گجرات کی رہنے والی تھیں اور وہ "اُوچ کی زبان" نہیں جانتی تھیں۔

مشائخِ کرام نے جس علاقے میں تبلیغ و ارشاد کا کام کیا پہلے اس علاقے میں بسنے والے لوگوں کی زبان سیکھی۔ حضرت خواجہؒ معین الدین اجمیریؒ نے اجمیر جانے سے پہلے پانچ سال ملتان میں قیام کر کے ہندوستانی زبان سیکھی تھی۔[6] شیخ احمد کھٹو (المتوفی ۱۴۴۶ء) کا آبائی وطن دہلی تھا لیکن ان کا بچپن اور جوانی راجستھان کے مشہور تاریخی قصبے کھاٹو میں گزری۔ جب موصوف نے احمد آباد کو اپنا مسکن قرار دیا تو عوام سے رابطہ قائم رکھنے کی غرض سے گوجری زبان سیکھ لی تھی۔[7] ہمارے مشائخ کرام نے زبان کو کبھی اپنے وقار کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ ذریعہ ابلاغ سمجھ کر

۱۔ ایضاً" ورق ۵۹ ب۔

۲۔ ایضاً" ورق ۴۷ ب۔

۳۔ ایضاً" ورق ۴۹ الف۔

۴۔ ایضاً" ورق ۹۲ ب۔

۵۔ عبدالحی، گل رعنا، مطبوعہ اعظم گڑھ، ۱۳۷۰ھ، ص ۱۵۔

۶۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۲۲۵۔

۷۔ (i) خلیق احمد نظامی، "ملفوظات کی تاریخی اہمیت" مضمون مشمولہ نذرِ عرشی، مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۴۴۳۔

(ii) محمد اسلم، شیخ احمد کھٹو، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۔

مختلف زبانیں سیکھتے رہے۔

"اُوچ کی زبان" سے حضرت شاہ عالمؒ کی واقفیت کا ثبوت ملفوظات سے مل جاتا ہے۔ سیّد بدر عالم رقمطراز ہیں کہ ایک روز انھوں نے اپنی مجلس میں بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا یہ شعر پڑھا۔

توبلی لیندی باولی دیدی کھری نلج
چوھا بل ز ما نہیں پو بھل باندھے بھج[1]

پنجابی زبان کے مایہ ناز ادیب اور محقق محمد آصف خان نے یہ شعر یوں لکھا ہے:

ٹوپلی لیندے باورے، دیندے کھرے نلج
چوھا کھڈ نہ ماوای، پچھے بندھیے چھج

جناب آصف خان تحریر فرماتے ہیں کہ یہ شعر میر عبدالواحد بلگرامی نے ۱۵۶۱ء میں اپنی مشہور تصنیف سبع سنابل میں نقل کیا ہے[2] (یعنی اس سے پہلے کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا۔) حضرت شاہ عالمؒ کی مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں یہ بیت پڑھی تو آپ نے کھڑے ہو کر سنی۔

خلیل اللہ کل ملک دا تارا
شاہ رسول جی وات اودھارا[3]

ایک روز دوران گفتگو حضرت شاہ عالمؒ نے فرمایا:

گنگی لنگی کوڑی لنجی کی[4]

ایک بار مولانا عالم پٹنی نے حضرتِ والا کو مخاطب کر کے کہا تھا:

شون کچی شون کچی جانی چھی پن طاقت نتھی

حضرت شاہ عالمؒ کے فرزند کا نام سیّد بیگ محمد تھا، جو عوام میں شاہ بھیکن کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی والدہ بی بی مرکی جام تغلق والئی سندھ کی بیٹی تھیں۔ تصوّف کی کتابوں میں یہ روایت ملتی ہے کہ ایک بار ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا فوت ہو گیا۔ وہ روتی پیٹتی حضرت شاہ عالمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو انہیں اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ انھوں نے اپنے فرزند شاہ

۱- ملفوظاتِ شاہ عالمؒ ورق ۱۰۱ الف۔
۲- محمد آصف خان، آکھیا بابا فرید نے، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۴۷۔
۳- ملفوظاتِ شاہ عالمؒ، ورق ۹۶ ب۔
۴- ایضاً، ورق ۸۰ الف۔

بھیکن کو گود میں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور بارگاہ خداوندی میں التجا کی۔۔ "راجن بکروتے بدل بکروتا۔۔" یعنی اُس بکرے کے بدلے یہ بکرا قبول کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی بیوہ کا مردہ بچہ زندہ ہو گیا اور شاہ بھیکن فوت ہو گئے[1]

مولوی عبدالحق نے اپنی مشہور تصنیف۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔۔ میں حضرت شاہ عالمؒ کا یہ شعر درج کیا ہے:

کاندھی کا راجا تم سر کوئی نو بوجھے
سکیں کا راجا تم سر کوئی نہ بوجھے[2]

حضرت شاہ عالمؒ اُوچھ کی زبان میں اللہ تعالیٰ کو "راجن" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اس لفظ میں جو مٹھاس ہے، اس کا مزہ کوئی صاحب دل ہی لے سکتا ہے۔

بدر عالم فرماتے ہیں کہ شیخ بابو نامی ایک شخص نے ۳ رجب ۸۷۷ھ کو حضرت شاہ عالمؒ کی مدح میں ان کے حضور میں یہ منقبت پڑھی:

دستیجی نیتھی بید بلای تمرین سنائیں پیر بخاری
سرت کری تن بیدن لگتی جانی ہیرا کی جن دیتی
بھید پیی ندیکھی کوئی اوکھد لائیں کھو کیا ہوئی
کرک کلیجی کھوسکہ کہما جیوری انکیت ہی بلی سودیا
جس جھال دیا تیری ہوئی کیوری بجھاوی دوجا کوئی
جتنچ پلس ندیکھی کوئی او کھد لائیں کھو کیا ہوئی
قطب برھان کا پوت سو پیارا سوئی جانی دکھ ہمارا
بابو منور لاکی پالے منجھن میری پیری پچھای تلے[3]

حضرت نے یہ منقبت سن کر اسے مرید کیا اور تبرک تقسیم کر کے خلوت میں تشریف لے گئے۔

۱۔ (i) علی محمد خان، ضمیمہ مرأت احمدی، ص ۳۹۔
(ii) گزیٹیر آف بمبئی پریذیڈنسی، مطبوعہ بمبئی، ۱۸۹۶ء، ج ا، حصہ اول، ص ۳۳۶۔

۲۔ عبدالحق، اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، مطبوعہ یونین پریس دہلی، ص ۲۳۔

--- فرمودند اگرچہ بزبان ہندی است اما موافق عربی است۔

۳۔ ملفوظات شاہ عالم، ورق ۹۰ الف۔ اس منقبت کی زبان بھاشا اور گجراتی ملی جلی معلوم ہوتی ہے۔

عقاید و معاد

ایک روز حضرت شاہ عالمؒ نے دوزخ کے بارے میں طویل گفتگو فرمائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ شق القمر کے بارے میں حضرت شاہ عالمؒ کے خیالات چار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ موصوف الم نشرح لک صدرک میں شرح صدر سے چکڑالویوں کی طرح، علم لدنی مراد نہیں لیتے بلکہ ان کے خیال میں فرشتوں نے باقاعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کیا تھا۔ شاہ صاحب رؤیت باری کے معاملہ میں معتزلہ سے اختلاف کرتے ہیں اور اس مسئلہ میں امام احمد بن حنبلؒ کے پیرو ہیں۔ انہوں نے معراج کے موضوع پر جو گفتگو فرمائی تھی وہ پانچ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں موصوف جمہور کے عقیدہ پر کاربند نظر آتے ہیں۔ سید بدر عالم نے معراج کی جزئیات پر بڑا زور دیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ہمایوں کے عہد میں شاہ محمد غوث گوالیریؒ نے "معراج نامہ" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھ کر اپنے معراج پر جانے کا ذکر کیا تھا۔ اس لئے عوام کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو جسمانی معراج نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح ملفوظات کے آخر میں مہدی کی علامات پر خوب کھل کر بحث کی گئی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی سمجھ میں آتی ہے کہ سید محمد جونپوری نے جب مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تو اس پر علمائے گجرات اس کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے اس کے دعویٰ کا بطلان کیا۔ شیخ علی متقیؒ محض اس کے دعویٰ کی تردید کے لئے مکہ مکرمہ سے گجرات آئے[1] اور انہوں نے "علاماتِ مہدی" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھ کر یہ ثابت کیا تھا کہ سید محمد جونپوری میں یہ علامات موجود نہیں ہیں' لہٰذا اس کا دعویٰ بے بنیاد ہے[2]۔ اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے' جس کی نقل راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ (شیخ علی متقیؒ نے مہدی کی جو علامات بیان کی ہیں' ان کے بارے میں ان کے ساتھ اختلاف کی گنجائش نکل آتی ہے)۔

حضرت شاہ عالمؒ اختلافات آئمہ سے کماحقہ' واقف تھے اور موصوف اختلافی مسائل پر بڑے عالمانہ پیرایہ میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے صلوٰۃ الوسطیٰ کے موضوع پر بھی عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

فاضل مرتب جسمِ انسانی کے بارے میں فرماتے ہیں: "دو چشم و دو گوش و دھن بمنزلہ پنج

۱- محمد بقاء' ریاض الاولیا' مخطوطہ برٹش میوزم لندن' اورینٹل ۱۷۴۵' ورق ۱۹۰ الف۔
۲- علی متقیؒ' رسالہ در علاماتِ مہدی' مشمولہ: مجموعہ رسائل شیخ علی متقیؒ' مخطوطہ آزاد لائبریری' علی گڑھ' نمبر ۲۵/۵ فارسی' ورق ۳۰ الف۔

کواکب اند: زحل و مشتری و عطارد و مریخ و زہرہ۔ سر مثالِ آسمان است و تن چون زمین، و رگ و پی چون آبہای رواں و مویہا چون درختان و حواس چون ستارگان و پوست و گوشت و پی و خون و استخوان و مغز و منی چون ہفت اقلیم و بیداری چون روز و خواب چون شب و خوشدلی چون بہار و غم چون زمستان و گرسنگی چون تابستان و گریہ چون باران و خندہ چون برق و دل چون کرسی دماغ چون عرش۔[1]

قاضی نجم الدین بنبانی

"قاضی الشیوخ و شیخ القضاۃ نجم الدین و الحق البنبانی" سفرِ حج پر گئے تو ان کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا اور قاضی صاحب ڈوب گئے۔ جب حضرت شاہ عالمؒ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ ایسے دانشمند محقق اور مدقق کو دریا کا سفر نہیں کرنا چاہئے۔ کہیں صدیوں کے بعد ایسا شخص پیدا ہوتا ہے۔

جامع ملفوظات رقمطراز ہے کہ حضرت نے انہیں سفرِ حج سے منع کیا تھا۔ جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ حج پر جانے کی بجائے وہ یہیں نان، شکر اور روغن غربا میں بانٹ دیں، اس کا بڑا اُجر ملے گا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ وہ اپنی آنکھوں سے بیت اللہ دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کی بڑی خواہش ہے کہ وہ اس کا طواف کریں۔ حضرت نے ان سے کہا کہ وہ دعا کریں کہ خدا تعالیٰ تین روز کے لئے کعبہ انہیں بخش دے تاکہ وہ مع اہل و عیال حج کریں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں دُعا کی مقبولیت پر یقین ہے لیکن وہ عام مسلمانوں کی متابعت کرنا چاہتے ہیں۔

جب قاضی صاحب کسی طرح بھی نہ مانے تو آپ نے فرمایا کہ وہ سفر پر روانہ ہونے سے قبل اپنے داماد مخدوم بڈھا سہروردی سے بھی مل لیں، قاضی صاحب اسے مثلِ فرزند کے سمجھتے تھے۔ اس نے ان کی بڑی تکریم کی لیکن سفرِ حج میں ان کی موت کی پیشین گوئی کر دی۔ مخدوم نے ان سے کہا کہ حضرت شاہ عالمؒ یہ جانتے تھے لیکن انہوں نے حیا کی وجہ سے خود نہیں بتایا اور آپ کو یہاں بھیج دیا ہے۔ قاضی صاحب نے ان سے سوال کیا کہ آیا وہ سفرِ حج سے واپسی پر فوت ہوں گے یا جاتے وقت، اس نے کہا کہ واپسی پر۔ قاضی صاحب بے فکر ہو کر سفرِ حج پر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے حج کیا اور واپسی پر گجرات کی بندرگاہ دیو تک بخیریت پہنچ گئے۔ دیو سے کچھ لوگ خشکی کے راستے احمد آباد کی طرف چل دیئے اور انہوں نے لوگوں میں مشہور کر دیا کہ حضرت شاہ عالمؒ نے تو قاضیؒ موصوف کو موت کی خبر دی تھی لیکن وہ تو زندہ واپس آ رہے ہیں۔ جب یہ بات حضرت تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا "دریا اگر از گفتہ بندھاء خدا تعالیٰ

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۱۳۹ الف۔

بیروں رود، زود خشک گردد۔" چنانچہ جب قاضی صاحب ویو سے جہاز میں سوار ہو کر کھنبائت جا رہے تھے تو راستے میں جہاز ڈوب گیا۔[۱]

رُشد و ہدایت

گجرات میں حضرت شاہ عالمؒ کے اثر و نفوذ کا اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہر جمعہ کو ایک ہزار کے قریب افراد ان سے بیعت ہوا کرتے تھے۔ ربیع الاوّل، رجب اور رمضان میں ان کی تعداد بڑھ کر تین چار ہزار ہو جاتی تھی۔ اسی طرح عاشورہ کے دن بھی قریباً اتنے ہی افراد ان کے ہاتھ پر توبہ کرتے تھے۔ فاضل مرتب نے قریباً ہر مجلس میں کئی کئی ہزار افراد کے بیعت ہونے کا ذکر کیا ہے۔[۲]

مشہور مؤرخ کمساریٹ کی روایت ہے کہ گجرات کے عوام پر حضرت شاہ عالمؒ کا سوشل اثر بہت زیادہ تھا۔[۳] ملفوظات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عالمؒ عوام میں بڑے مقبول تھے۔ لوگ ان کا اور ان کے آباؤ اجداد کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔

تقریباتِ ربیع الاوّل

ربیع الاول میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کے موقعہ پر حضرت شاہ عالمؒ ایک دعوتِ عام کا اہتمام کیا کرتے تھے جس میں بہترین قسم کے کھانے پکائے جاتے تھے۔ اس موقع پر مکلف قالین بچھائے جاتے اور ان پر ریشمی فرش بچھایا جاتا، سنجاب کے تکیے رکھے جاتے اور مخمل و زربفت کے شامیانے لگائے جاتے تھے۔[۴] ملفوظات کے مطالعہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عالمؒ اپنے لئے "مصطفیٰ سر" نامی ایک حوض کے کنارے سرخ خرگاہ لگا کر مجلس منعقد کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں کھانے کے بعد حاضرین میں عطر تقسیم کرنے کا بھی رواج تھا۔[۵]

شاہ عالم اور سلاطینِ گجرات

حضرت شاہ عالمؒ بڑے مضبوط ارادے کے مالک تھے اور ملکی سیاست میں حصہ لیا کرتے تھے۔ سلطان قطب الدین نے انہیں اپنا رُوحانی مشیر بنایا تھا۔ بعد میں سلطان کے ساتھ ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے لیکن وہ انہیں کسی قسم کا گزند نہ پہنچا سکا۔[۶]

---

۱ - ایضاً" ورق ۶۳ ب۔
۲ - ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۵۸ الف۔
۳ - کمساریٹ، تاریخِ گجرات (انگریزی)، مطبوعہ مدراس، ۱۹۳۸ء، ج ۱، ص ۲۰۸۔
۴ - ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۵۸ ب۔
۵ - ایضاً" ورق ۹ ب۔
۶ - کمساریٹ، تاریخِ گجرات، ص ۲۰۸۔

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سلطان مظفر اور اس کے فرزند، سلطان احمد کا والد تاتار خان، ہیبت خان، جلال خان اور محمود خان حضرت شاہ عالمؒ کے پردادا حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے مرید تھے۔ سلطان احمد نے ایک بار حضرت شاہ عالمؒ کی موجودگی میں ان کے والدِ بزرگوار حضرت قطب العالمؒ کے سامنے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا:

جدِّ ما سلطان مظفر پیش حضرت سید الاقطاب مخدوم جہانیاں علیہ الرضوان ایمان آورند و مرید شدند[1]	میرا دادا سلطان مظفر حضرت سید الاقطاب مخدوم جہانیاں علیہ الرحمتہ کے سامنے ایمان لایا اور ان کا مرید ہوا۔

سلطان احمد کو حضرت قطب العالمؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور اس نے ان کی گجرات میں آمد کے موقع پر جو شعر ان کی مدح میں پڑھا تھا، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وہ ان کے علاوہ شیخ احمد کھٹوؒ اور شیخ رکن الدینؒ کا بھی معتقد تھا[2] وہ گجرات کی تاریخ میں اپنی نیکی اور عدل و انصاف کے لئے مشہور ہے۔ راقم الحروف نے خود دیکھا ہے کہ گجرات کے عوام اب تک اس کے مزار کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

حضرت شاہ عالمؒ ابھی سات سال کے تھے کہ ان کے والدِ بزرگوار انہیں اپنے ساتھ سلطان احمد کے پاس لے گئے۔ سید بدر عالم کی روایت ہے کہ اس مجلس میں سلطان نے حضرت شاہ عالمؒ سے پوچھا کہ وہ کیا پڑھتے ہیں؟ حضرت قطب العالمؒ نے ان کی طرف سے جواب دیا کہ یہ ابھی متعلم ہیں۔ سلطان نے ان سے کہا کہ انہیں کہیں کہ کچھ پڑھ کر سنائیں۔ والدِ بزرگوار کے اشارہ پر انہوں نے چار بیت سنائے۔ حضرت شاہ عالمؒ نے اپنے بڑھاپے میں یہ واقعہ حاضرین کو سنایا اور سلطان کو یاد کر کے فرمانے لگے: "زہے نیک بخت مغفور کہ سلطانِ مذکور بود۔"[3]

سلطان محمود بیگڑھ

سلطان محمود ثانی کی وفات کے بعد حضرت شاہ عالمؒ نے اس کی بیوہ بی بی مغلائی، جو ان کی اہلیہ مرحومہ بی بی مرکی کی حقیقی بہن تھیں، کے ساتھ عقد کر لیا۔ بی بی مغلائی کا فرزند سلطان محمود بیگڑھ اس وقت کمسن تھا۔ اس کی تربیت حضرت شاہ عالمؒ نے کی اور اسے اپنے ہاں پناہ دی، ورنہ اس کے شریک اسے ٹھکانے لگا دیتے۔

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۲ ب۔
۲ - گزیٹیر بمبئی پریذیڈنسی، مطبوعہ بمبئی، ۱۸۹۶ء، ج ۱، حصہ ۱، ص ۲۴۰۔
۳ - ملفوظاتِ شاہ عالم، ورق ۲ ب۔

حضرت شاہ عالمؒ کی زندگی ہی میں سلطان محمود اپنے آبائی تخت پر متمکن ہو گیا تھا۔ حضرت نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال اس کے عہد میں گزارے۔ موصوف اس کے مربّی اور محافظ سمجھے جاتے تھے[۱]۔ حضرت شاہ عالمؒ اور ان کے بزرگوں کے ساتھ سلاطینِ گجرات کے تعلقات کو سمجھنے کے لئے سلاطین گجرات کا شجرۂ نسب پیش خدمت ہے۔

۱۔ سلطان مظفر

(۱۳۹۲ء --- ۱۴۱۱ء)

تاتار خاں

۲۔ سلطان احمد

(۱۴۱۱ء --- ۱۴۴۳ء)

۳۔ سلطان محمد اوّل (۱۴۴۳ء -- ۱۴۵۱ء)

۵۔ داؤد شاہ (۱۴۵۸ء -- ۱۴۵۸ء)

۴۔ سلطان قطب الدین (۱۴۵۱ء -- ۱۴۵۸ء)

۶۔ سلطان محمود بیگڑھ (۱۴۵۸ء -- ۱۵۱۱ء)

حضرت شاہ عالمؒ کے زمانے میں گجرات کی حالت

ملفوظات کے مطالعہ سے گجرات کے بارے میں بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ پرتگیز بحری قزّاق تھے اور ان سے بحیرۂ عرب اور خلیج فارس میں کوئی جہاز محفوظ نہیں رہتا تھا۔ پرتگیز ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کی سرکردگی میں پہلی بار جنوبی ہند تک پہنچے تھے، اس لئے ان کی سرگرمیاں اس کے بعد ہی شروع ہوئی تھیں۔ ۱۴۷۶ء میں ایک شخص شیراز سے حضرت شاہ عالمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا کہ راستے میں بحری قزّاقوں نے اس کا مال و اسباب لوٹ لیا ہے اور وہ محض ان کی زیارت کے لئے احمد آباد آیا ہے[۲]۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ پرتگیزوں کی آمد سے قبل جنوبی ہند کے عربی النسل باشندے بھی بحری قزّاقی میں بدنام تھے۔

---

۱ - کمساریٹ، تاریخ گجرات، ص ۲۰۸۔

۲ - ملفوظات شاہ عالم، ورق ۶۴ الف۔

حضرت شاہ عالمؒ کو موضع "رنگ" میں تعدی اور زیادتی کی اطلاع ملی تو آپ نے دو معتبر آدمیوں کے ہاتھ ملک قیصر خان کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ مجرموں کو گرفتار کر لے۔ اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اس نے پانچ مجرم گرفتار کر لئے ہیں۔[1] (یہ سلطان محمود بیگڑھ کے زمانے کا واقعہ ہے)۔

ملفوظات میں کئی بار امساک باراں کا ذکر آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء میں گجرات میں بارش نہیں ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے غلّہ گراں ہو گیا تھا۔

ملفوظات میں ایک موقعہ پر جامع ملفوظات نے "صاع بحساب وزنِ متعارف گجرات" کا ذکر کیا ہے۔ گجرات کا صاع اس زمانے میں "ہفت سیر و سہ رُبع سیر و سہ رُبع رُبع تولچہ و ہفت حصہ از ہشتاد حصہ تولچہ و چہار سبع درہم" کے برابر تھا۔[2]

شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ قریباً ایک سال گجرات میں قیام کر چکے تھے۔ موصوف وہاں کی سرزمین کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں، "درحقیقت دران سرزمین بُوی عشق و محبت می آید و از دیرانہای وی نُورِ برکت و ولایت می تابد۔"[3] یہ بُوئے عشق و محبت اور نُور ولایت حضرت شیخ احمد کھٹو، حضرت قطب العالمؒ، حضرت شاہ عالمؒ اور حضرت وجیہہ الدین علوی گجراتیؒ کے انفاس طیبہ کا نتیجہ تھا۔

حضرت شاہ عالمؒ کی وفات

حضرت شاہ عالمؒ نے ۲۰ جمادی الثانی ۸۸۰ھ / ۲۲ اکتوبر ۱۴۷۵ء کو تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ شیخ عبدالحق محدثؒ نے "فخر" سے اور عبداللہ خویشگی نے "شمعِ عشق" سے تاریخ نکالی ہے۔[4]

اولادِ امجاد

حضرت شاہ عالمؒ نے تین نکاح کئے تھے اور ان کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ علی محمد خاں نے اس ترتیب کے ساتھ ان کے نام گنوائے ہیں۔ شاہ راجو، سید بڈھن، سید شیخ محمد، بی بی راجی، بی بی امتہ اللہ، سیّد بیگ محمد، بی بی امان، بی بی منجھلی اور سیّد سلطان محمد۔[5] حضرت

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۲ الف۔

۲ - ایضاً" ورق ۹۵ ب --- "۷ سیر + ۳/۴ سیر + ۳/۴ ، ۳/۴ تولہ + ۷/۸۰ ، ۴/۷ درہم= ۱ صاع گجرات۔"

۳ - عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی، ۱۳۳۲ھ، ص ۱۶۳۔

۴ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۵۰۹ الف۔

۵ - علی محمد خان، مرآتِ احمدی، ص ۳۸۔

شاہ عالمؒ کی اولاد ساداتِ شاہیہ کہلاتی ہے اور ان کے دوسرے بھائیوں کی اولاد ساداتِ تقیہ کے نام سے مشہور ہے۔

جانشینی

حضرت شاہ عالمؒ کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے شاہ راجو مسند نشین ہوئے۔ جامع ملفوظات سید بدر عالم ان ہی کی نسل سے ہیں۔

درگاہ

حضرت شاہ عالمؒ کی درگاہ رسول پورہ (احمد آباد) میں ہے۔ مزار کی عمارت سلطان محمود بیگڑھ کے ایک امیر تاج خان کی تعمیر کردہ ہے۔ مزار سے ملحقہ مسجد محمد صالح بدخشی کی بنوائی ہوئی ہے اور اس کے منارے نجابت خان کی یادگار ہیں۔ خانقاہ اور رباط کی عمارتیں سلطان محمود شہید کی شاہ صاحب سے عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ خانقاہ کی عمارت میں سیف خان نے بھی کافی اضافہ کیا تھا[1] جہانگیر کے عہد میں آصف خان نے حضرت شاہ عالمؒ کے مقبرہ پر خوبصورت پتھر لگوائے اور عمارت پر سنہری کام کروایا[2]

مسجد کے مناروں کو ۱۸۱۹ء کے زلزلہ میں کافی نقصان پہنچا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں ان کی مرمت کرائی گئی[3] مسجد کے جنوب میں ایک گنبد کے نیچے حضرت شاہ عالمؒ کے خاندان کے بہت سے افراد دفن ہیں[4]

جس زمانے میں کمساریٹ نے تاریخ گجرات لکھی تو اس زمانے میں حضرت شاہ عالمؒ کے عرس کے موقع پر اندازاً" پچاس ہزار کا مجمع ہو جاتا تھا[5] شیخ عبدالحق محدثؒ احمد آباد میں رہ چکے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ جمعرات کو لوگ بکثرت ان کے مزار پر جاتے ہیں[6] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے احمد آباد کی تاریخی عمارتوں پر ایک کتاب شائع کی تھی' اس میں حضرت شاہ عالمؒ کے روضہ کی تصویر موجود ہے۔ ابھی حال ہی میں Christian W. Troll نے Muslim Shrines in India کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں حضرت شاہ عالمؒ کے مزار کی تصویر شائع کی ہے۔ ان کا مزار کسی بادشاہ کا مقبرہ معلوم ہوتا ہے۔

✪✪✪

---

۱ - ایضاً"-

۲ - گزیٹیر بمبئی پریذیڈنسی' مطبوعہ بمبئی' ۱۸۷۹ء' ج ۴ ص ۲۸۶-

۳ - ایضاً"-

۴ - ایضاً"-

۵ - کمساریٹ' تاریخ گجرات' ج ۱ ص ۲۰۹-

۶ - عبدالحق محدث' اخبار الاخیار' ص ۱۶۲-

ملفوظات حضرت اَخی جمشید رَا جگیریؒ

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملفوظاتِ حضرت اَخی جمشید را جگیریؒ" کے عنوان سے ایک نادر مخطوط محفوظ ہے[1] اس کا کوئی دوسرا نسخہ فی الحال میرے علم میں نہیں ہے۔ اس مخطوط کے مطالعہ سے حضرت اَخی جمشید را جگیریؒ کی تعلیمات کے علاوہ اس عہد کے معاشی اور سماجی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

صاحبِ ملفوظات

حضرت اَخی جمشید نسلاً بنی اسرائیلی تھے۔ ان کے جدِّ امجد قاضی قُدوۃ الدین المعروف بہ قاضی قدُوہ فتح دہلی کے جلد بعد ہندوستان تشریف لائے۔ سلطانِ دہلی نے انہیں اودھ میں جاگیر عطاً فرمائی اور وہیں ان کی اولاد بڑھی اور پھیلی۔

حضرت اَخی جمشیدؒ دریا باد (ضلع بارہ بنکی) کے ایک نواحی گاؤں زہر میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں جذبۂ عشقِ الٰہی سے مغلوب ہو کر انہوں نے فقیری اختیار کر لی اور حضرت مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدین جہاں گشت بخاریؒ (م ۱۳۸۴ء) کے مرید ہو گئے۔ مخدوم صاحبؒ نے تربیت کے بعد انہیں خلافت دے کر قنوج بھیجا لیکن وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی۔ اس لئے موصوف وہاں کی سکونت ترک کر کے را جگیر تشریف لے گئے۔ ان کے کسی مدّاح نے ان کی نقلِ مکانی کا ذکر اس شعر میں کیا ہے:

تا ز قنوج آمدی در را جگیر
گشتہ شیدائی تو ہر برنا و پیر

حضرت اخی جمشیدؒ کی بقیہ زندگی را جگیر میں سالکوں کی تربیت میں گزری۔ ان کا انتقال بروز بدھ ۱۱ شوال ۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء کو ہوا۔ عبداللہ خویشگی اور مفتی غلام سرور لاہوری دونوں سے روایت ہے کہ ان کی وفات ایک روز قبل منگل کے دن ہوئی تو ان کی ایک پرانی ملازمہ رونے لگی۔ اس پر موصوف اٹھ بیٹھے اور ملازمہ سے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اتنے

---

۱ - یونیورسٹی کلکشن نمبر ۴ / ۶۶' فارسیہ مذہب و تصوف۔

بڑے ولی اللہ ہو کر منگل کے منحوس دن فوت ہوئے ہیں۔ اس پر حضرت اخی نے فرمایا کہ یہ دن نجس ہے تو موصوف کل فوت ہوں گے۔ اخی جمشیدؒ کا مزار بدھوں کے قدیم علمی مرکز نالندہ کے قریب بہار شریف کے نواح میں واقع ہے۔

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات یحییٰ بن علی الاصغر بن عثمان الحسینی قنوج کا رہنے والا تھا۔ اس نے بچپن ہی میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی مریدی کا شرف حاصل کیا۔

اس نے ملفوظات کے متن میں اپنے متعلق یہ لکھا ہے کہ اس نے چودہ سال کی عمر تک "بہت کچھ" حاصل کر لیا تھا۔

سید یحییٰ نے اپنے مرشدِ گرامی قدر حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے بارے میں "مشاغلِ جلالی و مشاغلِ متلالی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا ہنوز سراغ نہیں ملا۔[۱]

جامع ملفوظات مورخہ ۱۴ جمادی الاول ۷۹۴ھ / ۱۳۹۱ء کو نمازِ جمعہ کے بعد حضرت اخی جمشیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسی روز سے ان کے ملفوظات جمع کرنے لگا۔

حضرت اخی جمشیدؒ ۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء میں فوت ہوئے۔ اس لئے ملفوظات جمع کرنے کا آغاز ان کی وفات سے سات سال قبل ہوا۔ لہٰذا ان ملفوظات کو ان کی آخری عمر کا حاصل سمجھنا چاہیے۔

جامع ملفوظات عربی و فارسی کا جید عالم تھا۔ راقم الحروف نے برِعظیم پاک و ہند کے بہت سے مشائخ کے ملفوظات کا مطالعہ کیا ہے، لیکن ایسی مقفع و مسجع اور ادق عبارت آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔ سید یحییٰ کی یہ تحریر ملاحظہ فرمائیے:

"درویشِ بیہوشی عاشق فرد صاحبِ درد آبِ حیات معرفت گوہرِ دریا محبت چشمہ حکم الٰہی کوثر شرابِ ناتناہی ہمای کوہسار عشق سیمرغ ہوای صدق ناظر تجلّیاتِ سبحانی بحشم دل ماہی تخیلات نفسانی بچشم کل ضابطۂ ممالک ذوق مستوعبِ اقالیم شوق افروزندہ۔"[۳]

سید یحییٰ نے ملفوظات میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا ذکرِ خیر ان الفاظ میں کیا ہے:

---

۱ - (i) عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، نمبر ۲۵ - ۱۱، ورق ۱۰۵ ب۔

(ii) مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء مطبوعہ کانپور ۱۹۱۴ء ج ۲، ص ۴۳۔

۲ - ملفوظاتِ اخی جمشید راجگیری، ورق ۲ ب۔

۳ - ایضاً، ورق ۳ ب۔

حضرت بندگی سیّد السادات معدن الخیر و الحسنات منبع العلم و الحکم محاسن الفضل و الکرم مظہر کلمۃ اللہ العلیا قدوۃ الاصفیاء والاتقیاء مصباح الاطیبۃ تاج الہاشمیہ ملجاء الضعفاء ومؤید الفقراء قطب اقطاب عالم مخدوم جہانیاں شیخ جلال الحق و الشرع والدین نور اللہ مجہ بانوار افضالہ[1]

جامع ملفوظات شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ایک ایک ورق پر کئی کئی ابیات درج کی ہیں۔ دو موقعوں پر اس نے پوری پوری غزل نقل کر دی ہے۔ اسے عربی عبارتوں کا منظوم ترجمہ کرنے پر دسترس تھی۔کئی مواقع پر سید یحییٰ نے عبارات کا مطلب واضح کرنے کے لئے اشعار نقل کئے ہیں۔ یہ اشعار حضرت اخیؒ نے ارشاد نہیں فرمائے بلکہ ان کا اضافہ جامع ملفوظات نے "زیبِ داستاں" کے طور پر کیا ہے۔

حضرت اخی جمشیدؒ کے ملفوظات بڑے خشک ہیں۔ ان میں قصے کہانیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اکثر مقامات پر حضرت اخیؒ نے آیاتِ قرآنی کی تشریح بھی فرمائی ہے اور احادیث بھی نقل کی ہیں۔

ملفوظات میں 'الکشاف' تذکرۃ اولیاء، نوادر الاصول الترمذیؒ، مسند احمد ابن حنبلؒ، قوت القلوب' تاج الاسامی' کبریٰ' بیانِ احکام' روضہ' تنبیہ (مصنفہ ابو اللیث سمرقندیؒ) تفسیر درر، ترغیب الصلوٰۃ، دبستان (مصنف ابواللیث سمرقندیؒ)، صحو، مسعودی اور مثنوی معنوی کے حوالے ملتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابیں حضرت اخیؒ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ حضرت اخیؒ کے ملفوظات میں رومیؒ کے اشعار بھی عام ملتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں برّعظیم پاک و ہند میں مثنوی معنوی مقبول ہو چکی تھی۔

حضرت اخیؒ کے ملفوظات میں عشق کا ذکر بار بار آتا ہے۔ انہوں نے ایک موقع پر "سلطان عشق" کی اصطلاح بھی استعمال فرمائی ہے۔ حضرت اخیؒ نے ایک موقع پر مجنوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

مجنون العامری حُجّۃ اللہ علی المشتاقین[2]

ملفوظات میں ہندی دوہڑے بکثرت ملتے ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت اخیؒ اور جامع ملفوظات کو ہندی زبان پر عبور کامل تھا۔

سید یحییٰ رقمطراز ہے کہ ایک روز وہ عمدہ قسم کا لباس پہن کر حضرت اخیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس پر تیز نظر ڈالی اور فرمایا: جو شخص شاندار کپڑے اور عمدہ لباس سے اپنے بدن کے محل کو آراستہ کرتا ہے، وہ بیکار اور برہنہ روح کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" سید یحییٰ لکھتا ہے کہ وہ لباسِ فاخرہ ترک کر کے "زمرۂ گرد آلوداں" میں شامل ہو گیا ہے[3]

---

۱ - ایضاً" ورق ۲ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۸۹ ب۔
۳ - ایضاً" ورق ۸ ب۔

ملفوظات

ملفوظات کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے: "محامد متمدہ حضرت علیمی را کہ معتکفانِ صوامعہ عرش مجید و متخیلیان زوایا سدرہ مشید از احاطب نوع من علمہ..."

زہے اکل

حضرت اخی جمشیدؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ جو حضرت اخی کے دادا مرشد تھے' کھانا تناول فرما رہے تھے' اتفاق سے وہاں بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے ایک معمرؒ مرید بھی تشریف فرما تھے۔ اس بزرگ نے کہا کہ خدا کے ایسے بندے بھی ہیں جو اس وقت تک نماز کی نیت نہیں کرتے جب تک خدا کو نہ دیکھ لیں۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ وہ صحیح کہتے ہیں' لیکن ایسے بندے بھی موجود ہیں جو اس وقت تک مُنہ میں لقمہ نہیں ڈالتے جب تک رازق کو نہ دیکھ لیں۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت اخیؒ نے فرمایا:

سبحان اللہ زہی اکل [1]

روزِ جزاء کے شاہد

حضرت اخی جمشیدؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن فاسقوں اور کافروں کی زبانیں' ہاتھ اور پاؤں ان کے فسق و کفر پر گواہی دیں گے۔ اسی طرح خدا کے عاشقوں کے چہروں کی زردی اور راتوں کو خدا کی یاد میں آنکھوں سے بہنے والے آنسو ان کے احوال کی گواہی دیں گے [2]

نعمتِ الٰہی

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ خدا کے دوست کہلانے کے وہی لوگ مستحق ہیں جو مصیبت میں لذت محسوس کریں۔ مصیبت خدا کی طرف سے نعمت ہوتی ہے اور جو اس پر شکر ادا کرتا ہے' خدا اس کے عشق میں اضافہ کر دیتا ہے [3]

ثواب و عذاب

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد رُوح اور جسم دونوں کو عذاب ہوتا ہے کیونکہ خیر و شر ان دونوں سے صادر ہوتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ نیکیاں رُوح سے صادر ہوتی

---

۱ - ایضاً" ورق ۸۵ الف۔

۲ - ایضاً" ورق ۸۰ الف۔

۳ - ایضاً" ورق ۸۱ الف۔

ہیں اور گناہ جسم سے۔اس کی مثال یوں ہے جیسے ایک لنگڑا اور اندھا باغ میں داخل ہوئے۔ دونوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ پھل توڑ کر کھائیں لیکن دونوں یہ کام انجام دینے سے قاصر تھے۔ ان دونوں نے مل کر پھل توڑنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اندھے نے لنگڑے کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور اس نے پھل توڑ لئے۔ اس طرح دونوں گناہ میں شریک ہو گئے۔ حضرت اخیؒ نے یہ مثال دے کر دل کو اندھے سے تشبیہ دی[1]

نمازِ قلبی

حضرت اخیؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ مسجد بیت اللہ، بیت المعمور اور عرش پر نماز ادا کرنے سے درجے بلند ہوتے ہیں لیکن دل کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے کیا کہنے؟ یہ نماز راز بھی ہو گی اور ناز بھی، اس میں جمال بھی ہو گا اور مشہور حضرت متعال بھی[2]

امراضِ باطن

حضرت اخیؒ نے ایک روز حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جسمانی امراض دوا اور معجون کے استعمال سے جاتے رہتے ہیں، لیکن باطنی امراض صرف اللہ کے فضل سے ہی جاتے ہیں۔ کسی شخص نے باطنی امراض کی وضاحت چاہی تو حضرت نے فرمایا کہ شک اور نفاق، باطنی امراض میں شامل ہیں[3]

چراغِ دہلیؒ

ایک زمانے میں حضرت اخیؒ فیروز آباد میں "بازارِ چوب" کے قریب رہتے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات ملک عبداللہ نام کے ایک زاہد مرتاض سے تھی۔ وہ حضرت چراغ دہلیؒ کا صحبت یافتہ تھا۔ وہ اکثر ان کے واقعات حضرت اخیؒ کو سنایا کرتا تھا۔ ایک دن جامع ملفوظات کی موجودگی میں اس نے حضرت اخیؒ کو بتایا کہ اس نے ایک بار چراغِ دہلیؒ کو اس حال میں دیکھا کہ ان پر سُکر غالب تھا اور موصوف سجادہ پر سر رکھ کر بار بار اس رُباعی کی تکرار کرتے تھے۔

۱- ایضاً" ورق ۴۷ ب۔
۲- ایضاً" ورق ۴ ب۔
۳- ایضاً" ورق ۸ ب۔

"اے قامت تو دراز جعد بشکست
و آن نرگس پُر خمار بی می مست
فردا بکلیسا روم و ناہنی
ناقوس بدستی و بی دینی دست"[1]

شیخ الشیوخؒ کی وصیت

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے یہ وصیت فرمائی تھی:

یا بنی ارجع الی القرآن فی جمیع الاحکام و لاتعدل عن العلم خطوۃ و تعلم الفقہ ولاتکن من جہال الصوفیۃ و عوامہم و قراء الاسواق فانہم لصوص الدین و قطاع الطریق علی المسلمین[2]

اے بیٹا! تمام امور میں قرآن کی طرف رجوع کرنا اور علم سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹنا۔ فقہ پڑھنا اور جاہل یا عام صوفی یا بازاری قاری نہ بن جانا۔ یہ لوگ دین کے چور اور مسلمانوں کے رہزن ہیں۔

بو علی قلندرؒ

حضرت اخیؒ نے ایک موقع پر حضرت بُو علی قلندرؒ کو ان الفاظ سے یاد فرمایا ہے:

شیخنا شیخ العاشقین شیخ شرف الدین پانی پتی[3]

لصوصِ دین

جامع ملفوظات رقمطراز ہے کہ ایک دن اس کی موجودگی میں قنوج کا کوتوال حضرت اخیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ وہ رات کو گشت کر کے چوروں، عیاروں اور ڈاکوؤں کو پکڑتا ہے کیونکہ وہ درم و دینار اور اسباب قلیل لے جاتے ہیں۔ وہ اس معمولی سے جرم کی پاداش میں انہیں سُولی پر لٹکانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ وہ ان چوروں سے تعرض نہیں کرتا جو خدا کی عبادت میں چوری کرتے ہیں اور آخرت کو دنیا کے بدلے فروخت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی اس کی گرفت سے بچ جاتے ہیں جو شیخی کے پردے میں

۱- ایضاً" ورق ۴ ب۔
۲- ایضاً" ورق ۱۰۹ ب۔
۳- ایضاً" ۱۰ ب۔

مسلمانوں کو لوٹتے ہیں اور گلیوں بازاروں میں در بدر پھر کر لذتِ نفسانی اور خواہشِ شہوانی تلاش کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت اخیؒ نے فرمایا: "ہم بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔"[۱]

مخدوم جہانیاںؒ کی کسرِ نفسی

حضرت اخیؒ نے ایک روز اپنا چشم دید واقعہ حاضرین مجلس کی موجودگی میں جامع ملفوظات کو سنایا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک اجنبی حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ موصوف حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے قائم مقام ہیں اور وہ "لقمۂ بازار" ہے اس لئے اس کے حال پر توجہ فرمائیں۔ اس نے یہ بھی عرض کیا کہ ایک بار مقطع ملتان نے ایک خانقاہ تعمیر کروائی جس میں بہت سے حجرے تھے۔ ایک دن وہ حضرت زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ اس کی تعمیر کردہ خانقاہ سُونی پڑی ہے' اسے آباد کریں۔ حضرت زکریاؒ نے فرمایا کہ ہر روز بازار سے ایک کتا پکڑ لاؤ اور ان کی نظروں سے گزار کر اسے خانقاہ میں بھیج دو۔ کچھ عرصہ بعد وہ خانقاہ پُر ہو گئی۔ اس اجنبی کی بات سن کر حضرت مخدوم جہانیاں نے فرمایا "اے عزیز ان کتوں میں ایک میں بھی تھا۔"[۲]

حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی دعا

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ حج کو جاتے ہوئے ایک شہر سے گزرے تو اس شہر کے باشندے بڑی تعداد میں ان کی زیارت کو آئے۔ حضرت زکریاؒ نے اپنے نور باطن سے ان کے ماتھوں پر "داغِ شقاوت" دیکھا۔ حضرت نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس شقاوت کو سعادت سے بدل دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا "میں نے تمہارے اس شہر میں آنے کی برکت سے شقاوت کو سعادت میں بدل دیا۔"[۳]

چور کی بخشش

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ ایک رات ایک چور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا اور وہاں پر موجود سامان سمیٹ کر چلتا بنا۔ حضرت اس کی یہ حرکت دیکھتے رہے لیکن اسے کچھ نہ کہا۔ کچھ عرصہ بعد وہ چور مرگیا۔ ایک شب حضرت نظام الدینؒ نے خواب میں اسے دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ اس نے کہا کہ خدا نے اسے بخش

۱ - ایضاً" ورق ۴۰ الف- وکیے از آ نطائفہ مائیم۔
۲ - ایضاً" ورق ۵۷ ب-
۳ - ایضاً" ورق ۴۳ ب' ۴۴ الف-

دیا ہے۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا: "ظاہری طور پر تو تُو بخشش کے لائق نہ تھا' پھر یہ بخشش کیسے ہو گئی؟" چور نے کہا کہ جب اسے "کرسیٔ قضاء" کے سامنے پیش کیا گیا تو خدا نے فرمایا: "یہ چور نہیں بلکہ جاروب کش ہے۔ اس نے ہمارے دوست کے گھر سے مُردار باہر نکال پھینکا ہے' اس لئے یہ لائقِ قرب ہے' مستوجبِ عقوبت نہیں۔ اس لئے ہم نے اسے بخش دیا ہے۔"[۱]

عطیۂ مرشد کا احترام

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پاس شلوار نہ تھی۔ بابا فریدؒ نے انہیں ایک شلوار مرحمت فرمائی۔ حضرت نظام الدینؒ نے اسے اپنے سر پر باندھ لیا کہ یہ پیر کا دیا ہوا لباس ہے۔ بابا صاحب نے شلوار سر پر باندھی ہوئی دیکھی تو فرمایا:

وضع الشی علی غیر محلہ ظلم

میں نے تو یہ شلوار تمہیں حفظِ نفس اور سترِ عورت کے لئے دی تھی تاکہ تو اسے پہن کر لوگوں کے سامنے جائے۔ حضرت نظام الدینؒ نے عرض کیا کہ انہوں نے آزار بند کس کر باندھا ہوا ہے۔ اس سے ان کی یہ مراد تھی کہ وہ اسے دنیا میں ہرگز نہ کھولیں گے۔ بابا صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ کس کر باندھ لو۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا:

"چنان بستم کہ بر حورانِ بہشت ہم نکشادم"[۲]

رُوح کی جلا

حضرت اخیؒ جمشید فرماتے ہیں کہ جب تک تزکیۂ نفس حاصل نہ ہو اس وقت تک تصفیۂ دل نہیں ہوتا اور جب تک دل مصفّا نہ ہو اس وقت تک رُوح کو جِلا نہیں ملتی۔[۳]

سلام کرنے کے آداب

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ حمام میں کسی شخص کو سلام نہ کریں اور اسی طرح بیگانی عورت اور مرد کو بھی سلام نہ کریں۔ ملفوظات میں تین ورقوں پر سلام کے آداب مرقوم ہیں۔[۴]

۱- ایضاً" ورق ۱۰ الف' ۱۰ ب۔

۲- ایضاً" ورق ۵۷ الف۔

۳- ایضاً" ورق ۸ ب۔

۴- ایضاً" ورق ۳۶ ب۔

درویشی میں وراثت نہیں

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شیخ کے سات بیٹے تھے جو نماز' روزہ اور زکوٰۃ کے پابند اور حلم، علم، تواضع اور خُلق جیسی صفات سے متصف تھے۔ ہرچند وہ عبادت میں مشغول رہتے' لیکن عشقِ الٰہی سے خالی تھے۔ جب شیخ کا وقت آخر آیا تو بیٹوں نے پوچھا کہ اس کا سجادہ کس فرزند کے حصے میں آئے گا؟ شیخ نے کہا:

ما اُمینانِ حضرت الٰہیم اگر کسے شایانِ آن نبا شد و ما ازو نگاہداریم خائن باشیم و از دوستانِ خدا نباشیم۔ قولہ تعالیٰ انّ اللہ لا یحبّ الخائنین۔ (ہم اللہ تعالیٰ کی امانت کے امین ہیں۔ اگر کوئی اس کا اہل نہ ہو اور ہم اسے امانت سونپ دیں تو خیانت کے مُرتکب ہوں گے اور خدا کے دوستوں میں شمار نہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا)۔

شیخ نے ان سے کہا کہ اس شہر میں ایک ہندو غلام ہے' جو آبکاری کا کام کرتا ہے' اسے خرید کر اس کے پاس لائیں۔ وہ اسے مشرف باسلام کر کے اپنے سجادہ پر بٹھائے گا۔ بیٹے اس پر ناراض ہوئے تو باپ نے ان سے کہا کہ سجادہ میراث نہیں ہے۔ اگر کوئی باپ مرتے وقت مال و دولت چھوڑے تو بیٹے اس کے وارث ہوتے ہیں لیکن "کارِ عشق و محبت" میراث نہیں ہوتا۔

الغرض وہ اس غلام کو خرید کر اپنے باپ کے پاس لائے۔ شیخ کی نظر پڑتے ہی اس کا وجود جو مسِ خام تھا زرِ خالص بن گیا۔ شیخ نے اسے کلمۂ طیبہ پڑھا کر اپنے سجادہ پر بٹھا دیا۔

شیخ کی وفات کے بعد ایک روز شیخ زادوں نے اس سے پوچھا کہ وہ تو اُمّیِ محض ہے۔ پھر وہ علومِ ظاہری اور باطنی کے نکات کس طرح بیان کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ شیخ کی نظر پڑتے ہی اس کی نظریں لوحِ محفوظ پر جا لگیں اور اس نے سب کچھ وہیں سے حفظ کر لیا۔ شیخ نے جب کلمہ پڑھایا تو اس پر ظاہر و باطن کے حقائق منکشف ہو گئے۔ جب اس کا ہاتھ پکڑ کر مَسند پر بٹھایا تو ذوق و شوق پیدا ہو گیا۔ اب اس میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔[1]

زُنّار کی حقیقت

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت رُکن الدین ملتانیؒ نے مخدوم جہانیاںؒ کو پیاگ (پریاگ؟) بھیجا۔ جب موصوف وہاں پہنچے تو انھوں نے ایک بُت خانے میں ایک زنّار دار کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ مخدوم نے اسے سلام کیا اور اس سے پوچھا کہ یہ زُنّار کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ یہ زُنّار طریقت حق کے سالکوں کا سلک ہے اور اس نے اسے اسیر بنایا ہوا ہے۔[2]

۱۔ "ایضاً" ورق ۵۹ ب۔

۲۔ "ایضاً" ورق ۶۴ ب۔

حضرت اخی جمشیدؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت بایزید بسطامیؒ بازار سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک جگہ زنار بکتے دیکھے۔ انہیں بھی زنار پہننے کا شوق چرایا۔ انہوں نے دکاندار سے قیمت پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کی کم سے کم قیمت "دنیا و مافیہا" ہے۔ حضرت بسطامیؒ نے پوچھا کہ زیادہ سے زیادہ اس کی بھلا کیا قیمت ہو گی؟ اس نے کہا:

آنچہ دونِ حق است باید داد و زنارِ عشق و محبتِ باری تعالٰی جل و علاء کہ قلادۂ عشق عاشقانست می باید خرید۔[1]

جو کچھ بھی اللہ کے علاوہ ہے وہ دے دے اور اللہ کے عشق و محبت کا زنار جو عاشقوں کا پٹہ ہے، خرید لے۔

سماع کا جواز

حضرت اخی جمشیدؒ سماع کے قائل تھے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ایک بار لوگوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اہلِ مدینہ سماع کو مباح سمجھتے ہیں یا ناجائز؟ انہوں نے جواب دیا کہ اہلِ حجاز سماع کو حرام یا مکروہ نہیں کہتے مگر ایسے کلام کو جائز نہیں سمجھتے جس میں اجنبی عورتوں کی تعریف کی گئی ہو۔[2]

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت اخیؒ سماع کی اباحت کے بھی قائل تھے اور انہوں نے اس کی تائید میں مُسند احمدؒ کے حوالے سے ایک "حدیث" نقل کی ہے۔ موصوف اس موضوع پر لمبی چوڑی بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے بزرگوں نے سماع میں رقص کیا ہے اور اگر اس فعل کو حرام کہیں تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ سب بزرگ حرام فعل کے مرتکب ہوئے ہیں۔[3]

حضرت اخیؒ فرمایا کرتے تھے کہ سماع سننی جائز ہے، لیکن اسے عادت بنا لینا مناسب نہیں ہے۔[4]

ہندوی الفاظ

حضرت اخیؒ فرماتے ہیں کہ قصبہ بنگر مئو میں شیخ عبدالعزیز کے سامنے ایک بچہ اللہ تعالٰی کے ننانوے نام پڑھ رہا تھا۔ جب وہ الاوّل و الآخر و الظاہر و الباطن تک پہنچا، تو خاموش ہو گیا۔ شیخ نے دیکھا کہ اس بچے کے دل پر اثر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس بچے کے دل میں جوش پیدا ہوا اور اس نے ہندوی زبان میں کہا:

تھا تھا تھا، ہے ہے ہے، ہو ہو ہو

---

۱ - ایضاً" ورق ۶۳ الف۔ ۲ - ایضاً" ورق ۳۰ ب۔

۳ - ایضاً" ورق ۳۴ ب۔ ۴ - ایضاً" ورق ۳۱ الف۔

ادھر یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے اور ادھر وہ جان بحق تسلیم ہوا[1]

ملفوظات میں ہندی دوہڑوں کے علاوہ بھی "ہندوی زبان" کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک موقع پر "چوکھنڈی" کا ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام کے ہاں عام فارسی بول چال میں ہندی الفاظ بلاتکلف استعمال ہوتے تھے۔ اس سے ہمارے اس دعویٰ کو تقویت ملتی ہے کہ اُردو زبان کی ابتداء خانقاہوں میں ہوئی ہے جہاں ہر طرح کے لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت بزرگوں سے ملنے آتے تھے۔

✪✪✪

---

۱ ۔ ایضاً" ورق ۷۰ الف' ۷۰ ب۔

ملفوظاتِ شاہ مینا لکھنویؒ

حضرت مخدوم شاہ میناؒ لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات کا ایک مطبوعہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب گزشتہ صدی کے اواخر میں مطبع مرقع عالم ہردوئی میں طبع ہوئی تھی اور اب اس کے مطبوعہ نسخے نایاب ہو چکے ہیں۔ اسی طرح "مناقبِ شاہ مینا" کے عنوان سے ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' کلکتہ میں محفوظ ہے[1] اور یہ ایک علم دوست بزرگ کی سعی و کاوش سے ۱۹۰۰ء میں ہردوئی سے طبع ہو چکا ہے۔[2]

شاہ مینا کے ملفوظات ان کے ایک مرید اور خلیفہ میر سید محی الدین بن حسین رضوی ساکن امیٹھی نے جمع کئے تھے۔ انہوں نے ملفوظات میں شاہ صاحب سے خلافت پانے کا ذکر کیا ہے۔[3] ان ملفوظات سے شاہ مینا کے معمولات' ان کی تعلیمات اور اس عہد کے معاشرے پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ملفوظات میں جا بجا اونچے پایہ کی علمی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں' جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی بڑے عالم اور پابند شریعت بزرگ کے ملفوظات ہیں۔

نام و نسب

ملفوظات کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شاہ مینا کا نام شیخ محمد بن شیخ قطبؒ تھا اور موصوف حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد سے تھے۔ عبداللہ خویشگی لکھتے ہیں کہ مینا عزت کا لقب ہے اور جس طرح پنجاب میں کسی کو میاں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں اودھ میں مینا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔[4] عین ممکن ہے کہ مینا میاں ہی کا مخفف ہو۔

وطنِ مالوف

شاہ مینا کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والدِ بزرگوار شیخ قطب' امیر تیمور کے حملے سے قبل دہلی سے ترکِ سکونت کر کے جونپور چلے گئے۔ جونپور اس زمانے میں

---

۱ - یونس' فہرست مخطوطات فارسی' ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' کلکتہ' مخطوط' نمبر ۷۔

۲ - ملفوظات شاہ مینا' ص ۲۸۔

۳ - ایضاً' ص ۳۔

۴ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری' ۲۵ - H' ورق ۲۳۶ الف۔

شاہان شرقی کا پایہ تخت تھا اور وہاں علماء و فضلاء کی کمی نہ تھی۔ اس کے باوجود شیخ قطب کی طبیعت جونپور سے اچاٹ ہو گئی اور موصوف دلمو چلے گئے۔[۱] کچھ عرصہ بعد انہوں نے دوبارہ رخت سفر باندھا اور دلمو سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ میں جا بسے۔

جس زمانے میں شیخ قطب لکھنؤ پہنچے ان دنوں وہاں شیخ قوام الدینؒ کے زہد و ورع کا بڑا شہرہ تھا۔ موصوف ان کی خدمت میں پہنچے اور پھر انہی کے ہو کر رہ گئے۔ شیخ قطب ابھی تک مجرد تھے۔ حضرت قوام الدینؒ کے حکم سے انہوں نے شادی کر لی۔ حضرت نے انہیں بشارت دی کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا جو چشتیہ سلسلے کا نام روشن کرے گا۔

شاہ میناؒ کی ولادت

جامع ملفوظات میر سید محی الدین رضوی لکھتے ہیں کہ شیخ قوام الدینؒ کا فرزند نظام الدین سرکاری ملازم تھا اور سلطان محمد بن فیروز تغلق (۱۳۹۲ء۔ ۱۳۸۹ء) نے اسے علم و نقارہ عطا کیا تھا۔ ایک روز وہ گھوڑے پر سوار نقارہ بجاتے ہوئے اپنے والد بزرگوار کے جماعت خانے میں داخل ہوا تو شیخ قوام الدینؒ نے غصے کے عالم میں فرمایا:

"اے نا برخوردار برفرشِ قوام الدین اسپ کجا؟"[۲]

چند روز بعد نظام الدین شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا تو اس کی والدہ اپنے خاوند سے ناراض ہوئیں کہ ان کی بددعا ہی سے ان کا اکلوتا بیٹا ہلاک ہوا ہے۔

حضرت قوام الدینؒ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا:

از خدا خواستہ ام کہ ترا فرزند شود شیخ محمد مینا نام بجای پسرمن، حکم نعم البدل داشتہ باشد۔[۳]

میں نے اپنے بیٹے کی جگہ خدا سے تمہارے لئے بیٹے کی دعا کی ہے۔ اس کا نام شیخ محمد مینا ہو گا اور وہ (نظام الدین کا) نعم البدل ہو گا۔

شاہ مینا ۸۰۰ھ / ۱۳۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت شیخ قوام الدینؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی وفات سے قبل اپنی اہلیہ کو وصیت کی تھی کہ وہ شاہ میناؒ کو اپنا دودھ پلائیں۔ جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ موصوفہ کا دودھ چالیس برس قبل خشک ہو چکا تھا۔ جب شاہ

۱۔ دلمو، کانپور۔ اناؤ۔ رائے بریلی ریلوے لائن پر کانپور سے ۹۹ کلو میٹر اور رائے بریلی سے ۴۹ کلو میٹر کے فاصلے پر اودھ کا ایک مشہور قصبہ ہے۔

۲۔ ملفوظات شاہ مینا، ص ۳۔

۳۔ عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۱۸۴ ب۔

مینا پیدا ہوئے تو دودھ دوبارہ جاری ہو گیا۔[1]

تعلیم و تربیت

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب شاہ مینا لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئے تو شیخ قوام الدینؒ کے ایک مرید قاضی فریدوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ قاضی فریدوں نے انہیں کافیہ پڑھایا اور باقی ضروری علوم انہوں نے قاضی منتجب الدین سے پڑھے۔ شاہ مینا نے عوارف المعارف کے چند اسباق شیخ اعظم ثانی سے پڑھے۔ علوم ظاہری سے فراغت کے بعد موصوف شیخ قوام الدینؒ کے خلیفہ حضرت شیخ سارنگ رحمتہ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ ان دونوں بزرگوں کے بارے میں ملفوظات میں کافی مواد موجود ہے۔

شیخ قوام الدینؒ

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف اخبار الاخیار میں شیخ قوام الدینؒ کا ذکر صرف ڈیڑھ سطر میں کیا ہے[2] عبداللہ خویشگی نے بھی معارج الولایت میں ان کے لئے صرف ایک صفحہ وقف کیا ہے لیکن اس میں بھی کام کی باتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ملفوظاتِ شاہ مینا میں شیخ قوام الدینؒ کا ذکر خیر بار بار آیا ہے۔

شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ نسلاً عباسی تھے اور ان کا شمار چشتیہ سلسلے کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ ان کی رُوحانی تربیت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت بخاری رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۳۸۴ء) نے کی تھی۔ موصوف کو مخدوم جہانیاں کے بھائی اور جانشین سید محمد بن احمد الحسینی المعروف بہ راجو قتالؒ (م ۱۴۲۴ء) کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی شرف حاصل تھا۔

عبداللہ خویشگی کی روایت ہے کہ مخدوم جہانیاں رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے قبل شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ کے مشورے سے اپنے بھائی راجو قتال رحمتہ اللہ علیہ کو اپنا جانشین بنایا تو مخدوم صاحب کی اہلیہ' جو اپنے بیٹے کو سجادہ نشین بنانا چاہتی تھیں' شیخ موصوف سے ناراض ہو گئیں اور انہوں نے بددعا دی کہ قوام الدینؒ کا بیٹا بھی ان کا جانشین نہ ہو سکے گا۔[3] سید محی الدین رضوی رقمطراز ہیں کہ مخدوم جہانیاں رحمتہ اللہ علیہ کی تدفین سے قبل ہی

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ مینا' ص ۲۹۹۔

۲ - شیخ عبدالحق' اخبار الاخیار' مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ' ص ۱۵۵۔

۳ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۱۸۳ ب۔

ان کے بیٹوں اور سید راجو قتال رحمتہ اللہ علیہ کے مابین جانشینی کے مسئلے پر نزاع شروع ہو گئی۔ کافی لے دے کے بعد یہ طے پایا کہ خانقاہ کا انتظام تو مخدوم صاحب کے بیٹے سنبھالیں اور ان کی نعمت راجو قتال رحمتہ اللہ علیہ کے پاس رہے۔"[1]

ملفوظات شاہ میناؒ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ شعر کہہ لیتے تھے۔ سید محی الدین رضوی نے ان کے چند اشعار تبرکاً ملفوظات میں نقل کئے ہیں۔ موصوف صاحبِ تصنیف بزرگ تھے اور ان کی تصانیف میں سے معیار التصوف' ارشاد المریدین اور اساس الطریقت کا ذکر ملفوظات میں ملتا ہے۔[2]

شاہ میناؒ اپنی گفتگو میں شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ کو محتسبِ عارفان یا محتسبِ درویشان کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے درویشی کے معیار کے بارے میں ان کا یہ قول نقل فرمایا:

ای درویش محک و معیار این کار کتاب و سنّت و سیرِ سلف کہ اہلِ اقتداء بودند' نہ اجازات مجرّد و مقامِ متبرک کہ فلاں فرزند درویشی است در مقام آبا و اجداد خود نشستہ کہ اگر لایقِ این مقام نبودی بدین مقام مشرف شدی۔ و بہ تحقیق بدانکہ شرفِ انسان نہ بزمان و مکان است بلکہ بہ تقویٰ است۔ قال اللہ تعالیٰ۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔[3]

اے درویش! درویشی کی کسوٹی اور معیار کتاب و سنّت اور اسلاف کی سیرت ہے جو ہمارے مقتدا تھے۔ صرف اجازت ملنے یا بابرکت جگہ پر بیٹھنے سے (کام نہیں چلتا) کہ یہ فلاں بزرگ کا فرزند ہے جو اپنے بزرگوں کی مسند پر براجمان ہے اور اگر یہ اس مقام پر بیٹھنے کے لائق نہ ہوتا تو کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ یہ بات محقق ہے کہ انسان کا شرف زمان و مکان سے وابستہ نہیں بلکہ تقویٰ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی معزز ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

اہلِ سنّت عام طور پر آئمۂ اربعہ میں سے کسی ایک امام کے مقلّد ہوتے ہیں لیکن ملفوظاتِ شاہ میناؒ کے مطالعہ سے یہ عجیب انکشاف ہوا کہ شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ سُنّی ہونے کے باوجود امام جعفر صادقؒ کے فقہی مسلک پر کاربند تھے۔[5] اس کی مثال صوفیوں کے کسی تذکرے میں ہماری نظروں سے نہیں گزری۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اور عبداللہ خویشگی نے شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ کا سن وفات نہیں لکھا۔ ملفوظاتِ شاہ میناؒ میں یہ مرقوم ہے کہ موصوف شاہ میناؒ کی ولادت سے چالیس روز پہلے فوت ہوئے تھے۔[6] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۸۰۰ھ / ۱۳۹۳ء

۱۔ ملفوظات شاہ میناؒ ص ۲۲۳ ۲۔ ایضاً" ص ۷۵' ۱۱۸' ۱۵۷۔

۳۔ ایضاً" ص ۳۳' ۷۵۔ ۴۔ ایضاً" ص ۷۹۔

۵۔ [illegible] امام جعفر رضی اللہ عنہ [illegible] ۶۔ ایضاً" ص [illegible]

میں ہوا تھا۔

شیخ سارنگؒ

شاہ میناؒ کے مرشد حضرت شیخ سارنگ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار سلطان فیروز تغلق کے درباری امراء میں ہوتا تھا۔ عبداللہ خویشگی کی روایت ہے کہ ان کی بہن سلطان محمد بن فیروز تغلق کے عقد میں تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت سلطان فیروز تغلق کی صحبت میں گزرتا تھا اور ان دنوں وہ ملک سارنگ کے نام سے مشہور تھے[1] زمانہ امارت میں ملک موصوف شیخ قوام الدینؒ سے اخذ فیض کرتے رہے اور انہوں نے انہیں اپنے حلقۂ مریدین میں داخل کر کے چشتیہ سلسلے میں خرقِ خلافت عطاء فرمایا۔

جب کبھی مخدوم جہانیاںؒ اور راجو قتالؒ اوچہ سے دہلی تشریف لاتے تو سلطان فیروز تغلق ان ہی کے ہاتھ انہیں کھانا بھیجا کرتا تھا۔ راجو قتالؒ کی تلقین سے انہوں نے نماز شروع کی۔ ایک روز انہوں نے ملک سارنگ کو مخدوم جہانیاںؒ کا پس خوردہ کھلایا اور اس کے ساتھ ہی ان کا باطن روشن ہو گیا[2] جب راجو قتالؒ دوبارہ دہلی تشریف لائے تو انہوں نے ملک موصوف کو اشراق اور چاشت کی نمازیں ادا کرنے کی تلقین فرمائی اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ مخدوم جہانیاںؒ نے بھی انہیں یہ شرف بخشا۔ کچھ عرصہ بعد ان بزرگوں کی توجہ کا اثر ظاہر ہوا اور وہ تمام مال و دولت لٹا کر حجاز مقدس چلے گئے۔

حرم شرف میں موصوف شیخ وقت حضرت یوسف ایرجیؒ سے فیض یاب ہوئے۔ حرمین شریفین سے واپسی کے بعد موصوف راجو قتالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سہروردی سلسلے میں خرقۂ خلافت عطاء فرمایا اور اپنے بزرگوں کی امانتیں ان کے سپرد کیں[3] شاہ مینا ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

شیخ سارنگ ہمیشہ در اتباع ہر دو بزرگوار قولاً و فعلاً بودہ است۔ ذرّہ از اتباع شان تجاوز نمی نمودند[4]

(شیخ سارنگ ہمیشہ زبانی اور عملی طور پر ان دونوں بزرگوں کی اتباع کیا کرتے تھے اور وہ ان کی اطاعت سے تجاوز نہیں فرماتے تھے)۔

شاہ مینا نے اپنے ملفوظات میں ایک جگہ شیخ سارنگ کو "سلطان العاشقین زائر حرمین

۱۔ عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۲۱۳ ب۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ عبدالحق محدث دہلویؒ، اخبار الاخیار، ص ۱۵۵۔

۴۔ ملفوظات شاہ مینا، ص ۳۴۔

الشریفین" کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔[۱] شیخ موصوف نے اپنی حیات میں صرف تین اصحاب، شیخ حسام الدین صوفی، شاہ میناؒ اور اپنے پوتے شیخ محمدؒ کو خلافت عطا فرمائی۔[۲]

شیخ سارنگؒ کی وفات کے بعد شاہ میناؒ نے مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی اور جلد ہی انھوں نے لکھنؤ میں اپنا حلقہ قائم کر لیا۔ ان کے ملفوظات کے مطالعہ سے اس عہد کے خانقاہی نظام اور شاہ صاحب کے طریق کار پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ شاہ مینا خود بھی بڑے عابد و زاہد اور مرتاض بزرگ تھے اور دوسروں کو بھی ورع و تقویٰ اختیار کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ جامع ملفوظات ان کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ ریاضت کے دوران میں موصوف خشک طعام تناول فرماتے تھے اور مرغن غذا کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ شاہ مینا نے ابتدائے سلوک میں بڑا سخت مجاہدہ کیا تھا۔ سید محی الدین رضوی تحریر فرماتے ہیں کہ ان دنوں موصوف روغن کی بو بھی سونگھ نہیں سکتے تھے۔ شاہ صاحب اکثر روزہ سے رہتے تھے لیکن اپنے حال کو دوسروں سے چھپاتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی خوراک برائے نام رہ گئی تھی اور کمزوری کے باعث ان کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔ ایک بار آپ کمزوری کے باعث زمین پر گر گئے لیکن ستر احوال کے لئے انھوں نے راستے میں سے ایک اینٹ ہٹائی تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ وہ اینٹ سے ٹھوکر کھا کر گرے ہیں۔[۳]

سالک کے لئے ہدایات

شاہ مینا خود بڑے پابند شرع بزرگ تھے اس لئے وہ اپنے مریدوں اور اہل طریقت کو بھی شریعت کی پابندی کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں انھوں نے ایک سالک کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ ہمیشہ باوضو رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی بے وضو نہ رہے۔ انھوں نے حدیث کے حوالے سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کو مومن کا ہتھیار فرمایا ہے۔ حضور علیہ الصلوۃ و السلام کا فرمان ہے کہ وضو پر وضو کرنا نورٌ علیٰ نور ہے۔ وضو کو نماز کی کلید کہتے ہیں۔ اسلام کی بنیاد طہارت پر ہے اور طہارت کو نصف ایمان کا درجہ دیا گیا ہے۔ ملفوظاتِ شاہ مینا کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ موصوف بے وضو کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔[۴]

---

۱ - "ایضاً" ص ۲۸۔
۲ - "ایضاً" ص ۲۳۴۔
۳ - "ایضاً" ص ۷ تا ۱۰۔
۴ - "ایضاً" ص ۹۳، ۹۴۔

شاہ صاحب نے سالک کے لئے ایک شرط۔۔ دوام الذکر مع حضور القلب بالقوۃ الشدیدۃ۔۔ ضروری قرار دی ہے۔ نیز انہوں نے دوام الصوم اور تقلیل الغذا کو بھی سالک کے لئے لازمی شرط قرار دیا ہے۔ شاہ مینا فرماتے ہیں کہ اس کے لئے دوامِ سکوت بھی لازمی ہے اور اسے چاہئے کہ وہ سوائے ذکرِ خدا کے اور کوئی بات نہ کرے۔[1] شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک بار ایک پیر نے اپنے کسی مرید کو خرقۂ خلافت پہنانے کے لئے تقریب منعقد کی اور بہت سے مشائخ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ اتفاق سے امیدوارِ خلافت کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے۔ آفتاب چہ گرم است۔ ادھر اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ادھر تمام مشائخ یہ کہتے ہوئے مجلس سے اٹھ گئے:

این لائق این کار نباشد کہ سخن لغو بی فائدہ گفت و درو ہیچ نفعی دین نبود۔[2]

یہ اس کام کے لائق نہیں ہے کیونکہ اس نے ایسی فضول اور بے فائدہ بات کہی ہے جس میں کوئی دینی فائدہ نہ تھا۔

ایک مجلس میں شاہ مینا نے فرمایا کہ سالک کے لئے ایک شرط "ربط القلب بالشیخ" ہے[3] ایک روز انہوں نے فرمایا کہ سالک کے لئے ایک ضروری شرط۔۔ دوام ترک الاعتراض علی اللہ تعالیٰ۔۔ بھی ہے۔ اسے خدا کی طرف سے جو رنج و راحت ملے' اسے دوست جانے[4] سالک کو زیورِ تقویٰ سے بھی آراستہ ہونا چاہئے اور یہاں تقویٰ سے مراد۔۔ ترک الشبہات[5]۔۔ ہے۔ شاہ مینا فرماتے ہیں کہ سالک کو بنیے کا طریقہ اپنانا چاہئے۔ وہ دن بھر سودا بیچتا ہے اور رات کو حساب کرتا ہے کہ آج کتنا نفع یا نقصان ہوا۔ اگر اسے نفع ہوا تو وہ رات کو اطمینان کے ساتھ سوتا ہے اور نقصان کی صورت میں اسے فکر میں نیند نہیں آتی۔[6]

شاہ میناؒ فرماتے ہیں کہ سالک کے لئے ایک شرط دوامِ خلوت ہے۔ اس کا چھوٹا سا خلوت خانہ ہونا چاہئے جس میں وہ نماز ادا کر سکے۔ ذکر کے وقت وہ خلوت خانہ تاریک رکھے۔ اس میں دن کی روشنی یا سورج کی کوئی کرن داخل نہیں ہونی چاہئے[7] شاہ میناؒ نماز باجماعت کے خود بھی بڑے پابند تھے اور اپنے ملنے والوں کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں

۱ - ایضاً" ص ۹۵ ' ۹۷۔
۲ - ایضاً" ص ۹۷۔
۳ - ایضاً" ص ۲۔
۴ - ایضاً" ص ۱۳۵۔
۵ - ایضاً" ص ۱۳۸۔
۶ - ایضاً" ص ۱۷۱ ' ۱۷۲۔
۷ - ایضاً" ۹۹۔

انہوں نے فرمایا کہ اہلِ خلوت کے لئے نماز باجماعت کی پابندی ضروری ہے۔ اگر کسی عذر یا خوف کی وجہ سے باہر نہ نکل سکے تو کسی شخص سے کہے کہ وہ اس کے ساتھ آ کر نماز پڑھ لیا کرے۔[۱]

شاہ میناؒ فرماتے ہیں کہ صوفیوں کو مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کا ضرور پابند ہونا چاہئے اور مسلکِ طریقت میں اپنے شیخ کے مذہب کے علاوہ دوسرے مذہب پر عمل کرنا جائز نہیں۔[۲]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ شاہ میناؒ فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اپنے شیخ کے علاوہ اور کسی کا خیال نہ لائے اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے عقیدت رکھے۔[۳]

ضرورتِ شیخ

اس عنوان کے تحت شاہ میناؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کا علم قرآن و حدیث کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتا۔[۴] ہمارے اکثر و بیشتر بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ تصوف کتابی علم نہیں ہے اور ایک شخص محض تصوف کی کتابیں پڑھنے سے صوفی نہیں بن جاتا۔ سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے:

علم تصوف بکردن است نہ بگفتن[۵]

شاہ میناؒ فرماتے ہیں کہ جب تک راہِ طریقت کا رہبر شیخ کامل رہنمائی نہ کرے سالک اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جس تک کاملین پہنچے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

من لا شیخ لہ فالشیطان شیخہ[۶]

ایک دوسری مجلس میں شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مبتدی کے لئے شیخ کامل کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مرید کو چاہئے کہ وہ "قولاً" اور "فعلاً" اپنے شیخ کی اقتداء کرے۔ مبتدی کو راہ سلوک کی کیا

---

۱ - ایضاً" ص ۱۰۳ --- رعایت جماعت امرے اہم است۔

۲ - ایضاً" ص ۸۲۔

۳ - ایضاً" ص ۸۳۔

۴ - ایضاً" ص ۷۱۔

۵ - صوفی حمیدالدین ناگوری، سرور الصدور، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، فارسی تصوف ۲۱ ر ۱۶۱، ورق ۹۳۔

۶ - ملفوظات شاہ مینا، ص ۷۱۔

خبر ہے؟ اس نے جو راستہ دیکھا ہی نہیں اس پر بغیر کسی رہبر کے چلنا مشکل ہے اور رہبر وہی ہو سکتا ہے جس نے وہ راستہ دیکھا ہو۔ اسی مجلس میں حضرت نے فرمایا کہ ابتدائے سلوک میں پیر کی مثال مشاطہ کی سی ہے۔ وہ مرید کو اعمال صالحہ، پیروی شریعت اور ذکر کی رغبت دلاتا ہے اور اسے ذلت و خواری کا، جو لازمۂ عشق ہے، ذائقہ چکھا کر خدا سے ملا دیتا ہے۔[1]

ایک مجلس میں شاہ میناؒ نے اسی عنوان پیر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ مشائخ دلوں کے طبیب ہیں۔ اگر کوئی طبیب کسی مریض کے مرض سے ناواقف ہے تو وہ اسے غلط دوا دے کر ہلاک کر ڈالے گا۔ جس طرح ہر مرض کی دوا الگ ہوتی ہے اسی طرح ہر جنون کے لئے جداگانہ معجون ہوتی ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص جاہل حکیم نہیں کر سکتا بلکہ یہ حکیم حاذق کا کام ہے۔[2]

صحیح پیر کے اوصاف

شاہ میناؒ فرماتے ہیں کہ شیخ کو عالم شریعت ہونا چاہئے۔ وہ فرائض، سنن، نوافل اور طاعت کا علم رکھتا ہو۔ نیز وہ محرمات و ممنوعات کی مختلف انواع سے واقف ہو اور حلال و حرام اور فرض و سنت کی تمیز رکھتا ہو۔[3]

درویش کی صفات

درویشوں کی صفات بیان کرتے ہوئے شاہ میناؒ فرماتے ہیں:

چون کسی برین طائفہ ظلم کند و یا دزدی مالی و کالای او را ببرد بدگوید و اگر بدگوید توکل باطل شود۔ بلکہ چون دزدی مال او را ببرد یاگم شود، شادگردد و غمناک نشود۔ و اگر تواند بکسی نگوید کہ دران خیریت دو جہانی تصور کند۔[4]

اگر کوئی شخص اس گروہ پر ظلم کرے یا چور ان کا مال یا سامان لے جائے اسے برا نہ کہے۔ اگر وہ برا کہے گا تو اس کا توکل ختم ہو جائے گا۔ جب چور اس کا مال لے جائے یا گم ہو جائے تو اسے رنجیدہ نہیں بلکہ خوش ہونا چاہئے۔ اگر ہو سکے تو وہ کسی سے اس کا ذکر بھی نہ کرے اور اسے دو جہانوں میں خیریت ہی سمجھے۔

شاہ میناؒ فرماتے ہیں کہ درویش کو کریم الطبع ہونا چاہئے اور اس کا جود و سخا جبلی اور

۱۔ ایضاً، ص ۷۷، ۷۸۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔
۴۔ ایضاً، ص ۵۷۔

فطری ہو۔ موصوف پابندِ شرع بزرگ تھے۔ اس لئے وہ قیدِ شریعت سے آزاد درویشوں کو ناپسند فرماتے تھے۔ سادہ لوح عوام کو ان کی صحبت سے اجتناب کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں:

اگر یکی را بہ بنی کہ در ہوا می پرد یا برآب می رود و فرضی و سنتی از سنن فرو میگذارد۔ فاعلم انہٗ کذّاب و لیس فیہ کرامۃ بل ہو سحر او استدراج۔[۱]

اگر تو کسی کو ہوا میں اڑتے ہوئے یا پانی کے اوپر چلتا ہوا دیکھے اور وہ کسی فرض یا سنّتوں میں سے کسی سنّت کا تارک ہو تو خوب جان لے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اس کے پاس کوئی کرامت نہیں۔ (جو کچھ ہے) وہ جادو یا استدراج ہے۔

شاہ صاحب بے شرع اور ملحد پیروں پر لعنت بھیجنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ان ملحدوں کا یہ خیال ہے کہ ایک بندے کو خدا کی اتنی زیادہ عبادت کرنی چاہئے کہ وہ درجۂ ولایت کو پہنچ جائے اور جب کوئی ولی بن جاتا ہے تو اس سے احکامِ شرع ساقط ہو جاتے ہیں۔ یہ گمراہی ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام اوصاف و کمالات سے متصف تھے وہ بھی احکامِ شرع سے مستثنیٰ نہ تھے' بلکہ انہیں تو اپنے پروردگار کی طرف سے یہ حکم ملا تھا:

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین[۲]

تو پھر اور کون ایسا ہو سکتا ہے جس سے احکامِ شرع ساقط ہو جائیں۔[۳]

بدعتی پیر سے اجتناب

شاہ مینا" اپنے مریدوں اور ملنے والوں کو بدعتی پیروں سے دُور رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر کسی از نادانی خود بجاہل یا از اہلِ بدعت یا بکسی کہ در وے اندک صورت بدعتی باشد متابعت کردہ و با او ارادت آوردہ یا از دستِ اُو خرقۂ باطل پوشیدہ باشد' باید کہ باز بخدمتِ شیخ رود و از ارادتِ او خرقہ پوشد تا گمراہ نشود و در ہلاکت و ضلالت نیفتد۔[۴]

اگر کوئی شخص اپنی نادانی سے کسی جاہل یا بدعتی یا ایسے شخص کی' جس میں تھوڑی سی بدعت کسی نہ کسی صورت میں موجود ہو' پیروی کرے اور اس سے عقیدت رکھے یا اس کے ہاتھ سے نقلی خرقہ پہنے اسے چاہئے کہ دوبارہ اپنے شیخ کی خدمت میں جائے اور تجدید بیعت کرے اور اس

---

۱ - ایضاً" ص ۴۹۔
۲ - جب تک پہنچے تجھ کو یقین۔
۳ - ملفوظات شاہ مینا' ص ۴۸۔
۴ - ایضاً" ص ۱۲۔

سے عقیدت رکھ کر خرقہ پہنے تاکہ وہ بے
راہ نہ ہو اور ہلاکت اور گمراہی میں نہ
پڑے۔

جامع ملفوظات سیّد محی الدین رضوی تحریر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عقیدت مند شاہ مینا سے کلاہ محبت عطا کرنے کی التجا کرتا تو موصوف اس سے پوچھتے کہ اس کا پیر زندہ ہے؟ اگر وہ اثبات میں جواب دیتا تو آپ اسے کلاہ نہ دیتے۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے پیر کی موجودگی میں کسی دوسرے سے خلافت یا خرقہ یا کلاہ لینی مناسب نہیں۔ آپ کا قول ہے کہ دو پیروں کی محبت بیک وقت دل میں جاگزیں نہیں ہو سکتی! حضرت بہاء الدین زکریاؒ اپنے مریدوں کو یہ مشورہ دیا کرتے تھے، "یک در گیر و محکم گیر۔"

تصوّف کی اصلاح

شاہ مینا نے صحیح اسلامی تصوّف کے نقوش اجاگر کرنے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔ ان کے ملفوظات پڑھ کر ایک قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ موصوف تصوّف کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ بڑی خواہش تھی کہ تصوّف میں جو غیر اسلامی عناصر داخل ہو گئے ہیں انہیں ختم کر کے تصوّف کو ایک بار پھر قرونِ اولیٰ کا احسان بنا دیں۔ شاہ صاحب نے سیّد علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مجدّد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی طرح جا بجا جاہل صوفیوں کے اعمال و اطوار کی مذمت کی ہے۔[۲]

انہوں نے اپنی ایک مجلس میں تصوّف پر حصولِ علم کی فضیلت ثابت کی ہے۔

تصوّف کی حقیقت

شاہ مینا نے ایک روز اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کارِ سلوک اور امرِ تصوّف ہوش کا کام نہیں ہے۔ یہ ایسے نہیں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص چونکہ تنگ لباس پہنتا ہے اس لئے میں بھی پہن لوں یا فلاں شخص بہت زیادہ نمازیں ادا کرتا ہے، میں بھی ایسا ہی کروں۔ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جو سب چیزوں سے بے خبر ہوں اور دن رات اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہیں۔[۳]

ایک مجلس میں انہوں نے صحیح تصوّف کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

۱۔ "ایضاً" ص ۴۸۔
۲۔ "ایضاً" ص ۴۹۔
۳۔ "ایضاً" ص ۴۳۔

ہرچہ ورائے فرض و واجب و سنت و مستحب و راحت اصحاب است، ہمان لایعنی است[۱]

فرض، واجب، سنت، مستحب اور دوستوں کی راحت کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، وہ سب بیکار ہے۔

شاد باش اے عشق خود سودائے ما

صوفیاء کرام عشق پر بڑا زور دیتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ عشق معشوق کے علاوہ ہر چیز کو جلا ڈالتا ہے۔ شاہ مینا فرمایا کرتے تھے:

العشق نار یقع فی القلب فیحرق ماسوی المحبوب[۲]

عشق ایک آگ ہے۔ جب وہ دل میں روشن ہوتی ہے تو محبوب کے علاوہ ہر شے کو جلا ڈالتی ہے۔

ایک مجلس میں شاہ صاحب نے عشق کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

عشق سودائی است کہ نبود این سودا جز ذات اور دیگر نباشد۔ ہر کرا عشق نیست او مجنون لی حاصل است۔ و ہر کرا عاشق نیست او خودبین و خود پرست است[۳]

عشق ایک سودا ہے اور اس کا نفع سوائے ذات باری کے اور کچھ نہیں۔ جسے کسی سے عشق نہیں وہ مجنون بے حاصل ہے اور جو عاشق نہیں وہ خود بین اور خود پرست ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار ایک شخص حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ (م ۷۲۵ھ) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پیرا ہوا کہ فلاں بزرگ صاحب کشف و کرامت ہے۔ سلطان المشائخ نے اس سے دریافت فرمایا کہ وہ عشق بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ شاہ مینا نے ایک روز اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ عشق یہ ہے کہ خود کو گم کر دے اور بیقرار رہے۔[۵]

ایک مجلس میں شاہ صاحب نے عشق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ عشق عشقہ سے نکلا ہے اور وہ ایک قسم کی بیل ہے۔ وہ جس درخت پر چڑھ جاتی ہے، اسے خشک کر دیتی ہے اور خود تر و تازہ رہتی ہے۔ لہذا عشق جس جسم میں داخل ہوتا ہے وہ غیر محبوب کو جلا دیتا ہے۔ وہ جسم تو کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے لیکن دل و روح منور ہو جاتے ہیں۔[۶]

۱۔ ایضاً'' ص ۴۷۔
۲۔ ایضاً'' ص ۶۳۔
۳۔ ایضاً'' ص ۴۲۔
۴۔ ایضاً'' ص ۴۴۔
۵۔ ایضاً'' ص ۴۶۔
۶۔ ایضاً'' ص ۶۳۔

ایک روز شاہ مینا نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کثرت کے ساتھ نمازیں ادا کرنی، روزے رکھنے اور تلاوتِ قرآن مجید تو ہر کس و ناکس کے بس کی بات ہے لیکن دردِ محبت کا حصول، جو ایک سالک کا مقصودِ حقیقی ہے، ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ راہِ طریقت میں مقصودِ اصلی درد ہے۔[۱] اسی مجلس میں انہوں نے دردِ عشق کے بارے میں فرمایا کہ اس کی علامت یہ ہے کہ سالک دنیا داروں کے ساتھ نشست و برخاست کو اپنے لئے زہرِ قاتل سمجھے۔ اس کے دل میں دنیاوی معاملات، حبِ جاہ، مال و اسباب اور خواہشاتِ نفسانی کا خیال تک نہ گزرے۔[۲]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک روز شاہ مینا ؒ نے محبت کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ محبت سے مراد اوصافِ ذمیمہ سے مبّرا ہونا اور اوصافِ حمیدہ سے متصف ہونا ہے۔ جوں جوں ایک شخص اوصافِ ذمیمہ ترک کرتا جائے گا توں توں اس کی رُوح محبت کی طرف مائل ہوتی جائے گی اور بالآخر وہ اوصافِ حمیدہ سے متصف ہو جائے گا۔[۳]

یسعیٰ نُورھُم بَین ایدِیھِم:

ایک روز شاہ مینا ؒ کی مجلس میں ان کے ایک معتقد نے ان سے کہا کہ جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے یا کسی کے ساتھ تواضع سے پیش آتا ہے تو وہ اپنے سامنے نُور دیکھتا ہے۔ شاہ مینا نے فرمایا کہ قرآن مجید میں نُور ہے اور وضو میں بھی نُور ہے۔ اسی طرح ہر عبادت میں نور ہوتا ہے۔ یہ نُور "طفلانِ طریقت" کی غذا ہے جس سے ان کی پرورش کی جاتی ہے۔ "طفلانِ طریقت" کو چاہئے کہ وہ اس نورانی غذا سے اپنی طاقت بڑھائیں تاکہ "نورِ حقیقی" تک ان کی رسائی ہو سکے۔[۴]

تقویٰ کا معیار

شاہ مینا نے ایک مجلس میں تقویٰ کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا مولانا احمد نامی ایک کاتب شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ کے لئے کتابوں کی نقلیں تیار کیا کرتا تھا۔ وہ ہر شام شیخ موصوف سے تیل مانگ لاتا اور رات کے وقت چراغ کی روشنی میں کام کرتا تھا۔ کام کے دوران میں جب اسے کھانے پینے کی حاجت لاحق ہوتی تو وہ چراغ گل کر دیتا اور لکھنے بیٹھتا تو دوبارہ چراغ روشن کر لیتا۔[۵]

---

۱ - ایضاً" ص ۴۲۔
۲ - ایضاً" ص ۴۳۔
۳ - ایضاً" ص ۴۵۔
۴ - ایضاً" ص ۱۴۳۔
۵ - ایضاً" ص ۱۴۸۔

متقی کے لئے حصولِ علم میں آسانی

شاہ مینا فرماتے ہیں کہ جو شخص متقی اور پرہیز گار ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بعض علوم کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے بغیر سکھا دیتا ہے۔ اس کا حافظہ اتنا اچھا ہو جاتا ہے کہ جو بات کسی غیر صالح شخص کی فہم میں ایک دن میں آتی ہے وہ اسے آنِ واحد میں سمجھ جاتا ہے![1]

معیارِ طہارت

شاہ مینا" نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ایک بار ایک بزرگ خراسان سے سنام آئے اور انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ وہاں کوئی قابلِ زیارت عالم و متقی بزرگ بھی رہتا ہے؟ لوگوں نے سعد الدین مفسّر کا پتہ بتایا۔ جس وقت وہ بزرگ ان کے گھر پہنچے اس وقت وہ اپنے گھر کی دیواروں پر گوبر اور مٹی کا لیپ کر رہے تھے۔ نووارد نے انہیں دیکھ کر حیرت سے کہا:

او چگونہ عالی و متقی است کہ این پلیدی بر در و دیوارِ خود رَوا دارد۔ ان اللہ یُحبّ المتطہرین[2]

وہ کیسا عالم اور متقی ہے جو اس نجاست کو اپنی دیوروں پر لگانا جائز سمجھتا ہے۔ (فرمان خداوندی ہے) یقیناً" اللہ پاک لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔

حقوق العباد پر زور

شاہ مینا" اپنی مجالس میں حقوق العباد پر بڑا زور دیا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ حقوق العباد بہت سے ہیں۔ ایک شخص پر اس کے والدین اور اساتذہ کے بہت سے حقوق ہیں اور اسی طرح رشتہ داروں کے بھی حقوق ثابت ہیں۔ ہمسایہ کا ہمسایہ پر حق ہے۔ غلاموں اور کنیزوں کا بھی اپنے آقا پر حق ہے اور ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔[3]

صوفیائے خام کی موجودگی

تغلق خاندان کے زوال کے ساتھ ہی برعظیم میں تصوّف کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر

---

۱ - ایضاً" ص ۱۸۹۔

۲ - ایضاً"

۳ - ایضاً" ص ۶۳۔

خلیق احمد نظامی تحریر فرماتے ہیں کہ صوفیہ نے صحو کی جگہ سُکر کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ رُوحانی اصلاح و تربیت کے لئے جس ضبطِ نفس، تحمل اور بردباری کی ضرورت تھی وہ قطعاً مفقود ہو چکی تھی۔[1] راقم الحروف نے اپنی تصنیف دین الٰہی اور اس کا پس منظر کے دیباچہ میں لکھا کہ فیروز تغلق کی وفات (۱۳۸۸ء) سے لے کر اکبر کی تخت نشینی (۱۵۵۶ء) تک اندازاً ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں، سوائے سکندر لودھی کے اٹھائیس سالہ دور حکومت کے برِعظیم پاک و ہند میں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ ڈیڑھ سو سال کا یہ دور مسلمانوں کی اخلاقی پستی، رُوحانی تنزل، بے حسی، بے عملی زندگی اور بے راہ روی کا دَور ثابت ہوا۔ اس عرصہ میں نہ تو خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ، بابا فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ یا شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کے پایہ کا کوئی صُوفی برِعظیم میں پیدا ہوا جو عوام کی صحیح رہنمائی کر سکتا اور نہ ہی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ یا شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ جیسا کوئی عالم پیدا ہوا، جو اپنی قوتِ تحریر سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتا۔ جو چند ایک صوفی اس دَور میں پیدا ہوئے وہ عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہوئے اور جو عالم پیدا ہوئے وہ علومِ شریعت کی بجائے ہندوؤں کے علوم کی طرف زیادہ مائل رہے۔[2]

شاہ میناؒ اس دَور کے صوفیائے خام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اب یہ زمانہ آ گیا ہے کہ بے علم اور بے تربیت لوگ نئے نئے طریقے اختراع کر رہے ہیں یا اپنی الگ رَوش بنا رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو تلقین ذکر کر رہے ہیں۔ عوام کو اپنا معتقد بنانے کے لئے انہوں نے کئی نئی باتیں ایجاد کر لی ہیں۔ وہ لوگوں کو حیرت میں ڈال کر راہِ راست سے ہٹا رہے ہیں۔[3]

شاہ میناؒ نے ایک مجلس میں خزانۂ جلالی کے حوالے سے فرمایا کہ قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ علماء فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں گے اور صوفیاء جاہل ہوں گے۔[4] شاید اس گفتگو سے ان کا اپنے عہد کے عالموں اور صوفیوں کی طرف اشارہ ہو۔

نذر و فتوح کے بارے میں شاہ میناؒ کی رائے

درویش کو چاہئے کہ اسے جو ملے وہ سمجھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ جو کھائے اسے عطیۂ الٰہی ہی گردانے۔ وہ جو کچھ لے خدا کے لئے لے۔[5]

---

۱ - خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۴۴۸۔
۲ - محمد اسلم، دین الٰہی اور اس کا پس منظر، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۔
۳ - ملفوظاتِ شاہ مینا، ص ۷۷۔
۴ - ایضاً، ص ۷۷۔
۵ - ایضاً، ص ۵۶۔

توحید کی تشریح

شاہ میناؒ نے ایک مجلس میں توحید کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

بعضی محققان گفتہ اند التوحید بحر لاساحل لہ' و ہر کہ غریق این بحر عمیق گشت ہر روز آتشِ عطش او زیادہ بود[1]

بعض محققین کہتے ہیں کہ توحید ایک سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ جو کوئی اس سمندر میں ڈوب جاتا ہے ہر روز اس کی پیاس کی آگ بڑھتی جاتی ہے۔

اِنّما العمال بالنیّات

شاہ میناؒ اپنے مریدوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ جو کام اور باتیں خلوصِ نیت کے بغیر کی جائیں' وہ سب لایعنی ہیں[2]

توکل کی علامت

ایک مجلس میں توکل کی فضیلت بیان کرتے ہوئے شاہ میناؒ نے فرمایا کہ توکّل کی تین علامات ہیں۔ اولاً" یہ کہ سالک کسی چیز کی طمع نہ کرے۔ ثانیاً" یہ کہ اگر کوئی بلا سوال اسے کچھ دے دے تو اسے رد نہ کرے۔ ثالثاً" یہ کہ اگر اسے کچھ مل جائے تو اسے دبا کر نہ بیٹھ جائے[3]

خود پرستی کی مذمت

شاہ مینا نے ایک مجلس میں فرمایا:

از مرد ہوا پرست خدا پرستی نشود و خود پرستی در کوچۂ خدا پرستی نرود[4]

نفسانی خواہشات کا اسیر خدا پرست نہیں ہو سکتا اور خود پرست کا گزر خدا پرستی کے کوچے سے نہیں ہو سکتا۔

---

۱ - ایضاً" ص ۱۵۔
۲ - ایضاً" ص ۴۷۔
۳ - ایضاً" ص ۱۰۰۔
۴ - ایضاً" ص ۱۰۰۔

مزامیر کے بارے میں شاہ میناؒ کا موقف

شاہ مینا نے اپنے ملفوظات میں قرآن و سنّت پر بڑا زور دیا ہے اور ان کے ملفوظات پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی جید عالم اور پابندِ شریعت بزرگ کے ملفوظات ہیں۔ اپنے مشائخ کرام کے طریقے کے برعکس وہ سماع سے اجتناب فرماتے تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں بُستان کے حوالے سے فرمایا کہ جنگ اور سفر کے علاوہ طبل بجانا جائز نہیں ہے۔[1] قوالیوں اور مجروں سے اپنے اعراس کی رونق بڑھانے والے چشتی پیروں کو شاہ میناؒ کے ساتھ بھلا کیا نسبت ہو سکتی ہے؟

ایک اہم علمی انکشاف

عہد سلاطین کے مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کی تصانیف میں سے تاریخ برامکہ' تاریخ فیروز شاہی' فتاویٰ جہان داری اور ثنای محمدی ہمارے علم میں ہیں۔ ان میں سے پہلی تین کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور ثنای محمدی کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ فتاویٰ جہان داری کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ برنی کے سوانح نگاروں نے اس کی ایک تصنیف "حسرت نامہ" کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کتاب شاہ مینا کے عہد میں دستیاب تھی اور انہوں نے اس کے حوالے سے ہارون الرشید کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔[2] پروفیسر شیخ عبدالرشید فرماتے ہیں کہ موصوف مدتوں سے اس کتاب کی تلاش میں ہیں لیکن شمالی ہند کے کسی سرکاری یا ذاتی کتاب خانے میں اس کا سراغ نہیں ملا۔ شیخ صاحب نے فرمایا کہ مدت ہوئی انہوں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ برنی نے اپنے آخری ایام حیات میں اپنی محرومی اور بے بسی کا ذکر حسرت نامہ کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔

ایام بیض کے روزے

صوفیاء کرام کے تذکروں میں ایام بیض کے روزوں کی بڑی فضیلت نظر آتی ہے۔ شاہ میناؒ فرماتے ہیں کہ ان نفلی روزوں کا بڑا ثواب ملتا ہے اور ہمارے خواجگانِ چشت کا ان ایام میں روزے رکھنے کا معمول تھا۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کے اکثر مرید سپاہی پیشہ تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی حضرت چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کی طرح اپنے مریدوں کو رخصت عطا فرمائی ہے۔[3]

۱۔ ایضاً" ص ۴۷۔

۲۔ ایضاً" ص ۴۳۔

۳۔ ایضاً" ص ۵۲۔

نفلی نمازوں پر زور

چشتی سلسلے کے صوفیاء نفلی نمازوں پر بڑا زور دیا کرتے تھے۔ شاہ میناؒ بھی اپنے مریدوں کو نفلی نمازیں بکثرت ادا کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ان کے ملفوظات میں نمازِ ظہر کے بعد دس رکعت صلوٰۃ الخضر، اس کے بعد چار رکعت صلوٰۃ الاوّبین اور اس کے بعد دو رکعت حفظ الایمان ادا کرنے کی تاکید آئی ہے۔[1] اسی طرح ملفوظات میں صلوٰۃ البروج، صلوٰۃ شکر اللیل، صلوٰۃ النور، صلوٰۃ الکوثر، صلوٰۃ الفردوس، صلوٰۃ المعرفۃ اور صلوٰۃ الہلاہل کا ذکر ملتا ہے۔ یہ سب نمازیں صلوٰۃ الاوّبین کے بعد ادا کی جاتی ہیں۔[2]

مسلکِ شافعی کے بارے میں ایک اہم نکتہ

راقم الحروف نے اکثر بزرگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حنفی مسلک عوام کا مذہب ہے اور شافعی مسلک خواص کا مذہب ہے، لیکن کسی نے اس کی توضیح نہیں کی۔ شاہ میناؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اما مشائخِ طریقت کہ مذہبِ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اختیار کردہ اند از بہر آنکہ مذہب تنگ و دشوار است برنفس، و طریق این طائفہ قہر نفس است باحتیاط نمودن درکار ہای دین، بنابرین این مذہب اختیار کردہ اند نہ برمعنی دیگر۔[3]

مشائخِ طریقت نے جو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک اختیار کیا وہ اس لئے کیا ہے کہ یہ مذہب نفس کے لئے تنگ اور دشوار ہے اور اس گروہ کا طریقہ نفس پر سختی کرنا اور دین کے معاملات میں احتیاط برتنا ہے اس لئے انھوں نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

شاہ میناؒ کا طریق بیعت

شاہ مینا لوگوں کو چشتی اور سہروردی سلسلوں میں مرید کیا کرتے تھے۔ جامع ملفوظات تحریر کرتے ہیں کہ موصوف ان میں سے کسی ایک سلسلے میں بیعت کر کے مرید کو کلاہ اور خرقہ عطا فرماتے تھے۔ تاہم ان پر چشتی نسبت کا غلبہ تھا۔

۱۔ ایضاً" ۱۵۹، ۱۶۰

۲۔ ایضاً" ص ۵۲۔

۳۔ ایضاً" ص ۸۳۔

جب کوئی ارادت مند بیعت کی غرض سے آتا تو حضرت کا کوئی خادم ارادت مند کا سر حلق کر کے اسے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کرتا۔ موصوف ارادت مند سے دریافت فرماتے۔ "این برادر را بہ برادری قبول کر دی۔" جب وہ اثبات میں جواب دیتا تو آپ فرماتے کہ آیئے دونوں بھائی توبہ کریں اور استغفار پڑھیں۔ پھر آپ تین بار استغفراللہ لا الہ الا ہو الحی القیوم و اتوب الیہ پڑھتے اور مرید بھی یہ الفاظ دہراتا۔ بعد ازاں آپ اس کے سر پر، حالانکہ وہ محلوق ہوتا تھا، قینچی چلاتے، جیسے اس کی پیشانی کے بال تراش رہے ہوں۔ اس کے بعد دائیں جانب اور پھر بائیں جانب قینچی چلاتے۔ قینچی چلاتے وقت آپ اللھم صلی اللہ علیٰ محمد و آلِ محمد و بارک وسلم پڑھتے اور مرید کی ثابت قدمی کے لئے یہ دعا فرماتے: اللھم ثبتنا علی التوبۃ و احفظنا عن المعصیت بحفظ منک بحق محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم و اہل بیتہ۔ جب آپ اسے کلاہ پہناتے تو فرماتے: توجہ بتاج الکرامۃ السعادۃ و احفظ عن المعصیۃ و ثبتہ علی دین الاسلام۔ اس کے بعد آپ مرید کو اپنے ہاتھ سے شیرنی کھلاتے۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ ہوا کرتے تھے: اللھم ارزقہ حلاوۃ الایمان برحمتک یا الرحمٰن الرحیم[1]

ملفوظات میں ضمناً اس عہد کے سیاسی واقعات اور سیاسی شخصیتوں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں جو کسی تاریخ یا تذکرے میں ہماری نظر سے نہیں گزریں، حالانکہ ان کے ذکر کے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

سلطان حسین شرقی

شاہ مینا کے زمانے میں لکھنؤ سلاطین شرقی کی عملداری میں تھا۔ جامع ملفوظات سید محی الدین رضوی رقمطراز ہیں کہ سلطان حسین شرقی (م ۱۵۰۰ء) شاہ میناؒ سے عقیدت رکھتا تھا[2] سلطان موصوف کا ذکر تاریخ میں "جونپور کا موسیقار بادشاہ" کے عنوان سے ملتا ہے[3] لیکن شاہ میناؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کے عہد حکومت میں اگر کوئی صوفی نماز جمعہ ادا کرنے جامع مسجد میں نہیں جاتا تھا تو سلطان اس سے باز پُرس کرتا تھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک بار بدیع الدین شاہ مدار رحمتہ اللہ علیہ جونپور گئے تو نماز جمعہ ادا کرنے نہ گئے۔ سلطان حسین شرقی کو پتہ چلا تو اس نے علماء کا ایک وفد ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مسافر، عورت اور غلام پر جمعہ واجب نہیں ہے۔ وہ چونکہ مسافر ہیں اس لئے نماز جمعہ سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے مُصلّیٰ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور لکھنؤ کی طرف چل دیئے[4]

---

۱ - ایضاً" ص ۱۵۷-
۲ - ملفوظات شاہ مینا، ص ۲۲۰-
۳ - ڈاکٹر عبدالعلیم، ا یسیز آن ہسٹری آف انڈو پاکستان میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۳-
۴ - ملفوظات شاہ مینا، ص ۲۹-

لکھنؤ پر ہندوؤں کا تسلط

شاہ مینا فرماتے ہیں کہ موصوف ابھی خُرد سال تھے کہ حاکم بکرم رائے تاس لکھنؤ پر مسلّط ہو گیا اور شہریوں نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی۔ شاہ میناؒ کے استاد قاضی فریدوں انہیں بھی قلعہ میں لے گئے۔ جب محاصرہ نے طول کھینچا تو قلعہ کے اندر اشیائے خور و نوش کی قلت ہو گئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ قاضی فریدوں موقعہ پا کر قلعہ سے باہر آتے اور شاہ میناؒ کے لئے لشکر کفّار سے کھانے پینے کی اشیاء مانگ کر لے جاتے۔ ایک روز کافروں نے قاضی فریدوں سے کہا کہ ان کے تیر اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن فلاں سمت نہیں جاتے۔ قاضیؒ موصوف نے کہا کہ اُن کے تیر اُس سمت نہیں جا سکتے کیونکہ اس طرف شاہ میناؒ رہتے ہیں۔[1]

اودھ میں زراعت کو نقصان

ملفوظات شاہ مینا میں مرقوم ہے کہ اس زمانے میں اودھ کے بعض علاقوں میں چوہوں نے کسانوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا اور زراعت تباہ ہو رہی تھی۔[2] اس سے اودھ کی معاشی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شمس خان گورنر اودھ

لکھنؤ کے گورنر شمس خان کے ساتھ شاہ میناؒ کے تعلقات ناخوشگوار تھے۔ وہ ان کی ولایت کا قائل نہ تھا اور ان کا امتحان لینے کے لئے اکثر ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ وہ گھر سے روانہ ہوتے وقت دل ہی میں یہ خیال کر کے چلتا کہ آج ان سے فلاں چیز طلب کرے گا۔[3]

سیّد محی الدین رضوی رقمطراز ہیں کہ ایک روز ایک شخص شاہ میناؒ کا مرید ہونے آیا اور وہ دستور کے مطابق شرینی بھی ساتھ لایا۔ شاہ صاحب نے حسب معمول وہ شیرینی حاضرین میں تقسیم نہ فرمائی اور اپنے خادم خاص میاں داؤد سے کہا کہ اسے کہیں دفن کر دے۔ حاضرین مجلس اس پر بڑے حیران ہوئے۔ ابھی چند دن گزرے تھے کہ وہ شخص چوری کے الزام میں پکڑا گیا۔ سپاہیوں نے اسے شمس خان کے سامنے پیش کیا تو اس کے استفسار پر ملزم نے بتایا کہ وہ

---

۱ - ایضاً'' ص ۲۱۳۔

۲ - ایضاً'' ص ۲۱۴۔

۳ - ایضاً'' ص ۲۰۶۔

شاہ مینا کا مرید ہے۔ شمس خان کے شاہ صاحب کے ساتھ تعلقات ناخوشگوار تھے۔ اس لئے اس نے ملزم کو شاہ میناؒ کے پاس بھیج کر ان سے استفسار کیا کہ کیا وہ ان کا مرید ہے؟ حضرت نے اثبات میں جواب دیا اور ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ انہوں نے اس کی شیرنی خرچ نہیں کی۔ انہوں نے اس وقت میاں داؤد کو بھیجا اور وہ زمین سے شیرنی نکال لایا۔ حضرت نے چور سے کہا کہ وہ اپنی شیرنی لے جائے اور ان کی کلاہ واپس کر جائے۔ چور اپنے کئے پر بڑا پشیمان ہوا اور اس نے ہمیشہ کے لئے چوری سے توبہ کر لی[۱]

ملفوظات میں کئی جگہ چوری اور رہزنی کے واقعات ملتے ہیں۔ جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شمس خان کے دور گورنری میں اودھ میں امن و امان کی صورت اچھی نہ تھی۔

ملفوظات میں اُردو الفاظ

شاہ میناؒ کا انتقال ۱۴۷۹ء میں سلطان بہلول لودھی کے عہد میں ہوا اور قریباً اسی زمانے میں سیّد محی الدین رضوی نے ان کے ملفوظات جمع کئے۔ ان ملفوظات کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اودھ میں اُردو زبان اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ شاہ میناؒ کے خادمِ خاص میاں داؤد ہندوی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے اور حضرت بھی "پورب کے ساکنوں" سے ہندوی میں گفتگو کیا کرتے تھے[۲] جامع ملفوظات نے کالپی کے ایک بزرگ شیخ فقا کا ذکر بھی کیا ہے جو ہندوی زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا کرتے تھے۔[۳]

ملفوظات میں کھٹ، بھوری اور پھاگ بازی جیسے ہندوی الفاظ ملتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشائخ کرام فارسی میں گفتگو کرتے وقت ہندی الفاظ بلا تکلّف استعمال فرماتے تھے۔ ایک بار شاہ میناؒ نے اپنی مجلس میں یہ دوہڑا پڑھا:

سائیں چیت چڑھی جب آئے
رت کرت ندیکھی جائے[۴]

سیّد محی الدین رضوی تحریر فرماتے ہیں کہ ایک بار شیخ سعدؒ لکھنو آئے لیکن وہ شیخ سارنگؒ سے ملنے نہ گئے۔ انہوں نے شکوے کے انداز میں کہا "اہومیت کا ہے بھو دین چاہ ٹوٹا دیکھا

---

۱ - ایضاً" ص ۲۰۶-
۲ - ایضاً" ص ۲۰۶-
۳ - ایضاً" ص ۲۰۷-
۴ - ایضاً" ص ۱۲۳-

جو پڑا یعنی گھر میں جگہ کم دیکھی اس لئے نہ آئے۔"[1]

ایک بار شاہ میناؒ جونپور تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ ابوالفتح سے ملنے گئے تو اس وقت ان کی خانقاہ میں سماع ہو رہی تھی اور قوال "پہاگ بازی" کے دوران یہ گا رہے تھے:

ہو ہو ہولی ری کئی پہاگ کو بیتے ری[2]

شاہ صاحب نے ایک روز اپنے مریدوں سے کہا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے خدا سے غافل نہ ہوں اور اس کا ذکر جاری رکھیں۔ بعد ازاں انہوں نے یہ دوہڑا پڑھا:

اوٹھت بیٹھت لیٹت لیجے
بیتے کوہ اندھیر نہ کیجے[3]

مشائخ کرام کا ذکر

ملفوظات میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ، شیخ نصیر الدین محمود اودھی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت بندہ نواز گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ، مخدوم جہانیاں رحمتہ اللہ علیہ، سید راجو قتالؒ، حضرت بہاء الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ اور مولانا شہاب الدین دولت آبادی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ مشائخ کرام کے تذکروں میں سید راجو قتال کا اصل نام صدر الدین رحمتہ اللہ علیہ دیکھنے میں آیا ہے[4] ملفوظات شاہ میناؒ اس لحاظ سے بڑی اہم کتاب ہے کہ اس میں ان کا پورا نام یوں درج ہے۔ "خواجہ ابوالفضل محمد بن احمد بن حسین الحسینی البخاری المعروف بہ شیخ راجوؒ"[5] اسی کتاب سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت راجو قتال رحمتہ اللہ علیہ اور مخدوم جہانیاں رحمتہ اللہ علیہ کے جدِ امجد حضرت میر جلال الدین سرخ پوش رحمتہ اللہ علیہ کا اصل نام حسین رحمتہ اللہ علیہ تھا۔

اودھ کے قصبات کا ذکر

شاہ میناؒ کے ملفوظات میں لکھنؤ کے قرب و جوار کے دیہات اور ندی نالوں کا ذکر موجود ہے۔ انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران میں خیر آباد، جاج مئو، موضع انام، بہرائچ اور موہان کے قریبی نالے ناکا باکا کا ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ ایضاً، ص ۲۲۸۔
۲۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔
۴۔ محمد اکرام، آب کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۳۱۹۔
۵۔ ملفوظات شاہ مینا، ص ۲۳۰۔

شاہ مینا کا ذوقِ مطالعہ

ملفوظات میں مندرجہ ذیل کتابوں کے حوالے ملتے ہیں جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ کتابیں لکھنؤ میں موجود تھیں اور شاہ صاحب کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ شرح رسالہ مکیہ' حسرت نامہ برنی' ارشاد المریدین' فتاویٰ ابواللیث سمرقندی' عوارف المعارف' خزانۂ جلالی' خلاصہ' مدارک' معیار التصوف' فتاویٰ صوفیہ' مرصاد العباد' تفسیر معالم التنزیل' جوامع الکلم' المحیط' سراج الہدایہ' تمہید لابوبکر سلمی' شرح المنار' جامع الصغیر' فتاویٰ سراجی' فوائد الفواد' شرح آداب للشیخ شرف الدین' بُستان' اساس الطریقۃ' تہذیب المذاہب' معدن المعانی' ثنائے محمدی برنی' حلیۃ الاولیا لابو نعیم' قوتُ القلوب' مصابیح' فوائد السالکین' رسالۂ مکیہ للشیخ قطب الدین دمشقی اور کتاب تحفۃ البررۃ فی الاسولۃ العشرہ۔

ملفوظات میں ایک نقص

شاہ مینا کے ملفوظات میں ایک بڑا نقص پایا جاتا ہے کہ جامع ملفوظات نے مجالس کی تاریخیں درج نہیں کیں' حالانکہ ان کے سامنے فوائد الفواد' خیر المجالس اور جوامع الکلم کی مثالیں موجود تھیں۔

شاہ مینا کا زمانۂ علالت اور وفات

شاہ مینا چھ ماہ تک علیل رہے۔ اس دوران میں انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور ان کا زیادہ تر وقت اپنے حجرے میں گزرتا تھا۔ ۲۳ صفر ۸۸۴ھ / ۱۴۷۹ء کو انہیں پیامِ اجل آ پہنچا۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ شاہ مینا اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تو ان کے پاس لباس کے سات جوڑے' چند عمامے اور کتابیں تھیں۔ ان کپڑوں کو پھاڑ کر قبر کا غلاف تیار کیا گیا۔[۱]

شاہ مینا کی درگاہ لکھنؤ میں میڈیکل کالج کے چوک میں واقع اور مرجع خلائق ہے۔ ۱۹۷۷ء میں کندھی لال نامی ایک ہندو کی بیوہ نے چالیس ہزار روپوں کی لاگت سے ان کا مقبرہ بنوایا ہے جو ایک غیر مسلم خاتون کی طرف سے شاہ مینا سے عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

شاہ مینا کی درگاہ سے قریب ہی میڈیکل کالج کے اندر ایک چھوٹے سے احاطے میں شیخ قوام الدین رحمتہ اللہ علیہ محو خوابِ ابدی ہیں۔ راقم الحروف مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء کو ان دونوں بزرگوں کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوا۔

۱ - ایضاً" ص ۲۱۹۔

سجادگی اور خلافت

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ شاہ میناؒ نے اپنے صرف دو مریدوں کو خلافت عطاء فرمائی۔ ان میں سے ایک تو ان کے برادر زادے قطب الدین تھے' جو شاہ صاحب کے بعد مسندِ ارشاد پر رونق افروز ہوئے۔ دوسرے خلیفہ شیخ سعد بن بدھنؒ تھے۔[1] ملفوظاتِ شاہ میناؒ کے متن میں جامع ملفوظات نے خود کو بھی شاہ صاحب کا خلیفہ بتایا ہے۔[2] شاہ میناؒ کی علالت اور خلوت نشینی کا ذکر کرتے ہوئے جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں کئی لوگوں نے خود کو شاہ میناؒ کا خلیفہ مشہور کر دیا تھا۔[3] رحمتہ اللہ علیہ واسعا" کثیرا"۔

---

۱ - ایضاً" ص ۲۳۴۔
۲ - ایضاً" ص ۲۸۔
۳ - ایضاً" ص ۳۱۔

تحفۃ السعداءؔ

رضا لائبریری رام پور میں تحفۃ السعداء کے عنوان سے حضرت شیخ سعد بن بڈھن خیر آبادی کے سوانح پر مشتمل پچاس ورق کا ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے[1] اس کے مصنّف نے متن میں اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔ "فقیر حقیر ضعیف نحیف گناہ گار امیدوارِ رحمتِ پروردگار غفار خواجہ جمال خاکروبِ آستانۂ قدوۃ العارفین عمدۃ السالکین قطب العارفین شیخ سعد خیر آبادی قدس سرہٗ"۔[2]

فاضل مصنّف مخدوم شیخ کمال بن سراج الاسلام محمود کے مرید تھے۔ مؤخر الذکر بزرگ شیخ سعد کے برادر زادے اور جانشین تھے۔ شیخ کمال کو اپنے بزرگوں سے جو خرقہ ملا تھا' وہ انہوں نے فاضل مصنف کو پہنایا تھا۔

تحفۃ السعداء کی تصنیف کے بارے میں مصنّف لکھتے ہیں کہ ان کی یہ دیرینہ آرزو تھی کہ وہ شیخ سعد کے سوانح مرتب کریں لیکن فرصت عنقا تھی۔ جب ان کے فرزند شاہ حمید ابو الفیض نے اصرار کیا تو انہوں نے ہامی بھر لی اور اس کام کو انجام تک پہنچا دیا[3]۔ تحفۃ السعداء کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "الحمد للہ والصلوٰۃ علیٰ نبیہ محمد الداعی الی الحق و طریقتہ صلی اللہ علیہ وسلم و علیٰ آلہ و شیعتہ..."

شیخ سعدؒ نسباً بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جدِ امجد قاضی قُدوۃ الدین المعروف بقاضی قُدوہ رُوم سے ہندوستان آئے۔ سلطانِ وقت نے ان کی بڑی قدر کی اور انہیں اجودھیا میں جاگیر عطا کی۔ ان کی اولاد' جو قِدوائی کہلاتی ہے' بارہ بنکی کے نواح میں خوب پھلی پھولی۔ شیخ سعد قاضی قُدوۃ کے فرزند قاضی موفق کی اولاد سے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تصنیف تحفۃ المحمود میں اپنا نام یوں لکھا ہے: "اضعف العباد القوی العالی سعد بن مکرم المعروف بقاضی بڈہن البلخی القرشولی۔"[4]

---

۱ - خواجہ جمال' تحفۃ السعداء' مخطوطہ رضا لائبریری رام پور' نمبر فارسی سلوک ۲۳۴۲۔

۲ - ایضاً" ورق ۱ الف۔

۳ - ایضاً"۔

۴ - ایضاً' ورق ۱۸ الف۔

شیخ سعد کا اصل وطن اُتام تھا لیکن حصول علم کی خاطر انہوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ موصوف نے پچاس سال تحصیلِ علم میں صرف کئے۔ ان کے اساتذہ میں ملک العلماء بدر السلطان قاضی شیخ بن شیخ مرتضیٰ برادرزادۂ اُستاد الائمہ منتجب بن علاء کا نام سرفہرست ہے[1] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان کے ایک استاد مولانا اعظم کا ذکر کیا ہے' جو اپنے عہد کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ شیخ سعد علوم شریعت و طریقت کے عالم ہونے کے علاوہ نحو' فقہ اور اُصول میں بھی بڑا ادراک رکھتے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف اور شارح تھے۔ ان کی تصانیف میں انہوں نے شرح مصباح' شرح حسامی' شرح بزدوی' شرح رسالۂ مکیّہ اور مجمع السلوک کا ذکر کیا ہے۔ آخر الذکر کتاب میں انہوں نے اپنے مرشد مخدوم شاہ مینا لکھنویؒ کے ملفوظات جمع کئے تھے اور یہ کتاب انہوں نے مخدوم جہانیاں کے ملفوظات، خزانۂ جلالی کی طرز پر قلمبند کی تھی[2] صاحب تحفتہ السعداء نے اس فہرست میں شرح اشعار لباب الاعراف المعروف بہ تحفتہ المحمود' رسالہ اجابتِ سماع اور خواب نامہ کا اضافہ کیا ہے۔ تحفتہ المحمود انہوں نے اپنے بھتیجے اور جانشین سراج الاسلام محمود کی خاطر لکھی تھی' اس لئے ان کے نام کی مناسبت سے یہ تحفتہ المحمود کے نام سے مشہور ہو گئی[3]

شیخ سعد' مخدوم شاہ میناؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ موصوف اپنی بیعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب وہ مخدوم صاحب کی خدمت میں بغرضِ بیعت حاضر ہوئے تو انہوں نے ان سے روزہ رکھوایا اور نمازِ عشا کے بعد غسل کروایا۔ بعد ازاں مخدوم صاحب نے انہیں قبلہ رُو بٹھایا اور خود قبلے کی جانب پشت کر کے بیٹھے۔ مخدوم صاحب نے انہیں خوشبو عنایت فرمائی جو انہوں نے اپنے محاسن پر ملی۔ اس کے بعد مخدوم صاحب نے انہیں تلقین کی اور سند عطا فرمائی۔ شیخ سعد نے اپنی تصنیف شرح رسالۂ مکیّہ میں تلقین کی سند یوں نقل کی ہے:

سعد بڈھن از شیخ محمد بن قطب (شیخ میناؒ) از شیخ سارنگ از مخدوم یوسف ایرجی از مخدوم جہانیاں از شیخ امام الدین گازرونی از شیخ اوحد الدین عبداللہ بن مسعود از شیخ اصیل الدین از شیخ رکن الدین ابی القاسم از شیخ قطب الدین بن ابی رشید احمد بن محمد بن صفی ابہری از شیخ ضیاء الدین ابو نجیب عبدالقاہر سہروردی از شیخ ابی احمد غزالی از ابی حفص عمر بن محمد عمویہ سہروردی از

---

۱ - خواجہ جمال' تحفۃ السعداء' مخطوطہ رضا لائبریری رام پور' نمبر فارسی سلوک ۲۳۴۲' ورق ۱۸ ب

۲ - شیخ عبدالحق' اخبار الاخیار' مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ' ص ۱۹۳۔

۳ - خواجہ جمال' تحفۃ السعداء' ورق ۱۸ الف۔

شیخ ممشاد دینوری از خواجہ جنید از خواجہ سری سقطی از خواجہ معروف کرخی از خواجہ داؤدطائی از حبیب عجمی از خواجہ حسن بصری از سیدنا علیؓ از احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

اس فہرست میں شیخ قوام الدینؒ کا نام غائب ہے۔ فاضل مصنف نے اس کی یہ توضیح کی ہے کہ شیخ سارنگ نے شیخ قوام الدینؒ سے اپنے دورِ امارت میں فیض اخذ کیا تھا اور مخدوم یوسف ایرچی سے ترکِ دنیا کے بعد صحبت رہی تھی' اس لئے انہوں نے اپنی زندگی کے اوّلین دور کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ بدیں وجہ اس فہرست سے شیخ قوام الدینؒ کا نام غائب ہے۔ ایک دوسرے واسطے سے مخدوم یوسف ایرچی کو شیخ قوام الدینؒ سے بھی فیض ملا تھا' اس لئے ان کا شمار بھی مخدوم صاحب کے مشائخ میں ہوتا ہے۔[2]

شیخ سعد کے مرشد

شیخ سعد حضرت شیخ محمد بن شیخ قطب المعروف بہ شاہ میناؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شاہ میناؒ کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ شیخ قطب امیر تیمور کے حملے سے قبل دہلی سے ترکِ سکونت کر کے جون پور چلے گئے۔ جون پور اس زمانے میں شاہانِ شرقی کا پایۂ تخت تھا اور وہاں علماء و فضلاء کی کمی نہ تھی۔ اس کے باوجود شیخ قطب کی طبیعت جون پور سے اچاٹ ہو گئی اور وہ دلمو چلے گئے۔[3] کچھ عرصے کے بعد انہوں نے دُوبارہ رختِ سفر باندھا اور دلمو سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں جا بسے۔[4]

جس زمانے میں شیخ قطب لکھنؤ پہنچے ان دنوں وہاں شیخ قوام الدینؒ کے زہد و ورع کا بڑا شہرہ تھا۔ موصوف ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر انہی کے ہو کر رہ گئے۔ شیخ قطب ابھی تک مجرّد تھے۔ حضرت قوام الدینؒ کے حکم سے انہوں نے شادی کر لی۔ حضرت نے انہیں بشارت دی کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا جو چشتیہ سلسلے کا نام روشن کرے گا۔[5]

شیخ قوام الدین کا اکلوتا بیٹا نظام الدین فوت ہو گیا تو انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: "میں نے اپنے بیٹے کی جگہ خدا سے تمہارے لئے بیٹے کی دعا کی ہے۔ اس کا نام شیخ محمد مینا ہو گا

۱- خواجہ جمال' تحفۃ السعداء' ورق ۲۱ ب۔
۲- "ایضاً" ورق ۲۲ ب۔
۳- دلمو' کان پور۔ اناؤ- رائے بریلی ریلوے لائن پرکان پور سے ۹۹ کلو میٹر اور رائے بریلی سے ۲۹ کلو میٹر پر اودھ کا ایک مشہور قصبہ ہے۔
۴- میر سید محی الدین رضوی' ملفوظات شاہ مینا'مطبوعہ مطبع مرقع عالم ہردوئی'ص ۳۔
۵- "ایضاً"۔

اور وہ نظام الدین کا نعم البدل ہو گیا۔

شاہ مینا ۸۰۰ھ (۱۳۹۳ء) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت شیخ قوام الدین نوت ہو چکے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی اہلیہ نے ان کی تربیت کی۔ جب شاہ مینا لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئے تو شیخ قوام الدین کے ایک مرید قاضی فریدوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ قاضی فریدوں نے انہیں کافیہ پڑھایا اور باقی ضروری علوم انہوں نے قاضی منتجب الدین سے پڑھے۔ شاہ مینا نے عوارف المعارف کے چند اسباق شیخ اعظم ثانی سے پڑھے علوم ظاہری سے فراغت کے بعد موصوف شیخ قوام الدین کے خلیفہ حضرت شیخ سارنگ[۲] کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

شاہ مینا کے ملفوظات ان کے ایک مرید سیّد محی الدین رضوی نے جمع کئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اچھے پڑھے لکھے بزرگ تھے اور انہوں نے اس زمانے میں مروجہ تصوّف کو عجمی اور ہندی اثرات سے پاک کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

شیخ سعد فرماتے ہیں کہ انہوں نے بیس سال شاہ مینا کی خدمت میں گزارے۔ اس دوران میں انہوں نے ان کو ٹانگیں دراز کر کے بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ شاہ صاحب ہمیشہ قبلہ رُو بیٹھا کرتے تھے۔ وہ نہ تو کھانے کی فرمائش کرتے اور نہ ہی اچھا کپڑا سلواتے۔ ان کا قول ہے: جو صوفی اچھا کھائے پیئے یا پہنے وہ صوفی نہیں بلکہ راہزنِ دینِ مصطفیٰ ہے۔ صوفی کو چاہئے کہ ہمیشہ وضو کر کے کھانا کھائے تاکہ شیطان اس کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو۔ کھانے کے دوران بھی وہ تسبیح جاری رکھے اور کھانے سے فارغ ہو کر وضو کرے تاکہ کھانا بوجھ نہ بنے۔

شاہ مینا ۸۸۴ھ (۱۴۷۹ء) میں فوت ہوئے۔ ان کی درگاہ میڈیکل کالج لکھنؤ کے چوک میں واقع اور مرجع خلائق ہے[۳]۔ ۱۹۷۷ء میں کندھی لال نامی ایک ہندو کی بیوہ نے چالیس ہزار رُوپوں کی لاگت سے ان کا مقبرہ بنوایا ہے جو ایک غیر مسلم کی طرف سے شاہ مینا کے ساتھ عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

شیخ سعد کے دادا مرشد

شیخ سعد کے دادا مرشد شیخ سارنگ[۱] کا شمار سلطان فیروز تغلق کے درباری امرا میں ہوتا

۱- ایضاً" عبداللہ خویشگی معارج الولایت میں لکھتے ہیں کہ شیخ قوام الدین نے یہ بات ... قطب سے کی تھی۔ (معارج الولایت مخطوط پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ نمبر ۲۵ - ۱۱ ورق ۱۰۲ ب)۔ ملفوظات شاہ مینا کے مقابلے میں معارج الولایت بہت بعد کی تصنیف ہے اس لئے سید محی الدین رضوی کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۲- شیخ عبدالحق، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۱۵۵۔

۳- راقم الحروف نے ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء کو اور پھر ۱۹ اگست ۱۹۸۱ء کو مخدوم شاہ مینا کے مزار پر حاضری دی ہے۔ ان کے مزار پر ہر وقت رونق رہتی ہے۔

تھا۔ زمانۂ امارت میں وہ بارہ ہزار سواروں کے کمان دار تھے۔ عبداللہ خویشگی کی روایت ہے کہ ان کی بہن محمد بن سلطان فیروز تغلق کے عقد میں تھی اور ان کا زیادہ تر وقت سلطان فیروز تغلق کی صحبت میں گزرتا تھا۔ ان دنوں وہ ملک سارنگ کے نام سے مشہور تھے[۱] زمانۂ امارت میں وہ شیخ قوام الدین سے اخذ فیض کرتے رہے اور انہوں نے اسے اپنے حلقۂ مریدین میں داخل کر کے چشتیہ سلسلے میں خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔

جب کبھی مخدوم جہانیاںؒ یا ان کے بھائی راجو قتالؒ اُوچ سے دہلی تشریف لاتے تو سلطان فیروز تغلق ان ہی کے ہاتھ انہیں کھانا بھیجا کرتا تھا۔ حضرت راجو قتالؒ کی تلقین سے انہوں نے نماز شروع کی۔ ایک روز انہوں نے ملک سارنگ کو مخدوم جہانیاںؒ کا پس خوردہ کھلایا اور اس کے ساتھ ہی ان کا باطن روشن ہو گیا[۲] دوسری بار جب حضرت راجو قتالؒ دہلی تشریف لائے تو انہوں نے ملک موصوف کو اشراق اور چاشت کی نمازیں ادا کرنے کی تلقین فرمائی اور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ مخدوم جہانیاںؒ نے بھی انہیں یہ شرف بخشا۔ کچھ عرصے بعد ان بزرگوں کی توجہ کا اثر ظاہر ہوا اور وہ تمام مال و اسباب لٹا کر حجاز مقدس چلے گئے۔

حرم شریف میں شیخ سارنگ شیخ وقت حضرت یوسف ایرجی سے فیض یاب ہوئے۔ حرمین شریفین سے واپسی پر وہ سیّد راجو قتالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سہروردی سلسلے میں خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور اپنے بزرگوں کی امانتیں ان کے سپرد کیں[۳] شاہ میناؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: "شیخ سارنگؒ ہمیشہ زبانی اور عملی طور پر ان دونوں بزرگوں کی اتباع کیا کرتے تھے اور وہ ان کی اطاعت سے تجاوز نہیں فرماتے تھے[۴]

عبداللہ خویشگی کی روایت ہے کہ سلطانِ وقت نے ان کی خانقاہ کے اخراجات کے لئے جاگیر دینا چاہی تو انہوں نے قبول کرنے سے معذرت چاہی اور فرمایا کہ وہ اس دلدل سے نکل آئے ہیں[۵] شیخ سارنگؒ نے بڑی طویل عمر پائی۔ شیخ سعد فرماتے ہیں کہ ان کی عمر ۱۲۰ سال کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ پیر فانی ہو گئے تھے اور ان میں رُوزہ رکھنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ ایک بار وہ رمضان المبارک میں دن کے وقت کھانا تناول فرما رہے تھے۔ شاہ مینا ان کے پاس بیٹھے

۱- عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۲۱۴ ب۔
۲- محمد اسلم، احوال و آثار مخدوم شاہ مینا لکھنویؒ، مطبوعہ ندوۃ المصنفین لاہور، ص ۷۔
۳- شیخ عبدالحق محدثؒ، اخبار الاخیار، ص ۱۵۵۔
۴- سیّد محی الدین رضوی، ملفوظات شاہ میناؒ ص ۳۴۔
۵- عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۲۱۵ ب۔

ہوئے تھے کہ معاً" ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر شیخ سارنگؒ اپنا پس خوردہ انہیں عنایت فرمائیں تو وہ اس کے عوض بطور کفارہ ساٹھ روزے رکھنے کو تیار ہیں۔ شیخ سارنگؒ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا "تم قطب ہو۔ میں تمہیں خلافِ شریعت حکم نہیں دے سکتا۔ میں تو معذور ہوں۔ اگر رات کو کچھ کھایا تو اس میں سے دے دوں گا۔"[1]

شیخ سعد فرماتے ہیں کہ انہوں نے لکھنؤ سے بارہ کوس کے فاصلے پر" مجھ" گاؤں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت اور ریاضت میں گزرتا تھا۔ ایک بار حضرت راجو قتالؒ نے انہیں خرقۂ خلافت بھیجا تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا کہ وہ اس لائق کہاں ہیں کہ بزرگوں اور ولیوں جیسا لباس پہنیں۔ اس پر حضرت راجو قتالؒ نے پیغام بھیجا کہ انہوں نے وہ خرقہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم سے بھیجا ہے۔ اس واقعے کے بعد اگر کوئی شخص اودھ سے حضرت راجو قتالؒ کے پاس مرید ہونے کی غرض سے جاتا تو وہ اسے مرید نہ کرتے بلکہ شیخ سارنگؒ کا مرید ہونے کا مشورہ دیتے۔ حضرت راجو قتالؒ فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے اس نواح میں شیخ سارنگؒ کو نصب کیا ہے۔[2]

شیخ سارنگؒ نے اپنی حیات میں صرف تین اصحاب، شیخ حسام الدین صُوفی، شاہ مینا اور اپنے پوتے شیخ محمد کو خلافت سے نوازا۔[3] انہوں نے سولہ ماہِ شوال ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء کو وفات پائی اور" مجھ" گاؤں میں دفن ہوئے۔ ان کا مزار" مجھ" گاؤں میں مرجع خلائق ہے۔ ایک زمانے میں یہ قصبہ ان کے نام کی مناسبت سے سارنگ پور بھی مشہور ہو گیا تھا۔

شیخ سعد کے پَرداد مرشد

شیخ سعد کے پردادا مرشد شیخ قوام الدینؒ کا ذکر اخبار الاخیار میں صرف ڈیڑھ سطر میں آیا ہے۔[4] عبداللہ خویشگی نے بھی معارج الولایت میں ان کے لئے صرف ایک صفحہ وقف کیا ہے لیکن اس میں بھی کام کی باتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔[5] ملفوظاتِ شاہ مینا اور تحفۃ السعداءؒ میں شیخ قوام الدینؒ کا ذکر بار بار آیا ہے اور وہیں سے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

۱۔ خواجہ جمال، تحفۃ السعداءؒ ورق ۶ ب، ۷ الف۔
۲۔ ایضاً" ورق ۶ ب۔
۳۔ سید محی الدین، ملفوظات شاہ مینا، ص ۲۳۴۔
۴۔ شیخ عبدالحق، اخبار الاخیار، دہلی: ۱۳۳۲ھ، ص ۱۵۵۔
۵۔ عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۱۸۴ ب۔

شیخ قوام الدین نسلاً عباسی اور کڑہ (مانک پور) کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار چشتیہ سلسلے کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ ان کی روحانی تربیت حضرت مخدوم جہانیاں نے کی تھی۔ موصوف کو مخدوم صاحب کے بھائی اور جانشین سید محمد بن احمد الحسینی المعروف بہ راجو قتالؒ کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی شرف حاصل تھا۔

شیخ قوام الدینؒ نے سلسلہ چشتیہ میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ انہوں نے سات بار حج کی سعادت حاصل کی تھی[۱]۔ شاہ مینا اپنی گفتگو میں شیخ قوام الدینؒ کو مختسبِ عارفاں یا مختسبِ درویشاں کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے[۲]۔ ایک بار انہوں نے درویشی کے معیار کے بارے میں فرمایا: "اے درویش! درویشی کی کسوٹی اور معیار کتاب، سنّت اور اسلاف کی سیرت ہے، جو ہمارے مقتداء تھے۔ صرف اجازت ملنے یا بابرکت جگہ پر بیٹھنے سے کام نہیں بنتا کہ یہ فلاں بزرگ کا فرزند ہے جو اپنے بزرگوں کی مسند پر براجمان ہے اور اگر یہ اس مقام پر بیٹھنے کے لائق نہ ہوتا " کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ یہ بات محقق ہے کہ انسان کا شرف زمان ومکان سے وابستہ نہیں بلکہ تقویٰ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[۳]

ملفوظاتِ شاہ مینا کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ قوام الدینؒ شعر کہہ لیتے تھے۔ سید محی الدین رضوی نے ان کے چند اشعار تبرکاً نقل کئے ہیں۔ موصوف صاحبِ تصنیف بزرگ تھے اور ان کی تصانیف میں سے معیار التصوف، ارشاد الطالبین اور اساس الطریقتہ کا ذکر ملفوظات میں ملتا ہے[۴]۔

اہلِ سنّت عموماً آئمۂ اربعہ میں سے کسی ایک امام کے مقلد ہوتے ہیں لیکن ملفوظاتِ شاہ مینا کے مطالعہ سے یہ عجیب انکشاف ہوا کہ شیخ قوام الدین سُنّی ہونے کے باوجود حضرت جعفر صادقؒ کے فقہی مسلک پر کاربند تھے[۵]۔ ایسی مثال صوفیوں کے کسی تذکرے میں ہماری نظروں سے نہیں گزری۔

شیخ عبدالحق محدثؒ اور عبداللہ خویشگی نے شیخ قوام الدین کا سنِ وفات نہیں لکھا۔ ملفوظاتِ شاہ مینا میں مرقوم ہے کہ موصوف شاہ میناؒ کی ولادت سے چالیس روز پہلے فوت ہوئے تھے[۶]۔

---

۱ - خواجہ جمال، تحفتہ السعداء ورق ۲ الف۔

۲ - سید محی الدین، ملفوظاتِ شاہ مینا، ص ۳۳، ۷۵۔

۳ - ایضاً، ص ۷۹۔

۴ - ایضاً، ص ۷۵، ۱۱۸، ۱۵۷۔

۵ - سید محی الدین، ملفوظاتِ شاہ مینا، ص ۸۳ --- بر مذہب امام جعفر رضی اللہ عنہ بودہ است۔

۶ - ایضاً، ص ۴۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) میں ہوا تھا۔ شیخ قوام الدینؒ کا مزار میڈیکل کالج لکھنؤ کے کیمپس میں نرسز ہوم کے قریب واقع ہے۔ شاہ مینا کی درگاہ سے اس کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ ہو گا۔

حضرت سعدؒ، شاہ میناؒ، شیخ سارنگؒ اور جناب قوام الدینؒ کے جانشین اور ان کے مسلک پر گامزن تھے۔ خواجہ جمال ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ موصوف "قولا" اور "فعلا" اپنے مرشد کا اتباع کیا کرتے تھے۔[۱] اپنے اسلاف کی طرح شیخ موصوف بھی مروّجہ تصوف کو قرن اول کا "احسان" بنانے میں کوشاں رہے۔ ان کا یہ قول سنہری حروف میں لکھنے کے لائق ہے کہ اگر شیخ کا قول و فعل، کتاب، سنّت اور اجماع صحابہ کے خلاف ہو جائے تو وہ شیخی کے لائق نہیں رہتا۔[۲]

شاہ مینا کی وفات کے بعد شیخ سعدؒ چھ سال تک لکھنؤ میں مقیم رہے۔ تحفتہ السعداء کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ ان کے وہاں قیام سے خوش نہ تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ باہر سے یہاں آ کر شاہ میناؒ کے جانشین بن گئے ہیں۔ ایک روز کسی شخص نے لکھنؤ کے علماء و مشائخ کی دعوت کی۔ شیخ سعد کی آمد سے قبل علماء و مشائخ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ انہیں صدر مجلس نہیں بنائیں گے۔ جب یہ وہاں پہنچے تو محفل کا رنگ دیکھ کر صفِ نعال کے قریب بیٹھ گئے۔ کھانا شروع ہونے سے قبل اتفاقاً سلطان سکندر لودھی کا ایک امیر سعید خان لودھی دس ہزار لشکریوں کے ساتھ ان کی زیارت کو وہاں پہنچ گیا۔ اس نے شیخ سعدؒ کے قدموں میں بیٹھنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھا۔ اس کے لشکریوں نے شیخ موصوف کی تعظیم میں اتنا غلو کیا کہ حاضرین مجلس کی پگڑیاں گر گئیں اور بہت سے علماء کو وہاں بیٹھنے کو جگہ نہ ملی۔ کھانے کے بعد علماء و مشائخ اپنے کئے پر نادم ہوئے۔[۳]

شیخ سعدؒ کو ان کے حسد سے بڑا رنج پہنچا۔ انہی دنوں شاہ مینا مرحوم نے انہیں خواب میں خیر آباد جانے کا اشارہ کیا۔ موصوف شاہ میناؒ کی خانقاہ اپنے بھتیجے شیخ نصیرالدینؒ کے سپرد کر کے خیرآباد روانہ ہو گئے۔ شیخ نصیرالدینؒ کے ناخلف فرزندوں نے خانقاہ کی تمام وقف اراضی فروخت کر دی۔ شیخ سعد نے گومتی کے کنارے ایک خانقاہ تعمیر کروائی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسافروں کے آرام کے لئے ایک سرائے تعمیر کروائی تھی، وہ بھی دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب تباہ ہو گئی۔ البتہ انہوں نے بانگرمئو میں جو خانقاہ بنوائی تھی، وہ ان کے بھتیجے شیخ ابراہیم نے آباد رکھی۔[۴]

۱ - خواجہ جمال، تحفتہ السعداء ورق ۱۸ الف۔
۲ - ایضاً، ورق ۳ ب۔
۳ - ایضاً، ورق ۲۲ ب۔
۴ - خواجہ جمال، تحفتہ السعداء ورق ۲۲ ب۔

خیر آباد میں قیام

شیخ سعد لکھنؤ سے خیرآباد چلے آئے۔ اس زمانے میں سلطان سکندر لودھی کے رشتے دار میاں راجی اور میاں موسیٰ وہاں کے حاکم تھے۔ شیخ موصوف نے شہر سے باہر ایک ویران جگہ دیکھ کر وہاں ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے میں قلعے سے لے کر ان کی خانقاہ تک ایک سپاٹ میدان تھا اور شہر میں شرفاء کی کمی تھی۔ ان کے وہاں جانے کے بعد شرفاء اور اعیان وہاں آ کر آباد ہو گئے۔

حاکمانِ شہر کا وکیل برخوردار شیخ سعدؒ کا مرید ہو گیا۔ ایک دن وہ اپنے مالکوں کے ساتھ شکار پر گیا تو اثنائے سفر میں امساک باراں کا ذکر شروع ہوا۔ میاں راجی اور میاں موسیٰ نے برخوردار سے کہا کہ اگر آج بارش ہو جائے تو وہ اس کے مرشد کی بزرگی کے قائل ہو جائیں گے۔ اگر شیخ موصوف عند الملاقات ان دونوں کو الگ الگ رنگ کی ٹوپیاں عطا فرمائیں تو وہ ان کے مرید ہو جائیں گے۔ خواجہ جمال لکھتے ہیں کہ جب وہ دونوں شیخ سعدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان میں سے ایک کو سبز رنگ کی اور دوسرے کو زرد رنگ کی ٹوپی عطاء فرمائی اور اس روز خوب زور کی بارش ہوئی۔ انہوں نے حضرت کی یہ کرامت دیکھ کر دو گاؤں خانقاہ کے اخراجات کے لئے نذر کئے۔[1]

تحفۃ السعداءؒ میں مرقوم ہے کہ قصبہ اور قلعہ خیر آباد کا بانی یوسف خان غازی تھا۔ وہ کسی حاکم کی طرف سے وہاں امیر مقرر ہو کر آیا تھا۔ اس کا مقبرہ وہیں ہے۔ اس کی وفات کے بعد اس کے سپاہی منتشر ہو گئے اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کو ضعف پہنچا۔ جب حضرت سعدؒ خیر آباد تشریف لائے تو اس وقت یوسف خان کا فرزند نصرت خان وہاں موجود تھا لیکن وہ کافی معمر ہو چکا تھا۔ ایک روز نُصرت خان حضرت سعدؒ سے ملنے آیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ اس کا والد کہا کرتا تھا کہ وہ گھر بنا رہا ہے لیکن اس کا مالک کوئی اور ہو گا۔ اب آپ یہاں تشریف لے آئے ہیں' لہٰذا آپ ہی خیرآباد کے مالک ہیں۔[2]

ایک دن ایک جوگی حضرت سعدؒ سے ملنے آیا۔ اس نے دیکھا کہ ان کی خانقاہ میں لنگر جاری ہے لیکن حضرت خود بڑے لاغر ہو رہے ہیں۔ اس نے خیال کیا کہ موصوف شاید لنگر کے اخراجات کے لئے فکر مند رہتے ہیں' اس لئے اس نے کیمیا گری سے کمائی ہوئی کچھ رقم نذر کرنی چاہی۔ حضرت سعد نے وہ رقم لینے سے انکار کر دیا اور ایک مرید سے کہا کہ اسے ان کے

---

۱ - ایضاً" ورق ۲۳ الف۔

۲ - خواجہ جمال' تحفۃ السعداءؒ ورق ۲۵ ب۔

حجرے میں لے جائے۔ جوں ہی وہ جوگی حجرے میں داخل ہوا' اس نے دیکھا کہ وہاں سونے چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ جوگی سمجھ گیا کہ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔[1]

حضرت سعدؒ کی زندگی میں فتح خان خیر آباد کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے وہاں ایک سرائے بھی بنوائی تھی جو اس کے نام کی مناسبت سے سرائے فتح خان کہلاتی تھی۔ فتح خان بڑا ظالم تھا اور خواص و عوام اس کے ظلم سے نالاں تھے۔ ایک بار وہ کہیں باہر گیا تو لوگوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ چند روز بعد جب اس کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو لوگ فریاد کرتے ہوئے حضرت سعد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے سلطان المشائخؒ اور سلطان غیاث الدین تغلق کا واقعہ بیان کر کے فرمایا "ہنوز دِلّی دُور است۔" حاضرین نے عرض کیا کہ وہ تو خیر آباد کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ آپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ جب فتح خان آبادی کے قریب پہنچا تو اس نے رخ پھیر کر کسی سے بات کرنی چاہی تو اس کا چہرہ مڑا کا مڑا رہ گیا۔ اطباءاس کے علاج سے عاجز آ گئے اور بالآخر وہ دو تین روز بعد مر گیا۔[2]

خیر آباد پر غیر مسلم کا تسلّط

تحفۃ السعداٗ میں مرقوم ہے کہ خیر آباد کا چودھری، کہرو نام، چمار برادری کا فرد تھا۔ حضرت سعدؒ اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ ایک روز میاں قاضی راجا نے ان سے کہا کہ وہ ایک کافر چمار کی اتنی تعظیم کیوں کرتے ہیں؟ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ وہ محض لوگوں کو اس کے ظلم سے بچانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ایک روز وہ حضرت سعدؒ سے ملنے آیا تو آپؒ نے لوگوں کے اصرار پر اس کی تعظیم نہ کی۔ وہ ان کی مجلس سے دل گیر ہو کر واپس گیا اور رعایا پر ظلم ڈھانے لگا۔ لوگ تنگ آکر حضرت کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت نے فرمایا "میں نہ کہتا تھا کہ میں تمہاری ہی خاطر اس کی تعظیم کرتا ہوں۔" حضرت سعدؒ نے میاں قاضی راجا کو کہرو کے پاس بھیجا' لیکن اس نے اقتدار کے نشے میں ان کی نصیحت پر کان نہ دھرے۔

اتفاق سے ایک روز اس کا بیٹا گھوڑے سے گر گیا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ کہرو بھاگا بھاگا شیخ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے کئے پر نادم ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ آئندہ کے لئے توبہ کرتا ہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا' "تیر بہدف رسید۔" کہرو ان کی مجلس سے مایوس ہو کر لوٹا اور کچھ دیر بعد اس کا بیٹا مر گیا۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۳۶ الف۔

۲ - ایضاً" ورق ۲۹ ب۔

خیر آباد کا حاکم آگرہ میں رہتا تھا۔ کہرو اس کے پاس پہنچا۔ اس کے دل میں شیخ سعدؒ اور خیر آباد کی رعایا کے خلاف عناد تھا اس لئے اس نے حاکم سے کہہ سن کر خیر آباد کی ایک لاکھ بیگھ اراضی جو آئمہ کے پاس تھی، اجارے پر لے لی۔ جب لوگوں کو اس کا علم ہوا تو وہ حضرت سعدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پیرا ہوئے، "ما مسلمانان از دستِ کافر ویران می شویم۔" حضرت نے اپنے ایک خلیفہ شیخ صفی سے کہا کہ ظالم کو دفع کرنے کے لئے کچھ پڑھیں۔ شیخ صفی نے کوئی وظیفہ پڑھا لیکن اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ اگلی شب ایک مرد بزرگ اس طرف آ نکلا۔ اس نے حضرت سعدؒ سے کہا "کہرو مرد بدّ بہ دُوزخ سپرد۔" اتفاق دیکھئے کہ جب کہرو حاکم کے پاس موجود تھا، کسی شخص نے حاکم سے کہا کہ کہرو جادو ٹونے کا بڑا ماہر ہے۔ حاکم نے اس سے کہا کہ وہ یہ علم اسے بھی سکھا دے۔ کہرو نے انکار کیا تو حاکم نے طیش میں آ کر اسے قتل کروا دیا۔[1]

سلطان سکندر لودھی

خواجہ جمال رقمطراز ہیں کہ ایک بار سلطان سکندر لودھی کٹرہ سے شیخ سعدؒ کی ملاقات کو آیا۔ حضرت نے حسب معمول اس کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ سلطان سکندر ناراض ہو کر واپس چلا گیا۔

ایک بار جب حضرت سعدؒ آگرہ میں تھے تو سلطان سکندر نے حکم دیا کہ انہیں کشتی میں بٹھا کر دریا کے وسط میں لے جائیں اور کشتی غرق کر دیں۔ سلطان کے حکم سے فیل بانوں نے ایک مست ہاتھی کشتی کی طرف بڑھایا۔ اس وقت میاں موسیٰ اور میاں راجی سکندر لودھی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ سلطان نے ان سے کہا کہ ان کا پیر دریا میں غرق ہوا چاہتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ان کا پیر ایسا نہیں ہے کہ دریا میں غرق ہو جائے۔ اتفاق سے دریا پایاب ہو گیا اور شیخ سعدؒ اپنے ساتھیوں سمیت پار ہو گئے۔[2]

تحفۃ السعداءؒ میں مرقوم ہے کہ آگرہ میں قیام کے دوران میں شیخ سعدؒ کھانے پینے میں بڑی احتیاط کیا کرتے تھے۔ جن دنوں ان کا قیام لشکر میں تھا تو لشکریوں نے ایک گاؤں لوٹ لیا۔ شیخ نے گیارہ روز تک کھانا نہیں کھایا۔ بارھویں روز محمد بن من اللہ کسی متقی امیر کے گھر سے کھانا لائے تو حضرت سعدؒ نے فاقہ توڑا۔[3]

خواجہ جمال لکھتے ہیں کہ ایک بار حضرت سعدؒ دہلی جاتے ہوئے بداوں سے گزرے۔ ان دنوں وہاں مخدوم بدر الدین کے زہد و ورع کا بڑا چرچا تھا۔ حضرت سعدؒ چنڈول میں سوار ہو کر

۱۔ خواجہ جمال، تحفۃ السعداءؒ ورق ۳۰ الف، ۳۰ ب، ۳۱ الف۔
۲۔ ایضاً، ورق ۲۴ الف۔
۳۔ ایضاً۔

مخدوم صاحب سے ملنے گئے۔ مخدوم صاحب کے ایک خادم نے ان سے کہا کہ مخدوم صاحب کی خانقاہ کا انتظام [illegible] لیکن وہ خادم ایک بچی کا [illegible] ہوئے تھا۔ شیخ نے اسے [illegible] بچیوں ہی کی ولادت [illegible] کے بعد ان سے بچیاں ہی پیدا ہوئی ہیں۔ اس نے مخدوم بدر الدین سے التجا کی کہ اس کے لئے بیٹے کی دعا کریں۔ انہوں نے فرمایا کہ خیر آباد جا کر حضرت سعد سے دعا کراؤ۔ وہ خیر آباد جا کر شیخ سے ملا تو انہوں نے فرمایا "برادرم بدر الدین نے تمہیں بھیجا ہے۔ جاؤ، خدا بیٹا دے گا۔" ۱؎

چاند موسیقار

تحفتہ السعداء میں مرقوم ہے کہ حضرت کی دعا سے چاند نامی ایک موسیقار نے نوعمری ہی میں سنگیت میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر سلاطین کے درباروں میں بڑا مقبول ہوا۔ اس کے بیٹوں نے بھی فن موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس کا ایک بیٹا شیخ پھول رباب بجانے میں اپنی نظیر آپ تھا۔ خواجہ جمال نے اس کی استادی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"در وادی نواختن رباب نادر العصر است۔ مقبول بادشاہ وقت است ہرکہ رباب او شنید است میداندکہ سحر پردازد۔" ۲؎

تحفتہ السعداء میں ایک جگہ کلاونت چھجو کا ذکر آیا ہے۔ وہ بھی اپنے زمانے کا بہترین رباب نواز تھا۔ شیخ بڈھن قنوجی اس عہد کے ایک نامور عالم اور زاہد تھے، وہ سماع کے منکر تھے۔ ایک بار حضرت سعدؒ کا ایک مرید بھون گاؤں سے خیر آباد جا رہا تھا۔ اتفاقاً قنوج میں اس کی ملاقات شیخ بڈھن سے ہوئی، تو انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے؟ اس نے عرض کیا کہ وہ اپنے پیر کی زیارت کے لئے خیر آباد جا رہا ہے۔ شیخ موصوف نے فرمایا، "تیرا پیر تو مسخرہ ہے، وہ سماع سنتا ہے"۔ جب وہ مرید خیر آباد پہنچا تو اس نے حضرت سعدؒ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے "ہندوی" میں فرمایا "وہ کندھت ناچی گا۔"

کچھ عرصہ بعد حضرت سعدؒ کا قنوج جانا ہوا تو موصوف نے شیخ بڈھن کی خانقاہ میں قیام کیا۔ انہوں نے ایک روز سماع سننے کی خواہش کا اظہار کیا تو لوگ قوالوں کو بلا لائے۔ شیخ بڈھن نے قوالوں کو آتے دیکھا تو اپنے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت سعدؒ نے انہیں پیغام بھجوایا کہ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ میزبان مہمان کو تنہا چھوڑ کر چلا جائے۔ مجبوراً شیخ بڈھن واپس

---

۱ ۔ خواجہ جمال، تحفتہ السعداء، ورق ۲۴ ب۔

۲ ۔ ایضاً، ورق ۳۲۔

آئے۔ دوران سماع جب حضرت سعدؒ کو وجد طاری ہوا تو انہوں نے شیخ بڈھن کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت ان پر بھی وجد طاری ہو گیا۔ شیخ بڈھن بے قرار ہو کر خانقاہ سے نکل گئے۔ قوالوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو وہ بھی ان کے ساتھ قنوج کے گلی کوچوں میں قوالی کرتے پھرتے رہے۔ اس واقعہ کے بعد شیخ بڈھن سماع کے قائل ہو گئے۔[۱]

شیخ سعدؒ فرماتے ہیں کہ خراسان کے ایک بزرگ شام گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے لوگوں سے کسی متقی عالم کا پتا پوچھا' لوگوں نے سعد الدین مفسر کا نام لیا تو وہ بزرگ ان سے ملنے گئے۔ جس وقت یہ ان کے ہاں پہنچے اس وقت وہ اپنے گھر کی دیواروں پر گوبر کا لیپ کر رہے تھے۔ اس بزرگ نے انہیں اس حال میں دیکھ کر فرمایا کہ یہ کیسے عالم اور متقی ہیں؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: واللہ یحب المطہرین' اور ان کے ہاتھ اور کپڑے گوبر سے سنے ہوئے ہیں۔[۲]

تحفۃ السعداء کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان ابراہیم لودھی کی تعلیم و تربیت شیخ بھکاری نے کی تھی۔ شیخ موصوف قصبہ اجولی کے رہنے والے تھے اور انہیں شیخ سعدؒ کے مدرسے سے سند فراغت ملی تھی۔ حضرت سعدؒ کے کہنے پر شیخ ابھن نے اپنی بیٹی کا عقد شیخ بھکاری کے ساتھ کر دیا تھا۔ سلطان ابراہیم نے تخت نشینی کے بعد اپنے استاد کا اتنا احترام کیا کہ انہیں منصب وزارت عطا کیا۔[۳]

مغلیہ عہد کے مؤرخوں نے ابراہیم لودھی کے ظالم و جابر ہونے کی گواہی دی ہے۔ میاں بھوہ اپنے زمانے کے نامور عالم اور ماہر موسیقار تھے۔ سلطان سکندر نے انہیں اپنا وزیر بنایا تھا۔ ابراہیم کے عہد میں علماء و امراء کی ناقدری شروع ہوئی تو کسی نے ابراہیم سے کہا کہ میاں بھوہ نے اسے "مشکِ سیاہ" کہا ہے۔ ابراہیم نے اتنی سی بات پر مشتعل ہو کر میاں صاحب کو خوب پٹوایا۔[۴] فاضل مرتب نے میاں بھوہ کے علاوہ محمد خان فرملی عرف کالا پہاڑ کے ساتھ ابراہیم کے نازیبا سلوک کا بھی ذکر کیا ہے۔[۵]

شیخ سعدؒ کی وفات

حضرت سعدؒ ۱۶ ربیع الاول ۹۲۲ھ / ۱۵۱۶ء کو بعمر ۱۰۸ سال فوت ہوئے۔ فیضی نے ان کی شان میں یہ اشعار کہے' جو ان کے مزار پر آویزاں ہیں:

۱۔ خواجہ جمال: تحفۃ السعداء؛ ورق ۲۶ الف۔
۲۔ ایضاً" ورق ۲۶ ب۔
۳۔ ایضاً" ورق ۲۷ ب۔
۴۔ ایضاً"۔
۵۔ ایضاً"۔

حیف آن شاہ ولایت شیخ سعد
گشت در فردوس اعلیٰ جا بگیر
بہ چو مخدوم کبیر اُو را لقب
لاجرم شد سال "مخدومِ کبیر"

شیخ سعدؒ کے خلفاء

حضرت سعدؒ نے اپنے بزرگوں کی روایت کے خلاف ۲۹ مریدوں کو خلافت عطا فرمائی۔ تحفۃ السعداء[۱] میں ان کے خلفا کے نام درج ہیں' جو یہ ہیں: شیخ محمود بلخی' شیخ مبارک لکھنوی' قاضی محمد' شیخ ملک شمس آبادی' شیخ چاند' قاضی راجا' میاں سکندر' قاضی بڈہ' شیخ ابراہیم بھوج پوری' شیخ ابراہیم راجو برادر زادہ خود' میاں شیخ صفی احمد ساکن سائے پور' شیخ گدن خیر آبادی' شیخ معظم گوپاموی' میراں سید حامد لکھنوی' شیخ محمود (سراج الاسلام) شیخ نصیر الدین برادر زادۂ خود' شیخ اعظم ساکن تلنبہ نو' میراں سید گسائیں بخاری' میراں سید ساکن کہری' شیخ نور الحق بجنوری ثم لکھنوی' شیخ رقاسم ساکن اجولی' شیخ بڈھن مبارک' میاں شیخ علاء الدین ارزانی' میاں بخش قاضی ساکن دانسو' شیخ مبارک ساکن ردودلی' میاں سید پیارے جون پوری' شیخ کدن صالح لکھنوی' میاں شیخ برہان اور ایک خلیفہ کا نام خواجہ جمال کو یاد نہیں رہا۔[۱]

شیخ سعدؒ کے جانشین

حضرت سعدؒ کی وفات کے بعد ان کے برادر زادے سراج الاسلام محمود بن شیخ محمد ان کے جانشین ہوئے۔ وہ بڑے خوش شکل تھے اور لوگ انہیں "یُوسف این اُمت است" کہا کرتے تھے۔ ان کے جود و سخا کا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ وہ اپنے عہد میں قرآن حکیم کے بہترین مفسر مانے جاتے تھے۔ ایک بار بابر بادشاہ انہیں ملنے آیا۔ ان سے ملاقات کے بعد اس نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ ایسے لوگ بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔

تحفۃ السعداء میں مرقوم ہے کہ ایک بار شہزادہ ہمایوں بابر سے ناراض ہو کر آگرہ سے دہلی چلا گیا۔ بابر نے سراج الاسلام سے کہا کہ اسے دلاسہ دیں اور سمجھا بجھا کر آگرہ واپس لے آئیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بادشاہ کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا۔[۲] سراج الاسلام نے بابر سے کہا کہ اگر وہ ان کے سامنے قسم کھائے کہ وہ اسے کسی قسم کا آزار نہیں پہنچائے گا تو پھر وہ اسے منانے جائیں گے۔ بابر نے قرآنِ حکیم ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ وہ ہمایوں کو کوئی آزار نہیں پہنچائے گا۔ اس کے بعد سراج الاسلام دہلی گئے اور ہمایوں کو سمجھا بجھا کر آگرہ لے آئے۔

۱ - خواجہ جمال' تحفۃ السعداء ورق ۲۰ الف۔

۲ - Kingship knows no Kinship

بابر نے ان کی اس خدمت سے خوش ہو کر ان کو سراج الاسلام کا خطاب عطا کیا اور خانقاہ کے اخراجات کے لئے ساٹھ ہزار بیگھ اراضی پیش کی۔[۱]

سراج الاسلام محمودؒ ۳ صفر ۹۳۸ھ (۱۵۳۲ء) کو فوت ہوئے تو اس وقت ان کے فرزند شیخ کمال کی عمر تین برس تھی۔ اس کے باوجود لوگوں نے انہیں اپنے والد کی مسند پر بٹھا دیا۔ موصوف نے ترپن سال کی عمر میں ۲۳ شعبان ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) کو وفات پائی۔ انہیں اپنے بزرگوں سے جو خرقہ ملا تھا وہ انہوں نے تحفتہ السعداء کے مرتب خواجہ جمال کو عطا فرمایا۔ خواجہ جمال نے ان کے لئے سلطان العاشقین اور برہان السالکین جیسے القاب استعمال کئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ مغل بادشاہ اکبر ان کا لحاظ کیا کرتا تھا۔[۲]

درگاہ شیخ سعدؒ، خیر آباد

خیر آباد، لکھنؤ سے سیتا پور جانے والی سڑک پر، لکھنؤ سے ۸۲ کلومیٹر کے فاصلے پر اَودھ کا ایک تاریخی قصبہ ہے۔ ماضی قریب میں ریاض خیر آبادی کی وجہ سے اس قصبے کو بڑی شہرت ملی ہے۔

خیرآباد میں یوں تو بہت سے بزرگوں کے مزارات ہیں، لیکن وہاں کی سب سے بڑی درگاہ، حضرت شیخ سعدؒ کی ہے۔ خیر آباد کے جنوب مغرب میں منشی نیاز احمد کے باغ کے قریب ایک بڑے احاطے میں حضرت سعدؒ کا مزار ہے۔ ان کے مزار پر ایک شاندار گنبد بنا ہوا ہے، جو دُور سے نظر آتا ہے۔ اسی احاطے میں ایک مسجد بھی ہے جس پر تین گنبد بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کی شمالی سمت ایک چھوٹا سا قبرستان بھی ہے جس میں برِعظیم پاک و ہند کے نامور عالم مولانا فضل امام خیر آبادیؒ (م ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء) اور مولانا عبدالحق خیر آبادیؒ (م ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ راقم الحروف نے ۲۱ اگست ۱۹۸۱ء کی شام خیر آباد میں گزاری اور وہاں کے تاریخی مقامات اور اکابر کے مزارات دیکھے۔

تحفتہ السعداء کی اہمیت

تحفتہ السعداء اس لحاظ سے بڑی اہم تصنیف ہے کہ اس میں شیخ قوام الدینؒ، شیخ سارنگؒ، مخدوم شاہ میناؒ، شیخ سعدؒ اور ان کے جانشینوں کے بارے میں بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔ شیخ

۱- خواجہ جمال: تحفتہ السعداء ورق ۴۶ الف۔

۲- ایضاً ورق ۴۷ ب۔

سارنگ کی تاریخ وفات اخبار الاخیار اور معارج الولایت میں نہیں ملتی۔ تحفتہ السعداءؔ میں ان کی تاریخ وفات درج ہے۔ شیخ موصوف کے بارے میں یہ اطلاع بھی خواجہ جمال ہی نے فراہم کی ہے کہ وہ زمانۂ امارت میں بارہ ہزار سواروں کے کمان دار تھے۔

حضرت راجو قتالؒ کا اصل نام سید محمد بن احمد الحسینی تھا لیکن وہ راجو قتالؒ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لقب کی توضیح کرتے ہوئے خواجہ جمال لکھتے ہیں کہ انہیں قتال اس لئے کہتے تھے کہ کوئی شخص ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ نیز حضرت کی زبان مبارک سے جو بات نکلتی، وہ پوری ہو کر رہتی۔[۱]

تحفتہ السعداءؔ ہی سے اس عہد کے دو مفسروں، حضرت سراج الاسلام محمودؒ اور بندگی میاں نظام الدین امیٹھویؒ کا پتہ چلا۔ اس تصنیف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانے میں مقامی حکام کا ظلم عام تھا۔ خواجہ جمال نے فتح خان اور چودھری کہرو کے ظلم و ستم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ لشکری بلاوجہ گاؤں لوٹ لیا کرتے تھے اور غریبوں کی کوئی داد فریاد نہ تھی۔

ایک موقعے پر خواجہ جمال لکھتے ہیں کہ زمیندار اور چودھری سرکاری واجبات ادا کرنے سے قاصر تھے۔ فتح پور کے چودھری میاں جنو کے ذمے بیس لاکھ ٹکے تھے لیکن اس میں یہ رقم ادا کرنے کی ہمت نہ تھی۔[۲]

تحفتہ السعداءؔ ہی میں بابر کے سراج الاسلام کے ساتھ تعلقات اور ہمایوں اور بابر میں رنجش کا ذکر آیا ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی انکشاف ہے۔ اس تصنیف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکبر شیخ کمال کا لحاظ کیا کرتا تھا۔

تحفتہ السعداء میں کوٹھی اور چنڈول جیسے ہندی الفاظ ملتے ہیں جو رُوزمرہ کی زبان میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ سعدؒ "ہندوی" زبان جانتے تھے۔ ان کے مرشد شاہ مینا بھی بلا تکلف "ہندوی" میں گفتگو کر لیتے تھے۔

ترقیمہ

تحفتہ السعداء ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: "تمام شد رسالہ مسمیٰ بہ تحفتہ السعداء بخط احقر العباد غریب داس بتاریخ سلخ ۳۰ شعبان ۱۱۷۵ ھجریہ روز شنبہ بحسب اتفاق آنجورس درمکان شاہ صفی اللہ نوّر اللہ مرقدہٗ۔"

---

۱ - خواجہ جمال، تحفتہ السعداءؔ ورق ۴ ب۔

۲ - ایضاً" ورق ۴۵ الف۔

تحفۃ المجالس

حضرت شیخ احمد کھٹو گنج بخشؒ کا شمار برِعظیم پاک و ہند کے اُن اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنہوں نے ہماری مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں اپنی سیرت اور کردار کے اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ راجستھان، گجرات اور کاٹھیاواڑ میں تبلیغِ اسلام اور تعمیرِ ملّت کے اہم فریضہ کو جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے شیخ موصوف نے انجام دیا ہے اس کی مثال برِعظیم کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

نام و نسب

شیخ احمد کھٹوؒ کا پیدائشی نام نصیر الدینؒ تھا[1]۔ ان کے آباء و اجداد کے بارے میں تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں۔ صرف اسی قدر تذکروں میں مرقوم ہے کہ ان کے اکابر کا شمار دہلی کے شرفاء میں ہوتا تھا[2]۔ ان کے نام کے ساتھ "ملک" کا لقب یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

ولادت

شیخ احمدؒ دہلی میں ۷۳۸ھ / ۱۳۳۶ء میں پیدا ہوئے[3]۔ شہنشاہ جہانگیر، محمد اسحاق بھٹی اور حاجی دبیر نے ان کی جائے ولادت کھٹو لکھی ہے[4]، جو تاریخی ریکارڈ کی روشنی میں صحیح نہیں کہ شیخ

۱- (i) ابوالفضل، آئینِ اکبری، مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۹ء، ج ۳، ص ۲۸۵۔
(ii) محمد غوثی منڈوی، گلزارِ ابرار (اردو) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۱۴۳۔

۲- Commissariat, M.S, A History of Gujarat, Madras: . Vol. I, p. 131.

۳- (i) ابوالفضل، آئینِ اکبری، ج ۳، ص ۲۸۵۔
(ii) محمد غوثی منڈوی، گلزارِ ابرار، ص ۱۴۳۔

۴- (i) جہانگیر، تزکِ جہانگیری، سر سیّد ایڈیشن، علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۴۔
(ii) محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء، ج ۲، ص ۱۰۳۔
(iii) حاجی دبیر، ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۰ء، ص ۱-۲۔

احمد دو سال کی عمر میں گلی میں کھیل رہے تھے کہ سخت آندھی چلی اور انہیں کشاں کشاں ایک ایسی جگہ' جہاں ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا' لے گئی۔ اہل قافلہ نے انہیں لاوارث سمجھ کر اپنے ساتھ لے لیا اور انہیں راجستھان کے مشہور تاریخی قصبے ڈیڈوانہ لے گئے۔ وہاں نجیب نساج نامی ایک نیک دل انسان رہتا تھا' اس نے انہیں قافلہ والوں سے لے لیا۔[۱]

محمد غوث منڈوی لکھتا ہے کہ آپ بچپن میں دہلی کی ایک گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ سخت آندھی چلی اور وہ انہیں پتنگ کی طرح اڑا کر دہلی سے (۳۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر) کھٹو لے گئی۔[۲] مولانا محمد اسحاق بھٹی رقمطراز ہیں کہ شیخ احمد بچپن میں ایک گاؤں میں گئے۔ وہاں گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ نہایت تیز آندھی آئی جو ان کو اُڑا کر کسی دوسری جگہ لے گئی اور اس طرح یہ اپنے وطن سے بہت دُور چلے گئے جہاں بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔ پردیسیوں کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ایک روز کہیں جا رہے تھے کہ اتفاقاً ایک درویش کامل بابا اسحاق مغربی کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے ان کو لاوارث سمجھ کر اپنے ساتھ لیا اور اپنی قیام گاہ موضع کھٹو لے گئے۔[۳]

بابا اسحقؒ سے تعلق

جن دنوں آپ ڈیڈوانہ میں نجیب نساج کے ہاں مقیم تھے' انہی دنوں بابا اسحاق مغربیؒ کا ایک دوست مولانا صدر الدین ڈیڈوانہ جانے لگا تو بابا جی نے اس سے کہا کہ اگر کوئی ذی شعور لڑکا مل جائے تو وہ اسے ان کے لئے حاصل کر لے۔ جب صدر الدین ڈیڈوانہ پہنچا تو اسے اطلاع ملی کہ انہی دنوں ایک بچہ نجیب نساج کے ہاتھ لگا ہے۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچا اور انہیں بابا اسحاق مغربیؒ کے لئے مانگ لایا۔[۴] مورخ شہیر کمساریٹ کا یہ کہنا درست نہیں کہ ان کا تعلق بابا اسحاقؒ کے ساتھ تیس سال کی عمر میں قائم ہوا۔[۵]

بابا اسحاق مغربی لعل پوشؒ کا شمار برعظیم کے نامور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ موصوف شیخ محمد مغربیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے اور انہی کے طفیل برعظیم میں تصوف کے مغربی سلسلہ کا رواج

---

۱ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری' ۲۵ - II ورق ۵۳۰ الف۔
۲ - محمد غوثی منڈوی' گلزار ابرار' ص ۱۴۳۔
۳ - محمد اسحاق بھٹی' فقہائے ہند' ج ۲' ص ۱۴۳۔
۴ - (i) محمد غوثی منڈوی' گلزار ابرار' ص ۱۴۴۔
(ii) عبداللہ خویشگی۔ معارج الولایت' ورق ۵۳۱ الف۔
۵ - Commissariat. A History of Gujarat. Vol. I, p. 131

ہوا۔ موصوف سلطان فیروز تغلق کے عہد میں برعظیم میں وارد ہوئے اور اجمیر کو اپنا مستقر قرار دیا۔ ان کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے انہیں عالم رؤیا میں لکھنو میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ سلطان فیروز تغلق ان کا بڑا نیاز مند تھا۔ بابا اسحاقؒ کے ساتھ سلطان کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے شیخ احمدؒ فرماتے ہیں:

سلطان فیروز شاہ بخدمت بندگی بابو جیو اعتقاد بسیار داشت ہمیشہ گفتہ میفرستادند کہ در وقتِ نیک ما را بیاد می آوردہ باشند[1]

سلطان فیروز شاہ بابو جی سے بڑی عقیدت رکھتا تھا اور انہیں اکثر یہ پیغام بھیجا کرتا تھاکہ اپنے خاص وقت میں مجھے بھی یاد رکھیں۔

بابا اسحاقؒ اور سلطانِ وقت

ایک بار جمعہ کے دن سلطان نے یہ فرمان بھیجا کہ بابا اسحاقؒ اس کے لئے ضرور دعا کریں۔ جب بابا صاحب نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لئے جامع مسجد میں پہنچے تو خطیب نے شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ شیخ احمدؒ فرماتے ہیں کہ بابا جی کا رنگ متغیر ہو گیا اور ان کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ بابا جی اپنے نفس سے کہنے لگے کہ اس قدر افزائی پر کہیں مغرور نہ ہو جانا[2]

بابا اسحاق تمام عمر مجرّد رہے اور خدا نے انہیں زن و فرزند کے جنجال سے آزاد رکھا۔ عمر کے آخری حصے میں شیخ احمد ان کے ہاتھ لگے تو انہوں نے فرزند کی طرح ان کی پرورش اور تربیت کی۔ شیخ موصوف فرماتے ہیں کہ بچپن میں بابا صاحب انہیں اپنے سینے پر لٹاتے اور اگر انہیں لمحہ بھر کے لئے اپنے سینے سے اٹھا کر پہلو میں لٹاتے تو یہ بیدار ہو جاتے۔ اس لئے بابا جی انہیں دوبارہ سینے پر لٹا لیتے۔ سردیوں کی طویل راتوں میں یہ سوتے میں پیشاب کر دیتے تو بابا فوراً اپنے کپڑے دھو ڈالتے اور مطلق خفا نہ ہوتے[3]اس طرح بابا جی نے انہیں پالا پوسا۔

شیخ احمد فرماتے ہیں کہ ان کے بچپن میں بابا جی نے انہیں دودھ پلانے کے لئے ایک بکری خریدی۔ انہوں نے اس کا نام پتلی رکھا۔ اسی کے دودھ پر ان کی پرورش ہوئی۔ جب وہ سات برس کے ہوئے تو ایک روز بابا اسحاق کے ایک پرانے دوست عبداللہ کتابوں سے لدا ہوا ایک اونٹ لے کر بابا جی سے ملنے آئے۔ اتفاق سے اس روز ان کی مہمانی کے لئے گھر میں

۱۔ تحفۃ المجالس، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، دہلی کلکشن نمبر ۹۷۷، ورق ۶۳ الف۔
۲۔ ایضاً، ورق ۶۳۔
۳۔ ایضاً، ورق ۵۷ الف۔

کچھ نہ تھا۔ بابا جی نے ان سے کہا کہ اگر وہ اپنی بکری ان کے حوالے کر دیں تو اسے ذبح کر کے ان کی ضیافت کر دیں۔ شیخ احمد نے عرض کیا:

وجود گوسفند چہ خواہد بود اگر مرا ذبح کنید راضی ام' چون این سخن از من شنیدند سرمرا بوسیدند و درکنار گرفتند[1]

بکری کی بھلا کیا حیثیت ہے' اگر مجھے ذبح کریں تو میں راضی ہوں۔ جب انہوں نے میری بات سنی تو میرے سر پر بوسہ دیا اور مجھے آغوش میں لے لیا۔

جب کھانا پک کر تیار ہوا اور دونوں بزرگ دستر خوان پر بیٹھے تو مہماں نے بابا جی سے کہا کہ بچے کو بھی بلا لیجئے۔ بابا جی نے شیخ احمد کو طلب کر کے اپنے ساتھ دستر خوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے آہستہ سے ان کے کان میں کہا کہ انہوں نے اس بکری کا دودھ پیا ہے' اب اس کا گوشت کیسے کھائیں۔ یہ کہہ کر ان کے پاس سے اٹھے اور گلی میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے[2]

جب یہ دونوں بزرگ کھانے سے فارغ ہوئے تو بابا جی نے انہیں دوبارہ طلب کیا اور عبداللہ سے کہنے لگے کہ ان سے سوال کریں۔ شیخ احمد فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے ان سے سوال کیا تو انہیں ایسا محسوس ہوا کہ بابا جی کی توجہ سے ان پر الہام ہوا ہے۔ انہوں نے جواب دیا تو عبداللہ نے انہیں پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ پھر یہ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے جتنی بار ان کے سامنے سے گزرتے اتنی بار عبداللہ احتراماً" کھڑے ہو جاتے۔ بابا جی نے اپنے مہمان سے کہا کہ وہ اطمینان سے تشریف رکھیں' بچہ تو کھیل میں مشغول ہے۔ عبداللہ نے کہا:

این بچہ نیست بزرگواریست کہ گلبانگ این بزرگوار در اطراف عالم خواہد رسید[3]

یہ بچہ نہیں' یہ تو بزرگ ہے۔ اس بزرگ کا شہرہ اطراف عالم میں پھیل جائے گا۔

جب شیخ احمد تیرہ برس کے ہوئے تو بابا جی انہیں لکھنؤ سے دہلی لے گئے۔ اتفاق سے ایک روز ان کے بھائی نے انہیں پہچان کر بابا جی سے کہا:

این برادر من ملک نصیر الدین است کہ دران باد سیاہ گم شدہ بود[4]

یہ میرا بھائی ملک نصیر الدین ہے جو اس سیاہ آندھی میں گم ہو گیا تھا۔

۱۔ ایضاً" ورق ۴ الف۔
۲۔ ایضاً" ورق ۴ ب۔
۳۔ ایضاً" ورق ۵ الف۔
۴۔ ایضاً"۔

شیخ احمد کے والدین ابھی حیات تھے۔ انہوں نے بڑا اصرار کیا لیکن یہ بابا اسحاق سے جدا ہونے پر رضا مند نہ ہوئے[1]

قیامِ دہلی

دہلی اس زمانے میں علم و ادب کا بڑا مرکز تھا۔ فیروز شاہ کے عہد میں قاضی محمد سادی' قاضی عبدالمقتدر شُریحی' مولانا احمد تھانیسری' سید جلال الدین کرمانی اور علامہ کمال الدین کے علم و فضل کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ شیخ احمد کے سوانح نگاروں نے ان کے اساتذہ کا تذکرہ نہیں کیا ، لیکن ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں کہ انہوں نے دہلی میں قیام کے دوران میں وہاں کے علماء سے خوب استفادہ کیا ہو گا۔

شیخ احمد کھٹو فرماتے ہیں کہ بابا جی انہیں ساتھ لے کر دہلی پہنچے تو انہوں نے ایسی جگہ قیام کیا جہاں مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت ٹھہرے ہوئے تھے۔ سلطان فیروز تغلق اور خوانین و ملوک مخدوم صاحب کی خدمت میں آتے اور لوگ بکثرت ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ ایک روز بابا اسحاق نے شیخ احمد سے کہا' "بابا احمد! تم بھی ان کے مرید ہو جاؤ کیونکہ سلطان اور امراء ان کے پاس آتے ہیں۔ تمہارا بابو تو مسکین صورت درویش ہے۔" شیخ احمد نے جواب دیا:

بابو جیو سلامت بجای مادر و پدر شما اید و پیرہم شمائید۔ بعد کرم اللہ تعالیٰ در دین و عقبیٰ پناہ شما است[2]	بابو جی آپ سلامت رہیں۔ آپ ہی میرے ماں اور باپ ہیں۔ آپ پیر بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کے بعد آپ ہی دین و عقبیٰ میں میری پناہ ہیں۔

ان کا جواب سن کر بابا جی نے کہا کہ وہ تو انہیں آزما رہے تھے۔ اب انہیں یقین ہو گیا ہے کہ ان کا دنیا کی طرف میلان نہیں ہے۔ اس کے بعد بابا جی نے انہیں اپنی آغوش میں لے کر کمالِ شفقت کے ساتھ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے فرمایا:

بابا احمد بدربار شما بادشاہان باعتقاد و صدق تمام خواہند آمد و استعداد دعا خواہند طلبید۔ بابا احمد ما ولایت و کرامت خود پوشیدہ	بابا احمد تمہارے دربار میں بادشاہ بڑے اعتقاد اور صدق کے ساتھ آیا کریں گے اور تجھ سے دعا کے خواستگار ہوں گے۔ بابا

۱- عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۳۱ الف۔

۲- تحفتہ المجالس' ورق ۶۲ الف۔

داشتیم و از خدای تعالیٰ خواستیم کہ ولایت و کرامت بابا احمد در حیوۃ و بعدِ ممات در اکناف و اطرافِ عالم ظاہر گردد[1]

احمد ہم نے اپنی ولایت اور کرامت کو پوشیدہ رکھا ہے اور اب خدا سے یہ چاہتے ہیں کہ بابا احمد کی ولایت اور کرامت اس کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیل جائے۔

جس زمانے میں شیخ احمد مسجد خانجہان میں مقیم تھے، مخدوم جہانیاں ان کے ورع و تقویٰ کی تعریف سن کر ان سے ملنے آئے۔ جب انہیں مخدوم صاحب کی آمد کی خبر ملی تو ان کے استقبال کے لئے بڑھے۔ مخدوم صاحب نے پالکی سے اترتے ہی انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور دیر تک ان کے سینہ کے ساتھ اپنا سینہ ملتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے تین بار فرمایا:

اے جوان از تو بُوی دوست می آید، ما را در وقتِ خوش بیاد بیارید، فراموش مکنید[2]

اے نوجوان تجھ سے دوست کی خوشبو آتی ہے۔ اچھے وقت میں ہمیں یاد رکھنا اور فراموش نہ کر دینا۔

بابا اسحاق اور شیخ احمد کھٹو کتنا عرصہ دہلی میں رہے۔ اس کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ تاہم عبداللہ خویشگی کی ایک روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جب شیخ احمد کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی تو وہ دہلی سے کھٹو منتقل ہو چکے تھے[3]۔

شیخ احمد نوجوانی کے ایام میں ایک روز بابا اسحاق سے اجازت لے کر بغرضِ سیر و تفریح ڈیڈوانہ روانہ ہوئے[4]۔ اتفاق سے اسی روز بابا جی کو بخار آ گیا اور انہوں نے ان کو بلانے کے لئے کسی شخص کو بھیجا۔ جب انہیں بابا جی کی علالت کی خبر ملی تو فوراً کھاٹو پہنچے۔ اس وقت کھاٹو کا مقطع بابا جی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا "میر احمد شما را می طلبند۔" بابا جی نے اس سے کہا:

---

۱ - ایضاً" ورق ۶۳ الف۔

۲ - ایضاً" ورق ۴ الف، ب۔

۳ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۵۳۱ ب۔

۴ - تحفتہ المجالس، ورق ۴۳ ب -- جامع ملفوظات نے ڈیڈوانہ کی بجائے گونڈوانہ لکھا ہے جو درست نہیں۔ ڈیڈوانہ کھاٹو سے ۴۰ کلو میٹر کے فاصلے پر راجستان کا مشہور قصبہ ہے۔

امیر مگو ما میخوانیم کہ ایشان را پیر کنیم و کلاہ باگنشت مبارک انداختہ میگردانند و دعا میخوانند و فرمودند کہ بابا احمد بیائد و کلاہ پوشیدند[1]

اے امیر مت کہو، ہم چاہتے ہیں کہ اسے پیر بنائیں۔ انہوں نے ایک ٹوپی اپنی انگلیوں میں لے کر گھماتے ہوئے دعا کی اور فرمانے لگے بابا احمد آؤ اور ٹوپی پہنو۔

شیخ موصوف نے کہا کہ وہ ان کی ٹوپی کس طرح پہنیں؟ بابا جی نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "بابا احمد ہر روز چالیس آدمی تمہارے دستر خوان پر کھانا کھائیں گے۔ ان کی تعداد اس سے زیادہ ہو سکتی ہے، کم نہیں ہو گی۔ اگر کبھی چالیس سے کم ہو جائیں تو بیشک میری ہڈیاں قبر سے اکھاڑ پھینکنا۔ بادشاہ تمہارے دروازے پر آ کر تم سے دعا کے طالب ہوں گے[2] بابا جی نے اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر ٹوپی رکھی۔ اس عطائے نعمت کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی[3] بابا جی کے اصرار پر شیخ احمد نے یہ دو بیت انہیں سنائے:

خدای جہان دار جان آفرین
حکیم سخن بر زبان آفرین
خداوند بخشندہ و دستگیر
کریم خطا بخش پوزش پذیر[4]

چند لمحے بعد بابا اسحاق یاحی یا قیوم کہتے ہوئے اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی نے بابا اسحاق کا سالِ ولادت ۸۵۱ھ اور سِن وفات ۹۸۹ھ تحریر کیا ہے[5] انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کے مرید شیخ احمد کھٹو ۱۱۱ سال کی عمر پا کر ۸۴۹ھ میں فوت ہوئے تھے۔ اس حساب سے مرشد اپنے مرید کی وفات کے دو سال بعد پیدا ہوئے۔ حیرت ہے مولانا محمد اسحاق بھٹی جیسے فاضل سے اس طرح کا سہو کیسے ہو گیا۔

بابا اسحاق مغربی کا مزار موضع کھاٹو میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ۱۹۴۱ء میں شاعرِ رومان اختر شیرانی کی معیت میں اس کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔

---

۱ - ایضاً"۔
۲ - ایضاً" ورق ۱۵ الف۔
۳ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۵۳۱ ب۔
۴ - تحفتہ المجالس، ورق ۱۵ الف۔ بعض کتابوں میں پہلا مصرع "بنام جہان دار جان آفرین" مرقوم ہے، لیکن میں نے یہاں تحفتہ المجالس کا تتبع کیا ہے۔
۵ - محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، ج ۲، ص ۱۰۳۔

ان کا بیان ہے کہ بابا جی کی قبر ایک چبوترے پر واقع ہے اور اس پر کوئی گنبد یا چھت نہیں ہے، حتیٰ کہ کوئی کتبہ بھی نصب نہیں۔ وہاں زائرین کے قیام کے لئے چند حجرے موجود ہیں جہاں عرس کے موقع پر مسافر ٹھہرتے ہیں۔ البتہ وہاں کا ماحول پرعظمت ہے[1]

بابا اسحاق مغربیؒ کے علاوہ مخدوم جہانیاں کے ایک خلیفہ شیخ تاج الدین سے بھی شیخ احمد کھٹو کو فیض ملا تھا۔ جامع ملفوظات محمود بن سعد بن صدر ایرجی تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ تاج الدین نے حضرت شیخ احمد کو سات سال کے لئے ترکِ لحم کا حکم دیا تھا۔ ایک روز انہوں نے حجام کو بلا کر ان کا سر حلق کروایا۔ شیخ احمد فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کو محلوق کرواتا ہے، وہ فیض بھی دیتا ہے[2]

بابا اسحاق مغربیؒ کی وفات کے بعد شیخ احمد کی طبیعت کھاٹو سے اچاٹ ہو گئی اور انہوں نے سیاحت اختیار کی۔ محمود بن سعد بن صدر ایرجی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: "این درویش دوازدہ سال پای برہنہ بی رفیق و بی طریق سفر کردہ است۔" بارہ سال کی صحرا نوردی کے بعد انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ بابا اسحاق مغربیؒ کے منہ بولے فرزند اور خلیفہ ہونے کی وجہ سے خواص و عوام ان کے معتقد ہو گئے۔ سلطان فیروز تغلق کے ساتھ بھی ان کے روابط اسی دوران میں قائم ہوئے تھے۔

دہلی سے آپ حج بیت اللہ کے لئے گجرات روانہ ہوئے۔اس زمانے میں راستی خان گجرات کا صوبہ دار تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے زادِ راہ بھی فراہم کیا ہو۔ شیخ موصوف کھنبائت سے جہاز میں سوار ہوئے[3]

حج سے واپسی پر شیخ احمد ٹھٹھہ کے مقام پر جہاز سے اترے اور سندھ میں سفر کرتے ہوئے اُوچ شریف پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات مخدوم جہانیاںؒ کے بھائی اور سجادہ نشین شیخ صدر الدین راجو قتالؒ سے ہوئی۔ مخدوم جہانیاں کا ۱۳۸۴ء میں انتقال ہو چکا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ احمد اس سن کے بعد ہی سفرِ حج سے واپس لوٹے ہوں گے۔ اس حساب سے اس وقت ان کی عمر ۴۸ برس سے متجاوز تھی۔ جس وقت موصوف شیخ صدر الدین راجو قتالؒ سے ملنے گئے تو اس وقت وہ چھت پر کھڑے تھے۔ انہوں نے خادم کے ذریعے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ شیخ صدر الدینؒ نے اپنے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا: "شیخ احمد مرحبا، شما عنداللہ بسیار

---

۱ - عبداللہ چغتائی، سہ ماہی اُردو کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۴۔
۲ - تحفۃ المجالس، ورق ۳۵ الف۔
۳ - علی محمد خان، مرأتِ احمدی، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۶ھ، ص ۲۲۔

استے[۱] اُوچ شریف سے موصوف دہلی تشریف لے گئے اور امیر تیمور کے حملہ (۱۳۹۸ء) تک وہیں رہے[۲]

جس زمانے میں شیخ احمد دہلی میں مقیم تھے، ان دنوں حضرت نور قطب عالمؒ (المتوفی ۱۴۱۰ء) کا ایک مرید دہلی اور پنڈوہ کے درمیان تجارتی سامان لے جایا کرتا تھا۔ ایک بار جب وہ پنڈوہ گیا تو حضرت نور قطب عالمؒ نے اس سے پوچھا کہ وہ دہلی میں کس کس بزرگ سے ملا ہے؟ اس نے کئی بزرگوں کے نام لئے لیکن ان میں شیخ احمدؒ کا نام نہ تھا۔ حضرت نور قطب عالمؒ نے دریافت فرمایا کہ کیا وہ شیخ احمدؒ سے بھی ملا ہے؟ تاجر نے جواب میں سکوت اختیار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اگر وہ ان سے نہیں ملا تو اس کا دہلی جانا ہی فضول ٹھہرا[۳] اگلی بار جب وہ بسلسلۂ تجارت دہلی آیا تو خاص طور پر شیخ احمد کھٹوؒ سے ملنے گیا۔ عند الملاقات اس نے تین سیر نبات اور نافۂ مشک شیخ موصوف کی خدمت میں پیش کیا[۴]

سلطان فیروز شاہ تغلق سے تعلقات

دہلی میں حضرت کا قیام حسب سابق مسجد خان جہان میں تھا۔ موصوف مجاہدہ کرتے کرتے مشت استخوان ہو کر رہ گئے تھے۔ جس روز پنڈوہ کا تاجر شیخ موصوف کی زیارت سے مشرف ہوا، اس سے اگلے روز سلطان فیروز شاہ تغلق علمائے دہلی کی معیت میں شیخ احمد کی زیارت کو آیا۔ آپ اس وقت اتنے کمزور تھے کہ کھڑے ہو کر سلطان کا استقبال بھی نہ کر سکے اور آپ نے بیٹھے بیٹھے وہ نافہ سلطان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب سلطان ان سے رخصت ہو کر مسجد سے باہر نکلا تو علماء نے اس سے کہا کہ شیخ نے اس کی کماحقہٗ تعظیم نہیں کی حالانکہ قرآن مجید میں اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اُولی الامر منکم کا حکم آیا ہے۔ سلطان نے ان سے کہا کہ یہ بات انہوں نے ان کے سامنے کیوں نہ کہی؟ سلطان نے روانہ ہوتے وقت علماء سے کہا کہ وہ مسجد میں شیخ احمد کھٹوؒ کی زیارت کریں۔ جب وہ ان کی خدمت میں پہنچے تو حضرت نے وہ نبات ان میں تقسیم کر دی اور علماء انہیں سلام کر کے چلے آئے۔ سلطان نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے شیخ سے کیا گفتگو کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ ان کے سامنے گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ سلطان نے کہا کہ یہ علماء کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے انہیں مخاطب کر کے شیخ کے بارے میں کہا:

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۸ ب۔

۲ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۵۳۶ ب۔

۳ - تحفۃ المجالس، ورق ۲ ب --- چو بملازمت ایشان نرسیدی رفتن دہلی ضایع بود۔

۴ - ایضاً" ورق ۲ الف۔

"کرامت و عظمت ایشان را من بسیار دیدہ ام سالہا ست کہ بایشان اعتقاد تمام دارم۔ در آنوقت کہ بیرونِ دہلی بودم کس فرستاد عرضہ داشت میکردم کہ حضرت مخدوم از صلحاء و اتقیاء اند بوقتِ نیک خود این مسکین را بدعا یاد میفر مودہ باشند۔ ایشان ہمہ وقت میفرمودند کہ شما پادشاہ دہلی خواہید شد۔ بکرم اللہ تعالی و برکتِ انفاس خوشبوی ایشان بادشاہ دہلی شدم و تاغایت ہم در پناہ ایشانم[۱]

ترجمہ : "میں نے ان کی کرامات اور عظمت بہت ملاحظہ کی ہے۔ میں برسوں سے ان کا معتقد ہوں۔ جن دنوں میں دہلی سے باہر تھا کسی قاصد کے ذریعے ان کی خدمت میں عرض کیا کرتا تھا کہ مخدوم صاحب نیک اور متقی بزرگ ہیں۔ کسی اچھے وقت میں اس مسکین کو بھی دُعا میں یاد کر لیا کریں۔ شیخ صاحب ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ تم دہلی کے بادشاہ ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالی کے فضل اور شیخ کے انفاسِ مقدسہ کی برکت ہے میں دہلی کا بادشاہ بن گیا اور ابی وقت سے ان کی پناہ میں ہوں۔"

بعد ازاں سلطان نے اپنے حاجب کے ذریعے پھولوں کا ایک ڈونہ شیخ موصوف کی خدمت میں بھیج کر دُعا کی درخواست کی۔ شیخ نے فرمایا کہ "سلطانِ اسلام" کے لئے دُعا مسلمانوں پر واجب ہے۔ وہ اس کے لئے دُعا کرتے ہیں[۲]

جامع ملفوظات محمود بن سعد بن صدر ایرجی رقمطراز ہیں کہ سلطان کا داماد صدر الدین میرٹھی شیخ احمد کھتوؒ کا بڑا معتقد تھا اور جب بھی وہ ان سے ملنے آتا تو ایک کوس سے پیادہ ہو جاتا۔ تیمور کے حملہ سے قبل جب وہ ان سے ملنے آیا تو شیخِ موصوف نے اس سے فرمایا کہ دہلی پر آفت آنے والی ہے۔ لہذا وہ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر جونپور چلا جائے۔ اس نے عرض کیا کہ ان حالات میں حضرت کیا کریں گے؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ اس مصیبت کے وقت اہالیانِ دہلی کی رفاقت کریں گے۔

صدر الدین کی دہلی سے روانگی کے پندرہ روز بعد تیمور دہلی پہنچ گیا[۳]اس کے سپاہیوں نے ہزاروں بے گناہ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ہزاروں انسانوں کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار ہونے والوں میں شیخ احمدؒ بھی تھے۔ تیمور نے چالیس چالیس قیدیوں کی ٹولیاں بنائیں اور ان پر نگران مقرر کئے۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۳ ب۔

۲ - ایضاً"۔

۳ - مولانا اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ شیخ احمد نے سلطان فیروز تغلق کو پندرہ روز پہلے بتا دیا تھا کہ تیمور دہلی پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس لئے سلطان فیروز شاہ دہلی سے جونپور چلا گیا۔ یا للعجب۔ امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں دہلی پر حملہ کیا اور اس واقعہ سے دس سال قبل ۱۳۸۸ء میں سلطان مذکور فوت ہو چکا تھا۔ ملاحظہ ہو' فقہائے ہند' ج ۲' ص ۱۰۶۔

تیمور دہلی آتے وقت راستے میں تمام فصلیں تباہ کر آیا تھا۔ اس لئے دہلی اور پنجاب میں شدید قسم کا قحط رُونما ہوا اور قیدی مرنے لگے۔ شیخ احمد فرماتے ہیں کہ ایک روز تیمور کا ایک نوجوان رشتہ دار قیدیوں کا معائنہ کرنے آیا تو اس نے ہر ٹولی میں سے دس سے پندرہ تک قیدی کم پائے۔ جب وہ شیخ موصوف کی ٹولی کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ نہ صرف قیدیوں کی تعداد پوری ہے بلکہ وہ سب کے سب صحت مند اورتوانا ہیں۔ اس نے قیدیوں سے استفسار کیا کہ انہیں کھانا کہاں سے ملتا ہے؟ انہوں نے اسے بتایا کہ رات کے وقت حضرت انہیں تازہ اور گرم نان کھانے کو دیتے ہیں۔ حضرت کی یہ کرامت دیکھ کر وہ ان کے قدموں میں گرا اور تیمور سے ان کا ذکر کیا۔ تیمور نے حکم دیا کہ شیخ کو گھوڑے پر سوار کر کے بڑے احترام کے ساتھ اس کے پاس لائیں۔ جب انہیں تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے ان سے پوچھا "کیا موصوف ہی وہ بزرگ ہیں جو ہر رات چالیس آدمیوں کو نان دیتے ہیں[1]؟ انہوں نے فرمایا کہ ان کی بھلا کیا ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ رازق ہے۔ ان کا رزق انہیں پہنچا دیتا ہوں۔ تیمور نے ان سے پوچھا کہ وہ صاحبِ کرامت ہیں تو اس کی آمد سے قبل دہلی سے نقل مکانی کیوں نہ کر گئے؟ انہوں نے فرمایا کہ انہیں پندرہ روز قبل پتہ چل گیا تھا کہ دہلی پر آفت آنے والی ہے اور انہوں نے صدر الدین میرٹھی کو مع اہل و عیال جونپور بھیج دیا تھا اور موصوف خود اہالیانِ دہلی کی رفاقت کے لئے شہر میں رک گئے تھے۔ مزید برآں شہر میں ان کے کافی مرید اور معتقد تھے انہیں اس حالت میں تنہا چھوڑنا مروّت کے خلاف تھا۔

امیر تیمور اور شیخ احمد کھٹوؒ

تیمور ان کا جواب سن کر خوش ہوا اور ان کی تکریم کی۔ اس نے ایک گھوڑا اور چند بکریاں ان کی نذر کیں اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ تیمور نے حکم صادر کیا کہ شیخ احمد جس قیدی کو رہا کرانا چاہیں اسے فوراً رہا کر دیا جائے۔ حضرت نے تمام قیدیوں کو تیمور کے چنگل سے رہائی دلوائی۔ جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت رُونے لگے اور انہوں نے رُوتے ہوئے فرمایا کہ خدا کا شکر کیونکر ادا ہو سکتا ہے[2]۔

ہمارے مورخین نے دورِ حاضر میں عہد سلاطین کی تاریخ لکھتے وقت شیخ احمد کھٹوؒ کے اس

۱- یہاں یہ بات یاد رہے کہ بابا اسحاق مغربیؒ نے ان سے کہا تھا کہ ہر روز چالیس آدمی ان کے دستر خوان پر کھانا کھایا کریں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بے شک ان کی ہڈیاں قبر سے اکھاڑ پھینکنا۔

۲- تحفۃ المجالس، ورق ۶ ب۔

عظیم کارنامے کا ذکر نہیں[۲] کیا۔ شیخ موصوف کی دوسری خدمات سے قطع نظر ہزاروں قیدیوں کی رہائی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے تاریخ کے صفحات میں مناسب جگہ ملنی چاہئے۔

مؤرخ گجرات کمساریٹ لکھتا ہے کہ شیخ احمد کھٹو کی سفارش پر امیر تیمور نے دہلی میں قتل عام بند کیا اور ان کی سفارش پر قیدیوں کو رہائی ملی[۱] عبدالقادر بدایونی نے قیدیوں کو رہائی دلوانے کا واقعہ تحریر کیا ہے لیکن ان کی سفارش پر قتل عام بند کرنے کا ذکر نہیں کیا[۲] کمساریٹ کے مقابلے میں بدایونی کا بیان زیادہ وزنی ہے کیونکہ دہلی میں قتل عام کے وقت تیمور شیخ احمد کے مقام اور مرتبے سے واقف نہیں تھا۔ قتل عام بند ہونے کے بعد دوسرے لوگوں کے ساتھ شیخ موصوف بھی پکڑے گئے اور جب ان کی تیمور کے ساتھ ملاقات ہوئی تو اسے ان کے مقام اور مرتبے کا علم ہوا اور ان کی سفارش پر قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس لئے ان کی سفارش پر قتل عام بند کرنے والی روایت کی کوئی حقیقت نہیں۔

محمود بن سعد بن صدر ایرجی تحریر فرماتے ہیں کہ امیر تیمور کا وزیر سیف الملوک المعروف بہ سیفل شیخ احمد کا مرید ہو گیا اور انہیں اپنی قیام گاہ پر لے گیا۔ اس موقعہ پر ایک گھوڑا بھی ان کی نذر کیا۔

شیخ احمد اور دوسرے قیدیوں کو رہائی مل چکی تھی' اس کے باوجود جب تیمور نے دہلی سے کوچ کیا تو حضرت نے بھی سمرقند جانے کا فیصلہ کیا اور لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اثنائے سفر میں ایک روز تیمور کے حرم کی ایک برقع پوش خاتون گھوڑا دوڑاتی ہوئی ان کے قریب آ کر ان سے کہنے لگی:

عنانِ مرکب خود را بگردان
کہ من تابِ جمال تو ندارم

اتنے میں حرم کی دوسری خواتین بھی ان کے قریب پہنچ گئیں اور انہوں نے شیخ سے گفتگو شروع کی۔ آپ فرماتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ فصیح فارسی میں بات چیت کرتی تھیں۔ وہ بھی ان کی گفتگو سے متاثر ہوئیں اور انہوں نے اقرار کیا کہ شیخ بہت فصیح و بلیغ زبان استعمال فرماتے ہیں۔ عورتوں نے ان سے کہا کہ اگلی منزل پر جب لشکر پڑاؤ ڈالے تو وہ ان کے قریب ہی ٹھہریں۔ انہوں نے معذرت کے انداز میں کہا کہ سیف الملوک نے انہیں اپنے پاس قیام کرنے کو کہا تھا اس لئے وہ مجبور ہیں۔

چند روز بعد ان کی خواہش پر سیف الملوک انہیں تیمور کے پاس لے گیا۔ شیخ احمد فرماتے ہیں کہ جب وہ تیمور کے پاس پہنچے تو اس وقت پانچ صد نوجوان ترک گرزیں سنبھالے

---

۱ - Commissariat, M.S. A History of Gujarat. Vol. I. p 131

۲ - عبدالقادر بدایونی' منتخب التواریخ' مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء' ج ۱' ص ۲۲۰۔

اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ امیر اس وقت ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا اور شیخ عبدالاوّل نبیرۂ برہان الدین مرغینانیؒ صاحبِ ہدایہ بھی اسی چبوترے پر تشریف فرما تھے۔ تیمور نے شیخ احمد کی بڑی عزت کی اور انہیں اپنے پاس بٹھایا۔ تیمور کی فرمائش پر شیخ عبدالاوّل نے ان سے کئی علمی سوالات کئے جن کے انہوں نے مناسب جواب دیئے۔ کچھ دیر بعد تیمور نے کھانا طلب کیا اور شیخ عبدالاوّل نے انہیں اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا۔ تیمور بار بار ان سے کہتا کہ اطمینان کے ساتھ کھانا تناول فرمایئے اور خوب سیر ہو کر کھایئے۔

شیخ احمد فرماتے ہیں کہ تیمور نے خود اپنے ہاتھ سے یخنی کا ایک پیالہ ان کے سامنے رکھا اور اس کے علاوہ آش کا ایک پیالہ بھی آگے بڑھایا۔ تیمور نے خود ایک چمچہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ شیخ یخنی نوش فرماتے ہوئے چمچے کا جو حصہ پیالے میں ڈالتے اسے اپنے لب سے نہ لگاتے اور جو حصہ ان کے لبوں سے مَس ہوتا اسے پیالے میں نہ ڈالتے[1] تیمور نے انہیں اس طرح یخنی نوش کرتے دیکھا تو بہت خوش ہوا اور شیخ عبدالاوّل سے کہنے لگا "شیخ نہایت حسنِ ادب را دارند"[2] شیخ عبدالاوّل نے امیر سے کہا کہ ان کے خیال میں ان جیسا درویش اس علاقے میں پہلے نہیں گزرا۔ جب دونوں بزرگ کھانے سے فارغ ہوئے تو تیمور مجلس سے اٹھ کر اپنے حرم میں چلا گیا اور شیخ موصوف عبدالاوّل سے اجازت لے کر اپنی قیام گاہ پر واپس چلے گئے۔ سیف الملوک نے ان سے کہا کہ عبدالاوّل اور اس مجلس کے حاضرین ان کے معتقد ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ان کی کرامت ملاحظہ کی ہے۔ جب موصوف تیمور کے پاس پہنچے تو اس کے سامنے دو ترک نوجوان گرزیں تھامے کھڑے تھے۔ انہوں نے ان کے بازو پکڑ کر اپنے راستے سے ہٹایا تو وہ ان کی ہیبت سے کانپنے لگے تھے[3]

تحفۃ المجالس اور "ملفوظات شیخ احمد مغربی" سے شیخ احمد کا سمرقند جانا ثابت ہے۔ سمرقند میں قیام کے دوران میں کئی بار علمائے ماوراء النہر کے ساتھ ان کی علمی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ علماء نے متعدد بار ان سے کہا کہ وہ درویشانہ لباس کیوں پہنتے ہیں؟ انہیں چاہئے کہ عالموں جیسی وضع قطع اختیار کریں[4]

۱۔ ہمارے زمانے میں جب پاکستانی طلبہ انگلستان جاتے تو سب سے پہلے انہیں اس طرح سُوپ پینے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہم اسے انگریزی تہذیب کا کمال سمجھتے تھے۔ ہمارے اکابر صدیوں پہلے اس طرح کے آداب سے واقف تھے۔

۲۔ تحفۃ المجالس' ورق ۸ ب۔

۳۔ ایضاً" ورق ۹ الف۔

۴۔ ایضاً" ورق ۴۷ ب۔

شیخ احمد کے ملفوظات اور تذکروں سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سمرقند میں ان کا قیام کتنی مدت رہا۔ جب آپ سمرقند سے واپس لوٹے تو دہلی اُجڑ چکی تھی اور تیمور کے حملے میں جو اہلِ فضل و کمال زندہ بچ گئے تھے وہ بھی دہلی سے جونپور یا گجرات کی طرف چلے گئے تھے۔ شیخ موصوف نے بھی ان بدلے ہوئے حالات میں دہلی میں رہنا مناسب نہ جانا اور آپ گجرات چلے گئے۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی رقمطراز ہیں کہ موصوف رہائی کے بعد حجِ بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے' یہ صحیح نہیں ہے[1] شیخ موصوف فریضۂ حج ۱۳۸۴ء کے لگ بھگ ادا کر چکے تھے۔

اس زمانے میں گجرات پر ظفر خان حکمران تھا۔ وہ بڑا متدیّن اور فرشتہ خصلت انسان تھا۔ اس نے شیخ احمد کی گجرات میں آمد کو نعمتِ عظمیٰ تصور کیا[2] جس زمانے میں حضرت دہلی میں مقیم تھے' ظفر خان بھی وہیں "تھا اور انہیں مسجد خانِ جہاں میں ملنے آیا کرتا تھا[3] تغلق خاندان کے دَور زوال میں اس نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے مظفر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ فرشتہ اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"ظفر خان در عہدِ سلطان محمد شاہ بحسنِ سلوک و پرہیزگاری و تقید بہ شرعِ محمدی و امانت و دیانت شہرت تمام پیدا کردہ۔"[4]

"سلطان محمد شاہ کے عہد میں ظفر خاں حسنِ سلوک' پرہیزگاری' پابندیٔ شریعت' امانت اور دیانت کے لئے مشہور تھا۔"

شیخ صاحب جب گجرات کے دارالحکومت نہوالہ پہنچے تو ظفر خان نے پچاس آدمیوں کا کھانا ان کی خدمت میں بھیجا اور تاتار خان کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے حضرت سے درخواست کی کہ وہ گجرات میں ہی مستقل طور پر سکونت اختیار کریں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے اس کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے سرکھیج میں سکونت اختیار کر لی[5]

شیخ احمد کی سرکھیج میں آمد سے قبل وہاں جو درویش سکونت پذیر تھے انہوں نے وہاں ان کے قیام کی مخالفت کی اور انہیں پیغام بھیجے کہ موصوف وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ تحفتہ المجالس کے اندراجات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کو چیلنج بھی کیا تھا[6]

---

۱ - محمد اسحاق بھٹی' فقہائے ہند' ج ۲' ص ۱۰۶۔
۲ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۳۶ ب۔
۳ - تحفتہ المجالس' ورق ۱۹ ب۔
۴ - فرشتہ' تاریخ فرشتہ' مطبوعہ بمبئی' ۱۸۳۲ء' ج ۲' ص ۳۵۱۔
۵ - تحفتہ المجالس' ورق ۱۹ ب۔
۶ - ایضاً" ورق ۵۵ ب۔

سرکھیج میں حضرت کی اقامت پینتالیس برس کے لگ بھگ رہی۔ گجرات کے حکمران، امراء اور عوام ان کے بڑے معتقد تھے۔ ان کی خانقاہ کا دروازہ ہر غریب اور مسافر کے لئے کھلا رہتا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ان کا لنگر بہت وسیع تھا[1] محمود بن سعد بن صدر ایرجی لکھتے ہیں کہ سرکھیج میں قیام کے دوران میں حضرت کی خانقاہ کا خرچ سوا لاکھ ٹنکے سالانہ تک پہنچ گیا تھا[2]

مزارِ مبارک

شیخ احمد نے سرکھیج میں ایک خوبصورت مسجد اور ایک وسیع تالاب بنوایا اور اس کے کنارے دہلی کے حوضِ خاص کی طرز پر کئی عمارتیں بنوائیں، جہاں ان کے مرید اور مسافر رہتے تھے۔ سلطان گجرات نے ان عمارتوں کی تعمیر کے وقت ان کی مالی امداد کرنا چاہی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت چاہی[3] اسلامی فنِ تعمیرات کے ماہر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ان عمارتوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مغربی ہندوستان میں اس سے بہتر اسلامی سنگی فنِ تعمیر کے نمونے اور کہیں نہیں ملتے[4] راقم الحروف جب ۱۹۶۹ء میں دوسری بار احمد آباد گیا تو ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی، صدر شعبہ فارسی گجرات کالج، احمد آباد کے شوق دلانے پر سرکھیج گیا اور ان عمارات کو دیکھا۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود سرکھیج کے رُوحانی ماحول میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

سلاطینِ گجرات کے ساتھ تعلقات

گجرات کے سلاطین شیخ احمد کے بڑے معتقد تھے۔ مظفر شاہ (ظفر خان) نے ہی ان سے گجرات میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی تھی جسے انہوں نے شرفِ قبولیت بخشا۔ مظفر شاہ کا جانشین سلطان احمد بھی بعد میں ان کا مرید ہو گیا تھا[5]

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ نظام الملک شیخ احمد کا معتقد تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "اگر تقویٰ را درجہان صورت می بود بصورتِ شیخ می بود[6]" اس نے سلطان احمد کے سامنے کئی بار ان

---

۱ - شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۱۵۷۔

۲ - تحفۃ المجالس، ورق ۱۹ ب۔

۳ - ایضاً، ورق ۵۲ الف۔

۴ - عبداللہ چغتائی، سہ ماہی اُردو کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۳۔

۵ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۵۳۷ الف۔

۶ - تحفۃ المجالس، ورق ۳۱ ب۔

کی کرامات بیان کیں۔ سلطان احمد نے اس سے کہا کہ جنّ یا سحر کے ذریعے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ نظام الملک نے سلطان کو مزید اطمینان دلانے کے لئے کہا کہ وہ دل کی بات جان لیتے ہیں۔ سلطان نے کہا کہ جن کا دل میں گزر نہیں ہوتا۔ دلوں کا حال خدا جانتا ہے یا جن بزرگوں کو وہ الہام کرتا ہے' وہ جان سکتے ہیں۔ نظام الملک نے جب یہ ماجرا شیخ احمد کھٹو سے بیان کیا تو انہوں نے اس سے دریافت فرمایا کہ اس نے سلطان سے ایسا کیوں کہا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ سلطان کسی بہانے ان کی زیارت سے مشرف ہو سکے۔

نظام الملک نے سلطان احمد کو حضرت کی زیارت کے لئے تیار کر لیا اور اس سے کہا کہ وہ کوئی بات اپنے دل میں رکھے اور اس کے ساتھ حضرت سے ملنے چلے۔ سلطان نے کہا کہ وہ اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہے اور لُطف تو جب ہے کہ شیخ عندالملاقات اسے بادشاہ کہہ کر مخاطب کریں' گرم گرم کھچڑی کھلائیں اور زرسرخ کا ایک ٹکڑا اسے عنایت کریں اور شاہی خزانہ میں برکت کے لئے دعا فرمائیں۔ نظام الملک نے جی میں گرم حلوہ کھانے کی ٹھانی اور سلطان احمد کو ساتھ لے کر نصف شب کے وقت حضرت سے ملنے گیا۔ جب انہیں ان کے آنے کی اطلاع ملی تو موصوف بالائی منزل سے نیچے اترے اور السلام علیک یا سلطان کہتے ہوئے سلطان احمد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کمرے میں لے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے نظام الملک کو بھی وہیں بلا لیا۔ حضرت نے حلوہ اور کھچڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ جب کھچڑی پک کر آئی تو انہوں نے سلطان سے تناول کرنے کو کہا تو اس نے کہا کہ وہ ان کا پس‌خوردہ کھائے گا۔ حضرت نے ایک لقمہ اٹھا کر مُنہ میں ڈالا اور رکابی سلطان کی طرف بڑھا دی۔ ایک خادم بھیج کر شیخ نے حلوہ منگوایا اور اسے نظام الملک کے سامنے رکھا۔

جب دونوں زائر کھانے سے فارغ ہوئے تو شیخ نے رُومال سے پچیس اشرفیاں نکال کر سلطان کو دیتے ہوئے فرمایا کہ انہیں اپنے خزانے میں رکھ لے' ان سے برکت ہو گی۔ سلطان ان کے ساتھ بڑی تواضع سے پیش آیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ واپسی پر سلطان نے نظام الملک سے کہا کہ اگر وہ شیخ سے نہ ملتا تو سعادتِ ابدی سے محروم رہتا۔ اس نے کہا کہ اس نے ایک ہی نشست میں ان کی اتنی کرامات دیکھ لی ہیں جو عمر بھر کے لئے کافی ہیں[1]

ایک بار سلطان دوبارہ ان سے ملنے آیا' تو آپ نے اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کیا اور چلتے وقت اسے ایک اسپِ تازی مرحمت کیا۔ جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ چاپانیر کے مقدم گنگا داس نے سلطان احمد کی خدمت میں آم بھیجے۔ سلطان نے ان میں سے پانچ آم رومال میں باندھ کر شیخ احمد کی خدمت میں بھیجے اور اس کے ساتھ ہی انہیں یہ پیام بھیجا کہ پہلے شیخ

۱۔ ایضاً" ورق ۱۳ ب' ۱۴ الف۔

آم کھائیں گے' بعد میں وہ کھائے گئے[1]

عبداللہ خویشگی رقم طراز ہے کہ شیخ موصوف کے توسط سے سلطان احمد حضرت خضر سے ملا اور ان کے مشورے پر سابرمتی ندی کے کنارے احمد آباد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ سلطان احمد نے حضرت خضر کے فرمان کے مطابق ایسے اشخاص کے ہاتھوں شہر کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا جنہوں نے کبھی عصر کی سنتیں قضاً نہیں کی تھیں۔ احمد آباد کی بنیاد احمد نام کے چار اصحاب یعنی سلطان احمد' شیخ احمد' قاضی احمد اور ملک احمد نے مل کر رکھی۔ شیخ احمد نے اپنے ہاتھ میں رسی لے کر شہر کی حدود متعین کیں اور ۷ ذی قعدہ ۸۱۳ھ (۱۴۱۱ء) کو احمد آباد کی تعمیر شروع ہوئی[2]

ایک روایت کے مطابق دن کو جس قدر شہر کی فصیل بنتی وہ رات کے وقت گر جاتی۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں مانک ناتھ نامی ایک جوگی رہتا ہے' یہ سب اس کے استدراج سے ہوتا ہے۔ جب اس سے باز پُرس ہوئی تو اس نے کہا کہ جب تک شہر کی بنیاد رکھنے والوں میں اس کا نام شامل نہیں کیا جاتا وہ شہر پناہ مکمل نہیں ہونے دے گا۔ سلطان احمد اس کی بات ماننے کو تیار نہ تھا لیکن شیخ احمد شہر کے ایک اہم چوک کو اس کے نام منسوب کرنے پر رضا مند ہو گئے[3] راقم الحروف دوبار احمد آباد جا چکا ہے اور شہر کا سب سے مصروف چوک' جہاں زیادہ تر صرافوں کی دکانیں ہیں' مانک چوک کہلاتا ہے۔

سلطان احمد کا جانشین سلطان محمد شاہ بھی ان کا بڑا معتقد تھا[4] وہ شیخ کے وقت نزع ان کے پاس موجود تھا۔ اس نے شیخ سے کہا کہ اسے ان ہی کے طفیل سلطنت ملی ہے۔ اس کی ان سے یہ التجا ہے کہ اسے جنت میں بھی اپنے ساتھ ہی رکھیں۔ حضرت کی قوتِ گویائی اس وقت جواب دے چکی تھی' اس لئے انہوں نے اپنی دو انگلیاں اپنی آنکھوں پر رکھ لیں۔ اس سے حاضرین نے یہ مطلب اخذ کیا کہ حضرت نے اشارتاً" فرمایا کہ بسر و چشم[5] محمود بن سعد بن صدر ایرجی رقم طراز ہیں کہ جس وقت شیخ موصوف کے جسدِ مبارک کو غسل دیا گیا' تو سلطان محمد شاہ اس وقت بھی وہاں موجود تھا[6]

---

۱ - ایضاً" ورق ۶۴ الف-

۲ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۳۷ ب-

۳ - تحفۃ المجالس' ورق ۵۴ الف-

۴ - ایضاً" ورق ۷۰ ب-

۵ - ایضاً" ورق ۷۱ ب-

۶ - ایضاً" ورق ۷۲ ب-

شیخ احمد کھٹوؒ نے سلطان محمد شاہ کے عہد میں ۱۴ شوال ۸۴۹ھ بمطابق ۱۳ جنوری ۱۴۴۶ء کو جمعرات کے دن زوال سے قبل ۱۱۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ محمود بن سعد بن صدر ایرجی اور مولانا محمد قاسم نے ان کے جسدِ مبارک کو غسل دیا۔ مبارک اور عبدالحی پانی ڈالنے پر مامور تھے۔ شیخِ موصوف نے اپنی وفات سے قبل محمد قاسم کو نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت کی تھی کیونکہ ان کی زندگی میں وہی امامت کیا کرتے تھے[۱] عبداللہ خویشگی رقمطراز ہے کہ "مخدومِ اولیاء" سے ان کی تاریخ ولادت، "قطب" سے مدتِ عمر اور "مخدوم قطب اولیاء" سے سالِ وفات برآمد ہوتا ہے[۲]

شیخ احمد نے اپنی وفات سے قبل شیخ صلاح الدین کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ شیخ صلاح الدین کا والد توکا جی ہندو تھا، اسے شیخ احمد نے مسلمان کر کے اس کا نام شیخ طاہر رکھا۔ صلاح الدین کی ولادت کے تین دن بعد اس کی والدہ فوت ہو گئی اور اس کے چند روز بعد والد بھی راہی ملکِ بقا[۳] ہوئے۔ شیخ احمد نے مثلِ اپنے فرزند کے ان کی پرورش کی۔ جس طرح بابا اسحاق مغربیؒ انہیں اپنے پیٹ پر سلایا کرتے تھے بعینہٖ موصوف اسے اپنے پیٹ پر سلاتے تھے[۴] شیخ احمد نے اپنی رحلت سے قبل سلطان محمد شاہ اور قاضی عبدالحی کی موجودگی میں اسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ شیخ صلاح الدین اپنے مُرشد کے قدموں میں دفن ہیں اور ۲۲ ربیع الاول کو ان کا عُرس ہوتا ہے[۵]

شیخ احمد کھٹوؒ اپنے تعمیر کردہ تالاب اور مسجد سے قریب دفن ہوئے۔ سلطان محمد شاہ نے ان کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ بنوانا شروع کیا جو اس کے جانشین سلطان قطب الدین احمد کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا[۵] جہانگیر نے اپنے بارھویں سال جلوس میں گجرات کے سفر میں ان کے مزار پر حاضری دی۔ وہ ان کے مزار کے بارے میں لکھتا ہے: "مقبرہ شیخ بغایت عمارت عالی و جای نفیس است۔" جہانگیر لکھتا ہے کہ گجرات کا نامور حاکم سلطان محمود بیگڑہ، اس کا بیٹا مظفر اور متوخر الذکر کا نبیرہ محمود شہید بھی وہیں محوِ خواب ابدی ہیں[۶]

جامع ملفوظات

شیخ احمد کھٹو کے ملفوظات ان کے ایک مرید سید محمود بن سعد بن صدر ایرجی نے جمع کئے

---

۱ - ایضاً"۔

۲ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، ورق ۵۳۸ الف۔

۳ - علی محمد خان، مرأتِ احمدی، ص ۲۴۔

۴ - ایضاً"۔

۵ - Commissariat, M.S; History of Gujarat, Vol. 1 . p. 133.

۶ - جہانگیر، تزکِ جہانگیری، ص ۲۱۳۔

ہیں۔ وہ ایرج کے رہنے والے تھے اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حج کے ارادے سے ایرج سے نکلے تھے۔ احمد آباد پہنچ کر انہوں نے محلہ بھنڈیری پورہ میں قیام کیا اور اگلے روز شیخ احمد سے ملنے گئے۔ ادھر یہ اپنی قیام گاہ سے شیخ موصوف کی زیارت کے ارادے سے نکلے، ادھر شیخ نے اپنا ایک خادم انہیں بلانے بھیجا۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور خادم انہیں لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہیں سے دونوں کے تعلقات قائم ہو گئے۔

جانشینی

شیخ احمد اپنے مرشد بابا اسحاق مغربیؒ کی طرح تمام عمر زن و فرزند کے جھمیلوں سے آزاد رہے۔ انہوں نے ایک روز محمود سے کہا کہ جس طرح بابا اسحاق نے انہیں اپنا بیٹا بنایا تھا ویسے ہی موصوف اسے اپنا بیٹا بناتے ہیں۔ محمود کو فرزندی میں قبول کرنے کے بعد شیخ احمد نے ان کی اہلیہ کو بھی ایرج سے بلا کر اپنی بیٹی بنا لیا۔ انہوں نے محلہ بھنڈیری پورہ میں ہی مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ ان کا مزار بھی وہیں ہے جہاں ہر سال دس رجب کو ان کا عُرس ہوتا ہے[1]۔

شیخ احمد ان کا بڑا پاس کرتے تھے۔ ایک بار ان کی سفارش پر امیر بایزید محمد بہادری کو کلاہ عنایت کی[2]۔ جب انہوں نے شیخ موصوف کے ملفوظات جمع کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے بخوشی دے دی[3]۔ تحفتہ المجالس کا فارسی متن ہنوز طبع نہیں ہوا۔ اس کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ ابو ظفر ندوی مرحوم نے اس کا اُردو ترجمہ ۱۹۳۹ء میں اعظم گڑھ سے شائع کیا تھا، جو اب کمیاب ہے۔

ان کے ملفوظات کا ایک اور مجموعہ ـــ ملفوظات شیخ احمد مغربیؒ ـــ کے عنوان سے ان کے ایک مرید محمد بن ابی القاسم نے مرتب کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے[4]۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے راقم الحروف کو بتایا کہ اس میں ایسی

---

۱ - علی محمد خان، مراٰتِ احمدی، ص ۲۲۔
۲ - تحفتہ المجالس، ورق ۲۰ ب۔
۳ - ایضاً، ورق ۲ الف۔
۴ - Ivanaw, W; Catalogue of The Persian Manuscripts in Asiatic Society of Bengal, Calcutta: 1924, MSS : 247.

کوئی بات نہیں جو تحفۃ المجالس میں موجود نہ ہو۔

تحفۃ المجالس میں اس دور کے کئی ایسے سیاسی واقعات بھی آ گئے ہیں، جن کا ذکر تاریخوں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ محمود بن سعد بن صدر ایرجی لکھتے ہیں کہ ملک ابوالمعالی مانڈو کا محاصرہ کئے پڑا تھا کہ کسی نے افواہ اڑا دی کہ وہ مارا گیا ہے۔ اس کے پریشان حال لواحقین شیخ احمد کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے اپنے کشف کی بنیاد پر فرمایا کہ وہ فکر مند نہ ہوں۔ ملکِ مذکور زندہ ہے اور اس وقت بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے لواحقین خوشی خوشی اپنے گھر لوٹے اور اس واقعہ کے چند روز بعد اس کا خیریت نامہ گھر والوں کو مل گیا۔

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ہندو اور مسلمان بکثرت حضرت کی زیارت کو آتے تھے۔ اگر کوئی ہندو مسلمانوں جیسا لباس زیب تن کئے ہوتا، تو حضرت فوراً اسے پہچان لیتے۔ ایک بار اس کے استفسار پر انہوں نے فرمایا، "بوئی مسلمان و بوی کافر پوشیدہ نیست"[۱]

برِعظیم میں اُردو زبان کے نشوونما کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں برِصغیر میں اگر کوئی ایسی جگہ تھی جہاں ہندوستانی سماج کے ہر طبقے اور فرقے اور سب مذاہب کے لوگ بلا روک ٹوک جمع ہو سکتے تھے تو وہ صوفیہ کی خانقاہیں تھیں۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُردو زبان کے نشوونما میں صوفیہ کا حصہ سب سے زیادہ اور سب سے اہم ہے[۲]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ شیخ احمد کھٹو[؟] گوجری زبان سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے ملفوظات میں متعدد ہندی دوھڑے موجود ہیں۔ صوفیائے کرام نے برِعظیم میں تبلیغِ اسلام کی خاطر یہاں کی زبانیں سیکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ انہوں نے مقامی زبانیں سیکھ کر انہیں اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر جانے سے قبل کئی سال تک ملتان میں قیام کر کے ہندوستانی زبان سیکھی تھی[۳] سید محمد الحسینی المعروف بہ بندہ نواز گیسو دراز سنسکرت زبان سے کماحقہٗ واقف تھے[۴] ہمارے اکابر نے زبان کو کبھی اختلافی مسئلہ نہیں بنایا اور اسے ذریعۂ اظہارِ خیال سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

---

۱ - تحفۃ المجالس، ورق ۶۵ الف۔

۲ - خلیق احمد نظامی، ملفوظات کی تاریخی اہمیت، مشمولہ نذرِ عرشی، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۴۴۳۔

۳ - محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۹۔

۴ - محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۱۱۹ -

شیخ احمد کھٹو کے ملفوظات میں ڈونہ' بہل' کنبل (کمبل) بھڑی' چیچ' سپاری اور کاتہ (کتھ) جیسے مقامی الفاظ ملتے ہیں جنہیں وہ فارسی میں گفتگو کرتے ہوئے بلاتکلف بولتے تھے۔ ملفوظات میں ایک جگہ بضد کو بجد بھی لکھا ہے[1]

تحفۃ المجالس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ شیخ احمد کھٹو" علم نجوم سے بخوبی واقف تھے اور جب محمود بن سعد بن صدر ایرجی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو حضرت نے اس کا طالع دیکھ کر اس کا نام تجویز کیا تھا[2]

سلطان فیروز تغلق کے زمانے میں دہلی میں علم نجوم کے کئی نامی گرامی ماہرین ہو گزرے ہیں۔ سلطان فیروز تغلق نے جب کانگڑہ فتح کیا تو وہاں سے سنسکرت کی تقریباً تیرہ صد کتابیں اس کے ہاتھ لگیں۔ سلطان نے ان میں سے علم نجوم پر چند کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا[3] جس سے مسلمانوں میں ہندوؤں کا یہ فن متعارف ہوا۔ حضرت گیسو دراز کی اہلیہ کے نانا مولانا جمال الدین علم نجوم میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور وہ اکثر پیش گوئیاں کرتے رہتے تھے[4] شیخ احمد کھٹو نے بھی غالباً" دہلی میں قیام کے دوران میں ہی یہ فن سیکھا تھا۔

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ شیخ احمد فارسی نظم سے واقف تھے[5] ان کے ملفوظات میں ہندی دوھڑے موجود ہیں۔ محمود بن سعد ایرجی نے ان کے اپنے اشعار ملفوظات میں قلمبند نہیں کئے' البتہ محمد بن ابی القاسم نے "ملفوظات شیخ احمد" مغربی" کے عنوان سے ان کے جو ملفوظات مرتب کئے ہیں ان میں ان کا کلام درج ہے۔

شیخ احمد کھٹو" سماع سن لیتے تھے۔ ایک بار برسات کے موسم میں قوالوں نے انہیں ملہار سنایا۔ جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ اس موقع پر کمال الدین نے نَے بجائی اور تاجن نے سرمنڈل بجایا۔ ساز اور راگ سن کر حضرت پر رقت طاری ہو گئی[6] عبداللہ خویشگی لکھتا ہے کہ شیخ احمد موسیقی سے واقف تھے اور انہوں نے لحن داؤدی پایا تھا[7]

مشائخ نقشبندیہ کے علاوہ ہمارے بزرگوں نے موسیقی کو کبھی شجر ممنوعہ نہیں سمجھا۔ قرون وسطیٰ میں موسیقی کو شاہی درباروں کے علاوہ صوفیائے کرام کی خانقاہوں ہی میں بار ملتا تھا۔ چشتیہ' قادریہ اور شطاریہ سلسلوں کے عروج کے ساتھ موسیقی کو بھی عروج ملا۔ امیر خسرو" نے حضرت

---

۱ - تحفۃ المجالس' ورق ۱۹ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۴۳ ب۔ در علم نجوم دستِ تمام دارند۔
۳ - خلیق احمد نظامی' سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات' مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء' ص ۳۹۹۔
۴ - محمد اکبر حسینی' جوامع الکلم' ص ۲۱۔
۵ - تحفۃ المجالس' ورق ۱۴ ب۔
۶ - ایضاً" ورق ۲۸ الف۔
۷ - عبداللہ خویشگی' معارج الولایت' ورق ۵۳۱ ب -- در علم موسیقی نیز الحان داؤدی داشت۔

نظام الدین اولیاء کے جماعت خانے میں ہی موسیقی کی نوک پلک درست کی تھی۔ شاہ پیر میرٹھی شطاریؒ کو مغل دور کے سوزمین۔۔ سببِ رونقِ اربابِ غنا۔۔ لکھتے تھے[1] میاں تان سین جیسے عظیم فنکار نے شیخ محمد غوث گوالیریؒ کی خانقاہ میں پرورش پائی۔ شاہجہان کے عہد میں صوفی بہاء الدین، شیخ نصیر الدین، شیخ شیر محمد، کبیر اور میر صالح جیسے قوالوں کے دم قدم سے کئی خانقہوں کی رونق قائم تھی۔ سید نظام الدین مدھ نائک جیسا موسیقار، جس کا راگ سن کر بقول میر غلام علی آزاد بلگرامی انسان تو انسان جانور بھی اپنے ہوش کھو بیٹھتے تھے، ایک بہت بڑے دینی اور رُوحانی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا[2] اس لئے اگر عبداللہ خویشگی نے شیخ احمدؒ کو صاحبِ لحنِ داؤدی لکھ دیا ہے تو اس سے ان کی عزت نہیں گھٹتی۔

✪✪✪

---

۱ - محمد صادق، طبقاتِ شاہجہانی، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۶۷۳ ورق ۳۴ ب۔

۲ - میر غلام علی آزاد، سروِ آزاد، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۳ء، ص ۲۵۷۔

لطائفِ قدّوسی

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کا شمار برِّعظیم کے نامور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ چشتیہ صابریہ سلسلے میں انہیں "مجدّد" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں دیوبند کے جن بزرگوں نے برِّعظیم پاک و ہند، بنگلہ دیش، برما، افغانستان، مشرقِ وُسطیٰ، مشرقی اور جنوبی افریقہ میں احیائے دین کا فریضہ انجام دیا اور اپنے وطن کو اغیار کے قبضے سے آزادی دلائی، ان کا رُوحانی سلسلہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ذریعے حضرت گنگوہیؒ سے جا ملتا ہے۔ ان کے ملفوظات "لطائفِ قدّوسی" لودھیوں کے آخری اور مغلوں کے ابتدائی دور حکومت کا ایک اہم ماخذ ہے لیکن ابھی تک کسی تاریخ نویس نے ان کے عمیق مطالعہ کی طرف توجہ مبذول نہیں کی۔ راقم الحروف نے جب پہلی بار لطائفِ قدّوسی کا مطالعہ کیا تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اس سے استفادہ کئے بغیر لودھیوں کے زوال اور مغلوں کے ابتدائی دور کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

لطائفِ قدّوسی کی تالیف

لطائفِ قدّوسی کی تحریر کا آغاز جمادی الاول ۹۴۴ھ / اکتوبر ۱۵۳۷ء میں ہوا۔ اس کی تالیف کے دوران ہی میں ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۴ھ /۲۷نومبر ۱۵۳۷ء کو حضرت گنگوہیؒ نے رحلت فرمائی۔ ان کی وفات کے بعد شعبان ۹۴۴ھ / جنوری ۱۵۳۸ء میں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی[۱] جامع ملفوظات شیخ رکن الدینؒ، حضرت گنگوہیؒ کے جلیل القدر فرزند ہیں۔ ملفوظات کی تدوین کے وقت ان کی عمر ۴۷ سال تھی اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک پختہ ذہن کی تصنیف ہے۔ حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ کے والدِ ماجد شیخ عبدالاحد سہرندیؒ، شیخ رکن الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے[۲] اس سے جامع ملفوظات کی رُوحانی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ شیخ رکن الدینؒ، لطائفِ قدّوسی، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، ص ۷۱۔

۲۔ مفتی غلام سرور، خزینتہ الاصفیاء، مطبوعہ نو لکشور لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ج ۱، ص ۴۲۸۔

لطائفِ قدوسی کی اہمیت

لطائف قدوسی کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ جامع ملفوظات نے متعدد تاریخی واقعات اپنے والدِ بزرگوار کی زبانِ فیض ترجمان سے سنے تھے اور موصوف خود بھی کئی واقعات کے عینی شاہد تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کا ایک مرید دتو سروانی ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان ہونے والی جنگوں میں، مؤخرالذکر کی فوج میں شامل تھا۔ علاوہ ازیں وہ ہمایوں اور بہادر شاہ کے درمیان ہونے والی جنگوں میں گجرات میں مقیم تھا۔ اس نے شیخ رکن الدینؒ کو ان جنگوں کے بارے میں ایسی معلومات بہم پہنچائی تھیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔ ان تمام واقعات میں جامع ملفوظات کی ہمدردیاں مغلوں کی بجائے افغانوں کے ساتھ تھیں۔ لطائفِ قدوسی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہمایوں کی ناکامی کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے برّعظیم کے مذہبی اور رُوحانی حلقوں کو ناراض کر لیا تھا۔ مؤرخوں نے ہمایوں کی ناکامی کے بہت سے اسباب بتائے ہیں لیکن اس اہم سبب کا کسی نے بھی ذکر نہیں کیا۔

لطائفِ قدوسی میں اس عہد کی بہت سی نامور شخصیتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے حضرت گنگوہیؒ کے ملفوظات کو اس عہد کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ سمجھنا چاہیے۔ ملفوظات میں سلطان بہلول لودھی، سکندر لودھی، ابراہیم لودھی، بابر، ہمایوں، بہادر شاہ گجراتی، شیر شاہ سوری، باربک شاہ، عمر خان سروانی، عرفان سروانی، ہیبت خان سروانی، سعید خان سروانی، بی بی اسلام خانو سروانی، سلیمان مندوی، شیخ سماء الدین سہروردیؒ، سیّد احمد ملتانی، شیخ عبدالصمد، میاں بہورہ، شیخ احمد ولد شیخ بڈھ بہاری، مولانا عبداللہ دانشمند دہلوی، شیخ خضر، مولانا جندن، مولانا قطب الدین سرہندی، مولانا شعیب، قاضی عبدالغفور پانی پتی، سلطان محمود لودھی، اننت کرجوگی، بالناتھ جوگی، دلاور خان ابن میاں بہوہ، قاضی فضل اللہ سیّد عبداللہ، شیخ جلال تھانیسریؒ، میاں مخدوم، میرحسن علی اور شیخ اوبہرا کا ذکر آیا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں لطائفِ قدوسی کا حوالہ دیئے بغیر ان نامور ہستیوں کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔

حضرت گنگوہیؒ کے آباء و اجداد

حضرت گنگوہیؒ کا شجرۂ نسب امام اعظم ابو حنیفہؒ سے جا ملتا ہے[1] ان کے آباء و اجداد میں کئی نامور عالم ہو گزرے ہیں اور ان میں سے اکثر بزرگ منصبِ افتاء پر فائز تھے[2] شیخ رکن

---

۱ ۔ ابوالفضل، آئینِ اکبری، مطبوعہ دہلی ۲۷۲اھ، ج ۲، ص ۲۲۳۔

۲ ۔ لطائفِ قدوسی، ص ۹، "آباؤ اجداد حضرت قطبی علماء شرع و مفتی وقت بودہ اند۔"

الدینؒ نے لطائفِ قدوسی میں اپنے والدِ بزرگوار کا نام یوں درج کیا ہے:

شیخ عبدالقدوسؒ بن شیخ اسمٰعیلؒ بن شیخ صفیؒ[1]

سید عبدالحیٔ لکھنوی نے اس شجرہ میں تھوڑا سا اضافہ کیا ہے اور انہوں نے شیخ صفیؒ کے والد کا نام نصیرؒ لکھا ہے[2]

حضرت گنگوہیؒ کے برادران

لطائفِ قدوسی کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کے تین بھائی تھے۔ ایک بڑے بھائی کا نام عبدالصمد[3] دوسرے بڑے بھائی کا نام عبدالملک عرف میاں شیخ[4] اور تیسرے بھائی کا نام عزیز اللہ تھا[5]

حضرت گنگوہیؒ کی ولادت اور تعلیم و تربیت

حضرت گنگوہیؒ سلطان بہلول لودھی کے عہد میں ۸۶۰ھ میں اودھ کے عظیم روحانی اور علمی مرکز رُدولی میں پیدا ہوئے[6] حضرت ابھی ایک سال کے تھے کہ ان کے والدِ بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔ والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد حضرت گنگوہیؒ کے ماموں قاضی دانیال نے ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ قاضی صاحب رودولی میں سکونت پذیر اور صاحبِ "حال و کمال" تھے۔ ایک دن حضرت گنگوہیؒ کی والدۂ محترمہ نے اپنے بھائی سے ان کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ عبدالقدوسؒ کا پڑھائی میں جی نہیں لگتا اور اس نے اپنی کتابیں اٹھا کر رکھ دی ہیں۔ قاضی صاحب نے بہن کی دلجوئی کے لئے کہا کہ وہ ان کی تعزیر کریں گے۔ اتفاقاً حضرت گنگوہیؒ بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ماموں سے کہا کہ نیک کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے اس لئے ابھی اور اسی وقت ان کو سزا دیں۔ جس وقت حضرت یہ الفاظ ادا کر رہے تھے چند عورتیں گاتی ہوئی ادھر آ نکلیں۔ جونہی ان کے گانے کے الفاظ حضرت گنگوہیؒ کے کانوں میں پڑے ان پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور موصوف ناچنے لگے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر قاضی صاحب نے اپنی بہن سے کہا:

---

۱ - ایضاً' ص ۴۔

۲ - عبدالحیٔ' نزہتہ الخواطر' مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۵۴ء' ج ۴' ص ۱۹۹۔

۳ - لطائفِ قدوسی' ص ۶۔

۴ - ایضاً' ص ۱۳۔

۵ - ایضاً' ص ۸۔

۶ - اعجاز الحق قدوسی' شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات' کراچی ۱۹۶۱ء' ص ۱۴۸۔

این پسر را عالی دیگر پیش آمده است ہیچ اندیشہ مکن، از ہمہ خوب خواہد شد[1]
اس بچے کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔تم فکر نہ کرو یہ سب سے اچھا نکلے گا۔

حضرت گنگوہیؒ کے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے ان کے فرزند شیخ رکن الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ موصوف اپنے بچپن میں مسجد میں جا کر نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرتے تھے[2] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اوائلِ عمر ہی سے حضرت کی طبیعت نیکی کی طرف مائل تھی اور وہ حصولِ ثواب کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ان کے والدِ بزرگوار کی ظاہری تعلیم تو واجبی سی تھی لیکن انہیں علمِ لدنی حاصل تھا۔ موصوف مشکل سے مشکل کتاب پڑھا لیتے تھے اور ایسے عالمانہ انداز میں نفسِ مضمون پر بحث کرتے تھے کہ بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے تھے[3] دہلی میں قیام کے دوران حضرت گنگوہیؒ کی مولانا عبداللہ دانشمند دھلوی اور شیخ احمد ولد شیخ بڈھ دانشمند بہاری کے ساتھ علمی موضوعات پر گفتگو رہتی تھی[4]

خطّاطی کی تعلیم

شیخ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ ان کے والدِ ماجد بڑے خوش خط تھے[5] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں رودولی جیسے قصبے میں بھی فنِ خطّاطی سکھانے کا انتظام تھا۔

قرائت کی تعلیم

حضرت گنگوہیؒ کو قرآنِ پاک کی تلاوت کا بڑا شوق تھا اور موصوف علمِ قرائت سے بھی واقف تھے[6] حضرت گنگوہیؒ اپنے ایک مکتوب میں شیخ درویش اودھی کو لکھتے ہیں:

دگر این بندہ توفیق یافت شب و روز در مشقت خود را اقرار نداشت تا حفظِ کلامِ ربانی بر قرأۃ امامِ ابی عمر رضی اللہ عنہ میانِ چند ماہ تمام کردہ[7]

---

۱ ۔ لطائفِ قدوسی، ص ۷۔
۲ ۔ ایضاً" ص ۶۔
۳ ۔ لطائفِ قدوسی، ص ۷۔
۴ ۔ ایضاً" ص ۴۷۔
۵ ۔ ایضاً" ص ۶۔
۶ ۔ ایضاً" ۴۱ ــــ "حضرت قطبی را علم قرأۃ ہم بسیار بود ــــ"۔
۷ ۔ عبدالقدّوس گنگوہیؒ، مکتوباتِ قدوسیہ، مطبع احمدی دہلی، مکتوب نمبر ۳۷، ص ۵۵۔

ترجمہ : ثانیاً" اس بندہ کو خدا نے توفیق بخشی۔ دن رات محنت کی اور اس وقت تک آرام نہ کیا جب تک چند ماہ میں امام ابی عمرؓ کی روایت سے قرآن مجید حفظ نہیں کر لیا۔

حضرت گنگوہیؒ نے فنِ قرأۃ پر ایک رسالہ "فوائد القرأۃ" کے نام سے لکھا ہے۔ شیخ رکن الدینؒ کی روایت ہے کہ ان کے والد نے قرآن پاک شیخ سلیمان مندوی سے سنا تھا۔ شیخ موصوف قرأۃ سے تو واقف نہ تھے لیکن انہوں نے مخارج ایک اُستاد سے سیکھے تھے[1]

حضرت گنگوہیؒ کے ایک اُستاد

سید عبدالحی نے حضرت گنگوہیؒ کے ایک اُستاد ملّا فتح اللہ المشہور بہ چکنہ کا ذکر کیا ہے۔ موصوف نے ان سے صرف و نحو پڑھی تھی[2]

مشائخ کرام اور مقامی زبانیں

لطائفِ قدوسی کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کو ہندی زبان پر کامل عبور حاصل تھا اور موصوف ہندی زبان میں بات چیت کر لیتے تھے[3] ایک دوسرے موقع پر اس بات کی تصریح موجود ہے کہ موصوف ہندوی دوھڑے پڑھ کر رُویا کرتے تھے[4] برِّعظیم میں جن اولیاء اللہ نے اسلام کی تبلیغ کی ہے ان کی اکثریت مقامی زبانوں سے واقف تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ انہوں نے اجمیر جانے سے پہلے ملتان میں طویل قیام کر کے ہندوستانی زبان میں مہارتِ تامہ حاصل کی[5] میر خورد کرمانی کی روایت ہے کہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ بھی ہندی زبان میں بات چیت کر لیتے تھے[6] سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوریؒ کے گھر میں "ہندوی" زبان بولی جاتی تھی[7] حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ بڑے فخریہ انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے سنسکرت زبان پڑھی ہے اور ہندوؤں کی دیومالا سے بھی بخوبی واقف ہیں[8] حضرت شیخ احمد کھٹوؒ کے ملفوظات "تحفتہ المجالس" کے مطالعہ سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ گوجری زبان سے کافی واقفیت رکھتے تھے[9] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

۱۔ رکن الدین' لطائفِ قدوسی ص ۴۱۔
۲۔ عبدالحی' نزہتہ الخواطر' مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۵۴ء ج ۴ ص ۱۹۹۔
۳۔ رکن الدین' لطائفِ قدوسی' ص ۳۶۔
۴۔ ایضاً" ص ۲۸۔
۵۔ شیخ محمد اکرام' مضمون مشمولہ "خواجۂ خواجگان" مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء' ص ۹۹۔
۶۔ میر خورد کرمانی' سیرالاولیاء' مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ' ص ۱۸۳۔
۷۔ فریدالدین' سرور الصدور' مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری' فارسی تصوف ۲۱ ر ۱۶۱' ورق ۸
۸۔ سید محمد اکبر حسینی' جوامع الکلم' مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ' ص ۱۹۔
۹۔ خلیق احمد نظامی' نذرِ عرشی' مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء' ص ۴۴۳۔

صوفیاء کرام نے زبان کے معاملے میں کبھی تعصب کو راہ نہیں دی۔

حضرت گنگوہیؒ کی تصانیف

مولانا عبدالحی لکھنوی، حضرت گنگوہیؒ کی تین تصانیف سے متعارف ہیں۔ انہوں نے حاشیہ بر تعرّف، شرح عوارف المعارف اور انوار العیون و اسرار المکنون کا ذکر کیا ہے[1] عمر رضا کحالہ کے خیال میں انوار العیون تصوّف کے موضوع پر ہے[2] رحمٰن علی کی یہ رائے ہے کہ اس کا موضوع "ہفت فن" ہے[3] شیخ رکن الدینؒ لطائفِ قدوسی میں بر سبیل تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے والدِ بزرگوار نے عوارف المعارف کی شرح عربی زبان میں لکھی تھی[4] لطائفِ قدوسی میں ان کی ایک تصنیف فوائد القرأۃ کا ذکر بھی آیا ہے جو انہوں نے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، فن قرأت پر لکھی تھی[5] حضرت گنگوہیؒ کے مکتوبات میں ان کے ملفوظات کے ایک مجموعہ کا ذکر آیا ہے۔ یہ ملفوظات لطائفِ قدوسی سے پہلے ان کے ایک معتقد شیخ خضر بڈھن جونپوری نے جمع کئے تھے۔ جامع مکتوبات نے اس مجموعہ کا نام "اسرار العجائب" لکھا ہے[6]

شیخ رکن الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے والدِ ماجد کا شادی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ دشت و کوہ میں فقر و تجرّد کی زندگی گزاریں اور مرنے پر گمنام رہیں۔ اتفاقاً" ایک شب ان کے مرشد شیخ محمدؒ کی والدہ اُمِ کلثومؒ نے خواب میں اپنے سُسر شیخ احمد عبدالحق رودولویؒ کی زیارت کی۔ موصوف نے اپنی بہو سے کہا کہ عبدالقدوس کو گود لے کر ان کی پرورش کریں۔ اس نیک بخت نے اس خواب کی یہ تعبیر لی کہ شیخ احمد عبدالحقؒ یہ چاہتے ہیں کہ عبدالقدوس کی شادی اپنی بیٹی سے کر دیں۔ اس رُوحانی اشارے کے تحت ان کا نکاح اپنے مرشد کی بہن کے ساتھ ہو گیا۔ شیخ رکن الدینؒ رقمطراز ہیں کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ شیخ عبدالقدوس کا نکاح ہو رہا ہے تو انہوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور "دیوانے" کے نکاح کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ دُولہا میاں کو عُروسی جُوڑا پہنا کر ایک چوکی پر، جو اس مقصد کے لئے سجائی گئی تھی، بٹھایا گیا اور "رسمِ جلوہ" ادا کی گئی۔ اس موقع پر مغنّیہ عورتوں نے شادی بیاہ پر گائے جانے والے گیت گانے شروع کئے جب انہوں نے یہ دوھڑا پڑھا:

---

۱ ۔ عبدالحی، نزھتہ الخواطر، مطبوعہ حیدر آباد، ج ۴، ص ۱۹۹۔

۲ ۔ عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین، مطبوعہ دمشق ۱۹۵۸ء، ج ۸، ص ۳۳۔

۳ ۔ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۰۔

۴ ۔ رکن الدین، لطائفِ قدوسی ص ۸۔

۵ ۔ ایضاً" ص ۴۱۔

۶ ۔ عبدالقدوس گنگوہیؒ، مکتوباتِ قدوسیہ، مطبع احمدی دہلی، مکتوب نمبر ۱۲۲، ص ۲۳۴۔

کہو کہ کھول دھنا شہ دیکھا لوری
اس گھونگھٹ ری کارن شہ ہاتہ مروری

تو حضرت پر وجد طاری ہو گیا۔ موصوف بے خودی کے عالم میں چوکی سے گر گئے اور عروسی جوڑا پھاڑ کر رقص کرنے لگے۔ حاضرین کو اس پر سخت تعجب ہوا اور انہوں نے ان کی ساس سے پوچھا کہ انہوں نے ایسے "دیوانے" کو بیٹی کیوں دے دی؟ اس نیک بخت نے کہا کہ نوشتۂ ازل یہی تھا اور وہ اسے بدل نہیں سکتے تھے[۱]

اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لودھیوں کے زمانے میں شادی بیاہ کے موقع پر باقاعدہ مغنّیہ عورتوں کو گانے کے لئے بلایا جاتا تھا اور مذہبی گھرانوں میں بھی اس فعل کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں شادی کے موقعہ پر "رسمِ جلوہ" ادا کی جاتی تھی۔

شادی کے بعد کی زندگی

شیخ عبدالقدوسؒ نے شادی کے بعد "شغل" باقاعدہ جاری رکھا۔ موصوف کسی دنیاوی کام میں دلچسپی نہیں لیتے تھے اس لئے گھر میں فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ ان کے بڑے صاحب زادے شیخ حمید الدینؒ بھوک سے بلکتے تو اپنی والدہ سے کھانا مانگتے۔ والدہ صاحبہ کے پاس کیا رکھا تھا جو انہیں کھانے کو دیتیں۔ وہ بچے سے کہتیں کہ جاؤ اپنے والد سے کھانا مانگو۔ جب بچہ اپنے والد کے پاس جا کر کھانا طلب کرتا وہ بچے سے کہتے کہ بیٹا جب وہ جنّت میں جائیں گے تو وہاں بہت سی چیزیں کھانے کو ملیں گی۔ بچہ تعجب سے پوچھتا کہ جنّت کہاں ہے؟ شیخ عبدالقدوسؒ بچے کا سوال سن کر خاموش ہو جاتے تو وہ روتا ہوا اپنی والدہ کے پاس چلا جاتا اور وہ بچے کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتیں[۲]

ابتدائے سلوک

شیخ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ ابتداءً میں ان کے والدِ بزرگوار نے شیخ عارفؒ بن حضرت احمد عبدالحق رودولویؒ کے ایک خادم شیخ پیارہ کی صحبت اختیار کی اور ان سے تصوّف کی ابتدائی تعلیم حاصل کی[۳]

---

۱ - رکن الدین، لطائفِ قدوسی، ص ۱۱۔
۲ - ایضاً" ص ۱۲۔
۳ - ایضاً" ص ۹۔

شرفِ بیعت

شیخ پیارہ سے تصوف کی ابتدائی تعلیم پانے کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے شیخ محمدؒ بن شیخ عارفؒ بن شیخ احمد عبدالحق رودولویؒ سے بیعت کی لیکن فیض اویسی طریقے پر حضرت احمد عبدالحقؒ سے اخذ کیا[1]۔ ان کے مرشد ان کے ہم سن تھے اس لئے کچھ دنوں بعد انہوں نے کسی مُسن بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہی ایام میں ایک روز حضرت احمد عبدالحقؒ مجسّم ہو کر ان کے سامنے آئے اور انہیں مخاطب کر کے کہنے لگے: "کسی دوسری جگہ مت جانا ہم مرے نہیں ہیں"[2]۔

پیر اور مرید کے تعلقات

لطائفِ قدوسی کے ایک اندراج سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کے مرشد شیخ محمدؒ ان کا بے حد احترام کیا کرتے تھے[3]۔ (ان کی والدۂ ماجدہ نے خواب میں حضرت احمد عبدالحقؒ کا اشارہ پا کر اپنی بیٹی کا نکاح حضرت گنگوہیؒ سے کر دیا تھا۔ اس لئے پیر اور مرید میں سالے اور بہنوئی کا رشتہ تھا)۔

راہِ سلوک

شیخ محمدؒ کی بیعت کے بعد شیخ عبدالقدوسؒ نے سلوک کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ موصوف نے اپنے پردادا مرشد شیخ احمد عبدالحقؒ کے مزار کی صفائی اور ان کے لنگر میں جلانے کے لئے ایندھن فراہم کرنے کا ذمہ لیا[4]۔ جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ جمعہ کے روز ان کے والد اپنے مرشد کے پورے خاندان کے میلے کپڑے جمع کرتے، انہیں ایک تالاب پر جا کر دھوتے اور سکھا کر مالکوں کو واپس پہنچا دیتے[5]۔

---

۱ - ایضاً، ص ۶۔
۲ - ایضاً، ص ۹۔
۳ - ایضاً
۴ - ایضاً، ص ۱۰۔
۵ - ایضاً، ص ۱۱۔

رودولی سے ہجرت

سلطان بہلول لودھی کے انتقال کے بعد رودولی میں کافروں کا عمل دخل شروع ہو گیا اور غیر مسلم سر بازار سؤر کا گوشت فروخت کرنے لگے۔ ان حالات میں حضرت گنگوہیؒ رودولی سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور اپنے متعلقین کے ساتھ رہائش کے لئے کسی مناسب مقام کی تلاش میں چل پڑے۔ اثنائے سفر ان کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا جہاں سلطان اپنے لشکر کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ وہاں حضرت گنگوہیؒ کی ملاقات عمر خان سروانی سے ہوئی۔ اس نے حضرت سے کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اس کے آبائی وطن شاہ آباد میں سکونت اختیار کر لیں۔ حضرت گنگوہیؒ اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے شاہ آباد میں قیام پذیر ہو گئے اور ۳۷ یا ۳۸ برس وہیں رہے۔ شیخ حمید الدینؒ کے علاوہ ان کے تمام بچے شاہ آباد میں پیدا ہوئے[1]

آمدِ گنگوہ شریف

حضرت گنگوہیؒ شاہ آباد میں ۳۷ یا ۳۸ سال مقیم رہے۔ جب بابر نے ۱۵۲۶ء میں دہلی اور آگرہ پر قبضہ کیا تو اس کے سپاہیوں نے شاہ آباد کو اس طرح تباہ کیا کہ دُور دُور تک سوائے ویرانی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ان حالات میں حضرت گنگوہیؒ شاہ آباد سے گنگوہ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے[2]

عبادت اور مشاغل

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہیؒ کا یہ معمول تھا کہ موصوف شبِ برات میں سو نفل با جماعت ادا فرماتے اور ان نفلوں میں قرآن مجید ختم کرتے۔ ان کا یہ معمول کبھی فوت نہیں ہوا[3] شیخ احمد اور شیخ علی، حضرت گنگوہیؒ کے دو کمسن بیٹے تھے۔ انہوں نے شبِ قدر کو عبادت میں بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضرت نے فرمایا: "جاؤ جا کر سو رہو۔ تم ابھی بچے ہو۔ شبِ قدر کی تاب نہ لا سکو گے۔"[4]

شیخ رکن الدینؒ رقمطراز ہیں کہ ابتدائے سلوک میں ان کے والدِ ماجد چار سو رکعت نفل

---

۱ - ایضاً" ص ۳۱-
۲ - ایضاً"-
۳ - ایضاً" ص ۳۴-
۴ - ایضاً" ص ۳۵-

دن کے وقت اور اتنے ہی رات کے وقت ادا کرتے تھے۔ سجدوں کی کثرت کی وجہ سے ان کا پاجامہ گھٹنوں سے اور جبّہ رانوں سے جلدی جلدی پھٹ جاتے تھے۔[1]

حضرت گنگوہیؒ صائم الدہر تھے۔ شیخ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے چالیس برس میں یہی دیکھا کہ ان کے والدِ بزرگوار سال میں صرف پانچ دن افطار کرتے تھے۔[2]

احتیاط کا عالم

شیخ عبدالقدوسؒ شریعت کا بڑا پاس کرتے تھے اور ذبیحہ کے بارے میں خاصی احتیاط برتتے تھے۔ جامع ملفوظات فرماتے ہیں کہ ان کے والدِ ماجد بے نماز قصاب کے ذبح کردہ جانور کا گوشت نہیں کھاتے تھے اور محلِ شبہ سے بھی پہلو بچاتے تھے۔ ایک قصائی ان کا مرید تھا۔ انہوں نے اسے ذبیحہ کے احکام اچھی طرح سمجھا دیئے تھے اور صرف اسی کے ہاتھ سے ذبح شدہ جانور کا گوشت تناول فرماتے تھے۔[3] ایک بار دہلی میں قیام کے دوران میں دستر خوان پر مرغی کا سالن چنا گیا۔ حضرت نے لقمہ شوربے میں تر کر کے ابھی اٹھایا ہی تھا کہ فوراً" دستر خوان پر رکھ دیا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ شیخ رکن الدینؒ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کھانا تناول نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو حضرت نے فرمایا کہ مرغی اچھی طرح ذبح نہیں کی گئی۔[4]

شیخ رکن الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے والدِ ماجد کنوؤں کا پانی مطلق استعمال نہیں فرماتے تھے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ کنوؤں میں سطحِ آب پر کوڑا کرکٹ اور بعض دوسری اشیاء' جو لوگ بے احتیاطی سے پھینک دیتے تھے' تیرتی نظر آتی ہیں۔ حضرت گنگوہی کو غالباً" اسی سبب سے کنوؤں کے پانی کے پاک ہونے پر شبہ تھا اور وہ کنوئیں کا پانی استعمال نہیں فرماتے تھے۔ گاؤں سے کافی دُور ایک تالاب تھا' ان کے استعمال کے لئے وہاں سے پانی لایا جاتا تھا۔[5]

سادگی

حضرت گنگوہیؒ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ موصوف ہمیشہ کھدر کا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ حضرت لباس کے لئے نیا کپڑا خریدنے کی بجائے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور گلیوں سے بوسیدہ اور پرانے کپڑے اکٹھے کر لیتے اور انہیں پاک کر کے اپنے لئے لباس سلوا لیتے۔[6]

---

۱ - ایضاً" ص ۱۵۔
۲ - ایضاً" ص ۴۹۔
۳ - ایضاً" ص ۱۵۔
۴ - ایضاً" ص ۵۰۔
۵ - ایضاً" ص ۱۵۔
۶ - ایضاً" ص ۵۹۔

دنیا داروں کو ملنے سے احتراز

شیخ عبدالقدوسؒ دنیا داروں اور سرکاری ملازموں سے ملنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ رودولی کا داروغہ قاضی محمود تھانیسری ان کا عقیدت مند تھا۔ جب کبھی وہ ان کی زیارت کا قصد کرتا تو حضرت گنگوہیؒ اس کی اطلاع ملتے ہی ویرانے کی طرف بھاگ جاتے۔ جامع ملفوظات اپنے والدِ ماجد کے بارے میں لکھتے ہیں:

تبرّی از اہلِ دنیا بر کمال بود۔ اختلاط باایشان زہرِ قاتل میدانستند۔[1]

دنیا داروں کو ملنے سے بڑا احتراز کرتے تھے اور ان سے ملنے جلنے کو زہرِ قاتل سمجھتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ کے آخری ایامِ حیات

حضرت گنگوہیؒ نے اپنی وفات سے تین سال قبل سکوت اختیار فرما لیا تھا اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ ان ایّام میں آپ ہر وقت عالمِ محویّت اور بے خودی میں رہتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ کا وصال

حضرت گنگوہیؒ نے ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۴ھ / ۲۷ نومبر ۱۵۳۷ء کو بروزِ منگل صبح چاشت کے وقت تحیۃ الوضو کے نفل ادا کرتے ہوئے انتقال فرمایا۔ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں ان کا سالِ وفات ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء لکھا ہے،[2] جو صحیح نہیں ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے اشعار

لطائفِ قدوسی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ گاہے گاہے سفر پر نکلتے تھے۔ ایک بار موصوف نے پاکپتن اور ملتان کا سفر حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اور حضرت شیخ بہا الدین زکریاؒ کے مزارات کی زیارت کی غرض سے کیا تھا[3] اسی طرح ان کے سفرِ آگرہ کا ذکر بھی ملفوظات میں آیا ہے[4] جن دنوں شیخ رکن الدینؒ دہلی میں تعلیم پا رہے تھے ان دنوں حضرت گنگوہیؒ کا قیام بھی دہلی ہی میں تھا[5] ان دنوں ان کا زیادہ وقت مشائخ کے مزاروں کی

۱ - ایضاً، ص ۷۰۔
۲ - ابوالفضل، آئینِ اکبری، مطبوعہ دہلی ۱۲۷۲ھ، ج ۲، ص ۲۰۳۔
۳ - ایضاً، رکن الدینؒ، لطائفِ قدوسی، ص ۳۹۔
۴ - ایضاً، ص ۵۴۔
۵ - ایضاً، ص ۴۶۔

زیارت میں گزرتا تھا۔ بابر اور ابراہیم کے درمیان جب پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی تو حضرت گنگوہیؒ بھی افغان لشکر میں موجود تھے۔[1]

تصوف کا زوال

مملوک، خلجی اور تغلق سلاطین کے عہد میں جس پائے کے اولیاء اللہ برّعظیم میں موجود تھے ان کی نظیر نہیں ملتی۔ سیّدوں اور لودھیوں کے عہد میں برّعظیم میں تصوف کا زوال شروع ہوا۔ اس زمانے میں برّعظیم کے شہروں اور قصبوں میں بے شمار ننگ دھڑنگ مجذوب اور بے شرع صوفی نظر آتے تھے۔ جس معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہوں اسے کسی طرح بھی صحت مند معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ لطائفِ قدوسی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کئی نامور صوفی، جن میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ سیّد نجم الدینؒ کے مرید شیخ حسین قلندر بھی شامل تھے، نماز نہیں پڑھتے تھے۔[2] شیخ رکن الدینؒ تصوف کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مداری سلسلہ، جو حضرت بدیع الدین مدارؒ کی طرف منسوب ہے، اس زمانے میں خاصا بدنام ہو چکا تھا۔[3][4]

جامع ملفوظات اپنے زمانے کے صوفیوں کے مبلغِ علم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

درین عہد کہ درویشان اند اکثر جہال اند برگفتۂ ایشان اعتماد نمی افتد، و چون چیزی مشکل در علمِ معرفت بہ پرسیدہ میشود پرسشِ ما را فہم نمی کنند و جوابِ شافی نمید ہند۔[5]	اس عہد میں جتنے درویش ہیں ان کی اکثریت جاہل ہے۔ ان کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔ جب معرفت کا کوئی مشکل مسئلہ ان سے پوچھا جاتا ہے تو وہ ہمارے سوال کو ہی نہیں سمجھ سکتے اور ان کے جواب سے تشفی نہیں ہوتی۔

یہ تو تھی ہمایوں کے آخری عہد حکومت کی بات، اب ذرا اکبر کے عہد کے صوفیوں اور سجادہ نشینوں کا ذکر شیخ اخوند درویزہ کی زبانی سنتے جائیے:

خصوصاً درین زمانۂ فساد کہ اکثر مردم	خاص طور پر اس زمانۂ فساد میں اکثر انسان

۱ - ایضاً، ص ۱۴۱۔
۲ - ایضاً، ص ۴۳، ۴۴۔
۳ - ایضاً، ص ۲۲، ۲۴۔
۴ - ایضاً، ص ۶ "دران ایام منسوب بگمراہی والحاد است"۔
۵ - ایضاً، ص ۵۵۔

صورت و شیطان سیرت برسجادہ پدر و پدرِ کلانِ خود نشستہ اند[1] — صورت شیطان سیرت لوگ اپنے باپ اور دادا کی مسندوں پر براجمان ہیں۔

لودھی عہد میں تصوف کا انحطاط

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جن دنوں میں وہ رودولی میں قیام پذیر تھے وہاں کئی نک دھڑنگ "صاحبِ کرامت" مجذوب گلیوں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یونس دیوانہ نامی ایک ایسے ہی "صاحبِ کرامت" مجذوب سے ان کی ملاقات رہتی تھی۔ حضرت گنگوہیؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ سرِراہ شراب پیا کرتا تھا۔ ایک روز انہوں نے اسے شارع عام پر شراب پیتے دیکھا تو اس خیال سے کہ اس سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے' انہوں نے راستہ بدلنا چاہا۔ یونس دیوانے نے انہیں کنی کترا کر نکلتے ہوئے دیکھا تو جام بکف ان کے پیچھے بھاگا اور انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا:

صوفی نشود صافی تا درد نکشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی[2]

اس واقعہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اولاً یہ کہ لودھیوں کے عہدِ حکومت میں احتساب کمزور ہو گیا تھا اور لوگ سرِعام شراب پینے لگے تھے اور انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ ثانیاً یہ کہ شراب عام دستیاب تھی اور رودولی جیسے علمی اور رُوحانی مرکز میں بھی بآسانی مل جاتی تھی اور لوگ سڑکوں پر چل پھر کر پیتے نظر آتے تھے۔

رودولی میں قیام کے دوران میں حضرت گنگوہیؒ کی وہاں کے مجاذیب کے ساتھ اکثر ملاقات رہتی تھی۔ ان "صاحبِ کرامت" مجذوبوں میں سے ایک تاجن دیوانہ بھی تھا۔ وہ فارسی اور ہندوی زبانیں جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھی خلوت میں حضرت گنگوہیؒ سے ملتا تو فرزانہ بن جاتا' لیکن دوسروں کے سامنے ہمیشہ دیوانگی کی باتیں کرتا[3]۔ اسی طرح رودولی کے ایک دیوانے بھیکا عرف پھیکا نے حضرت گنگوہیؒ کو کمال حاصل کرنے کی بشارت دی تھی۔[4]

حضرت گنگوہیؒ جب ملتان اور پاکپتن کے سفر پر نکلے تو دیپالپور میں ان کی ملاقات ابراہیم

---

۱ - اخوند درویزہ' ارشاد الطالبین' مطبوعہ دہلی ۱۸۸۸ء' ص ۲۹۹۔
۲ - ایضاً' ص ۹۔
۳ - ایضاً۔
۴ - ایضاً۔

مجذوب کے ساتھ ہوئی۔ اس کا رویّہ علماء کے ساتھ بڑا سخت تھا لیکن جب حضرت اس سے ملنے گئے تو اس نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور ان کے قدموں میں گر پڑا۔ رخصت کے وقت حضرت نے اس سے دُعا کی التجا کی تو اس نے کہا کہ وہ خود ان کی دُعا کا محتاج ہے[1]

سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد خلل

سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد سکندر لودھی تخت نشین ہوا تو مشرقی ہندوستان میں ابتری پھیل گئی۔ ان حالات میں غیر مسلموں نے قوت فراہم پیدا کر لی اور بیشتر شہروں اور قصبوں میں ان کا عمل دخل شروع ہو گیا۔ رودولی جیسے قدیم رُوحانی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مرکز میں ان کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ وہ شعار اسلام مٹانے پر تل گئے۔ بازاروں میں سؤر کا گوشت سرعام بکنے لگا۔ ان حالات میں حضرت گنگوہیؒ رودولی کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ واقعہ شیخ رکن الدینؒ کی پیدائش سے ایک سال پہلے ۸۹۶ھ / ۱۴۹۱ء میں پیش آیا[2]

چشتی بزرگوں کے مسلک کے برعکس حضرت گنگوہیؒ نے اپنے ہمعصر سلاطین کے ساتھ روابط قائم رکھے۔ آپ کے مکتوبات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سلطانِ وقت کو ظل اللہ فی الارض سمجھتے تھے اور اسے "اولی الامر" تسلیم کرتے تھے[3] سکندر لودھی کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور اس کے ساتھ خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ سلطان کے نام ایک خط میں موصوف اسے یاد دلاتے ہیں کہ اگر وہ ایک گھڑی بیٹھ کر عدل کرے تو یہ ایک گھڑی دوسروں کی ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔ سکندر لودھی کے نام ایک خط میں حضرت گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سلطانِ عادل کا چہرہ دیکھنا بھی عبادت ہے[4]

سلطان سکندر لودھی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابراہیم لودھی بھی حضرت کا قدر دان رہا۔ جب وہ ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں بابر کے خلاف لڑنے کے لئے نکلا تو اس نے "برکت" کے لئے حضرت گنگوہیؒ کو اپنے لشکر میں بلا لیا تھا۔

بابر کی آمد

بابر کے برِعظیم پر حملہ سے ایک سال قبل حضرت گنگوہیؒ کا ایک خاص مرید دتو سروانی

۱۔ ایضاً" ص ۳۹۔

۲۔ ایضاً" ص ۳۱۔

۳۔ عبدالقدوس گنگوہیؒ، "مکتوبات قدوسیہ" مطبوعہ مطبع احمدی دہلی، مکتوب نمبر ۴۴، ص ۴۴، ۴۵۔

۴۔ ایضاً" "النظر الی وجہ السلطان العادل عبادۃ"

۵۔ رکن الدین، لطائف قدوسی، ص ۶۳، ۶۴۔

بدایوں میں مقیم تھا۔ اس نے خواب دیکھا کہ مغرب کی سمت سے تند و تیز ہوا آ رہی ہے اور اس کے ساتھ غبار اڑ رہا ہے۔ فضا میں تاریکی پھیل گئی' درخت اور مکان گرنے لگے۔ ہوا ٹوٹے ہوئے درختوں کے پتوں اور مکانوں کے ملبہ کو مشرق کی سمت اڑا لے گئی۔ اس نے حضرت گنگوھیؒ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ اس نے جو بادِ قہر دیکھی ہے وہ افغانوں کے نفس کی شامت ہے۔ ان کی صفیں ٹوٹ جائیں گی اور یہاں ترکوں کی بساط بچھ جائے گی۔ اس خواب کے ایک سال بعد بابر نے پانی پت کے تاریخی میدان میں ابراہیم کو شکست دی۔ افغانوں نے اپنی صف لپیٹ لی اور ترکوں نے اس کی جگہ اپنی بساط بچا لی۔[1]

اس خواب سے اور اس طرح کے دوسرے خوابوں سے' جو حضرت گنگوھیؒ کے رشتہ داروں اور مریدوں نے بابر کی آمد سے قبل دیکھے تھے' یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بابر کے ہاتھوں افغانوں پر جو تباہی آئی' وہ ان کی شامتِ اعمال کا نتیجہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ برِعظیم کے مذہبی حلقوں کی ہمدردیاں مغلوں کی بجائے افغانوں کے ساتھ تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ افغانوں کی حرکتوں سے بھی نالاں تھے۔

حضرت گنگوھیؒ میدانِ جنگ میں

جب بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان پانی پت میں جنگ ہوئی تو ارد گرد کے علاقے سے لوگ بھاگ گئے اور تمام علاقہ ویران ہو گیا۔ ان دنوں کہیں بھی امن نہ تھا۔ حضرت گنگوھیؒ اپنے اہل و عیال کو لے کر کرنانہ چلے گئے۔ یہ مقام ابراہیم کے لشکر کے عقب میں دریا کے پار واقع تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جو بلا آئے گی وہ ابراہیم اور اس کے لشکر پر نازل ہو گی اور انہیں کسی محفوظ مقام تک جانے کا وقت مل جائے گا۔

افغان سپاہی حضرت گنگوھیؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ وہ گروہ در گروہ ان کی زیارت کو آنے لگے۔ ابراہیم کو معلوم ہوا تو اس نے حضرت گنگوھیؒ کو اپنے لشکر میں لانے کی کوشش کی۔ ان دنوں حضرت کہا کرتے تھے کہ اس بار انہیں خیریت معلوم نہیں ہوتی اور وہ ابراہیم کے لشکر کو پانی پت سے آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ جب ابراہیم نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت گنگوھیؒ نے اپنے اہل و عیال (بشمول شیخ رکن الدینؒ) کو "ہندوستان" کی طرف بھیج دیا اور خود اپنے بڑے فرزند شیخ حمید الدینؒ اور خادمِ خاص سید راجا کو ساتھ لے کر افغان لشکر میں چلے آئے۔

---

۱ - ایضاً" ص ۲۷۔

ایک روز حضرت گنگوہیؒ نے شیخ حمید الدینؒ سے فرمایا کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ قید ہوئے تھے' اس لئے انہوں نے بھی قید و بند کو اپنے بزرگوں کی سنّت سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ لہٰذا انہیں اختیار ہے کہ وہ اگر کسی محفوظ مقام کی طرف جانا چاہیں تو چلے جائیں۔ شیخ حمید الدینؒ اور سید راجا نے عرض کیا کہ جو طریقہ حضرت نے اختیار کیا ہے وہی انہوں نے بھی اختیار کیا ہے، وہ انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو حضرت گنگوہیؒ نے شیخ حمید الدینؒ سے فرمایا کہ انہیں اپنے گھوڑے کی حرکات دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو شکست ہو گی' اس لئے اب وہاں سے چلنا چاہئے۔ ابھی ایک پہر دن بھی نہیں گزرا تھا کہ ابراہیم کی شکست کا شور بلند ہوا۔ تھوڑی دیر بعد مغل سواروں نے انہیں گھیر لیا۔ حضرت گنگوہیؒ کا گھوڑا اور کپڑے مغلوں نے چھین لئے۔ شیخ حمید الدینؒ اور سید راجا گرفتار ہوئے۔ مغلوں نے حضرت گنگوہیؒ کی دستار شیخ حمید الدینؒ کے گلے میں ڈال کر انہیں فتراک سے باندھ لیا۔ حضرت نے ان کی تسلّی کے لئے فرمایا کہ پیروں کی دستار ان کے گلے میں ہے' یہی شفاعت کے لئے کافی ہو گی۔ مغلوں نے انہیں دوسرے اسیروں کے ساتھ دہلی کی طرف ہانکنا شروع کر دیا۔ حضرت گنگوہیؒ کی عمر اس وقت ۷۳ سال تھی اور ان میں چلنے کی ہمت نہیں تھی' اس کے باوجود موصوف پانی پت سے پا پیادہ دہلی پہنچے[1]

افغانوں کا شمالی ہند سے انخلاء

سلطان ابراہیم لودھی کی شکست کی خبر ملتے ہی افغانوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ شمالی ہند سے بہار اور بنگال کی طرف بھاگنے لگے۔ دریائے سرو (سرجو) کے گھاٹ پر بھگوڑے افغانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ کشتیاں کم پڑ گئیں۔ دتو سروانی' عیسیٰ خاں سروانی کے ساتھ گھاٹ پر موجود تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہاں یہ افواہ پھیل گئی کہ مغل عنقریب ہی وہاں پہنچنے والے ہیں۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی افغانوں کے رہے سہے اَوسان خطا ہو گئے۔ اس وقت افغانوں کی بیقراری کا عالم دیدنی تھا[2]

شمالی ہند سے فرار کے بعد سروانیوں نے بہار میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد سلطان ابراہیم لودھی کا بھائی سلطان محمود بھی بہار پہنچ گیا۔ افغان اسے اپنے درمیان دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اور کچھ نہیں تو انہیں "بادشاہ" تو مل گیا ہے۔ سلطان محمود نے افغانوں کو اپنے

---

۱ - ایضاً" ص ۹۳ ' ۹۴۔

۲ - ایضاً" ص ۷۲۔

جھنڈے تلے جمع کیا اور وہ بنارس تک پیش قدمی کر آیا۔ اس جمعیت کے باوجود افغانوں پر مغلوں کا خوف چھایا ہوا تھا۔

دتو سروانی بھی اتفاق سے سروانیوں کے اس لشکر میں موجود تھا۔ ایک رات اس نے خواب میں حضرت گنگوہیؒ کی زیارت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ افغانوں کی جمعیت اگرچہ زیادہ ہے لیکن وہ شامتِ نفس میں گرفتار ہیں۔ اس لئے بابر ضرور کامیاب ہو گا۔ اگلی صبح جب دتو عیسیٰ خاں سروانی سے ملنے گیا تو وہاں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ عیسیٰ خاں نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے رات کا خواب بیان کیا۔ عیسیٰ خان نے کہا کہ اس کا بھی یہی خیال ہے۔ دتو کی روایت ہے کہ تیسری رات کو سلطان محمود کیمپ سے بھاگ گیا اور اس کے ساتھ ہی افغانوں کی جمعیت بھی منتشر ہو گئی۔ اس موقع پر کچھ افغان بالا پتھ چلے گئے جہاں راجا برسنگھ نے انہیں گزارے کے لئے زمینیں دے دیں۔[1]

مغلوں کا ظلم و ستم

بابر کے برّعظیم پر حملہ سے قبل حضرت گنگوہیؒ کی اہلیہ نے خواب دیکھا کہ خراسان کی طرف سے آگ بڑھی چلی آ رہی ہے۔ اگلی صبح انہوں نے اپنے بیٹوں سے ذکر کیا کہ جلد ہی کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد بابر نے برّعظیم پر حملہ کیا۔ بابر کی پیش قدمی کی خبر سنتے ہی شہری اور دیہاتی محفوظ مقامات کی طرف بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہیؒ اپنے متعلقین کے ساتھ شاہ آباد سے گنگوہ چلے گئے۔ مغلوں نے شاہ آباد اور دیپالپور (من مضافات شاہ آباد) تباہ کر دیئے۔ دیپالپور علماء و صلحائ کی بستی تھی۔ بابر کی تاخت کے وقت "علماء و صلحاء بسیار کشتہ شد و کتب خانہا غارت شدند۔" شیخ رکن الدینؒ[2] کے الفاظ میں "دارالاسلام" غارت ہو گیا۔[1] اس غارتگری کے موقع پر حضرت گنگوہیؒ کے مرشد زادے شیخ عبدالشکورؒ[3] نے ان سے التماس کی:

شما توجہ بدرگاہ حق تعالیٰ بکنید کہ علماء و صلحاء مقتول میشوند و دارالاسلام غارت میشود۔[3]	آپ خدا تعالیٰ سے رجوع فرمائیں کہ علماء و صلحاء قتل کئے جا رہے ہیں اور دارالاسلام غارت ہوا جاتا ہے۔

---

۱ - ایضاً" ص ۴۳ ، ۴۷۔
۲ - ایضاً" ص ۶۳۔
۳ - ایضاً"۔

حضرت گنگوہیؒ نے توجہ فرمائی اور شیخ عبدالشکورؒ کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

نکبات بانبیاءؑ رسیدہ تو بیچارہ کیستی[1]	انبیاء کرام کو بھی تکالیف پہنچی ہیں تم کون ہوتے ہو؟

شاہ آباد کی تباہی

بابر نے اپنی تزک میں برِّعظیم پر تسلّط جمانے کے واقعات کچھ اس انداز سے لکھے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہمارے خیال میں بابر نے تزک لکھتے وقت رحمدلی اور انسان دوستی کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے جانشینوں کے درباروں میں لکھی جانے والی تاریخوں میں بھی اس کے ظلم و ستم کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔

شیخ رکن الدینؒ نے بابر کے سپاہیوں کے ہاتھوں شاہ آباد کی تباہی کا منظر پیش کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ یہ سرسبز و شاداب قصبہ اس طرح برباد ہوا کہ اب وہاں ویرانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا[2]۔ حضرت گنگوہیؒ کی ایک تحریر سے بھی مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ موصوف ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:

مغلاں تاختند و چندین ہزار خون ریختند و چند ہزار ولیؒ مومن را زیرِ تیغ آوردند[3]	مغلوں نے حملہ کر کے ہزاروں کا خون بہا دیا۔ انہوں نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سباءؑ کو اطاعت قبول کرنے اور خدا پر ایمان لانے کا پیام بھیجا تو ملکہ نے سرداروں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا۔ سرداروں نے اسے اپنی وفاداری اور جان نثاری کا یقین دلایا۔ ملکہ نے انہیں مخاطب کر کے کہا:

ان الملوک اذا دخلوا قریتہ افسد وہا و جعلوا اعزۃ اھلہا اذلتہ و کذلک یفعلون[4]	تحقیق بادشاہ جس وقت داخل ہوتے ہیں کسی شہر میں، خراب کرتے ہیں اس کو اور کرتے ہیں عزت والوں کو ذلیل اور اسی طرح یہ بھی کریں گے۔

جب ملکۂ سباءؑ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے معصوم عن الخطا پیغمبر سے ایسے "ظلم" کی

۱ - ایضاً۔
۲ - ایضاً، ص ۳۳۔
۳ - عبدالقدوس گنگوہیؒ، مکتوباتِ قدوسیہ، مطبع احمدی دہلی، مکتوب نمبر ۱۱۰، ص ۲۰۵، ۲۰۶۔
۴ - قرآن مجید، سورہ النمل، آیتہ ۳۴۔

توقع رکھتی تھی، تو بابر جیسے بادشاہ سے، جس کی رگوں میں چنگیز اور تیمور کا خون موجزن تھا، اس سے بھی بڑھ کر ظلم و تشدد کی توقع رکھنی چاہئے۔ برِعظیم پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے اس نے اور اس کے ماتحتوں نے مقامی آبادی پر بلا تفریق مسلم و غیر مسلم جو ظلم روا رکھا، اس کی صدائے بازگشت لطائفِ قدوسی کے صفحات سے سنائی دیتی ہے۔ شیخ رکن الدینؒ نے پکڑ دھکڑ اور حبس بیجا کے متعدد واقعات نقل کئے ہیں۔

برِعظیم پر قبضہ کے بعد مغلوں نے مقامی آبادی پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے بڑے بڑے سفاک اور ظالم امراءکو انتظامی عہدوں پر مامور کیا تھا۔ شیخ رکن الدینؒ اس پر شاہد ہیں کہ گنگوہ کے مغل عامل میر حسن علی نے ظلم و ستم پر کمر باندھی۔ مقامی "فقرا و ضعفا" کو بڑا رنج ہوا۔ حضرت گنگوہیؒ نے بھی حاکم کی منت و سماجت کی، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے روّیے سے دل برداشتہ ہو کر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جہاں ظلم ہو گا وہ وہاں نہیں رہیں گے۔ موصوف نے سواری طلب کی اور "بجہتِ مقہوریٔ ظالمان" بلند آواز سے:

اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر

پڑھتے ہوئے گنگوہ سے چل دیئے۔ حضرت گنگوہیؒ کی تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور چند روز بعد میر حسن علی مر گیا[1]۔

بابر اور اس کے ماتحتوں کے ظلم و ستم کے باوجود حضرت گنگوہیؒ نے اس کے ساتھ روابط قائم کر لئے۔ مکتوباتِ قدوسیہ میں بابر کے نام ان کا ایک خط موجود ہے جس میں موصوف اسے امامِ زماں، امامِ جہاں، سلطانِ وقت، جوان بخت، خدا پرست، جہاندار، شہریار دیندار، ضعیف پرور، عدل گستر، آسمان جاہ، فلک سپاہ، سلطان الاعظم المعظم، ابوالمجاہد المظفر، حضرت ظل اللہ فی الارض۔۔۔ کے القاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ حضرت اسے زمین پر خدا کا سایہ اور اولی الامر مانتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوبِ مرغوب میں بابر کو نمازِ باجماعت ادا کرنے، علم اور علماء کو دوست رکھنے اور شہروں میں محتسب مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے اسے یہ بھی لکھا کہ وہ صرف دیانتدار لوگوں کو اہم عہدوں پر فائز کرے اور کسی کافر کو عہدۂ دیوانی پر مامور نہ کرے۔ حضرت گنگوہیؒ سرکاری دفتروں میں غیر مسلموں کو معمولی قسم کا کام کرتے بھی دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ انہوں نے بابر کو کافروں سے جزیہ وصول کرنے کا بھی مشورہ دیا۔ خط کے آخر میں

۱۔ شیخ رکن الدینؒ، لطائفِ قدوسی، ص ۶۸۔

حضرت گنگوہیؒ بابر سے کہتے ہیں کہ اس کے عہد میں خیر القرون قرنی جیسی رونق دیکھنے میں آنی چاہیے[1]

بابر نے حضرت گنگوہیؒ کے خط کا کیا جواب دیا' اس کا کوئی ریکارڈ ہمارے پاس موجود نہیں۔ تاہم یہ ثابت ہے کہ بابر ایک بار ان سے ملنے گیا اور ان کے حلقے میں بیٹھا رہا[2]

ہمایوں سے تعلقات

ہمایوں کی تخت نشینی سے قبل ہی حضرت گنگوہیؒ نے ہمایوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے تھے اور اس کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ محمد ہمایوں میرزا کے نام ایک خط میں حضرت گنگوہیؒ لکھتے ہیں کہ انہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ اَوصافِ حمیدہ سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ علم اور جمال سے بھی آراستہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ تمام امور میں علماء اور صلحاء سے مشورہ لیتا اور عارفوں کی صحبت میں بیٹھتا ہے۔ نیز وہ اربابِ علم و معرفت کا قدردان ہے۔ یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے[3]

ہمایوں کی تخت نشینی کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے اسے ایک خط لکھا جس میں موصوف نے اسے ــــ عالم پناہ امامِ زماں امامِ جہاں حافظ بلاد اللہ ناصر عباد اللہ حضرت ظل اللہ ــــ کے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں کہ اس کے عہد میں آئمہ اور فقراء امن و امان سے رہتے ہیں۔ اسے چاہیے کہ روز بروز اسلام کی رونق بڑھانے میں کوشاں رہے[4]

ہمارے خیال میں یہ خط ہمایوں کے ابتدائی عہد حکومت میں لکھا گیا تھا کیونکہ چند ہی سال بعد حضرت گنگوہیؒ نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی اور وہ اسے برِعظیم سے نکالنے پر تُل گئے تھے۔ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں ملے گی۔

ہمایوں اور بہادر شاہ گجراتی

سلطان بہادر شاہ گجراتی نے راجستھان کی سب سے طاقتور ریاست میواڑ کی راجدھانی چتوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے کافی طول پکڑا اور محصورین بھوکوں مرنے لگے۔ راجپوتوں نے ہمایوں کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ ان کی مدد کو آئے تو وہ اسے فی منزل ایک لاکھ ٹنکے ادا کریں گے۔ ہمایوں کی دارالحکومت سے روانگی سے قبل ہی بہادر شاہ نے چتوڑ فتح کر لیا اور بہت سے

۱ - شیخ عبدالقدوسؒ' مکتوباتِ قدوسیہ' مکتوب نمبر ۱۶۹' ص ۳۳۵' ۳۳۶' ۳۳۷۔
۲ - ابوالفضل' آئینِ اکبری' مطبوعہ دہلی ۱۲۷۲ھ' ج ۲' ص ۲۴۔
۳ - شیخ عبدالقدوسؒ' مکتوباتِ قدوسیہ' مکتوب نمبر ۱۷۰' ص ۳۳۷' ۳۳۸۔
۴ - ایضاً' مکتوب نمبر ۱۷۱' ص ۳۳۸' ۳۳۹۔

کافروں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اسی اثناء میں بہادر شاہ کو اطلاع ملی کہ ہمایوں سارنگ پور پہنچ گیا ہے اور اس کے خلاف پیش قدمی کرنے والا ہے۔ بہادر شاہ نے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی اور چتوڑ کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بقیہ لشکر کے ساتھ ہمایوں کے مقابلہ کو بڑھا۔ بہادر شاہ نے قلعہ مرہ دسور (مندسور) کو اپنا مرکز بنایا۔ ہمایوں نے اس کی رسد کاٹ دی جس کے نتیجے میں اناج کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں اور اس کے لشکری گھوڑے ذبح کر کے کھانے پر مجبور ہو گئے۔

دتو سروانی بہادر شاہ کے کیمپ میں موجود تھا۔ اس نے خواب میں حضرت گنگوہیؒ کی زیارت کی۔ انہوں نے اس سے کہا کہ دیکھو ہمایوں کے خیمے کی طنابیں کہاں تک ہیں؟ اس نے دیکھا تو وہ مانڈو اور گجرات تک پہنچی ہوئی تھیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس معرکے میں ہمایوں کامیاب ہو گا۔ دتو بیدار ہوا تو اسے اپنی جان کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اسی روز سورج غروب ہوتے ہی بہادر شاہ نے راہ فرار اختیار کی۔ اس کے لشکر سے یوں غائب ہوتے ہی سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دتو بھی بھاگ نکلا اور اندھیرے میں بھٹک گیا۔ رات کو اس نے دوبارہ حضرت گنگوہیؒ اور شیخ حمید الدینؒ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس کی مدد کو آئے ہیں اور خدا نے چاہا تو وہ محفوظ رہے گا۔ اگلی صبح دتو کو راستہ مل گیا اور وہ برہان پور پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں اس نے مندسور سے بھاگے ہوئے افغانوں کی ایک بڑی تعداد کو موجود پایا۔

دتو سروانی نے ہمایوں کے خلاف شیر شاہ اور بہادر شاہ کی جنگوں میں حصہ لیا۔ وہ ان جنگوں کا عینی شاہد ہے۔ ہمیں اس پر حیرت ہے کہ ہمایوں اور شیر شاہ کے سوانح نگاروں نے لطائفِ قدوسی جیسے اہم ماخذ کو کیسے نظر انداز کر دیا ہے[1]

سلطان بہادر شاہ کا قتل

سلطان علاء الدین ابن سلطان سکندر لودھی چانپانیر آیا تو اسے خبر ملی کہ سلطان بہادر شاہ کنبھایت پہنچ گیا ہے۔ علاء الدین نے دتو سروانی کے ہاتھ اسے چار ہاتھی، سات اونٹ اور سات سو اشرفیاں بطور تحفہ بھیجیں۔ دتو ابھی راستے ہی میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ فرنگی (پرتگیز) جہازوں میں آتشیں اسلحہ لاد کر دیو (DIU) کی طرف بڑھ رہے ہیں اور وہ دیو پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ سلطان بہادر شاہ دیو کو بچانے کے لئے کنبھایت سے نکلا۔ اسی اثناء میں علاء الدین بھی اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ دتو کا کہنا ہے کہ انہی دنوں اس نے خواب میں حضرت گنگوہیؒ کو دیکھا۔

---

۱ - رکن الدین، لطائفِ قدوسی، ص ۷۵، ۷۶۔

موصوف نے اس سے کہا کہ گجرات چھوڑ دے، وہاں بڑا خلل پیدا ہونے والا ہے۔ اتفاق سے ٹھٹھہ سے آنے والے ایک مسافر کے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی اور اس کی معیت میں دتو چانپانیر ہوتا ہوا مانڈو پہنچ گیا۔ پندرہ روز بعد اسے اطلاع ملی کہ فرنگیوں نے بحری جنگ میں سلطان بہادر شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ سلطان کے قتل کے بعد گجرات میں "خللِ عظیم" پیدا ہو گیا۔[۱]

ہمایوں گجرات میں

ہمایوں کے احمد آباد پر قبضہ کے بعد سلطان بہادر شاہ نے دیو میں پناہ لی۔ جب اس سانحہ کی خبر برہان پور پہنچی تو سلطان سکندر لودھی کا فرزند علاء الدین اپنے سپاہیوں کو لے کر بہادر شاہ کی مدد کو نکلا۔ اتفاق سے دتو سروانی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ جب وہ نندر بار پہنچا تو اس نے خواب میں حضرت گنگوہیؒ کو دیکھا۔ موصوف نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "اے دتو! آگے بڑھو اور ہمارا پیغام گجرات کے پیروں کو پہنچا دو۔ اے دتو! تم گجرات جاؤ اور وہاں کے تمام پیروں کو ہمارا سلام پہنچاؤ اور ان سے کہو کہ ہمایوں بادشاہ اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے اور وہ کفر و اسلام میں تمیز نہیں کرتا۔ ہم اسلام کی مدد اور تمہاری اعانت کے لئے آئے ہیں۔ اگر آپ کا ارادہ ہو تو ہم آئیں۔ ہم اور آپ مل کر ہمایوں کو گجرات سے نکال دیں۔ اگر آپ چاہیں تو مانڈو جا کر ہمایوں کو وہاں سے بھگا دیں اور آپ اسے گجرات سے نکال دیں تاکہ اسلام کو امن اور قرار ملے۔"

دتو سروانی نے عرض کی کہ گجرات کے پیر اس مقام سے بہت دُور ہیں، وہ وہاں کیسے پہنچے اور کس طرح ان کا پیغام ان تک پہنچائے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ وہ بآسانی وہاں پہنچ جائے گا۔ دتو خواب ہی میں گجرات پہنچ گیا۔ احمد آباد میں حضرت قطب عالمؒ کی خانقاہ میں گجرات کے تمام پیر موجود تھے۔ وہ ان کو حضرت گنگوہیؒ کا پیغام پہنچانے کے بارے میں فکر مند تھا کہ اتنے میں ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے پوچھا کہ دتو بھلا اسی کا نام ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا کہ شاہ منجھن اسے بلاتے ہیں۔ جب وہ ان کے سامنے پہنچا تو انہوں نے پوچھا کہ شیخ عبدالقدوسؒ نے کیا فرمایا ہے؟ دتو نے ان کا پیغام پہنچایا اور وہاں سے فارغ ہو کر شیخ احمد کھٹوؒ کی خانقاہ میں پہنچا۔ وہاں بھی پیروں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ شیخ احمد کھٹوؒ نے دتو سے کہا کہ شیخ عبدالقدوسؒ کو ان کا سلام پہنچا دیں اور ان سے کہیں کہ وہ سب مل کر ہمایوں کو گجرات اور مانڈو سے نکالیں گے تاکہ گجرات میں پھر سے اسلام کا غلبہ ہو۔ شیخ رکن الدینؒ رقم طراز ہیں کہ دتو سروانی نے اگلی صبح اپنے ساتھیوں سے اس خواب کا ذکر کیا تو ان

۱۔ ایضاً، ص ۸۱، ۸۲۔

کے ایک ساتھی روپ چند نے علاء الدین سے کہا کہ ہمایوں اب گجرات میں نہیں ٹھہر سکتا۔ اس واقعہ کے پندرہ روز بعد اطلاع ملی کہ بہادر شاہ نے دیو سے سرکھیج (جہاں حضرت شیخ احمد کھٹو کا مزار ہے) آ کر ہمایوں کو شکست دی اور اس لڑائی میں بہت سے مغل مارے گئے۔ ہمایوں گجرات سے بھاگ کر آگرہ پہنچ گیا[1]۔

یہ واقعہ اگرچہ خواب کا ہے لیکن اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہمایوں کو گجرات سے نکالنے میں مذہبی حلقوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مذہبی حلقوں میں ہمایوں کے خلاف نفرت موجود تھی اور یہی چیز اس کی ناکامی کا ایک اہم سبب بنی۔

جن دنوں بہادر شاہ راجستھان میں ہندوؤں کے سب سے بڑے مرکز چتوڑ کا محاصرہ کئے پڑا تھا، تو برِعظیم کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اور دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔ اس موقعہ پر راجپوتوں نے ہمایوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا اور اسے فی منزل ایک لاکھ ٹکے ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ہمایوں نے رقم کے لالچ میں بہادر شاہ کی مملکت پر چڑھائی کر دی۔ مسلمانوں کو عموماً" اور مذہبی حلقوں کو خصوصاً" اس بات سے بڑا رنج پہنچا کہ ہمایوں نے سلطان بہادر شاہ کی مدد کرنے کے بجائے اس موقعہ پر کافروں کا ساتھ دیا اور سلطان بہادر شاہ کی مملکت پر حملہ کر کے اس کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔ مذہبی حلقوں نے ہمایوں کے اس جرم کو معاف نہیں کیا اور وہ اس کو برعظیم سے نکالنے پر کمربستہ ہو گئے۔ ہمایوں کی ناکامی کے اسباب میں مذہبی حلقوں کی ناراضگی آج تک سربستہ راز بنی رہی ہے۔ شیخ رکن الدینؒ نے اس راز سے پردہ اٹھا کر ہمیں صحیح طور پر صورت حال کو سمجھنے میں مدد دی ہے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مکتوبات میں ایک بڑا اہم خط موجود ہے جو انہوں نے اپنے ایک مرید عبدالرحمٰن کے نام لکھا تھا۔ اس خط پر تاریخ تو موجود نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط ایسے ہی حالات میں لکھا گیا تھا جن میں ہمایوں کی حرکات کی وجہ سے اسلام کے مفاد کو برعظیم میں نقصان پہنچ رہا تھا۔ حضرت گنگوہیؒ، عبدالرحمٰن کو لکھتے ہیں:

امروز آفتاب اسلام قریب بغروب است[2] — آج اسلام کا سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔

برِعظیم کے مشائخ کا افغانوں کی طرف رُجحان

شیخ رکن الدینؒ دتو سروانی سے روایت کرتے ہیں کہ ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان ایک

---

۱ - ایضاً"، ص ۷۹، ۸۰۔

۲ - شیخ عبدالقدوسؒ، مکتوباتِ قدوسیہ، مکتوب نمبر ۲۰، ص ۲۰۵۔

لڑائی میں دونوں لشکروں کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا۔ ہمایوں کا لشکر قصبہ بھوجپور کی سمت تھا اور شیر شاہ کا لشکر اس کے بالمقابل دریا کے اس پار۔ ایک روز ہمایوں نے اپنے لشکر میں یہ اعلان کیا:

اگر درین بار فتح ما شود و ہزیمت افغانان شود، نام افغانان زندہ نگذارم اگرچہ طفل باشد۔

اگر اس بار ہماری فتح ہو اور افغانوں کو شکست، تو میں افغانوں کا نام تک باقی نہیں رہنے دوں گا، خواہ بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

چند روز بعد ہمایوں کشتیوں کے پل کے ذریعے دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے شیر شاہ کے کیمپ کے مقابل اپنا کیمپ لگایا۔ دتو سروانی بڑا متفکر تھا کہ خدا معلوم کیا ہو۔ ایک شب اس نے حضرت گنگوہیؒ کو خواب میں دیکھا۔ موصوف نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، "اپنا خیمہ دیکھو"۔ جب اس نے نظر اٹھائی تو اپنے خیمے کی طنابیں ہمایوں کے لشکر میں دیکھیں۔ ہمایوں کا خیمہ گرا پڑا تھا اور مغل منتشر ہو رہے تھے۔ ہمایوں انہیں دلاسہ دے رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اسے اکیلا نہ چھوڑیں۔ اس کے لشکری اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمایوں اس صورت حال پر بڑا متاسف تھا۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ بادشاہ کا حال دیکھ لو۔ اس کے بعد موصوف نے دتو کی دلجوئی کے لئے فرمایا:

فتح شیر شاہ ست و ہزیمت ہمایوں بادشاہ ست و مدد پیران طرف شیر شاہ است۔

شیر شاہ کو فتح اور ہمایوں کو شکست ہو گی۔ پیر شیر شاہ کی مدد کر رہے ہیں۔

جب دتو بیدار ہوا تو اس کی تشویش جاتی رہی۔ اس واقعہ کے چوتھے روز ہمایوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا[1]۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برعظیم کے مشائخ اور مذہبی حلقے مغلوں کی بجائے افغانوں کے طرف دار تھے۔

حضرت گنگوہیؒ اور سروانی افغان

عمر خان سروانی لودھی عہد کا ایک نامور امیر تھا۔ سلطان بہلول لودھی نے اسے شاہزادہ نظام، جو بعد میں سکندر لودھی کے لقب سے تخت نشین ہوا، کے سپرد کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ شاہزادے سے ناراض ہو کر باربک شاہ کے پاس جونپور چلا گیا، لیکن وہاں اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی۔ عمر خان دل برداشتہ ہو کر جونپور سے رودولی چلا آیا اور یہاں آتے ہی اس نے لوگوں سے پوچھا کہ اس جگہ کوئی درویش موجود ہے؟ لوگوں نے حضرت گنگوہیؒ کا نام لیا تو وہ انہیں ملنے آیا اور عندالملاقات ان کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگا :"میرے پاس رہنے کی جگہ نہیں،

---

۱ - شیخ رکن الدینؒ، لطائف قدوسی، ۸۳۔

آپ مجھے جگہ دیجئے۔" حضرت نے اس کی دلجوئی کے لئے فرمایا:

اگر عبداللہ مارا جائی ہست ترا نیز خواہد بود، اندیشہ مکن کارِ تو برحسبِ مطلوب خواہد شد[1]	اگر اللہ کی طرف سے ہمارے لئے جگہ ہے تو آپ کے لئے بھی بن جائے گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں، آپ کا کام حسبِ منشا ہو جائے گا۔

حضرت گنگوھیؒ سے ملاقات کے بعد وہ یُونس دیوانے سے بھی ملا اور اسے نذر پیش کی۔ یُونس نے عمر خان کو کرسی پر بٹھایا، جس سے یہ مراد تھی کہ اسے سلطان کے دربار میں عزت کی جگہ ملے گی۔ ابھی عمر خان اپنی قیام گاہ پر نہیں پہنچا تھا کہ راستے میں اسے شہزادہ نظام کے قاصد مل گئے۔ وہ اس کے لئے خلعت لے کر آئے تھے۔ انہوں نے عمر خان کے سامنے قرآنِ پاک کی قسمیں کھا کر اسے یقین دلایا کہ شاہزادے کے دل میں اس کی طرف سے کوئی غبار نہیں ہے۔ عمر خان یہ مژدہ سن کر بے حد خوش ہوا اور قاصدوں کے ساتھ شاہزادے سے ملنے چلا گیا[2]۔

عمر خان سروانی کی بیٹی اسلام خانو، حضرت گنگوھیؒ کی مرید تھی۔ اس نے راہِ سلوک میں بڑی محنت کی اور وہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتی تھی۔ شیخ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے ہر عضو سے "اللہ" کی آواز سنتی تھی۔ اس کے دو بھائی ہیبت خان اور سعید خان کا شمار حضرت گنگوھیؒ کے مخالفین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے حضرت کو شاہ آباد سے نکالنے کا عزم کیا۔ جب حضرت کو ان کے اس ناپاک ارادے کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ دیکھا جائے گا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد سروانیوں پر سلطان سکندر لودھی کا عتاب نازل ہوا اور وہ شاہ آباد سے نقل مکانی کر کے گجرات چلے گئے۔ بی بی اسلام خانو کہا کرتی تھی کہ اس کے بھائیوں پر اس کے پیر کا غصہ نازل ہوا ہے[3]۔ حضرت گنگوھیؒ اپنی اس مریدہ کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

مکتوباتِ قدوسیہ میں اس کے نام حضرت کا ایک خط موجود ہے جس میں موصوف اسے لکھتے ہیں کہ اس کا شمار "مردانِ حق" میں ہوتا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اسے خرقہ دیا جاتا اور خلافت عطاء کی جاتی، لیکن چونکہ وہ عورت ہے، اس لئے وہ اس کی مجاز نہیں[4]۔

سروانیوں کے ساتھ حضرت گنگوھیؒ کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور ان کے اکابر کے

۱۔ ایضاً" ص ۳۰۔
۲۔ ایضاً" ص ۳۰، ۳۱۔
۳۔ ایضاً" ص ۴۱۔
۴۔ شیخ عبدالقدوسؒ، مکتوباتِ قدوسیہ، مکتوب نمبر ۸۶، ص ۹۱۔ "آن خواہر در ہمت میان مردان حق تعالی قدم زدہ است لائق است کہ چشمۂ پیران روان کند"۔

ساتھ ان کی باقاعدہ خط و کتابت رہتی تھی۔ مکتوباتِ قدوسیہ میں بہلول سروانی' سعدی خان سروانی' بی بی اسلام خانو' راجو سروانی' ہیبت خان سروانی اور ابراہیم سروانی کے نام حضرت کے خط موجود ہیں۔ ان خطوں میں حضرت نے ان کے لئے جو القاب تحریر فرمائے ہیں وہ قابل مطالعہ ہیں۔

اننت کر جوگی

جن دنوں عیسیٰ خان سروانی' سلطان محمود کے ساتھ بہار میں مقیم تھا' ان دنوں خانِ مذکور کے پاس اننت کر نامی ایک سنیاسی آیا اور کہنے لگا کہ بالناتھ جوگی ساکنِ ٹلہ نے بابر کی مدد کی ہے اس لئے وہ افغانوں کی مدد کے لئے آیا ہے۔ جب افغانوں کی مغلوں کے ساتھ جنگ ہوگی تو وہ میدان جنگ میں دشمنوں کی طرف رُخ کرے گا اور وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکیں گے۔ اننت کر سلطان محمود کے اُستاد میاں مخدوم سے بھی ملا اور وہاں اس نے ایسی ہی بڑ ماری لیکن کسی نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔

دتو سروانی اس زمانے میں عیسیٰ خان سروانی کے ساتھ مقیم تھا۔ اس کی اننت کر کے ساتھ آشنائی ہو گئی۔ وہ بقول اس کے توحید خوب بیان کرتا تھا[۱] ایک رات دتو نے حضرت گنگوھیؒ کو خواب میں دیکھا انہوں نے اسے تنبیہ کی کہ اس سنیاسی کی صحبت سے پرہیز کرے کیوں کہ وہ زندیق ہے اور اسے خدا کا قرب حاصل نہیں۔ اتفاق سے انہیں دنوں دتو بالا پتھ چلا گیا اور یوں اننت کر سے ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس واقعہ کے دو سال بعد اننت کر بھی بالاپتھ پہنچ گیا اور دتو کو تلاش کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ گیا۔ دتو ان دنوں گھر پر موجود نہ تھا اور دیہات کا دورہ کر رہا تھا۔ اننت کر نے یکے بعد دیگرے تین قاصد اس کے پاس یہ پیام دے کر بھیجے کہ وہ اسی سے ملنے آیا تھا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ اب وہ تیرتھ یاترا کے لئے پیاک (پریاگ؟) جا رہا ہے اور واپسی پر اس سے ملے گا۔ انہی دنوں دتو نے خواب میں حضرت گنگوھیؒ اور ان کے فرزندِ اکبر شیخ حمید الدینؒ کو دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ اس زندیق سنیاسی کی صحبت سے احتراز کیا کرے۔ دتو کہتا ہے کہ اس نے اننت کر کو بھی اپنے مرشد کے قریب کھڑے دیکھا۔ حضرت گنگوھیؒ نے اپنا جُوتا اتار کر شیخ حمید الدینؒ کو دیا اور اسے سنیاسی کے سر پر مارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تعمیلِ حکم میں تین جُوتے اننت کر کے سر پر لگائے۔ اس واقعہ کے دو تین روز بعد ہی وہ بالاپتھ سے چلا گیا اور چند روز بعد خبر ملی کہ مغلوں نے اسے قتل کر دیا ہے[۲]

۱۔ شیخ رکن الدینؒ' لطائفِ قدوسی' ص ۴۷۔ "توحید نیکو بیان می کرد"۔

۲۔ ایضاً۔

لطائفِ قدوسی میں صفحہ ۷۰ کے بعد کے تمام واقعات فاضل مرتب نے دتو سروانی کی روایت سے تحریر کئے ہیں۔ جب تک غور سے ان صفحات کا مطالعہ نہ کیا جائے تو قاری یہی تاثر لیتا ہے کہ واقعات کا مرکزی کردار شیخ رکن الدینؒ ہیں۔ اننت کر کے ساتھ دتو سروانی کی ملاقات تھی اور وہی اس سے "اسرارِ توحید" سیکھنے جایا کرتا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات" میں لطائفِ قدوسی کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ شیخ رکن الدینؒ ایک ہندو جوگی سے "اسرارِ توحید" سیکھنے جایا کرتے تھے۔ میرے خیال میں یہ واقعہ صحیح نہیں۱؎ راقم السطور نے بھی اُستادِ گرامی کی تحریروں پر اعتماد کرتے ہوئے ایک سے زائد بار یہی بات دہرائی۔ لیکن لطائفِ قدوسی کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوا کہ شیخ رکن الدینؒ نے یہ واقعہ دتو سروانی کی زبانی نقل کیا ہے کیونکہ موصوف کبھی کسی ہندو سنیاسی کی صحبت میں نہیں بیٹھے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

جامع ملفوظات شیخ رکن الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ گنگوہ میں ابراہیم نامی ایک جولاہہ رہتا تھا جو کھڈی چلانے کے ساتھ ساتھ درویشی میں بھی قدم رکھتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو حضرت گنگوہیؒ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جب موصوف نماز سے فارغ ہوئے تو شیخ رکن الدینؒ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "مرتبۂ این میت بلند و رفیع در نظر می آید۔" اس واقعہ کے چند روز بعد حضرت گنگوہیؒ دہلی تشریف لے گئے۔

جن دنوں موصوف دہلی میں قیام پذیر تھے، انہی دنوں سلسلۂ سہروردیہ کے نامور شیخ، حضرت سماء الدینؒ کا انتقال ہوا۔ حضرت گنگوہیؒ جنازے میں شریک ہوئے۔ نمازِ جنازہ سے فراغت کے بعد انہوں نے شیخ رکن الدینؒ سے کہا، "مرتبۂ این میت ہیچو مرتبۂ ابراہیم نمی بینم۔" اس کے بعد موصوف ابراہیم کا نام عزت سے لینے لگے اور جب بھی اس کا ذکر آتا تو اسے "شیخ ابراہیم" کہتے۲؎

آدابِ پیراں و اُستاداں

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اُستادوں اور پیروں کے ادب کا یہ تقاضا ہے کہ ان سے صرف ایک یا دو بار التماس کرنی چاہئے۔ مریدوں اور شاگردوں کو چاہئے کہ وہ تیسری بار التماس نہ کریں۔۳؎

---

۱ - خلیق احمد نظامی، سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۵۱۔
۲ - شیخ رکن الدینؒ، لطائفِ قدوسی، ص ۵۷۔
۳ - ایضاً، ص ۱۸۔

حضرت گنگوہیؒ اور ہندو

حضرت گنگوہیؒ مسلکِ وحدت الوجود کے بہت بڑے داعی تھے۔ عام طور پر وحدت الوجودی صوفی بڑے وسیع المشرب ہوتے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ کی یہ تحریر ان کے وسعت قلب کا پتہ دیتی ہے:

"این چہ شور و این چہ غوغا کشادہ کسی مومن کسی کافر، کسی مطیع کسی عاصی، کسی در راہ کسی بیراہ، کسی مسلم کسی پارسا، کسی ملحد کسی ترسا، ہمہ در یک سلک است۔"[1]

اس قدر وسعتِ قلب کے باوجود حضرت گنگوہیؒ اپنے پیشرو چشتی بزرگوں کی نسبت ہندوؤں کے بارے میں بڑے متشدّد تھے۔ موصوف بابر کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

ہیچ کس از کفار عہدۂ دیوانی و ہیچ وجہ نبود در دفاتر قلم نزنند و امیر و عامل نباشند چنانکہ در شرع خواری ایشان کہ و ہم صاغر ونست ہمیران نوع خوار و ذلیل باشند و مالگذاری کنند و جزیہ و زکوٰۃ مال بر وجہ شرع از ایشان بگیرند و از جامہ پوشش مسلمانان منع سازند و کفر خود مستور دارند و مراسمِ کفر برطریقِ غلبہ و اعلان نکنند۔ مواجب از بیت المال اسلام نیابند و بکسبِ خود مشغول باشند و با مسلمانان ہیچ برابری نکنند تا رونقِ اسلام بعز کمال رسد۔[2]

کسی بھی کافر کو عہدۂ دیوانی پر مامور نہ کریں یہاں تک کہ انہیں سرکاری دفاتر میں کلرک کا کام بھی نہ کرنے دیں۔ انہیں امیر اور عامل کے عہدے نہ دیئے جائیں اور جس طرح شریعت میں "ہم صاغرون" کے تحت ان کی ذلّت آئی ہے اسی طرح وہ ذلیل و خوار رہیں۔ وہ سرکاری واجبات ادا کریں اور ان سے شریعت کے مطابق جزیہ اور زکوٰۃ وصول کی جائے۔ انہیں مسلمانوں جیسا لباس پہننے سے روکا جائے۔ وہ اپنے کفر کو پوشیدہ رکھیں اور کفر کے شعار اعلانیہ اور زبردستی بجا نہ لائیں۔ وہ اسلام کے بیت المال سے رقوم نہ لیں۔ وہ اپنے کسب و کار میں لگے رہیں اور کسی طرح بھی مسلمانوں کی برابری نہ کریں تاکہ اسلام کی رونق اپنے نقطۂ عروج کو پہنچے۔

کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی بزرگ کی تحریر ہے جو کافر و مومن کو "ہمہ در

۱۔ شیخ عبدالقدوسؒ، مکتوباتِ قدوسیہ، مکتوب نمبر ۱۱۰، ص ۲۰۵۔

۲۔ ایضاً، مکتوب نمبر ۱۳۹، ص ۳۳۷۔

یک سلک است" سمجھتے تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے رودولی میں مسلمانوں کی حکومت ہوتے ہوئے ہندوؤں کا عمل دخل دیکھ لیا تھا۔ ان کی موجودگی میں ہندو اسلامی شعار مٹانے لگے تھے اور مسلمانوں کو چڑانے کے لئے بازاروں میں کھلے بندوں سؤر کا گوشت فروخت کرنے لگے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ نے ہندوؤں کی ذہنیت کو بر وقت بھانپ کر بابر کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ انہیں سرکاری دفاتر میں بھرتی نہ کرے اور ان سے جزیہ وصول کرے۔

حضرت گنگوہیؒ کا عقیدہ

یہ بات عام مشہور ہے کہ چشتیہ سلسلہ کے اکثر و بیشتر بزرگ تفضیلی عقیدہ رکھتے تھے جن میں شاہ نیاز احمد بریلوی، خواجہ حسن نظامی اور ان کے خلفاء، سجادہ نشینانِ پھلواری، مارہرہ، کاکوری اور بدایوں شامل ہیں۔ چشتیہ سلسلہ کے مشائخ کی اکثریت کے برخلاف حضرت گنگوہیؒ صحیح سُنی عقیدہ رکھتے تھے۔ موصوف ایک خط میں لکھتے ہیں:

"صدیق اکبرؓ برجملہ اولیاءِ عالم فضل آمد کہ ابتداء تا انتہاء فضلِ صحبت یافت"۔[1]

لودھیوں کے زمانے کی دہلی

لودھیوں کے عہد کی دہلی کے متعلق لطائفِ قدوسی میں چند باتیں بر سبیل تذکرہ آگئی ہیں۔ جامع ملفوظات نے سرائے میاں بھورہ اور سرائے شیخ عبدالصمد جونپوری کا ذکر کیا ہے۔[2] اسی طرح ایک موقع پر انہوں نے شیخ عبدالصمد کی خانقاہ کا بھی ذکر کیا ہے۔[3] حضرت گیسو درازؒ کے ملفوظات میں قدیم دہلی کے تیرہ دروازوں کے نام بر سبیلِ تذکرہ آگئے ہیں۔ انہوں نے دروازۂ پالم، دروازۂ شکار، دروازۂ بزرگ، دروازۂ کشمیر، دروازۂ غزنین، دروازۂ بھیلہ، دروازۂ مندہ، دروازۂ کمال، دروازۂ دہلی، دروازۂ بداؤں، دروازۂ سیری، دروازۂ حاجب عطار اور دروازۂ حوضِ رانی کا ذکر کیا ہے۔[4] ضیاء الدین برنی نے اس فہرست میں دروازۂ بھندر کال کا اضافہ کیا ہے۔[5] شیخ رکن

---

١ - ایضاً"، مکتوب نمبر ١٠٥، ص ١٩٠۔

٢ - شیخ رکن الدینؒ، لطائفِ قدوسی، ص ٣٩۔

٣ - ایضاً۔

٤ - محمد اسلم، سرمایۂ عمر، مطبوعہ لاہور ١٩٧٦ء، ص ٢٠٦۔

٥ - ضیاء الدین برنی، تاریخِ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ١٩٥٧ء، ج ٢، ص ١١٠۔

الدینؒ کو خدا جزائے خیر دے انہوں نے ہمارے علم میں یہ اضافہ کیا ہے کہ دہلی میں ایک دروازۂ بغداد بھی موجود تھا۔[1]

✪✪✪

۱۔ شیخ رکن الدینؒ، لطائفِ قدوسی، ص ۹۴۔

ملفوظاتِ
شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ " کے عنوان سے ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے جس میں احمد آباد کے اس عظیم بزرگ کی چند مجالس کے ملفوظات قلم بند ہیں[1] اس کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں بھی محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے[2] راقم الحروف نے جب ان کا تقابل کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سر مو کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ دونوں مخطوطے مکمل ہیں ورنہ ان کا اختصار دیکھ کر یہی گمان گزرتا کہ شاید یہ کسی ضخیم مخطوطے کے چند جز ہیں۔ علی گڑھ والے مخطوطہ کے سرورق پر۔۔ ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ ۔۔ درج ہے لیکن بابائے اُردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ شیخ کے ایک مرید نے۔۔ بحرالحقائق۔۔ کے عنوان سے ان کے ملفوظات جمع کیے تھے[3] مولوی صاحب نے اپنا ماخذ نہیں بتایا۔ ہو سکتا ہے کہ ملفوظات کے اس مجموعہ کا اصل نام "بحر الحقائق" ہو۔ مرتب نے متن میں ایک موقعہ پر اپنا نام ۔۔ العبدالفقیر الحقیر محمد۔۔ تحریر کیا ہے۔ شیخ کے تلامذہ میں شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوریؒ (م ۱۶۳۰ء) کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ شیخ کے ملفوظات اسی فاضل نے جمع کیے ہوں۔

۱- ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن، مخطوطہ نمبر ۲۱ ، ۲۲۱ فارسیہ تصوف۔

۲- ایضاً "انڈیا آفس لائبریری" مخطوطہ دہلی کلکشن نمبر (ا) ۱۵۳

۳- محمد یوسف کھٹکھٹے (مترجم)، مجموعہ حالاتِ حضرت شاہ وجیہہ الدین علویؒ گجراتی، مطبوعہ مطبع شاہی بمبئی، ص ۳۔

شیخ وجیہہ الدینؒ کی ابتدائی زندگی

شیخ وجیہہ الدینؒ کا شمار برِعظیم پاک و ہند کے نامور اولیاء اللہ اور اہل قلم حضرات میں ہوتا ہے۔ ان کا شجرۂ نسب سترہ واسطوں سے امام محمد تقیؒ سے ملتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سید بہاء الدین المکی سلاطینِ گجرات کے عہد میں عرب سے آ کر چانپانیر (محمد آباد) میں آباد ہو گئے۔ گجرات میں یہ خاندان علوی مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ گجرات کا ایک حکمران سادات کو ملازم رکھنا سوئے ادب سمجھتا تھا' اس لئے اس خاندان کے افراد خود کو علوی کہلانے لگے[2]

شیخ وجیہہ الدینؒ ۲۲ محرم الحرام ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء کو چانپانیر میں پیدا ہوئے۔ "شیخ" سے سالِ ولادت برآمد ہوتا ہے۔[3] انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا شمس الدینؒ سے حاصل کی۔ اس کے بعد حدیث کا درس اپنے ماموں ابو القاسمؒ سے لیا اور اس فن کی تکمیل علّامہ محمد بن محمدؒ سے کی۔ آخر میں حضرت ابو البرکات بنبانی عباسیؒ کو حدیثیں سنا کر ان سے سند لی[4] موصوف نے علوم عقلیہ ابوالفضل مظہر الدین گازرونیؒ اور علّامہ عماد الدین محمد بن محمود الطاریؒ سے پڑھے تھے۔ متوخر الذکر بزرگ کو شیخِ اجل علّامہ جلال الدین دوانیؒ (م ۱۵۰۱ء) سے تلمّذ تھا۔

تکمیل سلوک

شیخ وجیہہ الدینؒ نے چشتیہ اور مغربیہ سلسلوں کی تعلیم اپنے والد شیخ نصراللہ بن عماد الدین علویؒ سے پائی۔ وہ ایک پڑھے لکھے اور صاحبِ حال بزرگ تھے اور پاٹری[5] میں منصبِ قضا پر فائز تھے[6] شیخ وجیہہ الدینؒ نے کچھ عرصہ شیخ قاضی خان چشتی نہوالی المعروف بہ شیخ قاضنؒ کی صحبت میں رہ کر ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا[7] موصوف کے مشائخِ طریقت میں بڈھ بن ابوالقاسمؒ کا نام بھی ملتا ہے۔ ان سے انہوں نے سہروردیہ سلسلہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے شیخ نجم الدین بن شیخ علی خطیبؒ سے ذکر و حلقہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔

۱۔ چانپانیر' بڑودہ سے گودھرہ جانے والی ریلوے لائن پر بڑودہ سے چھٹا ریلوے اسٹیشن ہے اور بڑودہ سے اس کا فاصلہ ۳۸ کلو میٹر ہے۔

۲۔ خلیق احمد نظامی' حیات شیخ عبدالحق محدّث دہلوی' مطبوعہ دہلی ۱۹۵۳ء ص ۹۸۔

۳۔ عبدالحیی لکھنوی' نزہتہ الخواطر' مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۴ء' ج ۴' ص ۳۸۵۔

۴۔ عبدالباقی نہاوندی' مآثر رحیمی' مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء' ج ۳' ص ۱۷۔

۵۔ پاٹری' احمد آباد سے جانب مغرب رَن کچھ کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ احمد آباد سے اس کا فاصلہ ۹۳ کلو میٹر ہے۔

۶۔ عبدالحیی لکھنوی' کتاب مذکورہ بالا' ص ۳۸۵۔

۷۔ محمد یوسف کھتکھٹے' کتاب مذکورہ بالا' ص ۷۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ جب ان پر جذبۂ شوق کا غلبہ ہوتا تو سیّد کبیر الدین مجذوبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دردِ دل کی شکایت بتا کر علاج کی درخواست کرتے۔[1] آخر میں شیخ وجیہہ الدینؒ نے حضرت محمد غوث گوالیریؒ کے دستِ حق پرست پر عشقیہ سلسلہ میں بیعت کر لی۔[2] ان کے بیعت ہونے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

شیخ محمد غوث گوالیری کی گجرات میں آمد

شیخ وجیہہ الدینؒ کے مرشد حضرت محمد غوث گوالیریؒ، ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے جھگڑے میں ہمایوں کے طرف دار تھے۔ جب شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر عنانِ حکومت سنبھالی تو وہ حضرت محمد غوثؒ کے درپے آزار ہوا۔ ان حالات میں حضرت والا گوالیار سے ترک سکونت کر کے گجرات تشریف لے گئے۔[3] گجرات میں قیام کے دوران میں وہاں کے علماء نے، جن میں شیخ علی متقیؒ صاحب کنز العمال پیش پیش تھے، ان کی مخالفت شروع کر دی۔

شیخ عبدالحق محدثؒ تحریر فرماتے ہیں کہ علمائے گجرات نے ان کی مخالفت ان کے بعض رسائل کی بنا پر، جسے لوگ "معراج نامہ" کہتے ہیں، کی تھی۔[4] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس عنوان سے انہوں نے کوئی الگ رسالہ تصنیف نہیں فرمایا تھا' جیسا کہ ان کے بعض تذکروں میں مرقوم ہے' بلکہ بعض رسائل میں انہوں نے اپنے معراج کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا' لوگ اسے "معراج نامہ" کہنے لگے تھے۔

حضرت محمد غوث گوالیریؒ کے احوال و آثار پر مشہور ادیب پروفیسر محمد مسعود احمد نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ انہیں بھی اس تصنیف کا سراغ نہیں مل سکا۔ موصوف کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کو بھی اس رسالہ کی بڑی تلاش رہی اور انہوں نے اس سلسلے میں خط و کتابت بھی کی لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں ملا۔[5]

شیخ عبدالحق محدثؒ کی تحریر سے راقم الحروف نے یہ اخذ کیا ہے کہ شیخ گوالیریؒ نے معراج نامہ کے عنوان سے کوئی الگ کتاب تصنیف نہیں کی۔ موصوف نے اپنی ایک تصنیف۔۔ اورادِ

۱- خلیق احمد نظامی' کتاب مذکورہ بالا' ص ۹۸۔

۲- عشقیہ سلسلہ خواجہ محمد اعرابی یزید عشقیؒ کی طرف منسوب ہے۔ ان کا نام شطاریہ سلسلہ کے شجرہ میں حضرت محمد غوث گوالیریؒ سے اوپر دسویں نمبر پر ہے۔ ملاحظہ ہو: اورادِ غوثیہ۔

۳- فقیر محمد جہلمی' حدائق الحنفیہ' مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۶ء' ص ۳۸۹۔

۴- عبدالحق محدثؒ' اخبار الاخیار' مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ' ص ۲۵۲۔ 'واقعہ انکار علمائے گجرات بروی بتقریب بعضے رسائل وے کہ مردم آن را معراج نامہ گویند' مشہور است۔"

۵- محمد مسعود احمد' شاہ محمد غوث گوالیریؒ' مطبوعہ میر پور ۱۹۶۴ء' ص ۱۲۱۔

غوثیہ" میں کئی بار اپنے معراج کا ذکر کیا ہے[1]۔ علمائے گجرات نے اسی تحریر کو "معراج نامہ" کا نام دے کر ان کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی اور شیخ علی متقیؒ نے ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ سلطان محمد شاہ ثالث (۱۵۳۷ء۔ ۱۵۵۳ء) پر شیخ وجیہہ الدینؒ کا بڑا اثر تھا[2]۔ اس لئے اس نے ان کی اجازت کے بغیر اس فتویٰ پر عمل روک دیا۔ جب وہ فتویٰ شیخِ موصوف کی خدمت میں بھیجا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب تک وہ شیخ محمد غوث گوالیریؒ سے نہ مل لیں اس وقت تک فتویٰ پر عمل نہیں کریں گے۔ جب ان کی شیخِ موصوف کے ساتھ ملاقات ہوئی تو وہ ان کا جمال عالم آراء دیکھ کر ان کے گرویدہ ہو گئے اور وہ فتویٰ چاک کر ڈالا۔ جب شیخ علی متقیؒ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ شیخ وجیہہ الدینؒ کے پاس پہنچے اور اپنے کپڑے پھاڑ کر یوں گویا ہوئے:

چرا بہ شیوع بدعت و وقوع رخنہ در دین راضی می شوید۔	بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ پیدا کرنے میں تم کس طرح راضی ہو گئے۔

شیخ وجیہہ الدینؒ نے جواب دیا: "ہم لوگ اہلِ قال ہیں اور شیخ اہلِ حال۔ اس لئے ہم ان کے احوال و کیفیات کو نہیں سمجھ سکتے۔ یوں بھی شریعت کی نظر میں ان کا دعویٰ قابلِ گرفت نہیں[3]۔"

راقم الحروف نے "اَورادِ غوثیہ" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت گوالیریؒ کو "معراج" عالمِ رُویا میں ہوا تھا۔ مفتی غلام سرور لکھتے ہیں کہ جب علمائے گجرات نے ان کے خلاف فتویٰ جاری کیا تو حضرت گوالیریؒ نے اپنی صفائی میں یہ کہا "این معراج مرا در عالمِ واقعہ بوقوع آمدہ است نہ در ہوش[4]" اس لئے حضرت وجیہہ الدینؒ کا یہ مؤقف بالکل صحیح تھا کہ ان کا یہ دعویٰ قابلِ گرفت نہیں ہے۔

شیخ علیؒ متقی، شیخ وجیہہ الدینؒ کے گھر سے رنجیدہ ہو کر نکلے اور انہوں نے سلطان سے جا

---

۱ - محمد غوث گوالیریؒ، اَورادِ غوثیہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن، مخطوطہ ۲۱ / ۳۱، فارسی تصوف۔

۲ - ڈاکٹر زبید احمد، عربی ادبیات میں ہند و پاکستان کا حصہ، (انگریزی) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۳۔

۳ - عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ج ۳، ص ۴۳۔

۴ - مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ کانپور ۱۹۱۴ء، ج ۲، ص ۳۳۴۔

کر کہا کہ وہ ایسے ملک میں نہیں رہ سکتے جہاں لوگ باطل کو تقویت دیتے اور حق کو پامال کرتے ہوں۔ انہوں نے گجرات سے ترکِ سکونت کا مصمم ارادہ کر لیا اور دوبارہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے[1]

محمد غوث گوالیریؒ سے بیعت

حضرت محمد غوث گوالیریؒ کی گجرات میں آمد سے قبل شیخ وجیہہ الدینؒ متعدد شیوخ کی خدمت میں رہ کر سلوک کی منازل طے کر چکے تھے لیکن جیسا شیخ وہ چاہتے تھے ویسا انہیں نہیں ملا تھا۔ جب ان کی حضرت گوالیریؒ سے پہلی ملاقات ہوئی تو ان کا دل پکار اٹھا:

آخر آمد آن یارے کہ ما می خواستیم

شیخ وجیہہ الدینؒ نے اپنا سرِ نیاز ان کے سامنے خم کر دیا اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ محمد غوثی منڈوی تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ گوالیریؒ سے بیعت ہونے کے بعد شیخ وجیہہ الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ موصوف ان کی صحبت میں رہ کر بڑے قلیل عرصہ میں مسِ خام سے طلائے خالص بن گئے ہیں[2] شیخ موصوف اگرچہ علم و فضل کے اعتبار سے اپنے مرشد سے بہت آگے تھے لیکن اس کے باوجود وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ حضرت گوالیریؒ کی ملاقات سے پہلے خدا کو نہیں جانتے تھے' انہیں ان کے شیخ نے ہی خدا تک پہنچایا ہے[3]

تکمیلِ سلوک کے بعد جب حضرت گوالیریؒ نے انہیں چودہ سلاسلِ تصوّف میں خلافت عطا فرمائی تو انہوں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں چودہ سلاسلِ تصوّف کی جو نعمت ملی ہے اس کی علیحدہ علیحدہ لذت محسوس کریں گے[4]

شطاریہ سلسلہ

حضرت شیخ وجیہہ الدینؒ شطاری سلسلے سے وابستہ تھے۔ اس سلسلے سے وابستہ بزرگوں نے قرونِ وسطیٰ میں گجرات' کاٹھیاواڑ' مدھیہ پردیش' بہار' انڈونیشیا' ملائیشیا اور حرمین شریفین میں تصوّف

---

۱ - عبدالصمد انصاری' اخبار اصفیاء' مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن' ایتھے ۶۴۱' ورق ۵۰ ب۔
۲ - محمد غوثی منڈوی' گلزار ابرار (اردو)' مطبوعہ لاہور ۱۳۹۵ھ' ص ۴۰۶۔
۳ - شیخ محمد' ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ' ورق ۷ ب۔
۴ - ایضاً' ورق ۲ الف۔

کے اس سلسلے کو بڑا فروغ دیا اور تصوّف کے موضوع پر متعدد بلند پایہ کتابیں تحریر کیں، لیکن اس کے باوجود اس سلسلے کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے طبع ہونے والے اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ میں "شطاریہ" کے عنوان سے مشہور مستشرق مارگولیتھ کا اب سے غالبا" نصف صدی قبل لکھا ہوا ایک مختصر سا شذرہ شامل ہے؛ جس میں شطاریوں کے بارے میں سطحی سی باتیں ہیں[1] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شہرۂ آفاق مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی نگرانی میں ایک ریسرچ اسکالر سے شطاریہ سلسلہ پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ لکھوایا ہے، جو اس وقت راقم الحروف کی دسترس سے باہر ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے آپ کو شطاری اس لئے کہتے ہیں کہ سلوک اور طریقت میں دوسرے سلسلوں کے بزرگوں سے زیادہ تیز اور سرگرم (شطار) ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جنگلوں میں رہ کر سخت ریاضتیں کرتے تھے اور ان سے غیر معمولی افعال و تصرّفات منسوب کئے جاتے تھے[2] مارگولیتھ کا خیال ہے کہ شاطر اس صُوفی کو کہتے ہیں جو علائق دنیوی سے کاملا" قطع تعلق کر چکا ہو[3] وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ نفی کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں اور اثبات سے غرض رکھتے ہیں۔ ان کی یہ رائے ہے کہ نفی کی طرف متوجہ ہونا محض تضیع اوقات ہے۔ اس سلسلہ سے وابستہ صُوفی کبھی شکوہ و شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ انہیں جو مل جاتا ہے کھا لیتے ہیں اور ہر وقت منعم حقیقی پر نگاہ رکھتے ہیں۔ توحید کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے کہ توحید ایک "سمجھنا" ایک کہنا، ایک دیکھنا اور ایک ہونا ہے[4]

مارگولیتھ اور شیخ محمد اکرام نے شطاریوں کی تصانیف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ورنہ انہیں شطاری سلسلہ کے بارے میں بڑی اچھی معلومات مل جاتیں۔ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلے شیخ عبداللہ شطاریؒ نے اس سلسلے کو متعارف کرایا۔ ان کے بعد شیخ ظہور حاجی حضورؒ نے روحانی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا[5] ان کے بعد ان کے خلیفہ شیخ محمد غوث گوالیریؒ نے اسے

---

۱ - اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۵ء، ج ۱۱، ص ۷۳۴۔
۲ - شیخ محمد اکرام، رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۳۵۔
۳ - اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۱۱، ص ۷۳۴۔
۴ - ایضا" ص ۵ - ۷۳۴۔
۵ - سطحی قسم کے تذکروں میں شیخ ظہور کو حاجی حضور لکھا ہوا ملتا ہے۔ ان کا لقب حضور نہیں بلکہ حصور ہے۔ قرآن مجید میں یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفت آئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:
سیداً و حصوراً ونبیاً من الصلحین

عوام میں مقبول بنایا۔ شیخ موصوف نے جواہر خمسہ، اَوراد غوثیہ اور بحر الحیاۃ کے عنوان سے تصوّف کے موضوع پر کتابیں لکھیں جن سے شطاریوں کی تعلیمات اور ان کے طور طریقوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بحرالحیاۃ دراصل اَمرت کُنڈ نامی ویدانت اور تنتر ازم کے موضوع پر ایک سنسکرت کتاب کا فارسی ترجمہ ہے[1] اس میں شیخ موصوف نے اپنے رُوحانی تجربات بھی قلمبند کئے ہیں۔ ترجمے کا مقصد مسلمانوں کو ویدانت سے روشناس کرانا اور تصوّف اور ویدانت میں تطبیق کی کوشش کرنا ہے۔

شیخ محمد غوث گوالیریؒ نے شطاری سلسلے کے اُصول مرتب فرمائے ہیں۔ موصوف نے اپنی تصنیف اَوراد غوثیہ میں اپنے مریدوں کو ۲۲ وصیتیں کی ہیں۔ ان سے اس سلسلہ کی تعلیمات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

شیخ وجیہہ الدینؒ کو حضرت گوالیریؒ نے چودہ سلسلوں میں بیعت کرنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن وہ طالبوں کو صرف شطاری سلسلہ میں بیعت کیا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنی مجلس میں فرمایا:

سلوکِ شطاری از ہمہ سلوک اسہل و از ہمہ انفع است[2]

شطاری سلسلہ دوسرے تمام سلاسل سے آسان تر اور سب سے زیادہ نفع دینے والا ہے۔

اسی طرح آپ فرمایا کرتے تھے کہ دوسرے سلاسلِ تصوّف میں عظمت اور کرامات بہت ہیں اور شطاریہ سلسلے میں ترقیٔ باطن بیشار ہے[3] ایک بار شیخ وجیہہ الدینؒ نے اپنے مرشد سے کثرتِ صوم کی جگہ دوامِ صوم کی اجازت چاہی تو انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کرنی چاہیے[4] شیخ وجیہہ الدینؒ بھی اپنے مریدوں کو کثرتِ صوم اور دوامِ صوم سے منع کرتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے ان سے کہا کہ فلاں شخص بڑی ریاضت کرتا ہے اور کثرت سے روزے رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے باطن سے بے خبر ہے[5] ایک مرید نے ان سے دوامِ صوم کے بارے میں استفسار کیا

---

۱ ۔ محمد غوثؒ، بحرالحیاۃ، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لنڈن، ایتھے ۲۰۰۲ مائیکرو فلم عندی۔
۲ ۔ شیخ محمد، ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدین گجراتی، ورق ۸ ب۔
۳ ۔ محمد یوسف متنگلے، کتاب مذکورہ بالا، ص ۳۶۔
۴ ۔ شیخ محمد، ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی، ورق ۵ الف، ۵ ب۔
۵ ۔ ایضاً، ورق ۸ ب۔

تو انہوں نے فرمایا کہ اسے مغلوں سے یہ سبق سیکھنا چاہئے۔ وہ گھوڑے کو بکثرت کھلاتے اور خوب دوڑاتے ہیں۔ انہوں نے مرید سے کہا کہ نصف شب کی بیداری، ایامِ بیض اور پیر اور جمعرات کے روزے اس کے لئے کافی ہیں[۱]

شیخ موصوف فرماتے ہیں کہ خلوت میں شغل کرنے سے اخلاقِ ذمیمہ ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ اوصافِ حمیدہ پیدا ہوتے ہیں۔ موصوف اگر کسی مرید کو تلاوت کرتے ہوئے دیکھتے تو اسے کہتے کہ وہ تلاوت کر رہا ہے شغل کیوں نہیں کر رہا اور اگر کسی کو کسی کے لئے پانی لئے ہوئے جاتا دیکھتے تو اس سے کہتے کہ وہ ایسے فضول کام میں کیوں وقت ضائع کر رہا ہے، شغل کیوں نہیں کرتا[۲] آپ نے ایک بار حاضرین سے کہا کہ سالک جو ذکر و شغل زیادہ ذوق و شوق سے کر سکتا ہو، اسے وہی کرنا چاہئے کیونکہ اس کی ترقی اسی پر منحصر ہے۔ ایک روز ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ کتابیں پڑھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس سے عقیدہ محکم ہوتا ہے۔ اتفاق سے مولانا خلیفہ بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ علمِ حکمت پڑھنے سے عقیدہ میں تردد ہوتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کا پڑھنا ترک کر دو۔[۳]

قرونِ وسطیٰ میں فلسفہ کے خلاف دینی حلقوں میں ایک عام نفرت پائی جاتی تھی۔ شاہ غلام دہلویؒ کے ملفوظات۔۔ دُرّ المعارف۔۔ میں درج ہے کہ انہوں نے ایک روز بُو علی سینا کی کوئی کتاب پڑھنی شروع کی۔ ابھی انہوں نے ایک صفحہ ہی پڑھا ہو گا کہ انہوں نے اپنے قلب پر سیاہی محسوس کی۔ شاہ صاحب نے فوراً وہ کتاب رکھ دی اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اس تاریکی کو دُور کرنے میں مصروف ہو گئے۔[۴]

دسویں صدی کے ایک نامور عالم مولانا فضل اللہ بن رُوز بہان اصفہانیؒ (م ۱۵۲۱ء) نے عبیداللہ خان اُزبک (م ۱۵۳۹ء) والئی بخارا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ دینی مدارس میں فلسفہ کی تعلیم ختم کر دے۔ مولانا فرماتے ہیں:

بر شیخ الاسلام واجب باشد کہ از تعلیمِ آن منع کند، و اصلاً نگزارد کہ کسی بدرس و افادہ آن مشغول گردد۔ و جمیع فسادات کہ

شیخ الاسلام پر واجب ہے کہ وہ فلسفہ پڑھانے سے منع کرے اور وہ کسی شخص کو بھی اس کے دَرس یا اس سے استفادہ کا

---

۱ - ایضاً، ورق ۵۔
۲ - ایضاً، ورق ۲ الف۔
۳ - ایضاً، ورق ۸ الف۔
۴ - شاہ رؤف احمدؒ، دُرّالمعارف، مطبوعہ استانبول، ۱۹۷۴ء، ص ۳۸۔

در اسلام ناشی شدہ، منشاء آن اشتہار علوم فلاسفہ است[۱]

موقعہ نہ دے۔ اسلام میں جتنے فتنے پیدا ہوئے ہیں ان کا سبب فلاسفہ کے علوم کی اشاعت ہے۔

شیخ وجیہہ الدینؒ کے ایک مرید میاں شیخ صالح نے بعض کتابیں نقل کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:

"ہم شطاری ہیں، اس لئے ہم ایسے کاموں سے سروکار نہیں رکھتے ہم تو توحید میں غرق رہتے ہیں[۲]"

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ان کے نزدیک شریعت اور حقیقت ہیں، طریقت نہیں ہے۔ جب کوئی اپنی روحانی منازل طے کر لیتا ہے تو پھر اس حالت کو طریقت کہتے ہیں[۳]۔ بعض ناخواندہ صوفی ولایت کو نبوّت سے افضل سمجھتے ہیں۔ حضرت وجیہہ الدینؒ نے ایک روز فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی ولی کو نبی پر فضیلت دے تو اسے قید کر دیں اور جب تک وہ اس "عقیدۂ فاسدہ" سے تائب نہ ہو، اسے رہا نہ کریں[۴]۔

نبی اور ولی کے مقام کا فرق بیان کرتے ہوئے خواجہ عبیداللہ ابن حضرت باقی باللہؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں: نہایات الصدیقین اوّل احوال الانبیاء۔ اس کی تشریح موصوف یوں کیا کرتے تھے کہ اگر احوال الانبیاء کو پانی سے بھری ہوئی ایک مشک سے تشبیہ دی جائے تو نہایات الصدیقین کی مثال اس طراوت جیسی ہو گی جو مشک کی سطح پر آ جاتی ہے (یعنی قطرۂ آب بھی نہیں[۵]) خواجہ صاحبؒ نے ابو العباس ابنِ عطار ارمیؒ کا قول نقل کیا ہے:

ادنیٰ منازل المرسلین اعلیٰ مراتب الانبیاء
ادنیٰ مراتب الانبیاء اعلیٰ مراتب الصدیقین
ادنیٰ مراتب الصدیقین اعلیٰ مراتب الشہداء
ادنیٰ مراتب الشہداء اعلیٰ مراتب الصالحین

---

۱ - فضل اللہ بن روز بھان، سلوک الملوک، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۹۶۶ء ص ۶۷۔
۲ - شیخ محمد، ملفوظات شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی، ورق ۳ ب۔
۳ - ایضاً، ورق ۲ الف۔
۴ - ایضاً، ورق ۳ الف۔
۵ - عبیداللہ، مبلغ الرجال، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، یونیورسٹی کلکشن نمبر ۱۹۱، ورق ۴۳

ادنیٰ مراتب الصالحین اعلیٰ مراتب المومنین

خواجہ عبیداللہؒ، حضرت ابوبکر کلاباذیؒ کی شرح تعرّف کے حوالے سے یہ نقل فرماتے ہیں کہ اس پر اولیاء اللہ کا اجماع ہے کہ خواہ کوئی کتنا ہی بلند پایہ اور قوی مایہ کیوں نہ ہو وہ انبیاء کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔[1]

ان اکابر اولیاء کے مقابلے میں صوفیائے خام کے اس قول کی کیا وقعت ہے کہ ولایت نبوّت سے افضل ہے۔

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک بار دو ہندو جوگی شیخ وجیہہ الدینؒ کی شہرت سن کر ان کے مرید ہونے آئے۔ حضرت انہیں اپنے حجرے میں لے گئے اور تلقین کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔ کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ کیا انہوں نے جوگیوں کو مرید کر لیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "استغفر اللہ! میں کسی کافر کو مرید نہیں کرتا، البتہ تلقین کر دیتا ہوں۔ شاید وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔"[2]

شیخ وجیہہ الدینؒ اپنے مریدوں کو بعض اَوراد کے وظیفہ کے دوران میں گوشت خوری سے اجتناب کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ البتہ جو شخص ذکرِ جہر کرنے کی اجازت چاہتا تھا، اسے مرغن شوربا استعمال کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔[3]

حضرت وجیہہ الدینؒ کے ملفوظات میں "موکلان اسماء" کا ذکر موجود ہے۔ ان کے مرشد حضرت محمد غوث گوالیریؒ اس فن کے امام تھے۔ ان کی ایک تصنیف جواہر خمسہ کا ایک باب دعوتِ اسماء اور تسخیرِ کواکب کے موضوع پر ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ فن اپنے مرشد سے سیکھا ہو گا۔

شیخ وجیہہ الدینؒ کا اخلاق و عادات

مولانا عبدالحیی لکھنویؒ شیخ موصوف کے بارے میں لکھتے ہیں:

و کان صاحب الصدق و اخلاص قانعاً بالیسیر شریف النفس لا یمتاز عن آحاد الناس فی المجلس۔[4]

وہ صدق و اخلاص کے پیکر، تھوڑے پر قانع اور شریف النفس تھے۔ وہ مجلس میں کسی بھی شخص سے ممتاز نظر نہیں آتے تھے۔

۱۔ محمد اسلم، تاریخی مقالات، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۷۰، ۷۱۔

۲۔ شیخ محمد، ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی، ورق ۴ الف۔

۳۔ ایضاً، ورق ۵ ب۔

۴۔ عبدالحیی، نزہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸۵۔

شیخ وجیہ الدینؒ، اللہ تبارک و تعالیٰ کے ایک صفاتی نام ۔۔ الشافی ۔۔ کے عامل اور مظہر تھے۔ جمعہ کے روز مریضوں کی ایک بڑی تعداد ان کی خدمت میں حاضر ہوتی اور ان کی دعا سے شفا پاتی[۱]۔

شیخ کا علمی مقام

علوم ظاہری میں آپ کو بڑی قدرت اور ملکہ حاصل تھا۔ اکثر درسی کتابوں پر ان کی شرح اور حاشیہ موجود ہے[۲]۔ حدایق الحنفیہ کے فاضل مصنف نے ان کا شمار اس عہد کے نامور فقہاء اور محدثین میں کیا ہے[۳]۔ شیخ موصوف کا زیادہ تر وقت اپنے گھر یا مدرسے میں گزرتا تھا۔ انہوں نے دنیا داروں کے گھر نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ ایک دو بار انہیں حکامِ وقت کی طلب پر مجبوراً جانا پڑا تو انہوں نے اس پر بڑی کراہت ظاہر کی[۴]۔ عبداللہ خویشگی کی روایت ہے کہ شیخ وجیہ الدینؒ رات کو عبادت میں مصروف رہتے اور دن کے وقت اپنے مدرسہ میں طلبہ کو پڑھاتے تھے[۵]۔

محمد غوثی منڈوی لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں گجرات میں ایک رسم تھی کہ شادی کی رات گزرنے کے بعد صبح سویرے دلہا اور دلہن کو بنا سنوار کر تخت پر بٹھاتے اور چند رسمیں پوری کرتے تھے۔ شیخ موصوف کی شادی کے بعد یہ رسمیں ادا کرنے کا موقعہ آیا تو شیخ صاحب گھر میں موجود نہ تھے۔ ان کے احباب ان کی تلاش میں نکلے تو ان کے والد بزرگوار نے فرمایا کہ انہیں پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے اس لئے وہ ضرور مدرسہ میں ہوں گے۔ جب ان کے احباب انہیں تلاش کرتے ہوئے مدرسہ پہنچے تو انہیں درس میں مشغول پایا[۶]۔

عبدالباقی نہاوندی کی روایت ہے کہ برِعظیم کے اکثر علماء شیخ وجیہ الدینؒ کے شاگرد ہیں[۷]۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کا فیضِ علم صرف گجرات تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دُور دُور سے تشنگانِ علم ان کی خدمت میں اپنی پیاس بجھانے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔

انہوں نے تقریباً پچاس سال تک احمد آباد میں درس و تدریس اور رُشد و ہدایت کا ہنگامہ گرم رکھا[۸]۔ جامع ملفوظات کی روایت ہے کہ حضرت نے ایک دن اپنی مجلس میں اس بات

۱ ۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ج ۳، ص ۴۳۔
۲ ۔ دارا شکوہ، سفینۃ الاولیاء (اردو)، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ء، ص ۲۴۳۔
۳ ۔ فقیر محمد جہلمی، حدایق الحنفیہ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۶ء، ص ۳۸۸۔
۴ ۔ شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۳۹۳۔
۵ ۔ عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۲۵ ۔ II، ورق ۵۵۳۔
۶ ۔ محمد غوثی منڈوی، گلزارِ ابرار (اردو)، مطبوعہ لاہور ۱۳۹۵ھ، ص ۴۰۸ ۔ ۴۰۹
۷ ۔ نظام الدین احمد، طبقاتِ اکبری، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ج ۲، ص ۴۷۳۔
۸ ۔ شیخ محمد، ملفوظاتِ وجیہ الدینؒ گجراتی، ورق ۹ ب۔

کا اعتراف کیا کہ ان سے چار لاکھ کے قریب افراد نے فیض حاصل کیا ہے۔ ایک دن انہوں نے فرمایا کہ ان کی خداتعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ ان کے دامن سے جو لوگ وابستہ ہیں وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہاں اور دین و دنیا میں سرخرو رہیں[1]

اردو کی ابتداء

از منہ وسطیٰ میں برّعظیم پاک و ہند میں اگر کوئی ایسی جگہ تھی جہاں شاہ و گدا' امیر و غریب' گبر و مومن اور رند و پارسا بلا امتیاز اور بلا روک و ٹوک جمع ہو سکتے تھے تو وہ صوفیہ کرام کی خانقاہیں تھیں۔ حاضرین اپنی درخواستیں مشائخ کرام کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ اپنا پیغام ان تک پہنچاتے۔ افہام و تفہیم کے اسی جذبے نے اردو زبان کو جنم دیا۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں جتنا اہم کردار خانقاہی نظام نے ادا کیا ہے اتنا شاید ہی کسی دوسرے ادارے نے کیا ہو۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق اس ضمن میں لکھتے ہیں: "دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لئے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ درویش کا تکیہ سب کے لئے کھلا تھا۔ بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور صحبت کو موجب برکت سمجھتے۔ عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔ اس لئے تلقین کے لئے انہوں نے جہاں طور ڈھنگ اختیار کئے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطّے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ جتنے اولیاء اللہ سرزمینِ ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے انہیں کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ یہ بڑا گُر تھا اور صُوفیہ اسے خوب سمجھتے تھے[2]"

حضرت خواجہ معین الدین بجزیؒ (م ۱۲۳۶ء) کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ انہوں نے اجمیر جانے سے قبل ملتان میں کئی سال قیام کر کے "ہندوی" زبان سیکھی تھی[3]۔ ان کے ایک خلیفہ سلطان التارکین صوفی حمیدالدین ناگوریؒ (م ۱۲۷۴ء) کے گھر میں "ہندوی" زبان بُولی جاتی تھی[4]۔ سرکھیج (احمد آباد) کے نامور بزرگ شیخ احمد کھٹوؒ (م ۱۴۴۶ء) گوجری زبان سے بخوبی

---

۱ - ایضاً" ورق ۹ الف۔

۲ - مولوی عبدالحق' اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' مطبوعہ یونین پریس دہلی' ص ۸۔

۳ - محمد اکرام' آبِ کوثر' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء' ص ۲۲۵۔

۴ - فریدالدین محمود' سرور الصدور' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ' نمبر ۲۱ / ۶۱' فارسی تصوّف۔

واقف تھے۔[1] بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے والدین پنجاب کے رہنے والے تھے اس لئے موصوف مقامی زبان میں بڑی روانی سے گفتگو کر لیتے تھے۔ ان کا پنجابی کلام "بابے دی بانی" کے نام سے گرنتھ صاحب میں موجود ہے اور حال ہی میں پروفیسر محمد آصف نے اسے -- آکھیا بابا فریدؒ نے-- کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔[2] شاہ مینا لکھنویؒ (م ۱۴۷۹ء) کے ملفوظات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے ایک مرید میاں داؤد پورب کے ساکنوں سے "ہندوی" زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔[3] حضرت شاہ عالم بخاریؒ (م ۱۴۷۵ء) گجراتی زبان سے واقف تھے اور گجراتیوں سے اسی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔[4] حضرت سید محمد الحسینی المعروف بہ بندہ نواز گیسو درازؒ (م ۱۴۲۲ء) کے بارے میں ان کے فرزند ارجمند محمد اکبر حسینیؒ لکھتے ہیں کہ موصوف سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی دیومالا سے بخوبی واقف تھے۔[5] شیخ وجیہہ الدینؒ کے مرشد شیخ محمد غوث گوالیریؒ بھی سنسکرت زبان اور ہندوؤں کے علوم سے کماحقہٗ واقف تھے۔ انہوں نے سنسکرت کی ایک کتاب امرت کنڈ کا بحر الحیاۃ کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

شیخ وجیہہ الدینؒ اور اُردو

شیخ وجیہہ الدینؒ کے ملفوظات میں جتنے اُردو فقرے اور الفاظ ملتے ہیں، اتنے کسی دوسرے بزرگ کے ملفوظات میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو ان کے چھ اردو فقرے ملے تھے جو انہوں نے اپنی تصنیف-- اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام-- میں نقل کر دیئے ہیں۔[6] راقم الحروف کو ان کے ملفوظات کے مطالعے کے دوران میں ان کے متعدد فقرے مل گئے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں شیخ وجیہہ الدینؒ کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اردو زبان پر کافی عبور تھا اور وہ گجراتی میں بات چیت کرنے کی بجائے اردو میں گفتگو کرنا پسند فرماتے تھے۔ راقم الحروف کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اردو کی نشوونما صرف دہلی اور لکھنؤ میں ہی نہیں ہوئی بلکہ برعظیم کے مختلف صوبوں میں بھی اس سلسلے میں بڑا کام ہوا ہے۔

---

۱ - محمد اسلم، شیخ احمد کھٹو، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۔

۲ - محمد آصف، آکھیا بابا فریدؒ نے، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء۔

۳ - میر سید کی الدین رضوی، ملفوظاتِ شاہ میناؒ، مطبوعہ ہردوئی، ص ۲۰۶۔

۴ - سید جعفر بدر عالم، ملفوظاتِ شاہ عالمؒ، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، یونیورسٹی کلکشن نمبر ۳۴، فارسی تصوّف، ورق ۳ الف۔

۵ - محمد اکبر حسینیؒ، جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۱۹۔

۶ - عبدالحق، اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۳۱۔

ایک روز حضرت وجیہہ الدینؒ نے میاں صالح سے پوچھا کہ انہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ شراب پیتا ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا: "ولیوں کیا سفتاں ہوتیاں ہیں[1]" یعنی کیا ولیوں میں ایسی صفتیں ہوا کرتی ہیں؟ ایک روز کسی شخص نے کہا کہ میاں شیخ فضل اللہؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: "جب ترقی کریں گے آپن درس کہیں گے[2]" ایک شخص نے کہا کہ ان کا فلاں مرید فلاں کام میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا "سب چھوڑ بیٹھے تو شتاب فایدہ ہو جاوے گا[3]" ایک دن آپ نے بازار میں فروخت ہونے والی کسی چیز کے بارے میں ان الفاظ میں استفسار فرمایا: "وہ کیا ہووے جو احمد آباد کے بازار میں بکے[4]" ان کے ایک مرید میاں صبغۃ اللہ کسی ایسے کام میں مشغول تھے جو حضرت کو پسند نہیں تھا۔ ایک دن وہ ملنے آئے تو آپ نے فرمایا "میاں صبغۃ اللہ چھوڑ دے[5]"

ایک روز کسی معتقد کے استفسار پر آپ نے فرمایا: "یک ہوں یا دو ہوں[6]" ایک دن کسی شخص نے آپ سے راستہ پوچھا تو آپ نے فرمایا "یوں اربتی چلیو جیو[7]" ایک دفعہ آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک واقف کار مل گیا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا "تمہیں ایتھا رہتے ہو[8]؟" یعنی تم یہاں رہتے ہو؟ ایک روز آپ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا "میری تائیں کیس خدمت کی جاتی ہے[9]" ایک شخص نے ریاضت و مجاہدہ کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا "تمہاری بلا ریاضت کرے[10]" ایک شخص نے حضرت کو کسی کام میں مشورہ دینا چاہا تو آپ نے فرمایا "منجہ تھی اوکی عقل ہے[11]" یعنی کیا تجھ میں مجھ سے زیادہ عقل ہے۔

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ عطاء محمد نامی ایک شخص نے عالمِ نزع میں آپ سے

۱۔ شیخ محمد، ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی، ورق [illegible] الف۔
۲۔ ایضاً، ورق ۹ الف۔
۳۔ ایضاً، ورق ۷ ب۔
۴۔ ایضاً، ورق ۸ الف۔
۵۔ ایضاً، ورق [illegible] الف۔
۶۔ ایضاً، ورق [illegible] الف۔
۷۔ ایضاً، ورق [illegible] ب۔
۸۔ ایضاً، ورق [illegible] الف۔
۹۔ ایضاً، ورق ۱۰ ب۔
۱۰۔ ایضاً۔
۱۱۔ ایضاً۔

ملاقات کرنا چاہی اور آپ کو پیغام بھیجا کہ تھوڑی دیر کے لئے اسے آ کر دیکھ جائیں۔ آپ نے قاصد سے کہا "فقیر پر فرض تو نہیں[1]" اس کے علاوہ آپ نے اسے یہ بھی کہلا بھیجا "ہوں مروں تو بھی کوئی نا رُو۔" ایک روز آپ نے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا "ناقابل کہیں کا۔ برائے زر شائیں ہو رہا ہے[2]" ایک مرید نے ان سے پوچھا کہ وہ کون سے کام نہ کرے؟ آپ نے فرمایا، "بہو مزاج ہووے سو نکرے[3]" یعنی جو حرام ہو وہ نہ کرے۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے ایسے ہی سوال سے کہا، "بہو نداج ہووے سو ترک کرے۔" ایک شخص نے کسی کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ فلاں چیز قبول نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا "آئین جھک مار کر قبول کرے گا[4]" ایک دن آپ نے شیخ علی متقیؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "شیخ علی کا تقویٰ کہاں میرا مکان کہاں[5]" یہ فقرہ واضح نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت نے مقام کہا ہو اور جامع ملفوظات نے مکان سمجھا ہو۔ ایک روز آپ نے ایک مرید سے کہا کہ اگر وہ فلاں کام کر بیٹھتا تو اس کا "تقویٰ چھوٹ جاتا۔"[6]

ایک روز شیخ موصوف نے بعض مریدوں کی کسی حرکت پر خفا ہو کر فرمایا، "کھرے نادان ہیں۔ کھرے نادان ہیں[7]" ایک دن آپ نے ایک تنگ حجرہ دیکھ کر فرمایا "خاصا پنجرہ ہے[8]" آپ نے غالباً" کسی شخص کی مالی امداد کی اور اس کے ساتھ ہی اسے کہا "ظاہر کیجیے ظاہر کیجیے[9]" کسی شخص نے اپنی مرضی سے کوئی وظیفہ پڑھنا شروع کیا تو آپ نے فرمایا، نہ یوں تو ذوق نہوی۔[10]

ایک دن آپ کی مجلس میں سرکارِ رسالت مآبؐ کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا "ہمیں رسولؐ کی لوک ہیں[11]" کسی شخص نے آپ سے کہا کہ فلاں شخص یوں کر رہا ہے تو آپ نے

---

۱ - ایضاً" ورق ۳ ب۔
۲ - ایضاً" ورق ۲ ب۔
۳ - ایضاً" ورق ۴ الف۔
۴ - ایضاً" ورق ۵ ب۔
۵ - ایضاً" ورق ۹ ب۔
۶ - ایضاً" ورق ۳ ب۔
۷ - ایضاً" ورق ۳ ب۔
۸ - ایضاً" ورق ۳ الف۔
۹ - ایضاً" ورق ۳ الف۔
۱۰ - ایضاً" ورق ۳ ب۔
۱۱ - ایضاً" ورق ۲ ب۔

فرمایا "اپنوں کون کیا!" یعنی ہمیں کیا کرنا چاہئے۔[1]

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ موصوف وقت کا شمار گھڑیوں سے کیا کرتے تھے، یعنی ایک گھڑی یا دو گھڑی۔[2]

شیخ وجیہہ الدینؒ کے زمانے میں گجرات کی حالت

شیخ وجیہہ الدینؒ کے ملفوظات میں گجرات کے بارے میں بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔ ایک روز انہوں نے حاضرین مجلس سے کہا کہ گجرات کی آب و ہوا کافی "ضعیف" ہے، اس لئے انہیں روغن ضرور استعمال کرنا چاہئے۔[3] اس زمانے میں نوساری کے حالات خراب تھے اور وہاں بغاوت ہو گئی تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت سے درخواست کی کہ ان حالات میں وہاں سے ہجرت کر جانی چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں کہ کیا ہو گا لیکن وہاں سے ہجرت نہیں کرنی چاہئے۔[4]

اکبر نے ۱۵۷۲ء کے اواخر میں گجرات فتح کر لیا اور اپنے رضاعی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو وہاں کا گورنر مقرر کر کے خود فتح پور سیکری چلا آیا۔ اکبر کی واپسی کے بعد محمد حسین مرزا کی قیادت میں امرائے گجرات نے احمد آباد کا محاصرہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کے علماء اور مشائخ نے بھی باغیوں کی طرف داری کی۔

جونہی اکبر کو اس صورت حال کا علم ہوا وہ گیارہ روز میں فتح پور سے احمد آباد پہنچ گیا۔ اکبر نے باغیوں کو شکست دے کر گجرات میں امن و امان قائم کیا۔ اس موقع پر خان اعظم نے احمد آباد کے کئی علماء اور مشائخ کو، جن میں شیخ وجیہہ الدینؒ بھی شامل تھے، مجرموں کی حیثیت سے اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے ان سے گفتگو کی اور ان کے جواب سے مطمئن ہو کر انہیں چھوڑ دیا۔[5]

شیخ وجیہہ الدینؒ کے زمانے میں گجرات میں مہدوی فرقہ کو خاصا عروج ہوا۔ عبدالرحیم خانِ

۱۔ ایضاً" ورق ۴ ب۔ مولوی عبدالحق نے یہ فقرہ یوں لکھا ہے: "اپنوں کو کیا کشف ہوئے یا نہوئے کام اس کا ہے۔" لیکن انہوں نے اپنا ماخذ نہیں بتایا۔

۲۔ ایضاً" ورق ۸ ب۔

۳۔ شیخ محمد، ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی، ورق ۵ ب۔

۴۔ ایضاً" ورق ۱۴ الف۔

۵۔ کمساریٹ، تاریخ گجرات (انگریزی)، مطبوعہ مدراس ۱۹۳۸ء، ص ۵۲۵۔

خانان کے دور نظامت (۱۵۸۵ء۔ ۱۵۸۹ء) میں ان کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں[1] گجرات میں بوہرے بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اس قوم کے بہت سے افراد مہدوی فرقے میں شامل ہو گئے۔ ان حالات میں گجرات کے نامور عالم اور محدث شیخ محمد بن طاہر بوہرہ پٹنیؒ نے اپنے سر سے دستار اتار دی اور یہ عہد کیا کہ جب تک یہ فتنہ ختم نہیں ہو جاتا وہ اپنے سر پر دستار نہیں باندھیں گے[2] جب اکبر گجرات آیا تو اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے سر پر دستار باندھی اور انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ انہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، بحیثیت حکمران اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس فتنہ کا سدباب کرے[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اور اس کے شیخ الاسلام مولانا عبداللہ سلطان پوری کی کوششوں کے باوجود مہدویوں کی سرگرمیاں جاری رہیں۔

شیخ وجیہہ الدینؒ کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی ان کے عقاید اور افکار سے نالاں تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے فرمایا کہ مہدوی بڑے جاہل ہیں۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا رہ کر مر جائے تو اسے بڑا اونچا مرتبہ ملتا ہے[4] راقم الحروف کی یہ رائے کہ یہ نظریہ مہدویوں نے غالباً جینیوں سے لیا ہے جن کے ہاں بھوکا پیاسا رہ کر مرنا باعث نجات سمجھا جاتا ہے۔ گجرات اور راجستھان کی سرحد پر مونٹ آبو جینیوں کا بہت بڑا مرکز ہے اور کاٹھیاواڑ میں سابق ریاست جونا گڑھ کی حدود میں کوہ گرنار پر جینیوں کے کئی مندر موجود ہیں[5] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مہدویوں کو جینیوں سے ملنے کے مواقع میسر تھے اور ایسا عقیدہ انہوں نے جینیوں ہی سے لیا ہو گا۔ ایک روز حضرت نے مہدویوں کا ذکر کرتے ہوئے بڑے سخت الفاظ میں فرمایا: "این قوم بد تر از روافض است[6]" ایک مجلس میں حضرت والا نے مہدویوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے کئی ملنے والے، جو مہدوی عقائد رکھتے ہیں، فوت ہوئے تو موصوف نے عالم کشف میں انہیں دیکھا تو انہیں بہت ہی بُرے حال میں پایا[7]

جس زمانے میں گجرات میں گڑبڑ ہو رہی تھی، شیخ وجیہہ الدینؒ نے حضرت محمد غوث گوالیریؒ سے "تفرقۂ گجرات" ختم کرنے کے لئے دعائے سیفی پڑھنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ملفوظات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ موصوف گجرات کی صورت حال سے متفکر رہا کرتے تھے[8]

۱ - آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ، ص ۴۵۔
۲ - رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، (اردو) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۴۴۰۔
۳ - نواب صدیق حسن خان، ابجد العلوم، مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۵ھ، ص ۸۹۶۔
۴ - شیخ محمد، ملفوظات شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی، ورق ۴ الف۔
۵ - شیخ غلام محمد، مرأت مصطفیٰ آباد (جونا گڑھ) مطبوعہ جونا گڑھ ۱۳۳۱ھ، ص ۱۸۵۔
۶ - شیخ محمد، ملفوظات شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی، ورق ۴ ب۔
۷ - ایضاً، ورق ۴ ب۔ ۸ - ایضاً، ورق ۳ الف۔

شیخ حسام الدین متقیؒ

شیخ علی متقیؒ کے مرشد شیخ حسام الدینؒ کے بارے میں شیخ وجیہہ الدینؒ فرماتے ہیں کہ ان کا تقویٰ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ مچھلی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ (قرآن مجید میں مچھلی کے شکار کیلئے: احل لکم صید البحر آیا ہے)۔ ایک روز انہیں معلوم ہوا کہ جس دریا کی مچھلی وہ کھاتے ہیں اس دریا کے کنارے دس یا بیس کوس کے فاصلے پر کافروں کا ایک معبد ہے جہاں وہ مچھلیوں کے کھانے کے لئے آٹا دریا میں ڈالتے ہیں۔ شیخ حسام الدین کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ وہی مچھلیاں کھاتے ہوں جنہیں کافر آٹا کھلاتے ہیں۔ انہوں نے اسی وہم کی بنا پر مچھلی کھانا بھی ترک کر دی اور چند روز بعد فوت ہو گئے[۱]

شیخ علی متقیؒ

شیخ علی متقیؒ کا شمار دسویں صدی ہجری کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔ موصوف کے بزرگوں کا اصل وطن جونپور تھا لیکن وہ خود برہانپور میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ گجرات میں گزرا[۲] سلاطین گجرات ان کے علم و تقویٰ کی بنا پر ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جب ہمایوں اور بہادر شاہ کے درمیان گجرات میں لڑائیوں کا آغاز ہوا تو شیخ موصوف گجرات سے مکہ مکرمہ چلے گئے[۳]

جب گجرات میں مہدویوں نے زور پکڑا تو شیخ علیؒ متقی' سید محمد مہدی جونپوری کا رد کرنے کے لئے مکہ مکرمہ سے گجرات آئے۔ جونہی سید محمد جونپوری کو ان کی آمد کی خبر ملی' موصوف احمد آباد سے ٹھٹھہ روانہ ہو گئے[۴] شیخ علی متقیؒ نے "علامات مہدی" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں یہ ثابت کیا کہ مہدی کی علامات سید محمد جونپوری میں نہیں پائی جاتیں۔ انہوں نے رسالہ کے آخر میں حرمین شریفین کے ساٹھ جید علماء کی آراء بھی دی ہیں جن کے نزدیک مہدی جونپوری ـــ کاذب و مبطل ـــ تھا[۵] شیخ وجیہہ الدینؒ، شیخ علی متقیؒ کے بارے میں لکھتے

---

۱ - ایضاً' ورق ۴ ب۔

۲ - ان کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: زاد المتقین' تصنیف شیخ عبدالحق محدثؒ' مخطوطہ برٹش میوزیم لندن' اورینٹل ۲۱۷۔

۳ - محمد اسحاق' علم حدیث کے مطالعہ میں ہندوستان کی خدمت' (انگریزی) مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۵۵ء' ص ۱۰۹۔

۴ - محمد بقاؒ' ریاض الاولیاء' مخطوطہ برٹش میوزیم لندن' نمبر اورینٹل ۱۷۴۵' ورق ۳۰ الف۔

۵ - شیخ علیؒ متقی' رسالہ علامات مہدی' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ' حبیب گنج کلکشن' نمبر ۲۴ - ۵ فارسی ورق ۲۸ ب۔

ہیں: شیخ علی انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔ ان جیسا متقی دنیا بھر میں پیدا ہونا محال ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر انہوں نے شیخ علی متقیؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "شیخ علیؒ کا تقویٰ کہاں اور میرا مکان کہاں۔"

کارِ عشق و محبت میراث نہیں ہوتا

ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ ایک پیرِ طریقت کے انتقال کے بعد عموماً اس کے فرزندوں اور خلفاء میں ٹھن جاتی ہے۔ فرزند یہ سمجھتے ہیں کہ صرف انہیں ہی اپنے والد کی مسند پر بیٹھنے کا حق حاصل ہے اور خلفاء یہ سمجھتے ہیں کہ فقر و معرفت میراث نہیں جو باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہو۔

مخدوم اخی جمشید راجگیریؒ کے ملفوظات میں درج ہے کہ ایک شیخ کے سات بیٹے تھے اور وہ سب کے سب جادۂ شریعت پر گامزن اور اوصافِ حمیدہ سے متصف تھے۔ جب ان کے والد کے انتقال کا وقت قریب آیا تو انہوں نے پوچھا کہ اس کا جانشین کون ہو گا؟ باپ نے کہا کہ وہ اس امانت کا امین ہے' اس لئے اگر کسی غیر مستحق کو سجادہ پر بٹھائے گا' تو وہ عنداللہ خائن ہو گا۔ شیخ نے کہا کہ اس شہر میں ایک ہندو غلام ہے جو آب کاری کا کام کرتا ہے اسے بلا لائیں۔ بیٹے اس غلام کو اس کے مالک سے خرید لائے۔ شیخ نے اسے مشرف باسلام کر کے اپنا سجادہ اس کے حوالے کیا۔ جب بیٹوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو شیخ نے کہا کہ اگر باپ مرتے وقت مال چھوڑے تو بیٹے وارث ہوتے ہیں لیکن "کارِ عشق و محبت" میراث نہیں ہوتا[1]

شیخ محمد غوث گوالیریؒ کے نو فرزند تھے لیکن ان کے رُوحانی جانشین شیخ وجیہہ الدینؒ ہوئے۔ جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ انہیں بھی اپنے پیر زادوں سے کافی تکالیف پہنچی تھیں[2]

تقسیمِ کار

شیخ وجیہہ الدینؒ نے ایک بار حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا:

علماء حفظِ ملک .بسپاہیاں گزاشتند و خود بتدریس مشغول شدند' زیرا کہ تحفظِ ملک	علماء نے ملک کی حفاظت سپاہیوں پر چھوڑ دی ہے اور خود تدریس میں مشغول ہو گئے

۱۔ یحییٰ بن علی اصغر' ملفوظاتِ اخی جمشید راجگیری' مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ' یونیورسٹی گلشن' فارسیہ مذہب ۴ ر ۲۲ ورق ۵۹ ب۔

۲۔ شیخ محمد' ملفوظاتِ شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی' ورق ۳ الف۔

خلل در تدریس است ہمچنان صوفیاں را باید کہ تدریس بہ علماء گزارند۔ البتہ توجہ بتدریس در سیر باطن بغایت مخل است۔ درین شکی نیست[1]

ہیں کیونکہ ملک کی حفاظت کرنے سے تدریس میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح صوفیوں کو چاہئے کہ تدریس علماء پر چھوڑ دیں کیونکہ تدریس کی طرف توجہ سے سیر باطن میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

شیخ عبدالحق محدثؒ سے روابط

۱۵۸۵ء میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ حج کے ارادے سے مکہ جانے کے لئے گجرات پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ حاجیوں کے جہاز روانہ ہو چکے ہیں اس لئے اگلے موسم حج تک انتظار کرنا ہو گا۔ شیخ موصوف نے یہ عرصہ مانڈو اور احمد آباد میں گزارا۔ احمد آباد میں قیام کے دوران میں موصوف اکثر شیخ وجیہہ الدینؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوتے اور کسب فیض کرتے رہے[2]

عبدالرحیم خانخانان سے تعلقات

عبدالرحیم خانخانان ۱۵۸۵ء سے ۱۵۸۹ء تک گجرات کا صوبہ دار رہا۔ وہ اکثر شیخ وجیہہ الدینؒ سے ملتا رہتا تھا اور اس نے شیخ موصوف کی سفارش پر متعدد علماء اور فضلاء کے وظائف مقرر کر دیے تھے[3]

جہانگیر کی عقیدت

جہانگیر نے اپنے بارھویں سال جلوس (۱۶۱۷ء) میں گجرات کا دورہ کیا۔ ایک روز وہ بڑی عقیدت کے ساتھ شیخ وجیہہ الدینؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ جہانگیر اس حاضری کے بارے میں لکھتا ہے کہ شیخ موصوف کا مزار اس کی رہائش گاہ سے قریب صحن خانقاہ میں واقع ہے۔ موصوف شیخ محمد غوثؒ کے خلیفہ تھے لیکن ایسے خلیفہ جس کی خلافت مرشد کے لئے باعث فخر ہو۔

۱۔ ایضاً" ورق ۹ الف۔

۲۔ خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۳ء ص ۹۶ - ۹۷۔

۳۔ عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء ج ۳، ص ۱۸۔

شیخ محمد غوثؒ سے شیخ وجیہہ الدینؒ کی ارادت شیخ محمد غوثؒ کی بزرگی کی ایک روشن دلیل ہے[۱]

حضرت محمد شاہؒ کی عقیدت

احمد آباد کے مشہور ولی اللہ سید محمد شاہؒ (م ۱۷۵۰ء) کو شیخ وجیہہ الدینؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ ابتدائے سلوک میں انہوں نے ان کے مزار پر چلّہ بھی کیا تھا[۲] آخرِ عمر میں موصوف روزانہ ان کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتے تھے[۳] ان کا شاندار روضہ شیخ وجیہہ الدینؒ کے مزار سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ راقم الحروف نے ۱۷ جولائی ۱۹۶۸ء کو دونوں مزاروں کی زیارت کی ہے۔

وفات اور تدفین

شیخ وجیہہ الدینؒ محرم الحرام کے آخری دن ۹۹۸ھ / ۱۵۸۸ء میں فوت ہوئے۔ "شیخ وجیہہ دین" سے سالِ وفات برآمد ہوتا ہے[۴] موصوف اپنے مدرسے کے صحن میں دفن ہوئے۔ گجرات کے گورنر نواب مرتضیٰ خانؒ (۱۶۰۶ء- ۱۶۰۹ء) نے ان کے مزار کا چھپر کھٹ تعمیر کروایا جس پر سیپ کا نہایت اعلیٰ درجے کا کام ہوا ہے[۵] خانقاہ کی عمارات اکبر کے ایک امیر صادق خاں نے بنوائیں[۶] فنّی اعتبار سے شیخ وجیہہ الدینؒ کا مقبرہ بڑا خوب صُورت ہے اور خاص طور پر اس کی جالیاں دیکھنے کے لائق ہیں[۷]

رُوحانی جانشین

شیخ وجیہہ الدینؒ کے خلفاء میں سے شیخ صبغتہ اللہ بھڑوچیؒ نے بڑا نام پایا۔ احمد آباد کے سلاطین ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے[۸] موصوف برِعظیم سے ترکِ سکونت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے جبل اُحد پر سکونت اختیار کی۔ دیارِ حبیبؐ میں قیام کے دوران میں شیخ صبغتہ اللہ نے اپنے دادا مرشد حضرت محمد غوث گوالیریؒ کی مشہور تصنیف جواہر خمسہ کا عربی میں ترجمہ کیا[۹] ان کی سب سے بڑی خدمت حرمین شریفین میں شطاریہ سلسلے کی ترویج و اشاعت ہے۔

۱ - جہانگیر، تزکِ جہانگیری، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲۔

۲ - ابوظفر ندوی، تذکرۂ اقدس، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء، ص ۱۹۔

۳ - محمد اسلم، تاریخی مقالات، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۸۶۔

۴ - علی محمد خان، مرأتِ احمدی، مطبوعہ بڑودہ ۱۹۳۰ء، ضمیمہ، ص ۲۰۔

۵ - محمد اکرام، رودِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۹۳۔

۶ - جہانگیر، تزکِ جہانگیری، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۱۔

۷ - گزیٹیئر بمبئی پریذیڈنسی، مطبوعہ بمبئی ۱۸۷۹ء، ص ۲۷۸۔

۸ - آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ، ص ۴۶۔

۹ - [illegible]

سلطانِ ترکی نے ان کے زہد و ورع اور علم و فضل کی شہرت سن کر انہیں قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی، لیکن شیخ موصوف نے دیارِ رسولؐ کو چھوڑنا پسند نہیں فرمایا۔ شیخ صبغتہ اللہ نے ۱۶۰۷ء میں مدینہ طیبّہ میں وفات پائی[۱]

علمی جانشین

شیخ وجیہہ الدینؒ کے ایک نامور شاگرد شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوریؒ تھے۔ شیخ فضل اللہ کا شمار برہان پور کے اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ اس دیار میں موصوف "نائبِ رسولؐ" کے لقب سے مشہور ہیں۔

شیخ محمد ۱۵۴۵ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت ان کے والدِ بزرگوار نے کی اور دینی تعلیم شیخ وجیہہ الدینؒ کی خدمت میں رہ کر حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد موصوف حجاز چلے گئے جہاں اس زمانے میں شیخ علی متقیؒ کی علمی شہرت کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بج رہا تھا۔ حجاز میں قیام کے دوران میں شیخ محمد نے شیخ علی متقیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے حدیث کی سند لی[۲]

حرمین شریفین سے واپسی پر شیخ محمد نے برہان پور میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا لیکن کچھ عرصہ بعد اسے ترک کر کے خود کو عوام کی رشد و ہدایت کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے -- التحفتہ الرسلتہ اِلی النبی-- کے عنوان سے ایک مایۂ ناز کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا انڈونیشی اور ملائی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ شیخ موصوف نے خود ہی اس کی ایک شرح -- الحقیقتہ الموافقتہ الشریعتہ-- کے عنوان سے قلمبند کی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے[۳]

شیخ محمد بن فضل اللہ کا انتقال ۱۶۲۰ء میں ہوا۔

سجادگی

شیخ وجیہہ الدینؒ کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے خلف الرشید شیخ عبداللہ علوی مسندِ ارشاد پر بیٹھے لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند شیخ اسد اللہ نے مسندِ ارشاد کو زینت بخشی لیکن وہ بھی جلد ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جب

---

۱ - محمد اکرام، رودِ کوثر، ص ۳۹۵۔

۲ - ایضاً۔

۳ - ایوانوف، فہرست مخطوطات فارسی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء، مخطوطہ (۳) ۳۲۸ عربی۔

۱۶۱۷ء میں جہانگیر احمد آباد آیا تو اس وقت شیخ اسد اللہ کے بھائی شیخ حیدر سجادہ نشین تھے۔ جہانگیر ان سے مل کر بڑا خوش ہوا اور اس نے ان کی سیرت و کردار کی بڑی تعریف کی ہے[1]

✪✪✪

۱۔ جہانگیر، تزک جہانگیری، ص ۲۱۸

مراۃِ طیبہ

مراۃ طیبہ کے عنوان سے ۱۲۳ ورق کا ایک نادر مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے[1]۔ مجھے کافی عرصہ سے اس مخطوطہ کو دیکھنے کی آرزو تھی اور بالاخر ۱۳ اگست ۱۹۷۸ء کو جناب اکبر علی خان عرشی زادہ کی کرم فرمائی سے راقم السطور کو اس کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ یہ مطلا و منقش مخطوطہ فارسی زبان کے مروجہ خط نستعلیق کی بجائے نسخ میں لکھا گیا ہے۔ اس کی ورق گردانی کے دوران میں یہ معلوم ہوا کہ کاتب نے اسے کسی پرانے نسخے سے نقل کیا ہے اور اس نے اصل نسخے کے دو ورق تبرکاً محفوظ کر لئے ہیں، عین ممکن ہے کہ پرانا نسخہ فاضل مصنف کے ہاتھ ہی کا تحریر کردہ ہو۔

مصنّف

فاضل مصنف نے اپنا نام مراۃ طیبہ کے متن میں ابو ضیاء محمد معین الدین بن حضرت قدوۃ الواصلین زبدۃ العارفین الواصل الی اللہ الودود خواجہ خاوند محمود العطاری النقشبندی العلوی الحسینی تحریر کیا ہے[2]۔ موصوف لاہور کے مشہور نقشبندی بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشاںؒ کے فرزند تھے۔ ان کا شمار شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے[3]۔ حدیث اور متعلقہ علوم پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ فاضل مصنف اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ مراۃ طیبہ کی تصنیف کے وقت ۱۰۶۳ھ تک طلبہ کو چھ بار صحیح بخاری اور صحیح مسلم، تین بار سنن ترمذی اور آٹھ بار مشکوٰۃ شریف ختم کرا چکے ہیں[4]۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے خود کو حدیث کے درس و اشاعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔

خواجہ معین الدین کی زندگی کا بیشتر حصہ سری نگر میں اپنے والدِ بزرگوار کی تعمیر کردہ خانقاہ میں گزرا اور وہیں انہوں نے ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء میں وفات پائی[5]۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مریؒ رقم

---

۱ - معین الدین، مرآۃ طیبہ، مخطوطہ رضا لائبریری رام پور، نمبر فارسی ۲۷۹۔

۲ - ایضاً ورق ۲ ب۔

۳ - عبدالحی لکھنوی، نزہتہ الخواطر، مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۵۵ء، ج ۵، ص ۳۰۶۔

۴ - معین الدین، مرآۃ طیبہ، ورق ۱۲۱ ب۔

۵ - مفتی غلام سرور، حدیقتہ الاولیاء، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۳۶۔

طراز ہیں کہ وفات کے وقت ان کی عمر ستر برس سے متجاوز تھی[۱] ان کے تین بڑے فرزند ان کی زندگی ہی میں رحلت کر گئے تھے۔ اس لئے خواجہ صاحب کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ نے کمسن بچوں کی پرورش کے علاوہ خانقاہ کی دیکھ بھال بھی اپنے ذمہ لے لی[۲]

وادیٔ کشمیر میں نقشبندیہ سلسلہ کی ترویج میں خواجہ معین الدینؒ کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ انہوں نے کشمیری مسلمانوں میں اتباعِ شریعت کا جذبہ پیدا کیا اور بدعات کے خاتمہ میں بڑی سرگرمی دکھائی[۳] موصوف اپنے ورع و تقویٰ کی وجہ سے اپنے ہم عصر علماء و صلحاء میں بڑے مقبول تھے[۴] ان کے احوال و آثار پر قاضی محمد عمران کا ایک فاضلانہ مضمون ماہنامہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکا ہے[۵]

خواجہ معین الدینؒ نے چھوٹی بڑی نو کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے زبدۃ التفاسیر، کتابِ رضوانی اور فتاویٰ نقشبندیہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ خواجہ صاحب کے بعض سوانح نگاروں نے ان کی تصانیف میں مقاماتِ محمودیہ یا کتابِ محمودیہ کو بھی شامل کیا ہے[۶] یہ صحیح نہیں۔ مقاماتِ محمودیہ دراصل مرأۃ طیبہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ انڈیا آفس لائبریری لندن کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ایتھے نے بھی مقاماتِ محمودیہ اور مرأۃ طیبہ کو ایک ہی کتاب تسلیم کیا ہے[۷] اس کتاب کا اصل نام "مقاماتِ محمودیہ" ہے اور فاضل مصنف نے خود ہی اس کا تاریخی نام مرأۃ طیبہ لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں اس گتھی کو یوں سلجھایا ہے:

لو طلبت تاریخ تالیف مقاماتِ محمودیہ
لو وجدت تاریخہ فی مرأۃِ طیبہ[۸]

---

۱ - محمد اعظم دیدہ مری، تاریخ کشمیر اعظمی، طابع غلام محمد نور محمد تاجران کتب سری نگر، ص ۱۶۹۔

۲ - محمد حسن، تاریخ حسن، مطبوعہ سری نگر ۱۹۶۰ء، ج ۳، ص ۶۸۔

۳ - محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء، ج ۴، حصہ ۲، ص ۲۷۶۔

۴ - رحمن علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۲۲۹۔
متبع شریعت و مروّج شریعت و قامع البدعت بود و در زہد و ورع بے نظیر مقبول علمای و صلحای وقت بود۔

۵ - قاضی محمد عمران خان، ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، بابت ماہ مارچ ۱۹۶۸ء

۶ - مفتی غلام سرور، حدیقۃ الاولیاء، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۳۵۔ فٹ نوٹ محررۂ محمد اقبال مجددی۔

۷ - ایتھے، فہرست مخطوطات فارسی، انڈیا آفس لائبریری لندن، مخطوط نمبر ۱۸۹۵ ب۔

۸ - معین الدین، مرأۃ طیبہ، ورق ۴ الف۔

مرأۃ طیبہ کی اہمیت

مرأۃ طیبہ میں سولہویں صدی کے آغاز میں کشمیر اور وسطِ ایشیاء کی خانقہی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ حضرت ایشانؒ کے اسفار کے ضمن میں بہت سے علماء و مشائخ کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔ میری ناقص رائے میں حضرت ایشانؒ کے سوانح حیات کے مطالعہ اور اس عہد میں کشمیر اور ماوراء النہر کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لینے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

حضرت ایشانؒ کا حسب و نسب

مرأۃ طیبہ کے آٹھویں باب میں فاضل مصنّف نے اپنے والدِ بزرگوار کا حسب و نسب بیان کیا ہے۔ انہوں نے حضرت ایشانؒ کا شجرہ یوں درج کیا ہے۔

خواجہ خاوند محمود بن خواجہ میر سیّد شریف بن خواجہ ضیاء بن خواجہ میر محمد بن خواجہ تاج الدین حسین بن خواجہ حسین بن خواجہ علاء الدین عطارؒ[1] مؤخر الذکر بزرگ نقشبندیہ سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ (م ۱۳۸۹ء) کے داماد اور خلیفہ تھے اور ان کی رحلت کے بعد وہی ان کی مسند پر رونق افروز ہوئے تھے۔ حضرت ایشانؒ کے سوانح نگار جناب میاں اخلاق احمد نے اپنی تصنیف میں ان کا شجرہ یوں درج کیا ہے۔

سیّد خاوند محمود بن خواجہ میر سیّد شریف الدین بن خواجہ ضیاء الدین بن خواجہ میر محمد بن خواجہ علاء الدین حافظ بن خواجہ حسین بن علاء الدین عطارؒ[2] میاں صاحب نے یہ شجرہ غالباً کنز السعادت سے نقل کیا ہے اور پنجاب پبلک لائبریری کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار منظور احسن عباسی نے بھی کنز السعادت کے حوالے سے یہی شجرہ دیا ہے[3] اوّلاً اس شجرہ میں خواجہ تاج الدین حسین کا نام موجود نہیں۔ ثانیاً اس میں خواجہ میر محمد کے والد بزرگوار کا نام تاج الدین حسین کی بجائے علاء الدین حافظ لکھا ہے۔ اب مرأۃ طیبہ اور کنز السعادت دونوں ہی خواجہ معین الدینؒ کی تصانیف ہیں۔ اس لئے ان سے غلطی کا احتمال نہیں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسے سہو کتابت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مرأۃ طیبہ چونکہ ایک پرانے مخطوطہ سے نقل کی گئی ہے اس لئے اس میں درج شجرہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ ایضاً، ورق ۴۹ ب۔

۲۔ میاں اخلاق احمد، تذکرہ حضرت ایشانؒ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷، ۱۸

۳۔ منظور احسن عباسی، تفصیلی فہرست مخطوطات فارسیہ، پنجاب پبلک لائبریری مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۷۳۔

حضرت ایشاںؒ کی والدہ ماجدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزند محمد بن حنفیہؒ کی اولاد سے تھیں۔ خواجہ معین الدینؒ نے اپنی دادی کا شجرہ نسب یوں درج کیا ہے۔

والدۂ ماجدہ حضرت ایشاں بنت بابا میرک بن زین العابدین میرک بن صادق شیخ بن محمد باقی شیخ بن محمد قاسم شیخ بن خواجہ علی اتا بن خادم شیخ بن ابراہیم اتا بن خادم شیخ بن حضرت خواجہ احمد یسویؒ [1]

حضرت ایشاںؒ کی دادی صاحبہ میر نظام الدین علی کی صاحبزادی تھیں۔ میرِ موصوف صحیح النسب سیّد تھے اور میرزا بایسنغر کی سرکار میں صدر کے منصب پر فائز تھے۔ اسی طرح حضرت ایشاںؒ کے جدِ امجد خواجہ ضیاء کا نسب والدہ صاحبہ کی طرف سے امام ابو حفص عمر النسفیؒ (م ۱۱۴۲ء) سے جا ملتا ہے [2] یہ بزرگ اہلِ سنّت کے عقائد کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

حضرت ایشاںؒ ۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والدِ بزرگوار نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بخارا جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ خواجہ معین الدینؒ نے اس مدرسے کا نام نہیں لکھا لیکن حضرت ایشاںؒ کے سوانح نگار محترمی اخلاق احمد نے اس درسگاہ کا نام مدرسۂ سلطانیہ لکھا ہے [3]

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز وہ چند طالب علموں کے ساتھ بغرضِ سیر شہر سے باہر نکلے تو ان کے ساتھیوں نے انہیں بتایا کہ ایک بار عبداللہ خان اُزبک شکار کھیلنے گیا اس کے ساتھیوں میں خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی اولاد سے ایک شخص خواجہ عبدالهادی بطور ملازم اس کے ہمراہ تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے باوجود کوئی شکار ان کے ہاتھ نہ لگا عبداللہ خان کو اس بات کا بڑا رنج تھا۔ اتنے میں کلنگوں کا ایک غول ادھر آ نکلا۔ عبدالهادی نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ خواجہ نقشبندؒ کی برکت سے ایک کلنگ ضرور ان کے ہاتھ لگے گا۔ ادھر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ادھر ایک کلنگ غول سے جدا ہو کر عبداللہ خان کے سامنے آ گرا۔ جب خانِ مذکور نے عبدالهادی کی یہ کرامت دیکھی تو اسے اپنا مصاحب بنا کر اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

طالب علموں نے جب یہ قصہ ختم کیا تو اتنے میں فضا میں چند پرندے [4] نمودار ہوئے۔

---

۱ - معین الدین' مرأۃ طیبہ' ورق ۳۰ ب۔

۲ - معین الدین' مرأۃ طیبہ' ورق ۳۰ ب۔

۳ - میاں اخلاق احمد' تذکرہ حضرت ایشاں' ص ۱۸۔

۴ - خواجہ معین الدینؒ نے اس پرندے کا نام باغرقرہ لکھا ہے۔ مرأۃ طیبہ ورق ۴۳ ب۔

انہوں نے حضرت ایشاںؒ سے کہا کہ وہ بھی حضرت نقشبندؒ کی اولاد سے ہیں' اس لئے وہ بھی عبدالہادی کے الفاظ دہرائیں۔ حضرت ایشاںؒ نے خواجۂ بزرگ کی رُوح کی طرف توجہ کی اور ان میں سے ایک پرندہ پکڑا گیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر حضرت کے ساتھی ان کے معتقد ہوگئے لیکن حضرت خود ذہنی طور پر ایک عجیب مخمصے میں پھنس گئے[1]

حضرت ایشاںؒ کے زمانہ طالب علمی میں ایک روز ان کے والدِ بزرگوار نے ملّا جلال کیحکتنی سے کہا کہ وقت آنے پر ان کا بیٹا بہت بڑا آدمی ہوگا۔ اس نے کہا کہ وہ کیا بنے گا؟ ملّا یا درویش؟ انہوں نے کہا کہ وہ ملّا بھی بنے گا اور درویش بھی۔ اس نے کہا کہ ان کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ یہ بھی بنے گا اور وہ بھی۔ انہوں نے کہا کہ بچپن ہی سے اس کی عجیب حالت ہے۔ وہ کبھی یوسف زلیخا پڑھتا ہے اور کبھی مثنویٔ معنوی۔ اسے مطالعہ کا بڑا شوق ہے[2]

فاضل مصنّف اپنے والدِ بزرگوار کی زبانی تحریر فرماتے ہیں کہ نوجوانی کے ایّام میں جو بھی ان کے ساتھ بے ادبی سے پیش آتا' وہ مصیبت میں پھنس جاتا تھا۔ ایک روز حضرت ایشاںؒ وخش کے حاکم باقی بیگ ترکتانی کی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ اس نے ان کی شان میں گستاخی کی۔

باقی بیگ کی گستاخانہ بات سُن کر حضرت ایشاںؒ کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے غصہ کے عالم میں فرمایا۔

تا حال ہیچ مرد کی بینی و گوش خواجہ زادھا نبرید، است و امیدوارم ز بزرگان خود کہ بنی گوش ترا ببرند[3]	آج تک کسی شخص نے کسی خواجہ زادے کے ناک اور کان نہیں کاٹے۔ مجھے اپنے بزرگوں سے اُمید ہے کہ تمہارے ناک کان کاٹیں گے۔

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ ابھی ایک ہفتہ بھی گزرنے پایا تھا کہ عبداللہ خان اُزبک

---

۱ - خواجہ معین الدینؒ' مرآۃ طیبہ' ورق ۴۳ ب۔
۲ - ایضاً' ورق ۴۴ الف۔
۳ - ایضاً' ورق ۴۶ ب۔

کا میرشکار ادھر سے گزرا۔ وہ اپنے ساتھ شکاری جانور لے کر امیر بخارا کے پاس جا رہا تھا۔ اتفاق سے اس کے ایک باز نے کسی عورت کا برہ مار ڈالا۔ اس عورت نے باقی بیگ سے شکایت کی۔ اس نے میرشکار کو پکڑ لیا اور اسے جلادوں سے خوب پٹوایا۔ جب میر شکار بخارا پہنچا تو اپنے عبداللہ خان کو اپنے زخم دکھائے اور انصاف کی دہائی دی۔ عبداللہ خان نے فوراً دس سپاہی وخش روانہ کئے اور وہ باقی بیگ کو گرفتار کرکے بخارا لے گئے۔ خانِ مذکور نے اس کی ناک اور کان کٹوا کر اسے واپس وخش بھیج دیا۔ جب اہالیانِ وخش کو باقی بیگ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ اسے دیکھنے گئے۔ قاضیؒ وخش نے حضرت ایشاںؒ سے کہا کہ وہ بھی اس کی مزاج پرسی کو تشریف لے جائیں' شاید اسے اپنے کیے پر ندامت ہو۔ انہوں نے کہا کہ وہ اکیلے اس کے پاس جانا پسند نہیں کرتے' البتہ قاضی کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ایشاںؒ قاضیؒ موصوف کی معیت میں باقی بیگ سے ملے۔ ان کی واپسی کے بعد باقی بیگ نے حاضرینِ مجلس سے کہا کہ خواجہ صاحب اس سے ملنے نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے آئے تھے۔

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار باقی بیگ نے ان سے کہا کہ وہ ان کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ظلم و ستم پر کمر باندھی۔ جب حاکم بخارا عبداللہ خان کو علم ہوا تو اس نے باقی بیگ کو گرفتار کرکے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا[1]

آغاز سلوک

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ جب وہ بیس سال کے ہوئے تو ان کے والدِ بزرگوار نے "دہوی حصار" سے انہیں خط لکھا کہ ان کا وقتِ آخر ہے۔ اس لئے آخری بار ان سے مل لیں۔ حضرت ایشاںؒ خط ملتے ہی دہوی حصار کی طرف چل پڑے۔ لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے چند روز پہلے ان کے والدِ بزرگوار فوت ہو چکے تھے۔

حضرت ایشاںؒ نے والدِ بزرگوار کے ترکہ میں اپنے لئے کچھ نہ لیا اور اپنا حصہ اپنی بہنوں میں تقسیم کر دیا۔ دہوی حصار میں چند روز قیام کے بعد موصوف وخش چلے گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ ۹۹۴ھ کا واقعہ ہے[2]

---

۱ - ایضاً" ورق ۴۷ ب۔

۲ - خواجہ معین الدینؒ نے مرأتِ طیبہ میں اپنے والدِ بزرگوار کا سال ولادت درج نہیں کیا۔ اگر ۹۹۴ھ میں حضرت ایشاںؒ ۲۰ برس کے تھے تو ان کا سال ولادت ۹۷۴ھ تسلیم کرنا ہو گا۔ میاں اخلاق احمدؒ نے ان کا سال ولادت ۹۶۵ھ تحریر کیا ہے جو مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ وخش میں قیام کے دوران میں ہی بے خودی و بے شعوری کا آغاز ہوا اور موصوف نقشبندی سلسلہ کے ایک بزرگ قاضی ترسون سے ملنے بلخ تشریف لے گئے۔ اثنائے سفر ان کی ملاقات خواجہ میرزا بیگ سے ہوئی اور وہ انہیں اپنے گھر لے گیا۔ اتفاق سے قاضی ترسون بھی وہیں فروکش تھے اور سپاہیانہ وضع کے لوگ انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ حضرت ایشاںؒ انہیں نہ پہچان سکے اور انہوں نے حاضرین پر کئی قسم کے اعتراضات کئے۔ بعدازاں جب ان کا قاضی صاحب سے تعارف ہوا تو انہوں نے اپنی گستاخی پر معافی چاہی۔ اگلے روز حضرت ایشاںؒ قاضی ترسون سے دوبارہ ملے لیکن ان کی بعض باتیں انہیں ناگوار گزریں اور موصوف ان کی مجلس سے اٹھ کر ملّا اکبر شیرغانی المعروف بہ ابن یمین سے ملنے تشریف لے گئے۔ ملّا صاحب نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ بلخ میں قاضی ترسون سے مل کر آئے ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو ملّا صاحب نے کہا کہ وہ تو دیوانہ ہے اور دیوانے معذور ہوتے ہیں۔ حضرت ایشاںؒ ان کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ان سے بیعت کی التجا کی' لیکن انہوں نے بیعت نہ لی۔ ان کے اصرار پر وہ توجہ دینے پر آمادہ ہوئے۔ حضرت ایشاںؒ چار پانچ روز ان کی خدمت میں رہ کر وخش لوٹ گئے۔

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ وخش آنے کے بعد انہوں نے شیخ اللہ بردی کی مجلس میں بیٹھنا شروع کیا[1]۔ یہ بزرگ جمعہ کی نماز کے بعد ذکرِ جہر کیا کرتے تھے اور حضرت والا قدر بڑے ذوق و شوق سے محفلِ ذکر میں شرکت فرماتے۔ موصوف فرمایا کرتے تھے کہ انہیں ۲۳ برس کی عمر میں بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا چسکا پڑا تھا۔

قیامِ کشمیر

حضرت ایشاںؒ ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء میں سری نگر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے ایک عقیدت مند عوض بیگ سلمانی کی حویلی میں فروکش ہوئے۔ ان کی کشمیر میں آمد کے موقع پر ان کے ایک معتقد شاعر مشربی نے ان الفاظ میں عقیدت کا اظہار کیا:

آب و نانم نیست جزخون دل و لختِ جگر
چوں کنم جان عزیزی برسرم مہمان رسید
ہست جای شادمانی زانکہ درکشمیریاں
قطبِ حق پیرِ خلایق مرشدِ دوران رسید

۱- خواجہ معین الدینؒ' مرآۃ طیبہ' ورق ۴۵ ب۔

خواجہ والا گہر خاوند محمود آنکہ فیض
از وجودش ظاہر و باطن مشتاقان رسیدلہ

کشمیر میں آمد کے بعد انہوں نے اپنے قیام اور مریدوں کی تربیت کے لئے سری نگر میں ایک عالیشان خانقاہ تعمیر کروائی جو تا حال موجود ہے۔ جب خانقاہ کی عمارات مکمل ہوئیں تو زبدۃ الشعراء مولانا ذہنی نے "خانقاہی عجیب لطیف آمد" سے اس کی تاریخ نکالی۲ے

خواجہ معین الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ خانقاہ میں قیام کے دوران میں اکابرینِ کشمیر حضرتِ والا قدر کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان کے کشمیری معتقدین میں ملّا عثمان متو، شمس گنائی، حاجی طوسی، محمد جان بیگ، ملّا ابراہیم رضوی کشمیری، ملّا عبدالنبی، ملّا عبداللہ غازی اور عبداللہ بیگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات سے اکثر کشمیر کی سیاست پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ایشاںؒ کو کشمیر کی سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ خواجہ معین الدینؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار کشمیر کا حاکم حسین بیگ گرفتار ہوا تو لوگوں نے اس کی رہائی کے لئے ان کے والدِ بزرگوار سے درخواست کی اور ان کی دُعا سے اسے رہائی ملی۳ے

مصیبت میں عوام کا ساتھ

حضرت ایشاںؒ کی کرامات کے ضمن میں ان کے فرزند خواجہ معین الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک بار ان کے والدِ بزرگوار اپنے ایک مرید خواجہ حاجی باندھے کشمیری کے ہاں قیام پذیر تھے۔ حاضرینِ محفل میں سے کسی نے ان سے کہا کہ موسمِ سرما خشک جا رہا ہے اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے غلہ مہنگا ہوگیا ہے۔ اس کی درخواست پر حضرت ایشاںؒ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر بارش کے لئے دعا کی۔ فاضل مصنّف لکھتے ہیں کہ محفل برخاست ہونے سے پہلے آسمان پر بادل چھاگئے اور جب حضرتِ والا قدر وہاں سے اٹھ کر قلعہ آروَن کی طرف روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ ان کے ساتھیوں نے کہا کہ راستے میں نشیب و فراز زیادہ ہیں اور اگر بارش تیز ہوگئی تو چلنا مشکل ہو جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر بارش میں بھیگ بھی گئے تو تشویش کی کوئی بات نہیں۔ قحط سالی کی وجہ سے اس ملک میں مسلمان عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔۴ے

۱ - مشربی، قصائد مشربی، مخطوط بمبئی یونیورسٹی لائبریری، نمبر فارسی ۲۲، ورق ۲۱ ب۔
۲ - خواجہ معین الدینؒ، مرآۃ طیبہ، ورق ۷۴ ب۔
اس مصرع سے ۱۰۴۳ھ برآمد ہوتا ہے۔
۳ - ایضاً، ورق ۷۸ ب۔
۴ - ایضاً، ورق ۵۶ ب۔

قیام آگرہ

اکبر کے آخری ایام حکومت میں حضرت ایشاںؒ آگرہ تشریف لے گئے۔ آگرہ میں لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت سے افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ خواجہ عبدالرحیم نقشبندی' شاہ یحیٰ اور صوفی شامان نے درجہ نیابت پایا اور حضرت ایشاںؒ نے اپنے مریدوں کو خلافت عطاء فرمائی۔

ایک روز اکبر کی اہلیہ سلیمہ سلطان بیگم انکی زیارت کے لئے آئی۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ اکبر عنقریب ہی مرنے والا ہے۔ سلیمہ سلطان نے عرض کیا کہ کیا حضرت انہیں یتیم کرنے آئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ شہزادہ سلیم کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔ اس ملاقات کے چند روز بعد اکبر کا انتقال ہوا اور شہزادہ سلیم اس کا جانشین ہوا۔١

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد جن دنوں حضرت ایشاںؒ سکندرہ کی ایک سرائے میں مقیم تھے' سلیمہ سلطان بیگم دوبارہ ان سے ملنے آئی۔ اس کی استدعا پر موصوف نے آگرہ میں اس کے محل میں قیام فرمایا۔٢ انہی ایام میں سلیمہ سلطان کی والدہ شہزادی گلرخ بیگم بھی حضرت ایشاںؒ سے ملی۔ ایک بار گلرخ بیگم نے اپنے ہاتھ سے کپڑے سی کر حضرت والا کی خدمت میں پیش کئے۔ ان کے ساتھ شہزادی کی عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کپڑے سینے وقت اس نے ہر ٹانکے پر کلمۂ طیبہ پڑھا تھا۔٣ علاوہ اکثر ان کے لئے کھانا بھیجا کرتی تھی۔ آگرہ سے واپسی کے بعد سلیمہ سلطان بیگم کے ساتھ حضرت ایشاںؒ کی باقاعدہ خط و کتابت رہتی تھی۔٤

آگرہ میں قیام کے دوران میں ایک روز حضرت ایشاںؒ اکبر کے رضاعی بھائی خان اعظم میرزا عزیز کوکلتاش سے ملنے تشریف لے گئے۔ وہ خواجہ ناصر الدین عبیداللہ احرارؒ کے پوتے عبدالشہید کا مرید تھا۔ شاید اسی تعلق کی بناء پر حضرت ایشاںؒ اس سے ملنے گئے ہوں۔

---

١ - ایضاً" ورق ۱۴۳ الف۔

٢ - سلیمہ سلطان بیگم' بابر کی نواسی اور گلرخ بیگم کی بیٹی تھی۔ اس کا والد خواجہ زادہ نورالدین محمد' حضرت بہاء الدین نقشبندؒ کی اولاد سے تھا۔ یوں وہ حضرت ایشاںؒ کی قریبی رشتہ دار تھی۔ اسی بناء پر انہوں نے بیگم کی درخواست پر شاہی محل میں قیام فرمایا۔ سلیمہ سلطان بڑی سوجھ بوجھ والی خاتون تھی اور ملکی سیاست کو خوب سمجھتی تھی۔ اکبر کے آخری ایام حکومت میں جب شہزادہ سلیم نے الٰہ آباد میں علم بغاوت بلند کیا تو سلیمہ سلطان نے ہی درمیان میں پڑ کر باپ بیٹے میں صلح کرا دی تھی۔

٣ - ایضاً" ورق ۱۰۱ الف۔

٤ - ایضاً" ورق ۹۲ ب۔

ان ایام میں خان اعظم کے تعلقات اکبر سے کشیدہ تھے۔ اس لئے اکبر کے جاسوس اس کی مجلس میں ہر وقت موجود رہتے تھے[1] اس لئے کسی بھی موضوع پر کھل کر بات نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت ایشاںؒ نے اپنی گفتگو کو کشمیر پر اکبر کی فوج کشی اور باغیوں کی سرکوبی تک ہی محدود رکھا۔

آگرہ میں قیام کے دوران حضرت ایشاںؒ کی ملاقات سعید خان سے ہوئی۔ وہ ان دنوں ڈھائی ہزاری منصب پر فائز تھا۔ حضرت نے اسے ترقی کا مژدہ سنایا اور چند روز بعد وہ کابل کا گورنر مقرر ہوا[2]۔

خسرو کی بغاوت

حضرت ایشاںؒ نے آگرہ کے شاہی محلات میں چند روز مہمان کی حیثیت سے قیام کیا۔ ایک روز انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ عنقریب ہی آگرہ میں ایک فتنہ سر اٹھانے والا ہے، اس لئے جس قدر جلد ممکن ہو وہاں سے چلے جانا چاہئے۔ حضرت نے جہانگیر سے اجازت طلب کی اور لاہور روانہ ہوگئے[3]۔ ان کی آگرہ سے روانگی کے بعد شہزادہ خسرو نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ پنجاب کی طرف بھاگ نکلا۔ جہانگیر نے اس کا تعاقب کیا اور اس ہنگامے میں بہت سے لوگ مارے گئے[4]۔ ایک روز خسرو لاہور میں حضرت ایشاںؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی کامیابی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی درخواست کی[5]۔ حضرت والا نے خسرو کو مخاطب کر کے فرمایا:

ما فاتحہ مخالف بزرگان خود نمیتوانیم خواند و این قدر میخواہم کہ ہر کہ نیت خیریت و خالصاً للہ باشد بادشاہی را سزاوار او باشد	ہم اپنے بزرگوں کے طریقے کے خلاف فاتحہ نہیں پڑھتے۔ میں صرف اسی قدر کہوں گا کہ جس کی نیت اچھی ہے اور وہ محض

۱ - ایضاً" ورق ۶۳ الف۔
۲ - ایضاً" ورق ۶۳ ب۔
۳ - ایضاً" ورق ۶۷ ب۔
۴ - ایضاً" ورق ۶۷ ب۔
۵ - یہ واقعہ خسرو کے کسی سوانح نگار نے بیان نہیں کیا۔ حضرت ایشاںؒ نے اس موقع پر بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ اگر وہ خسرو کی حمایت کرتے تو ان کا حشر بھی گورو ارجن دیو جیسا ہوتا۔

دگر نہ لے | اللہ کے لئے کام کرنا چاہتا ہے، وہی بادشاہ بننے کے لائق ہے۔

حضرت ایشاںؒ کی یہ بات سن کر خسرو کے ایک مصاحب نے کہا کہ موصوف اپنے بزرگوں کے طریقے پر ہی دُعا کریں۔ حضرتِ والا نے کوئی جواب نہ دیا اور جب شہزادہ چلا گیا تو انہوں نے حاضرینِ مجلس سے کہا "یقین است کہ سلطان بادشاہ نمیشود۔" اس واقعہ کے دو تین روز بعد خسرو نے لاہور سے باہر نکل کر شاہی لشکر کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ وہ جان بچانے کے لئے بھاگا لیکن دریائے چناب کے کنارے پکڑا گیا۔[۲]

خسرو کی شکست اور گرفتاری میں شیخ فرید بخشی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جہانگیر نے شیخ موصوف کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں مرتضیٰ خان کا خطاب اور گجرات کی صوبیداری عطا کی۔[۳] شیخ موصوف نے خسرو کو موضع بھیروال میں گرفتار کیا تھا۔ جہانگیر نے یہ موضع بھی شیخ فرید کو بخش دیا[۴] کہ خسرو کی شکست اور گرفتاری سے جہانگیر کا تاج و تخت محفوظ ہوگیا۔ اس لئے وہ شیخ فرید کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کے خیمہ تک گیا اور فرطِ محبت سے انہیں آغوش میں لے لیا۔ جہانگیر نے ایک رات ان کے خیمہ میں گزار کر ان کی عزت بڑھائی۔[۵] جہانگیر کے لاہور میں قیام کے دوران میں حضرت ایشاںؒ کے ساتھ اس کی ملاقات کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔

درباری امراء سے روابط

مرآۃ طیبہ کے آخری حصے میں بہت سے سیاسی واقعات درج ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ایشاںؒ نقشبندی بزرگوں کی روش کے مطابق سیاسی اُمور میں دلچسپی لیتے تھے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرح درباری امراء کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے۔

خواجہ معین الدینؒ رقم طراز ہیں کہ خانِ دوران اور قلیچ خان کے درمیان کافی عرصہ سے نزاع چلی آرہی تھی۔ بادشاہ نے کئی بار ان میں صلح کرانے کی کوشش کی اور خواجۂ جہان اور رام داس کو ان کے باہمی جھگڑے چکانے پر مامور کیا لیکن اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ

---

۱ ۔ خواجہ معین الدینؒ، مرآۃ طیبہ، ورق ۶۸ الف۔
۲ ۔ ایضاً، ورق ۶۸ ب۔
۳ ۔ شاہنواز خان، مآثر الامراء، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء، ج ۲، ۳۷۰۔
۴ ۔ جہانگیر، تزکِ جہانگیری، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۳۲۔
۵ ۔ معتمد خان، اقبال نامۂ جہانگیری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۱۳۔

نکلا- جب حضرت ایشاںؒ کو اس صورت حال کا علم ہوا تو موصوف پشاور تشریف لے گئے اور ان دونوں کی صلح کروا دی۔[1]

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ خانِ دوران حضرت والا کا معتقد تھا اور اس نے ایک بار کوئی علاقہ فتح کیا تو کامیابی کی خوشی میں دس ہزار روپے، یکصد بھیڑیں اور پانچ خروار غلہ حضرت ایشاںؒ کی خدمت میں بطورِ نذر پیش کیا۔[2]

جہانگیر کے حضور میں

جہانگیر کے دربار میں ایک ایسا گروہ موجود تھا جو لگائی بجھائی کرکے اسے بزرگوں سے بدظن کرتا رہتا تھا- انہی لوگوں نے اسے حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ سے برگشتہ کیا تھا[3] انہی فتنہ پردازوں نے ایک بار حضرت ایشاںؒ کے خلاف جہانگیر کے کان بھرے اور اس نے جوابدہی کے لئے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا- اس وقت وہاں خواجہ ابوالحسن تربتی، خواجۂ جہاں اور خانِ اعظم بھی موجود تھے- جہانگیر نے انہیں مخاطب کر کے کہا:"اے خواجہ تو میخواہی کہ مرید ما را مرید خود سازی؟" انہوں نے جواب دیا "غلط رسانیدند- فقیر ہم مرید بادشاہم"۔ بادشاہ نے کہا :"چطور تو مرید مائی؟ حضرت ایشاںؒ نے جواب دیا کہ مرید ہونے کے دو طریقے ہیں- وہ بادشاہ کے شرعی مرید ہیں- وہ یوں کہ قرآن مجید میں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کا حکم آیا ہے- اس لئے وہ اولی الامر کے تابع فرمان ہیں- جہانگیر ان کے جواب سے خوش ہوا اور اس نے ایک خلعت اور ۲۵ ہزار روپے ان کی خدمت میں پیش کرکے انہیں لاہور جانے کی اجازت دے دی- خواجہ معین الدینؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ایشاںؒ نے اس رقم میں سے تیئس ہزار روپے لاہور پہنچتے پہنچتے راستے میں خرچ کر ڈالے۔[4]

شمالی کشمیر اور تبت میں تبلیغِ اسلام

حضرت ایشاںؒ نے شمالی کشمیر اور تبت میں اسلام کی تبلیغ کی طرف خصوصی توجہ دی اور اپنے مرید ملّا ابوالحسن کو ان علاقوں میں اسلام کی تبلیغ اور سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج کے لئے روانہ کیا- حضرت ایشاںؒ نے اسے رخصت کرتے وقت فرمایا کہ وہاں جا کر نقشبندیہ سلسلہ کے

---

۱ - خواجہ معین الدینؒ، مرآۃ طیبہ، ورق ۱۰۵ ب۔

۲ - ایضاً" ورق ۱۰۷ ب۔

۳ - محمد مراد، مناقب الحضرات، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، نمبر ۱ - تھے ۶۵۲، ورق ۱۷۰ ب۔

۴ - خواجہ معین الدینؒ، مرآۃ طیبہ، ورق ۹۳ ب۔

اکابرین کے روش اختیار کرے۔ [1] ان علاقوں میں اسماعیلی داعیوں اور خصوصاً شمس سبزواری کی سعی و تبلیغ سے اسماعیلی مذہب کو بڑا فروغ ہوا تھا[2] اور آج بھی گلگت اور ہنزہ میں اسماعیلی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ خواجہ معین الدینؒ لکھتے ہیں کہ ان علاقوں میں بسنے والوں کو سُنّی مذہب کا نام سننا بھی گوارا نہ تھا۔ چہ جائیکہ وہ سُنّی مذہب اختیار کرتے۔ تاہم ملّا ابوالحسن نے اپنا کام جاری رکھا اور اس نے ابدال خان نامی ایک شخص کو مرید کرکے مؤذن مقرر کیا۔ ملّا صاحب کی سعی و کاوش سے وہاں نمازِ باجماعت ہونے لگی اور جمعہ کے خطبہ میں خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی پڑھے جانے لگے۔ فاضل مصنف اس پر گواہ ہیں کہ ملّا ابوالحسن کو ان علاقوں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔[3]

قاضی نورالدین خاقانی

خواجہ معین الدینؒ لکھتے ہیں کہ لاہور کے قاضی نورالدین کا شمار اس عہد کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔ انہوں نے "اخلاقِ جہانگیری" کے عنوان سے اخلاقیات کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس کتاب کے ابھی تک دو ہی مخطوطے دریافت ہوئے ہیں جن میں سے ایک مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن[4] میں اور دوسرا ٹونک (راجستھان) میں ایک علم دوست بزرگ صاحبزادہ محمد مصطفیٰ خان جوہر کے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے۔[5]

قاضی نورالدین ہرات کے مشہور واعظ معین الدین مسکین صاحبِ معارج النبوۃ کے پوتے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کا دیوان خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے نام سے چھپ چکا ہے۔[6] حافظ محمود شیرانی نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ خواجۂ بزرگ کے نام سے جو "دیوانِ معین" چھپا ہے وہ دراصل معین الواعظ ہروی کا کلام ہے۔[7]

---

۱ - ایضاً" ورق ۸۳ ب۔
۲ - (i) آرنلڈ' ٹی' ڈبلیو' پریچنگ آف اسلام (انگریزی)، مطبوعہ لاہور' چوتھا ایڈیشن' ص ۲۹۱۔
(ii) علی محمد جان محمد چنارا، نور مبین حبل اللہ المتین' مطبوعہ سندھی پرنٹنگ پریس' بمبئی' ص ۳۸۲۔
۳ - خواجہ معین الدینؒ' مرأۃ طیبہ' ورق ۸۳ ب۔
۴ - نور الدین خاقانی' اخلاق جہانگیری' مخطوطہ انڈیا آفس لندن' نمبر ا یتھے ۲۰۷۔
۵ - ماہنامہ معارف' اعظم گڑھ' بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء۔
۶ - دیوان خواجہ معین الدینؒ' مطبوعہ نو لکشور لکھنؤ ۱۹۰۰ء۔
۷ - مقالاتِ حافظ محمود شیرانی' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء' ج ۶' ص ۱۷۱-۱۹۳۔

حافظ محمود شیرانی نے جب یہ مضمون لکھا اس وقت "اخلاقِ جہانگیری" ان کے پیش نظر نہیں تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ٹونک میں رہتے ہوئے حافظ صاحب "اخلاقِ جہانگیری" کا مطالعہ نہ کرسکے۔ اگر انہیں اس کتاب کو دیکھنے کا موقع ملتا تو ان کے مضمون کی صورت ہی مختلف ہوتی۔ قاضی نورالدین نے "اخلاقِ جہانگیری" میں اپنے دادا کی درجنوں غزلیں درج ہیں جو اب دیوانِ خواجہ معین الدین اجمیریؒ میں شامل ہیں۔

سلسلۂ نقشبندیہ

حضرت ایشانؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں سالک کو شیخ کی صحبت اختیار کرنی چاہئے اور نمازِ عصر کے بعد اپنے دن بھر کے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہئے کہ اس نے صبح سے اب تک کیا کیا ہے اور کتنے نفس گم کئے ہیں[۱] اسی ضمن میں مخدوم شاہ مینا لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ سالک کو بنئے کا طریقہ اپنانا چاہئے۔ وہ دن بھر سودا بیچتا ہے اور رات کو حساب کرتا ہے کہ آج کتنا نفع یا نقصان ہوا ہے۔ اگر اسے نفع ہوا ہو تو وہ رات کو اطمینان کے ساتھ سوتا ہے اور نقصان کی صورت میں اسے فکر میں نیند نہیں آتی۔[۲]

حضرت ایشانؒ فرماتے ہیں کہ طالبِ مولیٰ کو چاہئے کہ دن میں ستر بار استغفار پڑھے اور نمازِ عصر سے مغرب تک ذکر و فکر میں مصروف رہے۔ اس دوران میں وہ دنیاوی باتوں سے احتراز کرے۔

حضرت ایشانؒ فرمایا کرتے تھے کہ نقشبندیہ سلسلہ کے چار اُصول ہیں۔ یادداشت، نگاہداشت، خلوت درانجمن اور سفر در وطن۔ سالک کو چاہئے کہ وہ ان اُصولوں پر کاربند رہے۔[۳] نقشبندیہ سلسلہ کے ایک جلیل القدر شیخ حضرت ناصرالدین عبید اللہ احرارؒ فرماتے ہیں کہ نقشبندیہ سلسلہ کی بنیاد چار اُصولوں پر ہے۔ وہ اُصول یہ ہیں: ہوش بر دَم، نظر بر قدم، سفر در وطن، خلوت در انجمن۔[۴] حضرت ایشانؒ نے انہی اُصولوں کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار فرمایا کرتے تھے کہ سالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ اس کے رسولؐ اور مخلوقِ خدا کے آداب ملحوظ رکھے، اور فرائض اوامر اور نواہی کو معطّل نہ کرے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کا یہ تقاضا ہے

۱۔ خواجہ معین الدینؒ، مرأۃ طیبہ، ورق ۷ ب۔

۲۔ سید محی الدین رضوی، ملفوظاتِ شاہ میناؒ، مطبوعہ مطبع مرقع عالم ہردوئی، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

۳۔ خواجہ معین الدینؒ، مرأۃ طیبہ، ورق ۸ ب۔

۴۔ ملفوظاتِ خواجہ عبید اللہ احرارؒ (مولفہ نامعلوم) مخطوطہ مملوکہ قریشی احمد حسین احمد، گجرات، ورق ۱۵۱ ب۔

کہ ان کی روش اور کوئی سنت ترک نہ کرے اور حلیہ شرعِ محمدی کے مطابق خود کو آراستہ کرے۔ مخلوق کے ادب سے یہ مراد ہے کہ سالک تمام موجودات کو خود سے افضل جانے۔ حضرت اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ ادب سیکھنے کے لئے طفلِ مکتب بن جاو[۱]

موصوف فرماتے ہیں کہ ہمارے خواجگان کا طریقہ صحابہ کرامؓ جیسا طریقہ ہے۔ صحابہ کرامؓ کی مثال نجوم کی سی ہے۔ اس لئے سالک کا قدم مجاہدہ، صحابہ کے صراطِ مستقیم پر ہونا چاہئے[۲]

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ سالک کو مراقبہ کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ لوگوں نے ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ سے پوچھا کہ انہوں نے مراقبہ کرنا کس سے سیکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس فن میں بلی ان کی اُستانی ہے۔ وہ اپنی پوری توجہ چوہا پکڑنے پر لگائے رکھتی ہے اس وقت اس کی حالت دیوار پر بنی ہوئی تصویر کی طرح ہوتی ہے[۳]

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ مریدوں کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کے اقوال و ملفوظات کا مطالعہ کیا کریں۔ کسی شخص نے سید الطائفہ جنید بغدادیؒ سے اس کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

کلمات المشائخ جند من جنود اللہ فی الارض یقوی بھا احوال المریدین و یزید شوق المشتاقین[۴]

بزرگوں کی باتیں اللہ کے لشکروں میں سے زمین پر ایک لشکر ہے۔ ان سے مریدوں کے احوال قوی ہوتے ہیں اور مشتاقین کا شوق بڑھتا ہے۔

حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار کسی نے خواجہ یوسف ہمدانیؒ سے پوچھا کہ جب بزرگ انتقال کر جائیں تو پھر لوگوں کو اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے کون سا عمل کرنا چاہئے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایسی صورت میں ان کے احوال و اقوال کے موضوع پر آٹھ ورق روزانہ پڑھنے چاہئیں[۵]

مفتیٔ کشمیر سے اختلاف

حضرت ایشاںؒ کے ہم عصروں میں مفتیٔ کشمیر ملّا یُوسُف "اعلمِ وقت" سمجھا جاتا تھا۔ ایک بار

---

۱ - خواجہ معین الدینؒ، مرأۃ طیبہ، ورق ۵ ب۔

۲ - ایضاً، ورق ۶ ب۔

۳ - ایضاً، ورق ۷ ب، ۳ الف۔

۴ - ایضاً، ورق ۴۳ الف۔

۵ - ایضاً، ورق ۲۹ ب۔

وہ حضرت سے ملنے آیا تو انہوں نے ایک فتویٰ لکھ کر اس پر مُہر تصدیق ثبت کرنے کی درخواست کی۔ مرأۃ طیبہ کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ مروّجہ قانون کے خلاف تھا۔ اس لئے مُلّا یوسف نے حاکمِ وقت کے خوف سے اس پر مُہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے غصہ کے عالم میں اس سے کہا "تم شریعت کے حکم پر حاکم کی مرضی کو ترجیح دیتے ہو۔ یہ کفر ہے۔ میری مجلس سے چلے جاؤ۔ میں آئندہ تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔"[۱]

حضرت ایشانؒ جلالی طبیعت کے مالک تھے۔ خواجہ معین الدینؒ رقمطراز ہیں کہ ان کے والد جب کسی سے ناراض ہوتے تو اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے تھے:

"حیف کہ شمشیر خواجہا در غلاف بود"۔[۲]

لاہور میں مستقل قیام

حضرت ایشانؒ کے سرینگر میں قیام کے دوران میں وہاں شیعہ سُنّی فسادات شروع ہو گئے۔ کشمیر کے گورنر ظفر خان احسن نے، جو خود بھی شیعہ تھا، شاہجہاں سے درخواست کی کہ کشمیر میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے وہاں سے حضرت ایشانؒ کا اخراج ضروری ہے۔ ظفر خان کی درخواست پر شاہجہاں نے حضرت ایشانؒ کو لاہور میں قیام کرنے کا حکم دیا۔[۳] موصوف سرینگر میں اپنی خانقاہ کی دیکھ بھال اپنے فرزند خواجہ معین الدینؒ کے حوالے کر کے خود لاہور تشریف لے آئے تھے۔

لاہور میں حضرت نے باغبانپورہ کے قریب ایک خانقاہ تعمیر کی اور باغ لگایا۔ ان کی زندگی کے آخری چند سال لاہور میں گزرے جہاں بے شمار لوگوں نے ان سے فیض پایا۔ حضرت ایشان اتباعِ سنّت اور ترکِ بدعت پر بڑا زور دیتے تھے اور انہیں وحدت الوجودی صوفیوں سے سخت نفرت تھی۔[۴] لاہور میں موصوف نے ہفتہ وار وعظ کا سلسلہ شروع کیا جس میں بڑی تعداد میں لوگ حاضر ہوتے تھے۔

---

۱ - ایضاً" ورق ۴۲۔

۲ - ایضاً" ورق ۹ الف۔

۳ - مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لاہور ۱۲۸۴ھ، ص ۶۰۷۔

۴ - نور احمد چشتی، تحقیقاتِ چشتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۳۵۶۔

حضرت ایشاںؒ کی وفات

حضرت ایشاںؒ نے ۱۶۴۲ء میں وفات پائی۔ خواجہ معین الدینؒ لکھتے ہیں کہ اپنے والدِ بزرگوار کے آخری ایامِ حیات میں وہ کشمیر میں مقیم تھے۔ وہیں انہیں حضرتِ والا کا خط موصول ہوا جس میں یہ مرقوم تھا: "ترا و فرزندان ترا بخدا سپردم"[1] خواجہ صاحب یہ فقرہ پڑھ کر بڑے متفکر ہوئے اور نامہ بر سے ان کی صحت کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے جواب دیا کہ جب وہ لاہور سے چلا تھا اس وقت موصوف خوش و خرم تھے۔ خواجہ معین الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے آٹھ روز بعد انہیں اطلاع ملی کہ حضرت کی طبیعت میں قدرے گرانی ہے۔ اس کے آٹھ روز بعد ان کی رحلت کی خبر ملی۔

خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ نمازِ مغرب کا وقت تھا کہ ان کے والدِ بزرگوار نے فرمایا کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے اور انہوں نے ابھی نماز ادا کرنی ہے۔ انہوں نے مغرب کی نماز بڑے سکون کے ساتھ ادا کی اور نماز عشاء سے قبل ان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ شعر جاری تھا:

الٰہی غنچہ اُمید بکشای
گلی از روضۂ جاوید بنمای

خواجہ معین الدینؒ لکھتے ہیں کہ جب ان کی میّت کو غسل دینے کے لئے غسّال نے ان کی لنگی اتارنے کا قصد کیا تو موصوف نے اپنے ہاتھ سے لنگی تھام لی۔[2]

حضرت ایشاںؒ کی وفات پر ان کے فرزند خواجہ بہاء الدینؒ نے یہ تاریخ کہی:

تاریخ وفات قطبِ عالم	آنمرشد و مقتدئ خوش خو
از دہر چو شد ملولِ خاطر	در جنتِ عدن کردہ او رو
محمود بنام بود ازانی شد	محمود مقام آن نکو خو
در یازدہم ز ماہِ شعبان	دیدار طلب برفت حق جو
از ہجرت خاتم النبوۃ	در سال ہزار و پنجہ و دو

حضرت ایشاںؒ کے ایک معتقد روشنی کشمیری نے یہ تاریخ کہی:

---

۱ - معین الدینؒ، مرأۃ طیبہ، ورق ۱۱۷ الف۔

۲ - ایضاً، ورق ۱۱۹ الف۔

خواجہ خاوند مسند محمود رفت کو آفتاب عالم تاب
تیرہ چون چشم عالی نشود شد فرد آفتاب عالم تاب
گفت زان سال رحلش روشنی بود او آفتاب عالم تاب[۱]

مقبرہ

حضرت ایشانؒ نے اپنی زندگی ہی میں اپنا مقبرہ تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا۔ ابھی گنبد کی تعمیر باقی تھی کہ انہیں پیام اجل آ پہنچا۔ ان کی وفات کے بعد سعید خان نے گنبد مکمل کیا اور ہشیار خان نے مزار اور مسجد کے درمیان تالاب بنوایا۔[۲] حضرت کے مقبرہ کی عمارت شاہجہانی طرز کی ہے اس کا بنیادی نقشہ ہشت پہلو ہے اور پوری عمارت آٹھ محرابوں پر کھڑی ہے۔ اس مقبرے کا گنبد لاہور کے چند بڑے گنبدوں میں شمار ہوتا ہے۔ مقبرہ کے اندر ایک چبوترے پر حضرت ایشانؒ اور سید میر جان کابلی کی قبریں ہیں۔

مقبرہ سے جانب غرب اس عہد کی ایک مسجد ہے۔ لالہ کنہیا لال صاحب "تاریخ لاہور" لکھتے ہیں کہ گذشتہ صدی کے ربع آخر میں اس مسجد کی حالت بڑی خستہ ہو رہی تھی چنانچہ برطانوی حکام نے ان کی نگرانی میں اس کی مرمت کروائی۔[۳]

حضرت ایشانؒ کی وفات کے بعد قریباً ایک صدی تک یہ خانقاہ آباد رہی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب پنجاب میں ناظموں کا دورِ حکومت شروع ہوا تو انہوں نے اسی نواح میں سکونت اختیار کر لی۔ نواب عبدالصمد خان، زکریا خان، یحییٰ خان اور شاہنواز خان حضرت ناصرالدین عبید اللہ احرارؒ کی اولاد سے تھے، اس لئے وہ حضرت ایشانؒ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے عہد میں یہ خانقاہ بڑی آباد تھی۔

نواب معین الملک کی وفات (۱۷۵۳ء) کے بعد پنجاب میں سکھوں کا عروج ہوا تو انہوں نے نواب موصوف سے عناد کی بنا پر اس علاقے کو دھڑی دھڑی کر کے لوٹا۔ شاہی محلات، مساجد، مقابر اور باغات بُری طرح تباہ ہوئے۔ سکھ جرنیل گلاب سنگھ پاونڈیہ نے وہاں نالہ۔ فوج کی چھاؤنی قائم کی تو حضرت ایشانؒ کے مقبرہ میں بارُود ذخیرہ کیا۔[۴] مسجد کو بھی اس زمانے میں

---

۱ - ایضاً" ورق ۱۱۷ الف۔
۲ - کنہیالال، تاریخ لاہور، مطبوعہ لاہور، ۱۸۸۴ء، ص ۲۳۵۔
۳ - مرأۃ طیبہ، ورق ۱۱۹ ب۔
۴ - ایضاً" ص ۲۲۴۔

نقصان پہنچا اور اس کے فرش کی اینٹیں خشت فروشوں نے اکھاڑ لیں۔ انگریزوں نے لاہور پر قبضے کے بعد مقبرے سے بارود اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ اسی زمانے میں حضرت ایشاںؒ کی اولاد سے ایک شخص خواجہ احد کشمیری لاہور آیا اور اس نے سر ہنری لارنس کی اجازت سے مقبرے پر قبضہ کر لیا۔ خواجۂ موصوف نے کافی رقم صرف کر کے مقبرے کی مرمت کروائی اور محمد بخش صحاف کو اس کا متولی بنا کر خود کشمیر چلا گیا۔

گزشتہ صدی کے رُبعِ آخر میں حضرت میر جان کابلیؒ نے اس خانقاہ کی رونق کو دوبارہ بحال کیا۔ ان کی والدہ حضرت ایشاںؒ کی اولاد سے تھیں اس لئے انہیں حضرتِ والا سے ایک خصوصی لگاؤ تھا۔ موصوف ۱۸۷۱ء کے لگ بھگ لاہور تشریف لائے اور اپنی وفات ۱۹۰۱ء تک یہیں مقیم رہے۔[1] ان کی وجہ سے یہ خانقاہ دوبارہ آباد ہو گئی اور ہزاروں افراد نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اس صدی کے رُبعِ اول میں اسلامیہ کلولج کے پرنسپل حاکم علی نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی وجہ سے بھی کچھ عرصہ تک یہ جگہ آباد رہی۔ اب گزشتہ چند برسوں سے مزار کے ارد گرد "حضرت ایشاں کالونی" کے نام سے ایک آبادی بن گئی ہے جس کی وجہ سے مسجد میں نمازِ باجماعت ہونے لگی ہے۔

اولادِ امجاد

مرأۃ طیبہ کے نویں باب میں فاضل مصنّف نے اپنے والدِ بزرگوار کی اولاد اور ان کے خلفائے نامدار کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ حضرت ایشاںؒ کے سب سے بڑے فرزند خواجہ تاج الدین حسنؒ تھے۔ سترہ سال کی عمر میں انہوں نے جملہ علومِ عقلی و نقلی سے فراغت کے بعد درس دینا شروع کیا۔ ان کے ورع و تقویٰ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان سے کبھی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہیں ہوا تھا۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ انتیس برس کی عمر میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔[2]

۲۔ خواجہ خاوند احمدؒ حضرت ایشاںؒ کے دوسرے فرزند تھے۔ ان پر جذب طاری رہتا تھا۔ ان کے والدِ بزرگوار نے انہیں خلافت عطا کر کے ماوراء النہر میں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔

---

۱ - میاں اخلاق احمد، تذکرہ حضرتِ ایشاںؒ، ص ۶۳۔

۲ - خواجہ معین الدینؒ، مرأۃ طیبہ، ورق ۱۲۱ الف۔

۳۔ حضرت ایشاںؒ کے تیسرے فرزند خواجہ محمد خاوندؒ تھے۔ خواجہ معین الدینؒ نے ان کے حالات قلمبند نہیں کئے۔ "احسن الشمائل" کے مطالعہ سے راقم الحروف کو معلوم ہوا کہ ان کے دو پوتے محمد کامگار اور نور الدین پسرانِ خواجہ برہان الدینؒ چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ (م ۱۷۲۹ء) کے مرید تھے۔[۱] محمد کامگار نے اپنے مرشد کا حلیہ "احسن الشمائل" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جو اشعار نقل کئے ہیں، وہ اپنے والد خواجہ برہان الدینؒ کی بیاض سے نقل کئے ہیں۔[۲] اس کے علاوہ "ملفوظات خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی" اور "مجالسِ کلیمی" بھی ان کی علمی یادگار ہیں۔[۳]

۴۔ خواجہ معین الدینؒ، صاحبِ مرأۃ طیبہ حضرت ایشاںؒ کے چوتھے فرزند تھے۔ انہوں نے کشمیر میں اپنے والدِ بزرگوار کی قائم کردہ خانقاہ کو اپنے انفاسِ طیبہ سے برسوں تک آباد رکھا۔ ان کا شمار حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔

۵۔ حضرت ایشاںؒ کے پانچویں فرزند خواجہ قاسم محمودؒ تھے۔ ان کے حالات بھی مرأۃ طیبہ میں نہیں ملتے۔ اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ عمر نہیں پائی۔

۶۔ خواجہ بہاء الدینؒ حضرتِ والا قدر کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ انہوں نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی لیکن والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد ملازمت ترک کر کے والد کے مزار پر مجاور بن کر بیٹھ گئے۔[۴]

حضرت ایشاںؒ کے بھائی

مرأۃ طیبہ کے مطالعہ کے دوران یہ معلوم ہوا کہ ان کے ایک بھائی خواجہ آفتاب کاشغر میں رہتے تھے اور وہ انہیں برابر سوغاتیں بھیجا کرتے تھے۔

۱۔ محمد کامگار، احسن الشمائل، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، شیفتہ گلشن، نمبر ۵۶ / ۵۷ ورق ۷۹ ب۔

۲۔ ایضاً، ورق ۷۹ الف۔

۳۔ (i) محمد کامگار، ملفوظاتِ خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی، مخطوطہ خانقاہ تونسہ شریف۔
(ii) محمد کامگار، مجالسِ کلیمی، مخطوطہ خانقاہ تونسہ شریف، نمبر ۱۸۹ ب۔

۴۔ خواجہ معین الدینؒ، مرأۃ طیبہ، ورق ۱۳۱ الف۔

خلفائے نامدار

خواجہ معین الدینؒ نے مرأۃ طیبہ میں حضرت ایشاںؒ کے گیارہ خلفاء کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ خواجہ خاوند احمدؒ، یہ حضرت ایشاںؒ کے دوسرے فرزند تھے۔

۲۔ خواجہ عبدالرحیم نقشبندیؒ، یہ بزرگ حضرت علاء الدین عطّارؒ کے فرزند خواجہ حسن عطّار کی اولاد سے تھے۔

۳۔ شاہ یحییٰ، یہ بزرگ شجاع کرمانی اور خواجہ محمد امین دہ بیدی کی اولاد سے تھے۔

۴۔ باقی کلند تاک

۵۔ شادمان کابلی

۶۔ میرزا ہاشم برادر خواجہ دیوانہ بلخی۔ یہ بزرگ سُبحان قُلی خان حاکم بلخ کے پیر تھے۔

۷۔ حاجی بانڈے کشمیری

۸۔ حاجی طوسی

۹۔ حاجی ضیاء الدین حصاری

۱۰۔ ابو الحسن سمرقندی

۱۱۔ خواجہ معین الدینؒ صاحب مرأۃ طیبہ[۱]

ان خلفاء کے علاوہ ان کے مریدوں کی تعداد حد و حساب سے باہر ہے اور حضرت ایشاںؒ کے ہمعصر مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عوام کی ہدایت و رہنمائی میں موصوف یکتائے زمانہ تھے[۲] محمد صادق شاہجہانی رقمطراز ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ، خصوصاً ماوراء النہر کے باشندے، ان کے زمرۂ مریدین میں شامل ہیں۔[۳]

ہم حضرت ایشاںؒ کا ذکر خیر مشربی کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں:

خواجۂ عالی نسب خاوند محمودؒ آنکہ ہست
در جہانِ معرفت صاحبدلان را پیشوا

✪✪✪

۱ ۔ ایضاً، ورق ۳۲ الف۔

۲ ۔ محمد صادق، طبقاتِ شاہجہانی، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۶۷۳، ورق ۳۰۷ ب۔

۳ ۔ محمد اسعد قزوینی، بادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۳۲۱ ب۔

ملفوظاتِ شاہ رکن الدین شطاریؒ

خدا بخش اورینٹنل پبلک لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں "ملفوظ حضرت شیخ الاسلام و المسلمین حضرت عین الدین عبدالباری اشتہر بہ شاہ رکن الدین احمد شطاریؒ" کے عنوان سے ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے ۔[1] جس میں صاحبِ ملفوظات کے سوانح حیات اور تعلیمات کے علاوہ عہد سلطنت اور مغلیہ دور کے بعض ایسے واقعات بھی آ گئے ہیں جو عام تاریخوں میں نہیں ملتے۔ اس لئے تاریخ دانوں کے نزدیک اس مخطوطے کی بڑی اہمیت ہے۔

صاحبِ ملفوظات حضرت عین الدین عبدالباری المعروف بہ شاہ رکن الدینؒ شاہ جہان اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شطاری سلسلے کے ایک نامور شیخ گزرے ہیں۔ ان کے والدِ بزرگوار حضرت معین الدینؒ اور جدِ امجد حضرت قطب الدینؒ کا شمار بھی مغلیہ عہد کے نامور مشائخ میں ہوتا ہے۔ صاحبِ ملفوظات کے پردادا حضرت ابو الفتح شطاریؒ برِعظیم پاک و ہند میں شطاری سلسلے کے اساطین میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت معین الدینؒ کے گیارہ بیٹے تھے اور شاہ رکن الدینؒ ان میں سب سے چھوٹے تھے۔[2] ان کی تعلیم و تربیت بہار کے مشہور شہر حاجی پور میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے اپنے چچا شاہ محی الدینؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔ ملفوظات کے ایک اندراج سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے تیس برس اپنے مرشد کی صحبت میں گزارے تھے۔

شاہ محی الدینؒ ۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء میں راہئ ملکِ بقاء ہوئے۔ "جان پاکش داد در توحید تاب" سے ان کی تاریخِ وفات برآمد ہوتی ہے۔[3] ان کی وفات کے بعد شاہ رکن الدینؒ مسند نشین

---

۱ - فارسی تصوف، مخطوط نمبر ۳۰۱۰۔ (مخطوطے پر ورقوں کے نمبر لگانے کی بجائے صفحوں کے نمبر لگائے گئے ہیں۔)

۲ - ایضاً" ص ۸۱ ۔ از ہمہ کہتر فقیر است۔

۳ - فارسی تصوف، مخطوط نمبر ۳۰۱۰، ص ۵۵۔

ہوئے۔

حاجی پور کا تعلیمی ماحول

جس زمانے میں شاہ رکن الدینؒ حاجی پور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان دنوں وہاں ملّا شادابی اور ملّا آدابی نام کے دو بھائی رہتے تھے اور وہ دونوں شاعر تھے۔ ایک دن کسی مجلس میں شادابی نے پھولوں کا ایک گلدستہ دیکھ کر کہا:

ہمدرد ما کسی است کہ داغیست بر جگر

آدابی نے اس پر فوراً گرہ لگائی:

با ما دریں دیار ہمیں لالہ آشنا است[1]

شاہ کریم الدین بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور وہ پٹنہ میں رہتے تھے۔ انہیں شاہ محی الدینؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ان کی طبع موزوں تھی اور وہ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ شاہ کریم الدین، مرزا مراد قندھاری سے بڑی محبت کرتے تھے اور بلاتکلّف مرزا کے ہاں آتے جاتے تھے۔ ایک دن جب شاہ کریم الدین اس کے ہاں گئے تو اس وقت مرزا اور اس کا بھائی نواب نوازش خاں انگور کی بیل کے نیچے غالیچہ بچھائے بیٹھے تھے۔ غالیچہ ذرا چھوٹا تھا۔ اس لئے انہوں نے شاہ کریم الدین سے کہا کہ جہاں جگہ ملے بیٹھ جایئے۔ موصوف گھاس پر بیٹھ گئے۔ نوازش نے انہیں مخاطب ہو کر کہا:

امروز زیرِ سایۂ انگور نشستیم

مرزا مراد نے اس پر یہ گرہ لگائی:

فارغ شدہ بہ گوشۂ چوغفور نشستیم

انہوں نے شاہ کریم الدین سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ اس پر انہوں نے یہ شعر پڑھا:

بودیم شہ فقیر در ایوانِ قناعت
بیروں شدہ از خانہ چو مزدور نشستیم

نوازش خاں کو یہ شعر پسند آیا اور اس نے شاہ صاحب پر بڑی مہربانی کی۔[2]

---

۱ - ایضاً" ص ۸۴۔

۲ - ایضاً" ص ۸۵ ' ۸۶۔

شاہ رکن الدینؒ کا علمی ذوق

ملفوظات کے مندرجات دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ رکن الدینؒ کافی پڑھے لکھے بزرگ تھے اور فتوح الغیب، مکاتیب قطب الدین شطاری، کنز، معدن الاسرار، سید الاستغفار، رسائل نقشبندیاں، شرح فتوح الغیب، جواہر الاسماء، شرح گلشن راز، سراج الہدایہ[1]، شرح وقایہ، تفسیر جلالین، شرح جام جہاں نما، ارشاد الطالبین، رسالہ شطاریہ، مثنوی شاہ نعمت اللہ، بانت القدرت، مجموعۂ ادعیہ شاہ محی الدین، منطق الطیر، مکتوبات گیسو دراز، رسالہ در احوال ہمایوں، مکتوبات شاہ نور قطب عالم، اذکار میاں محمد رفیع منار کانوی، شرح جواہر خمسہ، منہاج العابدین اور محمد حسین بن مخدوم احمد چرم پوش کی "ایک تصنیف" جیسی بلندپایہ کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ آخری عمر میں شاہ رکن الدینؒ کا اکثر وقت تصحیح کتب میں گزرتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مرشد کی زندگی میں تیس برس تک عیدین کا خطبہ ارشاد فرمایا تھا[2]۔

شاہ رکن الدینؒ کی وفات

شاہ صاحب نے جامع ملفوظات کی موجودگی میں بدھ کے روز مورخہ ۸؍ جمادی الثانی ۱۱۱۷ھ / ۱۷۰۵ء کو وفات پائی۔ آخری وقت ان کی زبان پر اللہ اللہ کا ورد جاری تھا۔ جامع ملفوظات نے ان کے غسل میں شرکت کی۔ شاہ صاحب کو اسی روز نماز مغرب کے بعد سپردِ خاک کیا گیا۔

جامع ملفوظات چہلم تک وہاں رکا اور اپنی روانگی سے قبل اس نے مزار کے گرد چار دیواری تعمیر کروا دی۔

حضرت رکن الدینؒ کی وفات پر کسی شاعر نے ان کی تاریخ وفات ایک رباعی میں کہی تھی:

پاس نفسی کہ واپسیں است
در حضرت شیخ رکن دین است
جان داد بذکر اللہ اللہ = ۱۱۱۷ھ
تاریخ وفات او ازین است

---

۱ - سراج الہدایہ قاضی سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ فتح پوری دہلی نے مرتب کی ہے، انہوں نے یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ مخدوم جہانیاںؒ کے ملفوظات کا یہ مجموعہ جعلی ہے۔

۲ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۸۰۔

ایک اور شاعر نے یہ تاریخ کہی تھی:

از سرائش آن شہ عالی صفات
شادمان جان داد اندر یاد ذات[1]

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات نے ایک جگہ متن میں اپنا نام "فقیرِ بے تسکین امام الدین شطاری" لکھا ہے۔[2] وہ بہار کی تاریخی اور رُوحانی بستی راجگیر کا رہنے والا تھا اور اس نے تیرہ سال شاہ رکن الدینؒ کی صحبت میں گزارے تھے۔ ملفوظات کی ترتیب اور مندرجات دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے "مناہج الشطار" کے عنوان سے ایک تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

جامع ملفوظات نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پوتے حضرت سیف الدین سرہندیؒ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ حضرت سیف الدینؒ التحیات میں رفعِ سبابہ کے سخت مخالف تھے اور اسی موضوع پر ان کی گفتگو ہوئی تھی۔[3] جامع ملفوظات حضرت عبدالرشید جون پوریؒ سے بھی ملا تھا اور ان سے بھی رفعِ سبابہ کے مسئلے پر بات چیت کی تھی۔ حضرت عبدالرشیدؒ نے اس سے کہا کہ بعض لوگ رفعِ سبابہ کو واجب، بعض سنّت، بعض مکروہ اور بعض حرام لکھتے ہیں، اس لئے انہوں نے اسے ترک کر دیا ہے۔[4]

ملفوظات کا آغاز یکم ربیع الاول ۱۱۰۴ھ سے ہوتا ہے۔ آخری ملفوظ ۱۸ ماہِ جمادی الثانی ۱۱۱۷ھ کو شاہ رکن الدینؒ کی وفات کے دن قلم بند ہوا۔ اس مجموعے میں شاہ رکن الدینؒ کی زندگی کے آخری تیرہ سالوں کے ملفوظات ہیں۔ ان ملفوظات سے اس دَور میں بہار کے خانقہی نظام اور اس خطے کی سماجی اور معاشرتی زندگی پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے تاریخ کے طلباء کو ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہئے۔

شاہ ابوالفتح شطاریؒ

شاہ رکن الدینؒ کے پرداداشاہ ابُو الفتح شطاریؒ کا شمار برِّعظیم پاک و ہند میں شطاری سلسلے کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کا اصل نام ہدایت اللہ تھا، لیکن وہ اپنی کنیت ابُو الفتح اور لقب سرمَست کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ اس کا سنِ ولادت "ہادی سرمست محمدی" (۸۸۲ھ) سے برآمد ہوتا ہے۔[5]

۱ ۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۱۷۲۔
۲ ۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔
۳ ۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۷۳۔
۴ ۔ ایضاً، ص ۷۴۔
۵ ۔ ایضاً، ص ۷۵۔

شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ موصوف بارہ سال کی عمر میں جملہ علومِ عقلی و نقلی سے فارغ ہو گئے تھے۔ انہیں اپنے والدِ بزرگوار محمد معروف المشتہر بہ قاضی علاء شطاریؒ سے تلمذ تھا۔ حصولِ علم کے بعد انہوں نے دو سال تک طلبا کو درس دیا۔[1]

اسی دوران ان پر جذب غالب آنے لگا۔ ایک روز انہوں نے اپنی تمام کتابیں علما و طلبا میں تقسیم کر دیں اور اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہو کر التماس کی کہ ان پر جذبۂ شوقِ الٰہی غالب آ رہا ہے۔ والدِ بزرگوار نے فرمایا کہ طے کے روزے رکھو۔ انہوں نے عرض کیا کہ کتنے دن کا طے ہو گا؟ والدِ بزرگوار نے پوچھا کہ عمر کتنی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ چودہ سال کے ہو گئے ہیں۔ والد صاحب نے فرمایا کہ وہ چودہ دن کا طے کا روزہ رکھیں۔[2]

جب انہیں گیارہ دن گزر گئے تو اتفاق سے سلطان حسین شرقی، قاضی علاء شطاریؒ سے ملنے آیا۔ اس وقت ابُوالفتح ایک ستون کے سہارے کھڑے تھے اور ان کی نگاہیں اپنے مرشد کی طرف لگی ہوئی تھیں اور قلب بھی ان کی طرف متوجہ تھا۔ سلطان نے دیکھا کہ ایک نوعمر بچہ بڑا کمزور ہو رہا ہے اور وہ ایک ستون کے سہارے بمشکل کھڑا ہے۔ سلطان کے استفسار پر خادموں نے بتایا کہ وہ شاہ صاحب کے فرزند ہیں اور انہیں چودہ دن طے کا روزہ رکھنے کا حکم ہوا ہے اور ابھی تین دن باقی ہیں۔

سلطان نے شاہ صاحب سے کہا کہ ان سے اتنی چھوٹی عمر میں اتنی سخت ریاضت کیوں کروا رہے ہیں۔ یہ ان کے لئے باعث ضرر بن سکتی ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایسی ریاضت باعثِ ضرر نہیں بلکہ باعثِ قوتِ باطن ہوا کرتی ہے۔ یہ جواب سن کر سلطان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ حاضرین کو مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "سبحان اللہ! خلقتِ ایں مردم از عالمِ بیرون است"۔[3]

چودھویں دن شاہ صاحب نے ابُو الفتح کو تلقین فرمائی اور حجرے میں بٹھا دیا۔ تین دن بعد انہیں بلا کر کہا کہ ان کا کام پورا ہو چکا ہے۔ اسی وقت انہیں ابُو الفتح کا لقب دیا اور جب وہ اٹھارہ سال کے ہو گئے تو انہیں خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت شاہ محی الدینؒ کی خانقاہ میں اس پالکی کے تختے موجود تھے جس میں شاہ ابُو الفتح سوار ہوا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ہمایوں نے اس پالکی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا تھاکہ

۱۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۱۲۰۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔

۴۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۱۸۔

وفات

شاہ اَبُو الفتح نے ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء میں ۶۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ "محوِ تجلیاتِ الٰہی" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔[1]

مشربِ شطّار

حضرت شاہ رکن الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ شطاری کسی خانوادے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تصوّف کے چودہ خانوادوں سے بہرہ یاب ہیں۔ اس لئے شطار مشرب کا نام ہے خانوادے کا نہیں[2] شرحِ گلشنِ راز سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت اَبُو سعید اَبُوالخیر بھی شطاری مشرب کے پیرو تھے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ مشرب شطار میں ذکرِ جہر بھی ہے اور ذکرِ خفی بھی۔ اسی طرح وہ ذکر اَخفیٰ بھی کرتے ہیں۔[3] شطاری اسمِ ذات کا ذکر بلند آواز سے کرتے ہیں۔ صوفیوں کے ہاں حدیث کی صحت کا کوئی خاص التزام نہیں کیا جاتا' وہ اپنی تائید میں ضعیف ترین احادیث بھی لے لیتے ہیں بلکہ بَسا اوقات وضع بھی کر لیتے ہیں۔ حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایامِ حیات میں جبرئیلؑ مشربِ شطار لے کر نازل ہوئے اور انہوں نے حضورؐ کو اس کی تلقین کی۔[4] (انا للہ و انا الیہ راجعون)

شطاری بزرگوں کے ہاں نمازِ عشق مروّج تھی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سُورت پڑھ کر حبسِ دَم کر کے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ اسی طرح رکوع اور دوسرے ارکان میں بھی حبسِ دم کر کے اللہ اللہ کرتے ہیں۔[5]

نقشبندی مشرب

حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ نقشبندیوں کے ہاں تین چیزیں ہیں اور یہی ان کا سلوک اور رَوش ہے: (۱) تصوّرِ شیخ (۲) ذکر (۳) مراقبہ۔

حضرت رکن الدینؒ کی مجلس میں کبھی کبھی "رسائلِ نقشبندیاں" پڑھے جاتے تھے۔ جامع

---

۱ - ایضاً" ص ۵۵۔

۲ - ایضاً" ص ۷۴۔

۳ - ایضاً" ص ۵۰۔ در مشربِ شطار ذکرِ جہراست۔ ذکرِ خفی است' ذکر اخفیٰ است۔ شطاری سلسلے کے ذکر و اذکار اور تعلیمات کے لئے ملاحظہ ہو: راقم الحروف کی تصنیف: وجیہہ الدینؒ گجراتی" مطبوعہ ندوۃ المصنفین لاہور۔

۴ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدین' ص ۴۔

۵ - ایضاً" ص ۱۴۔

ملفوظات نے شیخ سعید نام کے ایک نقشبندی بزرگ کا ذکر کیا ہے جو قلندروں جیسی وضع رکھتے تھے۔ ان کا قیام غازی الدین خان کے لشکر میں تھا اور ان کے مرید ذکرِ جہر کیا کرتے تھے۔

سلطان فیروز تغلق

سلطان فیروز تغلق مشائخ بہار میں بڑا مقبول تھا۔ مخدوم شرف الدین یحیٰی منیریؒ کے ملفوظات میں بھی اس کا کئی بار ذکر آیا ہے۔ شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ جب سلطانِ مذکور بہار آیا تو مخدوم شاہ احمد چرم پوشؒ سے ملنے گیا۔ مخدوم صاحب نے اسے کوئی تعظیم نہ دی۔ جب وہ مخدوم شرف الدینؒ سے ملنے گیا تو انہوں نے اس کا استقبال کیا۔ سلطان نے شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے چلنے کا اشارہ کیا لیکن حضرت از راہِ تواضع سلطان کے پیچھے ہو گئے۔ سلطان نے اس موقع پر یہ بیت پڑھی:

در پیش روم طریقِ حاجب
در پس بروم چنین است واجب

مخدوم صاحب نے فوراً کہا:

گر پیش روی چراغِ راہی
ور پس بروی جہاں پناہی[1]

حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ سلطان فیروز شاہ تغلق بڑا اچھا حکمران تھا۔ وہ اشراف کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے ملازموں کو عراق و عرب بھیجا اور وہ حسب و نسب کی تحقیق کے بعد بارہ سیّدوں کو اس کے پاس لائے۔[2]

ہمایوں

ملفوظات میں ہمایوں کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ وہ شیر شاہ کے ساتھ نزاع کے دوران بہار میں مقیم رہا تھا اس لئے اس نے وہاں کے مشائخ کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے تھے۔

شاہ ابو الفتح برعظیم پاک و ہند میں شطاری سلسلے کے اساطین میں شمار ہوتے ہیں۔ بہار میں قیام کے دوران ایک بار ہمایوں ان سے ملنے گیا تو اس وقت شاہ صاحب پالکی میں سوار کہیں

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۳۷، ۳۸۔
۲ - ایضاً، ص ۳۷۔

تشریف لے جا رہے تھے۔ ہمایوں نے ازراہِ عقیدت ان کی پالکی کو کندھا دیا تھا۔[1] اورنگ زیب کے عہد تک اس پالکی کے تختے شاہ رکن الدینؒ کی خانقاہ میں محفوظ تھے۔ شاہ رکن الدینؒ اپنی گفتگو میں ہمایوں کو۔۔ شاہِ ولایت دست گاہ۔۔ کہہ کر یاد فرمایا کرتے تھے۔[2]

ہمایوں کے بارے میں ملفوظات کے مطالعہ سے یہ اہم انکشاف ہوا ہے کہ اس نے کوئی وظیفہ پڑھنا شروع کیا تھا جو "خراب" ہو گیا۔ اس سے تفرقہ اور انتشار پیدا ہوا اور وہ بارہ سال کے لئے تخت وتاج سے محروم ہو گیا۔[3]

ابتدائے حال میں ہمایوں نے ایک بار یہ بیت پڑھا:

ز غصہ غنچہ صفت تہ بہ تہ دلم خونست
کہ باوجودیکے نسبت دوئی چونست

اس پر کسی نے بادشاہ سے کہا کہ اس کے حال میں نسبت دوئی اصلح اور مناسب ہے اور وہ اس حال سے اسی وقت نکلے گا جب تمام مرادوں سے کنارہ کش ہو جائے گا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ تمام مرادوں سے دست بردار ہوتا ہے تاکہ اسے یہ نسبت حاصل ہو جائے۔ شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ یہیں سے تفرقہ کا آغاز ہوا اور وہ بارہ سال تک مہجور رہا۔[4]

شطاری سلسلے کے بزرگ تسخیر الاسماء (تنزازم) کا علم جانتے تھے اور حضرت محمد غوث گوالیریؒ اور ان کے برادرِ بزرگ شیخ پھولؒ نے اس فن میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اسی وجہ سے ہمایوں کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔[5] بنا بریں ہمایوں شطاری حلقوں میں بڑا مقبول تھا۔

شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ ہمایوں شیخ محمد غوثؒ کے بڑے بھائی شیخ پھولؒ کا مرید تھا۔ ایک بار ہمایوں کی عدم موجودگی میں مرزا ہندال نے انہیں دعوت کے بہانے محل میں بلا کر قتل کروا دیا۔[6]

مرزا ہندال

مرزا ہندال کے بارے میں شاہ رکن الدینؒ نے یہ انکشاف کیا ہے کہ وہ "صاحب

---

۱ ۔ ایضاً" ص ۱۷۔
۲ ۔ ایضاً" ص ۳۴۔
۳ ۔ ایضاً" ص ۱۰۲۔
۴ ۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین' ص ۱۰۲۔
۵ ۔ محمد اکرام' رودِ کوثر' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء' ص ۳۷۔
۶ ۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین' ص ۴۳۔

تصرف" تھا۔ ایک بار شاہی فیل خانے کا ایک ہاتھی مست ہو گیا تو مرزا ہندال نے یہ حکم دیا کہ اسے آراستہ کر کے اس کے پاس لائیں۔ خدام نے عرض کیا کہ آدمی کی بو سے ہاتھی کی مستی بڑھتی ہے اور وہ موجودہ حالت میں سواری کے لائق نہیں ہے۔ مرزا نے کہا جیسے بھی ہو اسے اس کے پاس لے آئیں۔ جب خدام اس ہاتھی کو مرزا کے پاس لائے تو اس نے اس کے دانت پکڑ کر اتنا زور لگایا کہ ہاتھی تلملا اٹھا اور اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ مرزا اس کے دانتوں پر پیر رکھ کر اس پر سوار ہو گیا اور ہاتھی کی مستی جاتی رہی۔[1]

شاہ جہان

شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ شاہ جہاں نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کر دی اور اپنے بھائی خسرو کو قتل کر کے پٹنہ آ پہنچا۔ پٹنہ کے قیام کے دوران وہ کئی درویشوں سے ملا اور ان سے دعا و فاتحہ کی التجا کی۔ شاہ جہان نے ان کی خدمت میں نذریں بھی گزاریں۔ میاں فیروز نامی ایک درویش نے اسے دہلی کی بادشاہت کی خوشخبری دی تو شاہ جہان نے اس کے لئے ایک مسجد بنوا دی۔[2]

جب شاہ جہان کو شکست ہوئی تو اس نے پٹنہ کے درویشوں سے اس رقم کا مطالبہ کیا جو انہوں نے اس سے بطور نذر لی تھی۔ شاہ بدیع الدینؒ وہ رقم خرچ کر چکے تھے۔ جب شاہ جہان کا اصرار اور تقاضا بڑھا تو انہوں نے اِدھر اُدھر سے رقم جمع کر کے مطالبہ پورا کر دیا۔ باقی درویشوں کے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی معاملہ کیا۔ اس وقت میاں فیروز کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کسی کا غلام ہے اور سوختنی لکڑی بیچ کر اپنی گزر بسر کرتا تھا۔ بعد ازاں اس نے سادہ لوح عوام کو لوٹنے کے لئے درویشی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ شاہ جہان نے اسے تختۂ دار پر چڑھا دیا۔[3]

داراشکوہ

شاہ رکن الدینؒ کے ایک مرید شاہ غریب کا اصل نام رُوح اللہ تھا اور وہ قلیچ خاں کے نواسے تھے۔ درویشی اختیار کرنے سے پہلے موصوف داراشکوہ کے ملازم تھے۔ جب داراشکوہ کو

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدینؒ ص ۱۱۴۔
۲ - ایضاً" ص ۱۱۲۔
۳ - ایضاً" ص ۱۱۳۔

شکست ہوئی تو اس کے بہت سے ملازم اس کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب سے مل گئے۔ ان میں روح اللہ بھی شامل تھے۔ اورنگ زیب نے بہادر خاں کوکہ کی نگرانی میں کچھ فوج داراشکوہ کے تعاقب میں بھیجی۔ جب داراشکوہ پکڑا گیا تو بہادر خاں نے ایک جماعت اس کی نگرانی کے لئے مقرر کی۔ داراشکوہ کو کھانا کھلانا اور سوار کرانا رُوح اللہ کے ذمے تھا۔ موصوف اپنے ہاتھ سے کھچڑی پکاتے اور داراشکوہ کو کھلاتے۔[1]

ایک روز بارش کی وجہ سے کھچڑی بر وقت تیار نہ ہو سکی اور شہزادے کی روانگی میں تاخیر ہو گئی۔ نگران جماعت کے سربراہ نے شہزادے کو بُرا بھلا کہا۔ اس پر شہزادے نے کہا کہ بادشاہوں کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اس روز شہزادہ بھوکا رہا۔ رُوح اللہ نے یہ تمام گفتگو سنی اور اپنے دل میں کہا کہ شہزادہ کتنے دبدبے کا مالک تھا اور اب چند ہی روز میں یہ حالت ہو گئی ہے کہ ایک عام آدمی اس کے سامنے گستاخی کرنے لگا ہے اور اب شہزادہ عاجز ترین شخص ہے۔ اس خیال کے دل میں جاگزین ہوتے ہی رُوح اللہ کا دل دنیا کی طرف سے سرد پڑ گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد وہ گستاخ افسر اچانک فوت ہو گیا۔ رُوح اللہ نے یہ دیکھ کر فوج کی ملازمت ترک کر دی اور حضرت رکن الدینؒ کا مرید ہو گیا۔ رُوح اللہ کی زندگی کے آخری ایام چاٹگام میں گزرے اور وہیں دریائے پہنی کے کنارے ان کا مزار ہے۔[2]

شہزادہ شجاع

شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت بنگال و بہار پر اس کے بڑے بھائی شہزادہ شجاع کا تسلّط تھا۔ اس کے جاسوس اس علاقے میں ہر اجنبی شخص پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص باہر سے اس علاقے میں کسی بزرگ کے مزار کی زیارت کے لئے آتا تو جاسوس اسے گھیر لیتے تھے۔ ایک بار رکن الدینؒ کے ایک واقف کار حاجی شہرت بہار شریف گئے تو شجاع کے جاسوسوں نے ان سے بازپُرس کی۔[3]

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۷۸۔
۲ - ایضاً“ ص ۷۷۔
۳ - ایضاً“ ص ۴۸۔

اورنگ زیب

شاہ رکن الدینؒ کی محفل میں کسی شخص نے ذکر کیا کہ دکن میں قیام کے دوران اورنگ زیب، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عرس کروایا کرتا تھا اور کھانے کے وقت اہل مجلس کے ہاتھ خود دھلوایا کرتا تھا۔ ایک شخص نے ہاتھ دھوئے اور دو غرارے بھی کئے۔ بادشاہ نے یہ حرکت دیکھ کر اسے کہا: "اگر غسل کی حاجت ہو تو اس سے بھی فارغ ہو جاؤ۔" ملفوظات میں اورنگ زیب کے نام کے ساتھ۔۔خلد اللہ ظلہ' علی کافتہ المسلمین۔۔ جیسا دعائیہ جملہ لکھا ہوا ہے۔[1] جس سے ہم عصر مذہبی حلقوں میں اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شہزادہ عظیم الشان

شہزادہ عظیم الشان بن شہزادہ معظم بن عالم گیر اورنگ زیب بنگال کا صوبے دار تھا۔ وہاں سے تبدیل ہو کر پٹنہ آیا اور بہار کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کے تقرر کا ذکر ملفوظات میں ملتا ہے۔[2]

شہزادہ محمد سلطان

شہزادہ محمد سلطان، حضرت رکن الدینؒ سے عقیدت رکھتا تھا۔ ان کے چہلم کے موقع پر اس نے ان کے مزار پر نصب کرنے کے لئے ایک مخملی شامیانہ بھیجا اور اس کے ساتھ ہی ان کے جانشین محمد شفیع کے لئے دو صد روپے' ایک شال اور خلعت بھیجے۔ شہزادے نے ایک دوشالہ ملا نعمت اللہ کے لئے بھی بھیجا۔ شہزادے کی طرف سے ایک اَحدی مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے بھی آیا۔[3]

اورنگ زیب کا بیٹا شہزادہ محمد سلطان ۱۰۸۸ھ / ۱۶۷۸ء میں فوت ہو گیا تھا۔ اس لئے شہزادۂ مذکور کے بارے میں پتا نہیں چل سکا کہ وہ کس کا فرزند تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شہزادہ محمد سلطان مرحوم کا فرزند ہو اور سہوِ کتابت سے اس کا نام احاطۂ تحریر میں آنے سے رہ گیا اور اس کے والد کا نام قلمبند ہو گیا۔ دراصل یہ عبارت یوں ہونی چاہئے تھی کہ شہزادہ محمد سلطان کے فرزند نے ایک مخملی شامیانہ اور..... بھیجے۔

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدین' ص ۳۹۔
۲ - ایضاً" ص ۱۱۲۔
۳ - ایضاً" ص ۱۷۴' ۱۷۵۔

نواب سیف خان

ملفوظات میں نواب سیف خان کا ذکر آیا ہے۔ شاہ رکن الدینؒ اس سے ملے تھے۔ اس ملاقات کے بعد نواب موصوف نے مُلّا عبداللطیف کے ہاتھ انھیں ایک دوشالہ بھیجا تھا۔[۱]

سیف خان کا اصل نام فقیر اللہ تھا اور یہ وہی شخص ہے جس نے "راگ درپن" کے نام سے فارسی میں علمِ موسیقی پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب حال ہی میں دہلی یونیورسٹی سے طبع ہو گئی ہے۔

بابا فرید الدین گنجِ شکرؒ

ایک دن جامع ملفوظات نے حضرت رکن الدینؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ بابا فرید الدین گنجِ شکرؒ ہندوی زبان میں ذکر کیا کرتے تھے۔ حضرت سے اجازت لے کر جامع ملفوظات نے وہ الفاظ لکھ کر حضرت کو دیئے اور ان سے فرمائش کی کہ وہ ان الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں۔ حضرت نے فرمایا: اھون توں اھمیں توں۔[۲]

جناب آصف خان نے۔۔ آکھیا بابا فریدؒ نے۔۔ میں اس ذکر کی املا کئی طریقوں سے کی ہے۔[۳] شطاری سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت محمد غوث گوالیریؒ نے بھی جواہرِ خمسہ میں بابا فریدؒ کا یہ ذکر نقل کیا ہے۔ شاید جامع ملفوظات نے یہ وہیں سے لیا ہو۔

اُردو الفاظ

ملفوظات میں نھڑی، چارپائی، کھچڑی، انبہ، کٹھل اور راوئی جیسے اُردو الفاظ ملتے ہیں، جس سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت رکن الدینؒ فارسی میں گفتگو کرتے ہوئے اُردو الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے تھے۔

صنعتوں کے بارے میں اہم انکشافات

ملفوظات میں "گلیم سیاہ لاہوری" کا ذکر آیا ہے۔[۴] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور یا

۱۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین ص ۱۳۷۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔
۳۔ آصف خان، آکھیا بابا فریدؒ نے، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء ص ۲۷۔
۴۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۸۷۔

پنجاب کے کسی شہر میں کمبل تیار ہوتے تھے اور وہ بہار تک بھیجے جاتے۔ اسی طرح ایک کپڑے کا بھی ذکر آیا ہے جو "قائم خانی" کے نام سے مشہور تھا۔[۱]

اہم تاریخی انکشافات

ملفوظات کے مطالعہ سے دو اہم علمی انکشافات ہوئے۔ اولاً" یہ کہ شیخ پھولؒ کے فرزند ملا عبداللہ نے اپنے چچا اور مرشدِ ثانی شیخ محمد غوث گوالیریؒ کی مشہور تصنیف جواہرِ خمسہ کی شرح لکھی تھی۔[۲] ثانیاً" یہ کہ شاہ رکن الدینؒ کے زمانے میں ایک رسالہ علمی حلقوں میں متداول تھا جس میں ہمایوں سے حکومت چھننے اور شیر شاہ کو تخت و تاج ملنے کا ذکر تھا۔[۳] افسوس کہ آج یہ اہم تاریخی دستاویز کہیں موجود نہیں ہے۔

ہندو راجے کا انصاف

شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک سال راجہ ہیربھان کی ریاست میں گزارا تھا' وہ بڑا عادل اور اوصافِ حمیدہ کا مالک تھا۔ اتفاق سے ایک بار اس کی ریاست میں مسلمانوں کی زمین سے پانصد من سونا نکلا۔ راجہ کے اہلکاروں نے اسے اطلاع دی۔ اس نے کہا وہ تمام سونا مسلمانوں کو دے دیں۔ اس پر ان کا حق ہے۔ اہل کار ایسا کرنے سے پس و پیش کرنے لگے تو راجہ نے کہا کہ اگر انہوں نے سونا مسلمانوں کو نہ دیا تو وہ زہر کھا لے گا۔ مجبوراً" اہلکاروں نے حکم کی تعمیل کی۔[۴]

کتاب کی قدر

عبدالرحیم نسور کے پاس "معدن الاسرار" کا ایک صحیح نسخہ تھا۔ جب راجہ مان سنگھ نے اس کا گھر لوٹا تو سامان کے ساتھ کتابیں بھی لے گیا۔ راجہ کو حضرت شاہ تاج شطاریؒ کے ایک مرید شیخ برمزید کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ اس نے وہ کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ شیخ برمزید نے معدن الاسرار کے علاوہ باقی تمام کتابیں راجہ صاحب کو واپس کر دیں۔

---

۱ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدین' ص ۸۶۔
۲ - ایضاً" ص ۸۹۔
۳ - ایضاً" ص ۱۲۳۔
۴ - ایضاً" ص ۱۲۴۔

جب عبدالرحیم کے قدم جمے تو اسے علم ہوا کہ معدن الاسرار شیخ برمزید کے پاس ہے۔ اس نے ان سے وہ نسخہ طلب کیا۔ شیخ مذکور نے جواب دیا کہ اس کتاب میں ان کے پیروں کے حالات ہیں لہٰذا وہ یہ کتاب اسے نہیں دیں گے۔ عبدالرحیم نے شاہ علاء الدین سے التماس کی تو انہوں نے معدن الاسرار کا اصل نسخہ عبدالرحیم کو بھجوا دیا اور اس کی نقل شیخ برمزید کو دے دی۔[۱]

علمِ کلام کا اہم مسئلہ

حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے طورِ سینا پر حضرت موسیٰؑ سے بے حرف و بے صوت کلام کیا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے باحرف و باصوت سنا تھا لیکن شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ سے بے حرف و بے صوت کلام فرمایا اور آپؐ نے بھی بے حرف و بے صوت سنا تھا۔[۲]

سخاوت کی حد

حضرت رکن الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دنیا و عقبیٰ کی تمام نعمتوں کا ایک لقمہ بنا کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کسی کے منہ میں دے دیں تو یہ اسراف نہ ہو گا۔[۳]

بنگال کے بارے میں تأثر

ایک دن جامع ملفوظات کی موجودگی میں شاہ رکن الدینؒ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ دستر خوان پر دوسرے لوازمات کے علاوہ گھی بھی موجود تھا۔ حضرت نے گھی کی تعریف کی۔ جامع ملفوظات نے کہا کہ اس نے سنار گاؤں میں شیخ محمد افضل کے دستر خوان پر جیسا گھی دیکھا تھا ویسا پھر کبھی نہیں دیکھا۔ سنا ہے کہ درکھن شاہ پور میں ایسا ہی عمدہ گھی ہوتا ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا:

در بنگالہ ہیچ چیز را لذّت نے شود مگر خوبی روغن امروز از شما شنیدہ شدہ۔[۴]	بنگال میں کسی چیز میں لذّت نہیں ہوتی مگر گھی کی خوبی آج ہی تم سے سنی ہے۔

۱۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۶۲، ۶۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۷۔ اللہ تعالیٰ باحضرت موسیٰ برکوہ طُور کلام بے حرف و بے صوت گفت، اما حضرت موسیٰ باحرف و باصوت شنیدند۔ درشبِ معراج با پیغمبر کلام بے حرف و صوت بود و شنیدن پیغمبر ہم بے حرف و صوت۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۴۔ ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۲۳۔

وجوبِ جمعہ کے بارے میں فقہی مسئلہ

حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ دیہاتوں میں نمازِ جمعہ بغیر سلطان کے نائب کی اجازت کے جائز نہیں ہے۔ البتہ نائب سلطان کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون ہے؟ قاضی خود کو نائبِ سلطان سمجھتا ہے اور صدر بھی نائب ہونے کا دعوے دار ہے۔ اسی طرح صوبے دار بھی سلطان کا نائب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک صوبے دار ہی نائبِ سلطان ہے۔[۱]

ایک عارفانہ بات

حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک دیوانہ دیوار کے سائے میں بیٹھا کرتا تھا اور کبھی کبھی اس پر چڑھ کر بھی بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دن وہ دیوار گر گئی تو دیوانہ خوشی کے مارے رقص کرنے لگا۔ لوگوں نے اس سے کہا: "ارے پاگل! تیرا تو نقصان ہو گیا ہے۔ تجھے اس دیوار سے فائدہ پہنچا کرتا تھا' تو خوش ہو رہا ہے۔ اس میں خوشی کی بھلا کون سی بات ہے؟ دیوانے نے کہا: "خوشی اس بات کی ہے کہ وہ اس طرف کو گری ہے جس طرف وہ مائل تھی اور میں جس طرف مائل ہوں میں بھی اسی طرف گروں گا۔"[۲]

ایک انوکھی منطق

حضرت رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نماز ادا کر رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ آپؐ کیا کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "نماز ادا کر رہے ہیں۔ تم بھی آ جاؤ۔" حضرت علیؓ کہنے لگے کہ وہ اپنے باپ سے اجازت لے کر نماز میں شریک ہوں گے۔ چنانچہ حضرت علیؓ گھر جانے کے لئے ابھی چار قدم ہی چلے تھے کہ انہیں یاد آ گیا کہ ان کے والد نے ان سے یہ کہا تھا کہ حضورؐ انہیں جس بات کا حکم دیں وہ اس کی تعمیل کریں۔ حضرت علیؓ فوراً پلٹے اور نماز میں شریک ہو گئے۔ شاہ رکن الدینؒ فرماتے ہیں کہ یہ چار قدم پیچھے ہٹنے سے ہی خلافت میں ان کا چوتھا نمبر ہو گیا۔[۳]

---

۱ - ایضاً" ص ۵۷۔
۲ - ایضاً" ص ۵۳۔
۳ - ایضاً" ص ۴۴۔

کیمیا گری

قرونِ وسطیٰ میں مرتب ہونے والے ملفوظات میں کیمیا گری کا بڑا ذکر آیا ہے۔ حضرت رکن الدینؒ کے ملفوظات میں بھی سیّد مبارک کیمیا گر کا ذکر آیا ہے جو برگِ تنبول کو ورقِ طلا بنا دیتا تھا۔[۱]

سنار گاؤں کا ایک کتاب خانہ

ایک دن حضرت رکن الدینؒ اپنے متوسلین کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ اتفاق سے جامع ملفوظات بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے سنار گاؤں کے ایک بزرگ شیخ محمد افضل کا ذکر کیا اور ان کے کتاب خانے کی بڑی تعریف کی۔[۲] سنار گاؤں مدتوں تک اہلِ علم و فضل کا مرکز رہا ہے' اس لئے وہاں ایک بڑے کتاب خانے کی موجودگی چنداں باعث حیرت نہیں۔

بہلولی کا چلن

سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱ء - ۱۴۸۹ء) نے تانبے کے سکّے رائج کئے تھے جو اس کے نام کی مناسبت سے بہلولی کہلاتے تھے۔ دو صدیاں گزر جانے کے بعد ہنوز اورنگ زیب کے عہد میں یہ سکّے بہار میں مروّج تھے۔[۳]

چند تاریخی اغلاط

جامع ملفوظات نے شاہ جہان کی بغاوت کے ضمن میں یہ لکھا ہے کہ اس نے شہزادہ پرویز کو مروا ڈالا تھا۔[۴] یہاں اس سے سہو ہوا ہے۔ پرویز کی بجائے خسرو ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح اس نے شہزادہ عظیم الشان کا نام شہزادہ محمد عظیم الدین لکھا ہے[۵] جو صحیح نہیں ہے۔ حضرت رکن الدینؒ کی وفات (۱۷۰۵ء) کے ضمن میں شہزادہ محمد سلطان کا ذکر آیا ہے' حالانکہ وہ ۱۶۷۸ء میں فوت ہو چکا تھا۔ یہاں اس کے کسی فرزند کا نام ہونا چاہئے۔ ۱۷۰۵ء میں اورنگ زیب کے پوتوں میں بہرحال محمد سلطان نام کا کوئی شہزادہ بقیدِ حیات نہیں تھا' اس لئے جامع ملفوظات کو اشتباہ ہوا ہے۔

✪✪✪

۱ - ملفوظاتِ شاہ رکن الدین، ص ۳۰۔
۲ - ایضاً" ص ۱۹۔
۳ - ایضاً" ص ۷۹۔
۴ - ایضاً" ص ۱۱۲۔
۵ - ایضاً۔

ملفوظات
شاہ عبدالرزاق بانسویؒ

استاد العلماء مولانا نظام الدین فرنگی محلیؒ بانیٔ درسِ نظامی کے مرشد گرامی شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کا شمار برِعظیم پاک و ہند کے نامور مشائخ میں ہوتا ہے۔ ان کے ملفوظات مولانا نظام الدینؒ نے "مناقبِ رزاقیہ" کے عنوان سے جمع کئے ہیں جو شاہی پریس لکھنؤ سے ۱۹۲۱ء میں طبع ہو چکے ہیں۔ شاہ صاحب کے بارے میں ایک کتاب محمد خان شاہجہانپوری نے "ملفوظِ رزاقی" کے عنوان سے قلمبند کی تھی جو ۱۳۱۳ھ میں مطبع مجتبائی لکھنؤ سے چھپ چکی ہے۔ محمد خان شاہجہانپوری نے اپنے چچا سے شاہ عبدالرزاقؒ کے حالات سُنے تھے اور وہ سیّد غلام علی کے مرید تھے۔ سیّد غلام علی، غلام دوست محمدؒ کے فرزند اور شاہ عبدالرزاق کے پوتے تھے۔ شاہ جہانپوری نے "ملفوظِ رزاقی" کے آغاز میں اس واسطے کو سند کے طور پر نقل کیا ہے۔[۱]

شاہ عبدالرزاقؒ کی ولادت

مولانا نظام الدینؒ کی روایت ہے شاہ عبدالرزاقؒ ۱۱۳۶ھ میں فوت ہوئے اور اس وقت ان کی عمر نوّے برس کے لگ بھگ تھی۔[۲] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب ۱۰۴۶ھ/ ۱۶۳۶ء کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔ محمد خان شاہجہان پوری نے ان کی عمر بانوے برس لکھی ہے۔[۳] اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۴ء بنتا ہے اور یہ شاہجہان کا دور حکومت تھا۔ شاہ صاحب اپنے ننھیال بانسہ میں پیدا ہوئے۔

شاہ عبدالرزاقؒ کے آباؤ اجداد (ددھیال)

شاہ عبدالرزاقؒ کے والدِ بزرگوار سیّد عبدالرحیم کا آبائی وطن رسول پور تھا۔ ان کا شجرۂ

---

۱ ۔ محمد خان شاہجہانپوری، ملفوظِ رزاقی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۱۳ھ۔
۲ ۔ نظام الدین، مناقبِ رزاقیہ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۱ء، ص ۴۔
۳ ۔ ملفوظِ رزاقی، ص ۱۴۔

نسب حضرت امام باقرؒ سے جا ملتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے جدِ امجد سیّد معین الدین المخاطب بہ مبارز خان' شاہ بہاء الدین نقشبندؒ کے مرشد گرامی حضرت سیّد امیر کلالؒ کی اولاد سے تھے۔ سیّد معین الدین نے بدخشاں سے دہلی آ کر فوج میں ملازمت کر لی۔[۱] کچھ عرصہ بعد سورج پور بہریلہ (نزد دریا باد) کے حاکم سورج من نے حاکمِ وقت کے خلاف بغاوت کر دی۔ حاکمِ وقت نے مبارز خان کو اس کی سرکوبی پر مامور کیا۔ سورج من کی ہزیمت کے بعد مفتوحہ علاقہ مبارز خان کو بطورِ جاگیر ملا۔[۲]

محمد خان کی روایت ہے کہ تین چار پشتیں گزر جانے کے بعد سورج من کی اولاد سے ایک شخص مبارز خان کے احفاد کا ملازم ہوا اور اس نے جلد ہی اپنے آقا کا اعتبار حاصل کر لیا۔ ایک شب اس کی بیٹی کی شادی کے بہانے راجپوت برات لے کر آئے اور انہوں نے قلعہ میں داخل ہو کر سیّدوں کو قتل کر دیا۔ اس قتلِ عام کے وقت دو سیّد زادیاں اپنے میکے گئی ہوئی تھیں اور وہ دونوں حاملہ تھیں۔ مقتول سیّدوں کا ایک پروردہ خادم رسول خان کھوکھر اس واقعہ سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ اس زمانے میں صاحبِ حیثیت زمیندار تھا اور اس نے اپنے نام پر رسول پور آباد کیا اور وہاں ان کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھی۔[۳]

ان سیّد زادیوں کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ رسول خان نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور جب وہ کسی قابل ہوئے تو انہیں لے کر دہلی گیا اور بادشاہِ وقت سے ان کا تعارف کرایا۔ ان لڑکوں نے شاہی فوج کی مدد سے سورج پور کا علاقہ دوبارہ فتح کر لیا اور وہاں سکونت پذیر ہو گئے۔[۴]

شاہ عبدالرزاقؒ کے ننھیال

شاہ عبدالرزاقؒ کے نانا کا نام عبدالملک قدوائی تھا اور وہ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے۔

۱۔ شیخ ادھاری ۲۔ بساون ۳۔ شیخ مداری

دوسری بیٹی کے چار بیٹے تھے۔

---

۱ - ملفوظِ رزاقی، ص ۶۔
۲ - مفتی محمد رضا' بانیٔ درسِ نظامی' مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۳۔
۳ - ملفوظِ رزاقی' ص ۷۔
۴ - ایضاً۔

۱۔ عبدالرشید ۲۔ ابو تراب ۳۔ عبدالرزاق ۴۔ محمد یٰسین

عبدالملک کی وفات کے بعد اس کی جائیداد اس کے نواسوں میں تقسیم ہوئی۔[۱] ابو تراب اور محمد یٰسین موضع رسول پور مبارک آباد ہو گئے۔ عبدالرشید بانسہ چلا آیا اور نانا سے جو اراضی اسے ملی تھی اس کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

کچھ عرصہ بعد عبدالرشید کا خالہ زاد بھائی ادھاری کے ساتھ زمین کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک روز ادھاری نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ عبدالرشید کے لواحقین اس کی میت اٹھا کر رسول پور چلے گئے۔[۲] اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شاہ عبدالرزاقؒ رسول پور کی سکونت ترک کر کے بانسہ چلے آئے۔

تعلیم و تربیت

شاہ عبدالرزاقؒ کو عام طور پر اُمّی بتایا جاتا ہے۔ مولانا نظام الدینؒ لکھتے ہیں کہ موصوف لکھنا نہیں جانتے تھے۔ البتہ انہوں نے بچپن میں قرآن حکیم ناظرہ پڑھ لیا تھا اور فارسی زبان بولنی سیکھ لی تھی۔ ایک بار نوعمری میں انہیں مولانا جامیؒ کی تصنیف "یوسف زلیخا" پڑھنے کا شوق چرایا۔ ان کے والد بزرگوار نے انہیں ایک خادم کے ساتھ رودولی بھیجنے کا انتظام کیا۔ راستے میں عنایت اللہ نامی ایک درویش سے ان کی ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے پوچھا کہ ان کے ہاتھ میں کون سی کتاب ہے؟ انہوں نے جواب دیا "یوسف زلیخا"۔ اس نے کہا: "تمہیں اس سے کیا غرض ہے کہ یُوسف کس حال میں تھا اور زلیخا کی کیا حالت تھی۔"[۳] محمد خان شاہجہان پوری کی روایت ہے کہ عنایت اللہ نے ان سے کہا: "ترا چہ کار کہ یُوسف چناں خوبصورت و حسن و جمال داشت و زلیخا بر اُو چنان فریفتہ بود۔ اللہ تعالیٰ شما را برائے کارِ یادِ خود آفریدہ است۔"[۴] شاہ صاحب نے اس کی بات سن کر یُوسف زلیخا پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

فوج میں ملازمت

نوجوانی کے عالم میں شاہ عبدالرزاقؒ نے سپاہیانہ زندگی گزارنے کا عزم کیا۔ شاید اس کی ایک وجہ ان کے خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ ان کی خاندانی رقابت بھی تھی اور شاہ صاحب کچھ

---

۱ ۔ ملفوظِ رزاقی، ص ۳۸۔
۲ ۔ ایضاً، ص ۳۸ ۔ ۳۹۔
۳ ۔ مناقبِ رزاقیہ، ص ۹۔
۴ ۔ ملفوظِ رزاقی، ص ۲۰۔

عرصہ کے لئے بانسہ سے دُور رہنا چاہتے تھے۔ آغاز سفر میں ان کی ملاقات قصبہ امیٹھی[۱] میں شاہ محمد یوسف (خلیفہ شاہ غلام مجتبیٰ عرف مجا شاہ قلندر) سے ہوئی۔ شاہ صاحب نے ان کے ہاں نوکری کر لی۔ جب انہیں ان کے مرتبے کا علم ہوا تو شاہ صاحب نے نوکری ترک کر دی۔[۲] اس کے بعد ان کا یہ معمول بن گیا کہ جب ان کے آقا کو ان کے مقام کا علم ہو جاتا تو موصوف اس کی نوکری چھوڑ کر دوسری جگہ نوکری اختیار کر لیتے۔ ایک بار شاہ عبدالرزاقؒ نوکری کی تلاش میں احمد آباد جا نکلے۔ وہاں انہوں نے شیخ عبدالصمد قادری خدانماؒ (م ۱۱۰۶ھ) کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور چار ماہ ان کی خدمت میں گزارے۔[۳] بعد ازاں ان ہی کے حکم پر دہلی جا کر سیّد حسن رسول نماؒ سے ملے۔

مولانا نظام الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے حضرت عبدالصمدؒ سے کہا کہ عبدالرزاق کو چلّہ کا حکم دیں۔ انہوں نے جواب دیا "چلّہ وی بر پشتِ اسپ است"۔ مولانا کی روایت ہے کہ جو کشائش دوسرے بزرگوں کو خلوت میں ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے شاہ عبدالرزاقؒ کو گھوڑے کی پشت پر ہو گئی۔[۴]

مجاز سے حقیقت تک

نوجوانی کے عالم میں دکن میں قیام کے دوران شاہ صاحب ایک کھترانی پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ ایک کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھر جانے لگی تو حضرت بھی اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک پہنچ گئے اور اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ کھترانی نے ان کی یہ کیفیت ملاحظہ کی تو انہیں مخاطب کر کے کہنے لگی: "خدائے تو دَر تو نیست کہ دَرمن می نگری۔" اس کی یہ بات سن کر شاہ صاحب کی حالت غیر ہو گئی اور اس کے بعد اس کا خیال دل سے جاتا رہا۔[۵] شاہجہان پوری کی روایت ہے کہ ایک بار پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو ان کے مرشد ظاہر ہو کر ان سے کہنے لگے:

"محبوب خود را دَر خود باید نگریست و خود معشوق باید بود۔"[۶]

۱ - امیٹھی نام کے دو قصبے ہیں۔ ایک لکھنؤ کے نواح میں ہے جہاں حضرت نظام الدین بندگی کی درگاہ ہے اور دوسرا قصبہ، رائے بریلی سے بنارس جاتے ہوئے پڑتا ہے۔ یہ ضلع سلطانپور میں ہے۔ اس قصبہ سے چار کلو میٹر کے فاصلہ پر رام نگر میں ملک محمد جائسی کی درگاہ ہے۔

۲ - ملفوظِ رزاقی، ص ۴۷۔

۳ - مناقبِ رزاقیہ، ص ۱۱۔

۴ - ایضاً" بعنایتِ الٰہی برپشت اسپ کشادہ کار شدکہ با اولیای تمل در خلوت میشود۔"

۵ - ملفوظِ رزاقی، ص ۸۷۔

۶ - ایضاً" ص ۸۸۔

بانسہ میں مستقل قیام

جب شاہ صاحب نوکری چھوڑ کر مستقل طور پر بانسہ میں مقیم ہو گئے تو ان کے خالہ زاد بھائیوں کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اب وہ ان سے ضرور بدلہ لیں گے۔ شاہ صاحب نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کام میں لگے رہے۔ ایک رات ان کے مخالفین انہیں قتل کرنے کے ارادے سے دیوار پھلانگ کر ان کے گھر میں داخل ہو گئے۔ شاہ صاحب اس وقت "مستغرق مع الحق" تھے۔ شیخ ادہاری نے ان پر وار کیا جس سے ان کے ہاتھ پر خفیف سا زخم آیا۔ اتنے میں شاہ صاحب سنبھل گئے اور انہوں نے پلٹ کر جو وار کیا، تو شیخ ادھاری اپنا ایک بازو وہاں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ کوشش کی لیکن اس بار بھی ناکام رہے۔[1]

مولانا نظام الدینؒ کی عقیدت

مولانا نظام الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالرزاقؒ اُمّی تھے لیکن جو مسائل بڑے بڑے فقہا سلجھا نہ سکتے تھے وہ شاہ صاحب چٹکیوں میں حل کر لیتے تھے۔[2] خود مولانا نظام الدینؒ کی بیعت کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔

مشہور روایت ہے کہ نظام الدینؒ کا ایک شاگرد شاہ عبدالرزاقؒ کی خدمت میں جانے لگا۔ مولانا نے ایک دن اس سے غیر حاضری کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ شاہ صاحب کے ہاں چلا جاتا ہے۔ مولانا نے اسے خوب ڈانٹا لیکن وہ باز نہ آیا۔ ایک دن تنگ آ کر مولانا نے اس سے پوچھا کہ وہ "کانے جاہل" کے پاس کیا لینے جاتا ہے؟[3] اس نے شاہ صاحب کی بڑی تعریف کی اور مولانا سے کہا کہ وہ بھی ایک روز جا کر دیکھیں کہ وہ کس پایہ کے بزرگ ہیں۔ چنانچہ مولانا نظام الدینؒ ایک روز بغرض امتحان شاہ صاحب کے پاس گئے۔ راستے میں انہوں نے فقہ کے دو مشکل مسئلے ان سے پوچھنے کے لئے سوچ لئے۔ مولانا نے جاتے ہی شاہ صاحب سے سوال کیا کہ اگر کوئی نمازی پہلی رکعت میں غلطی سے سورۂ والناس پڑھ لے تو دوسری رکعت میں کون سی سُورت پڑھے؟ حضرت نے جواب دیا کہ پھر وہی سُورت پڑھے۔

---

۱ - ایضاً" ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

۲ - مناقب رزاقی۔

۳ - محمد اسلم، ماہنامہ 'ابلاغ کراچی' بابت مارچ اپریل ۱۹۸۰ء ص ۸۹۔

مولانا نے دوسرا سوال کیا کہ تیمم میں صرف ہاتھوں پر مسح کیا جاتا ہے، کیا کہنیوں تک بھی مسح کر سکتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگر کرنا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگر کوئی اور سوال کرنا ہو تو جلدی سے کر لیں، یہاں امام اعظمؒ کی رُوح موجود ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ انہیں اور بھی کئی کام ہیں۔ اس لئے وہ اس وقت عجلت میں ہیں۔ حضرت نظام الدینؒ، شاہ صاحب کی ولایت کے قائل ہو گئے اور اسی نشست میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔[۱] جب ان کے بھائی مولوی محمد رضاؒ کو اس کا علم ہوا تو انہیں بڑا رنج ہوا۔ وہ اکثر انہیں یہ طعنہ دیتے تھے کہ اِس زمانے میں اُن جیسا کوئی عالم نظر نہیں آتا اور انھوں نے ایک اُمّی کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ شاہ عبدالرزاقؒ کی بیعت کرتے وقت انھوں نے اپنے خاندان کے علم و فضل کا بھی خیال نہیں رکھا۔ مولوی محمد رضاؒ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ان کے بھائی پر "اُس جاہل فقیر" نے جادو کر دیا ہے۔ مولانا نظام الدینؒ کے برادر زادے مُلّا احمد عبدالحق کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اپنے چچا کو مخاطب کر کے فرمایا "فکر نہ کرو تم پر بھی جادو ہو جائے گا۔"[۲] چنانچہ کچھ عرصہ بعد مولوی محمد رضاؒ بھی شاہ صاحب کے مرید ہو گئے۔

علمائے فرنگی محل آج تک شاہ عبدالرزاقؒ کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرنگی محل میں ایک منبر پر اپنے دست مبارک سے پتھر کی سِل نصب کی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک فرنگی محل کا کوئی عالم خطبۂ جمعہ کے دَوران اس سِل پر نہیں بیٹھا، جسے شاہ صاحب کے ہاتھ لگے تھے۔

شاہ عبدالرزاقؒ کو مولانا نظام الدینؒ پر بڑا فخر تھا۔ موصوف نے ایک بار اپنے معتقدین کو مخاطب کر کے کہا "مولوی نظام الدین را در مجلس سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمسرِ جنید قدس سرہ می بینم۔"[۳]

ہمعصر بزرگوں سے تعلقات

لکھنؤ میں شاہ دوست محمدؒ نام کے ایک بزرگ رہتے تھے۔ شاہ صاحب کبھی کبھی ان کی ملاقات کو جایا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد بھی موصوف سال میں دو تین بار لکھنؤ جاتے

---

۱ - ایضاً

۲ - مفتی محمد رضا، بانیٔ درسِ نظامی، ص ۲۴۷۔

۳ - ملفوظِ رزاقی، ص ۱۳۸۔

اور ان کے مزار پر حاضری دیتے۔[۱] شاہجہانپوری کی روایت ہے کہ شاہ عبدالرزاق کے فرزند ان کی دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے شاہ صاحب نے ان کے نام کی مناسبت سے نومولود کا نام غلام دوست محمد رکھا۔[۲]

سیر و سیاحت

شاہ عبدالرزاقؒ کو سیر و سیاحت بہت پسند تھی۔ ان کے ملفوظات میں گجرات اور دکن کے علاوہ بہرائچ' سہالی' الہ آباد' دہلی' جونپور' پوہان' رودولی اور لکھنؤ جانے کا ذکر آتا ہے۔

کم خوری کی تلقین

مولانا نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالرزاقؒ ماہِ صیام میں صرف افطاری کیا کرتے تھے اور اس کے بعد کھانا تناول نہ فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے منع فرماتے تھے۔ حضرت ہمیشہ اپنے متوسّلین کو تقلیلِ طعام کی نصیحت کیا کرتے تھے۔[۳] درویش کے بارے میں ان کا یہ قول مشہور ہے:"پُر ساختن شکم درحق وی زہر قاتل است و کم خوردن تریاق مجرب۔"

چشتی سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت میراں بھیکؒ درویشوں کی کم خوری کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

سادھو بھُکّے بھجن کے بھوجن بھُکّے ناں
جیہڑے بھُکّے بھوجن کے' اوہ سادھو ناں

("سادھو بھجن کے بھوکے ہوا کرتے ہیں۔ بھوجن کے نہیں اور جو بھوجن کے بھوکے ہوتے ہیں وہ سادھو نہیں ہوتے")۔

مولانا نظام الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ عبدالرزاقؒ زیادہ سونے والے طلباء سے ناراض ہوا کرتے تھے۔ موصوف مظلوموں اور بچوں پر شفقت فرمایا کرتے تھے اور قاضی کے پاس کسی کی سفارش نہیں کرتے تھے۔

حضرت کی خانقاہ میں لنگر جاری تھا۔ ان میں تواضع بہت تھی اور ان کی خانقاہ میں ہر

---

۱ - "ایضاً" ص ۱۳۶۔
۲ - "ایضاً" ص ۱۴۳۔
۳ - مناقب رزاقیہ' ص ۴۔

طرح کے درویش آیا کرتے تھے۔ انہیں ضرورت کے مطابق کھانا اور لباس مہیا فرماتے اور وہ چند روز قیام کے بعد چلے جاتے۔

اودھ کی سیاسی حالت

شاہ عبدالرزاقؒ کے عہد میں اودھ کی سیاسی حالت اچھی نہ تھی۔ بانسہ کے گرد و نواح میں امن و امان مفقود تھا۔ بڑے بڑے زمیندار اپنے مخالفوں کی بستیاں لوٹتے اور جلاتے پھرتے تھے۔

محمد خان شاہجہانپوری لکھتا ہے کہ ناگر ہندوؤں کی ایک ذات تھی۔ اس قوم کا فرد اودھ کا صوبیدار تھا۔ لوگ اس کے ظلم و ستم سے نالاں تھے۔ ایک بار تنگ آ کر لوگوں نے شاہ عبدالرزاقؒ سے درخواست کی کہ اس کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں' شاہ صاحب نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد برہان الملک سعادت خان اودھ کا صوبیدار مقرر ہوا۔[1]

شیخ فرحت اللہ اور شیخ نصرت اللہ' امیٹھی کے زمیندار تھے اور اس علاقے میں ان جیسا کوئی امیر نہ تھا۔ انہوں نے فوج جمع کر کے اودھ کے حاکم برہان الملک سعادت خان کے خلاف بغاوت کر دی اور قرب و جوار کے علاقے میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ انہوں نے بانسہ کے نواح میں کولا اور بوجا نام کی شرفاؔ کی دو بستیاں دھڑی دھڑی کر کے لوٹیں اور عورتوں کی عصمت دری کی۔ لوگوں نے شاہ عبدالرزاقؒ کی خدمت میں اس ظلم و تعدی کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:

"بسیار بد کردند نتیجہ' اعمال خویش نیک نخواہند دید۔"

اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ فرحت اللہ اور نصرت اللہ نے شرفاء کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر ان کے سر کٹیں گے۔ ابھی اس واقعہ کو پیش آئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ برہان الملک فوج لے کر آیا اور اس نے ایک جھڑپ کے بعد دونوں باغی زمینداروں کو مع اہل و عیال گرفتار کر لیا۔ برہان الملک نے ان کے سر کاٹ کر لکھنؤ کے اکبری دروازے پر لٹکا دیے۔ شاہ صاحب کے ایک مرید شیخ محمد روشن ساکن رسالی نے بڑی تگ و دَو کے بعد ان کے اہلِ خانہ کو ضمانت دے کر رہا کروایا۔[2]

---

۱ - ملفوظِ رزاقی' ص ۱۰۶

۲ - ایضاً' ص ۵۶۔

ملفوظ رزاقی میں ایک ہندو زمیندار راجہ براہا کی سرکشی کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس نے ایک راجہ کے ساتھ فوجی اتحاد کر کے قدوارہ[1] پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن وہ فرحت اللہ اور نصرت اللہ کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا۔[2]

فرخ سیر کی گرفتاری

مولانا نظام الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالرزاقؒ نے عالم رُویا میں فرخ سیر کا دربار دیکھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے وزیر نے اسے گرفتار کر لیا۔ حضرت کو اس کا بڑا ملال ہوا۔ چند روز بعد انہوں نے کشف میں دیکھا کہ ایک سرکش بھینسے کو زمین پر گرا کر اس کی ناک میں نکیل ڈال رہے ہیں۔ وہ سرکش وزیر چونکہ سیاہ فام تھا اس لئے حضرت نے جان لیا کہ سیاہ بھینسے سے وزیر مراد ہے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد اطلاع ملی کہ وزیر قید ہو گیا ہے۔[3] محمد خان شاہجہانپوری نے اس وزیر کا نام عبداللہ قلمبند کیا ہے۔[4]

شاہ صاحب کے فرزندوں کے حالات کے ضمن میں صفدر جنگ اور مرہٹوں کی لڑائی کا ذکر آیا ہے۔ جن دنوں صفدر جنگ اور مرہٹے آپس میں لڑ رہے تھے تو لوگوں نے مولانا نظام الدینؒ سے پوچھا کہ ان کے خیال میں فتح کس کی ہو گی؟ انہوں نے جواب دیا "لا یعلم الغیب الا اللہ" مجھے اس کے بارے میں کیا خبر ہے۔ سید اسمٰعیل (مرید خاص شاہ عبدالرزاقؒ) نے اپنے بیٹے کمال احمد کو جو خدا یار خان کا ملازم ہے، صفدر جنگ کے لشکر میں بھیجا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ فتح صفدر جنگ کی ہو گی۔[5]

اس عہد کی سیاسی شخصیتیں

شاہ عبدالرزاقؒ کے فرزندوں کے ذکر میں نواب نصراللہ خان، نواب آصف الدولہ، شجاع الدولہ، نواب فیض اللہ خان، راجہ انوپ سنگھ زمیندارِ رام نگر، جعفر یار خان، الماس علی خان

---

۱ - قاضی قدوۃ الدین المعروف بہ قاضی قدوۃ کی اولاد بقول محمد خان شاہجہانپوری اودھ میں ۵۲ گاؤں کی مالک تھی۔ یہ علاقہ عرف عام میں قدوارہ کہلاتا تھا۔ اب بھی بڑا گاؤں، اچھے گاؤں، بہرا اور مسولی قدوائیوں کے مشہور قصبے ہیں۔

۲ - ملفوظ رزاقی، ص ۹۸۔

۳ - مناقب رزاقیہ، ص ۳۱۔

۴ - ملفوظ رزاقی، ص ۴۸۔

۵ - ایضاً" ص ۴۷۔

عالِ کاس گنج و کوڑیا گنج، حیدر بیگ خان نائب آصف الدولہ، راجہ نکیت رائے، نائب حیدر بیگ خان اور دوست محمد خان جیسی سیاسی شخصیتوں کے نام ملتے ہیں۔ اسی طرح بانسہ کے گرد و نواح کے علماء و مشائخ، ندی نالوں اور مواضعات کے نام بار بار ملفوظات میں آتے ہیں جن سے ملفوظات کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔

ہندو بیراگی سے دوستانہ مراسم

بانسہ کے نواح میں رام پور نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں اس زمانے میں چیت رام بیراگی رہتا تھا۔ اس کے اور شاہ عبدالرزاقؒ کے بڑے اچھے تعلقات تھے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا۔ ایک بار چیت رام نے شاہ صاحب کی دعوت کی اور اس موقع پر ایک ناٹک پیش کرنے کا اہتمام کیا جس میں کرشن جی کو گوپیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ حضرت نے جونہی ناٹک کے کرداروں پر نظر ڈالی وہ سب کچھ بھول کر رونے لگے۔ حضرت نے چیت رام سے کہا کہ اس نے انہیں مصنوعی کرشن دکھایا ہے، آپ اسے اصلی کرشن دکھائیں گے۔ چنانچہ اسی مجلس میں شاہ صاحب نے چیت رام کو کرشن جی کے درشن کرا دیئے۔ اس نے خوش ہو کر ان کی خدمت میں نذر پیش کی۔[۱]

ایک بار برھان الملک نے بانسہ پر حملہ کیا۔ اس کے بانسہ پہنچنے سے پہلے ہی حضرت نے اپنے اہل و عیال حفاظت کی غرض سے چیت رام کے ہاں بھیج دیئے۔[۲]

توکل علی اللہ

جب شاہ عبدالرزاقؒ کا وقتِ آخر آیا تو ان کے مریدوں نے عرض کیا کہ اپنے فرزند میاں غلام دوست محمد کو نصیحت فرمائیں۔ شاہ صاحب نے اسے مخاطب کر کے کہا: "استقامت کے ساتھ بیٹھنا اور امراء و سرکاری افسروں کے پاس حصولِ معاش کے لئے نہ جانا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے جو کچھ اپنے مرشد سے ملا تھا وہ میں تجھے دے رہا ہوں۔ اسی میں مشغول رہنا انشاء اللہ اسی میں نفع ہو گا اور خدا تجھ سے راضی رہے گا"۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ استقامت کس طرح حاصل ہو گی؟ شاہ صاحب نے جواب دیا "میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں رکھتا۔ رزّاق مطلق مجھے رزق پہنچاتا ہے اور اتنا دیتا ہے کہ میں اچھے اچھوں کی برابری کرتا ہوں۔[۳] شاہجہانپوری کی روایت ہے کہ

۱۔ ملفوظِ رزاقی، ص ۳۷۔
۲۔ ایضاً، ص ۹۹۔
۳۔ مناقبِ رزاقیہ، ص ۶۔

محمد شاہ کے عہد میں شاہ عبدالرزاقؒ کو حکومت کی طرف سے پانچ دیہات کی معافی کا پروانہ موصول ہوا۔ آپ نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور فرمایا "در خانۂ خالق و رزّاق ما کدام چیز موجود نیست کہ از مخلوق خواستہ شود۔"[۱]

وفات

شاہ عبدالرزاقؒ نے ۶ شوال ۱۱۳۶ھ/ ۲۴-۱۷۲۳ء کو بعارضہ نفخ شکم و درد قولنج وفات پائی۔ مولانا نظام الدینؒ نے ان کی عمر نوّے برس کے لگ بھگ اور شاہجہانپوری نے بانوے سال بتائی ہے۔

حلیۂ مبارک

مولانا نظام الدینؒ نے اپنے قلم سے اپنے مرشد کی تصویر یوں کھینچی ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، ناک بلند، دندان مبارک بڑے، داڑھی لمبی۔ آخر عمر میں گرمیٔ ریاضت کے سبب ان کی دائیں آنکھ بیٹھ گئی تھی۔[۲]

مزار شریف

شاہ عبدالرزاقؒ کا مزار موضع بانسہ ضلع بارہ بنکی میں ہے ----- بارہ بنکی اور لکھنؤ سے وہاں تک بس بھی جاتی ہے لیکن وہ دن میں دو تین پھیرے ہی لگاتی ہے۔ اس لئے عام طور پر لوگ بارہ بنکی سے گونڈہ جانے والی سڑک پر بس میں سفر کرتے ہیں اور بڑے گاؤں کے چوراہے پر اتر جاتے ہیں۔ چوراہے سے بڑا گاؤں قریبا" ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ بڑے گاؤں سے بانسہ کا فاصلہ تین میل ہے اور وہاں سے بانسہ جانے کے لئے کھڑکھڑا مل جاتا ہے۔[۳]

---

۱ - ملفوظِ رزاقی، ص ۹۶۔

۲ - مناقبِ رزاقیہ، ص ۴۔

۳ - کھڑکھڑا بڑی تکلیف دہ سواری ہے اور اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں کے ریڑے کو لکڑی کوچ سمجھنا چاہئے۔ کھڑکھڑے پر سامان لدھا ہوا ہوتا ہے اور سامان کے اوپر جہاں جگہ ملتی ہے مسافر بیٹھ جاتے ہیں۔ دو تین مسافروں کا رخ سامنے کی طرف ہوتا ہے اور دو تین کا دائیں جانب اور اتنوں ہی کا بائیں جانب۔ اسی طرح دو تین مسافر پیچھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ کھڑکھڑے کے پہیے پر لوہے کا چکّر چڑھا ہوا ہوتا ہے اور جب وہ کنکروں سے بنی ہوئی سڑک پر چلتا ہے تو مسافر ہچکولے کھانے لگتے ہیں۔

بانسہ شریف ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور مکانات اکثر کچے ہیں جن پر پھونس کی چھتیں ڈالی گئی ہیں۔ گاؤں کے ایک سرے پر شاہ عبدالرزاقؒ کی درگاہ ہے۔ ایک قاش دار گنبد کے نیچے شاہ صاحبؒ محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو زائرین بھی وہاں آتے ہیں۔

ہمارے دوست اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے سابق رفیق شاہد حسین رزّاقی، شاہ عبدالرزاقؒ کی اولاد سے ہیں۔ ان کا گھر بھی درگاہ سے قریب واقع ہے۔ شاید پورے گاؤں میں یہی ایک پختہ گھر ہے۔ ان دنوں شاہد صاحب کے بھتیجے شنّو میاں اس مکان میں رہتے ہیں۔

بانسہ کے ارد گرد کا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ اس کے نواح میں کئی ندیاں بہتی ہیں۔ جس زمانے میں راقم الحروف وہاں گیا اُن دنوں دھان کی فصل کا موسم تھا اور تا حدِ نظر ہریالی ہی ہریالی نظر آتی تھی۔

اَولاد و احفاد

شاہ عبدالرزاقؒ نے تین نکاح کئے۔

زوجۂ اوّل سے شاہ کرم اللہ (م ۱۲۰۷ھ) پیدا ہوئے۔ شاہ کرم اللہ کے دو بیٹے تھے۔ سیّد غلام حسن اور سیّد نعمت علی۔ اوّل الذکر اولادِ نرینہ سے محروم رہا اور متوخر الذکر کا ایک بیٹا تھا جس کا نام الٰہی بخش تھا۔

زوجۂ دوم سے شاہ غلام دوست محمد (م ۱۱۹۷ھ) پیدا ہوئے۔ ان کے تین فرزند تھے۔ سیّد حسین علی عرف شاہ بدلے، شاہ غضنفر علی اور سیّد غلام علی۔ اوّل الذکر کا ایک بیٹا تھا جس کا نام سیّد مظفر علی تھا۔ ثانی الذکر کے فرزند کا نام ہزبر علی اور مؤخر الذکر کے بیٹے کا نام شیر علی تھا۔

شاہ غلام دوست محمد نے مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا مزار وہیں محلّہ کریم آباد میں ہے۔

تیسری زوجہ سے شاہ منگری پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالرزاقؒ نے انھیں رُودَولی میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ شاہ منگری کے دو بیٹے تھے۔ سیّد غلام حسین اور سیّد غلام حسن۔ اوّل الذکر لاولد فوت ہوا اور ثانی الذکر اولادِ نرینہ سے محروم رہا لیکن اس کی بیٹی سے اولاد کا سلسلہ جاری ہوا۔[1]

---

۱ - ملفوظِ رزاقی، ص ۱۳۲ - ۱۳۵۔

مرید و خلفاء

محمد خان شاہجہان پوری کی روایت ہے کہ شاہ عبدالرزاقؒ کے تین صد مرید تھے اور انہوں نے ان میں سے بائیس افراد کو خلافت سے نوازا تھا۔ ان کے خلفاء میں حضرت نظام الدینؒ اور مولوی محمد رضاؒ کے نام سرفہرست ہیں۔

شروع شروع میں مولوی محمد رضاء شاہ عبدالرزاقؒ کے بڑے مخالف تھے اور اپنے بھائی نظام الدینؒ کو طعنے دیا کرتے تھے کہ انہوں نے "جاہل اور کانے فقیر" کی بیعت کرتے وقت اپنے خاندان کی علمی وجاہت کا بھی خیال نہیں رکھا۔ مولوی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان کے بھائی پر "جاہل اور کانے فقیر" نے جادو کر دیا ہے۔ مولانا نظام الدینؒ کے برادر زادے احمد عبدالحق نے ایک روز ان کی بات سن کر کہا: "فکر نہ کرو۔ ایک دن تم پر بھی جادو چل جائے گا۔"

کچھ عرصہ بعد حضور نبی کریمؐ سے خواب میں اشارہ پا کر مولوی محمد رضا بھی بیعت کے لئے بھاگم بھاگ بانسہ پہنچے۔ شاہ صاحب نے اپنے ساتھیوں سے پُوربی لہجے میں کہا: "بڑا منکر آوت ہے۔"۱ شاہ صاحب ان کی آمد سے قبل مجلس سے اٹھ کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔ مولوی صاحب نے دروازے پر دستک دی' اندر سے سوال ہوا: "کون ہے"؟ ادھر سے جواب دیا "محمد رضا"۔ شاہ صاحب نے نام سن کر فرمایا "وہی محمد رضا جو ایک اونچے خاندان کا فرد ہے اور اپنے زمانے کا پیشوا ہے۔ اسے ایک جاہل فقیر سے کیا سروکار؟" حضرت نے تمام باتیں دہرائیں جو وہ ان کے بارے کہا کرتے تھے۔

مولوی صاحب نے عرض کیا: "یقیناً" مجھے آپ سے انکار تھا لیکن کیا کروں حضور نبی کریمؐ کے حکم سے آیا ہوں۔" شاہ صاحب نے فرمایا: "اچھا! تو تمہیں لکھنو چل کر مرید کریں گے۔" یہاں انتظار کی تاب کہاں تھی۔ عرض کیا: "حضرت کب لکھنو تشریف لائیں گے۔" شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان دنوں سائیس نہیں ہے۔ وہ گھوڑے کا سامان سر پر رکھ کر ساتھ چلتا ہے۔ جب وہ آ جائے گا تو پھر لکھنؤ کا قصد کریں گے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ سائیس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جو حاضر ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد رضا گھوڑے کا سامان سر پر اٹھا کر لکھنو تک حضرت کے ہمرکاب رہے۔ لکھنؤ پہنچ کر حضرت نے مرید کیا۔ بیعت کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے مرشد کے ہو کر رہ گئے۔۲

علمائے فرنگی محل کی بیعت سے شاہ عبدالرزاق کی بزرگی کا شہرہ چار دانگ عالم میں بج گیا۔ فرنگی محل کے علماء آج تک شاہ صاحب اور ان کی اولاد کا دل و جان سے احترام کرتے ہیں۔

✪✪✪

۱۔ مفتی محمد رضا' بانی درس نظامی' ص ۲۴۸۔

۲۔ ایضاً' ص ۲۴۸ ' ۲۵۲۔

محبوبُ القلوب

بندگی نظام الدینؒ (۱۵۷۲ء - ۱۴۹۴ء) لودھیوں، سُوریوں اور مغلوں کے دورِ حکومت میں امیٹھی ضلع لکھنؤ میں ایک ولیِ کامل ہو گذرے ہیں۔ ان کا شجرۂ نسب خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔[1]

ان کے آباؤ اجداد کا وطن موضع سترکھ ضلع بارہ بنکی تھا۔ جب قصبہ امیٹھی کی بنا پڑی تو سلطانِ وقت نے ان کے جدِ ششم شیخ معروف کو سترکھ سے لا کر امیٹھی میں آباد کیا اور وہاں کا قاضی مقرر کیا۔[2]

ولادتِ با سعادت

جامع ملفوظات محمد علی لکھتے ہیں کہ بندگی نظام الدینؒ یکم محرم ۹۰۰ھ / ۲ اکتوبر ۱۴۹۴ء کو سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت میں امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یُو پی میں امیٹھی نام کے دو قصبے ہیں۔ ایک لکھنؤ سے ۲۷ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے، جسے بندگی نظام الدینؒ کا مسقط الراس ہونے کا شرف حاصل ہے اور دوسرا قصبہ ضلع سلطانپور میں رائے بریلی۔ بنارس ریلوے لائن پر رائے بریلی سے ۶۰ کلو میٹر کے فاصلے پر آباد ہے۔ یہ مسز اندرا گاندھی کا حلقۂ انتخاب تھا۔

---

۱ - محمد علی، محبوب القلوب، ص ۸۔

۲ - ایضاً، ص ۹۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اُن کا پورا نام شیخ نظام الدین انبیٹھی لکھا ہے۔[۱] مُلّا عبدالقادر بدایونی نے ان کا نام میاں شیخ نظام الدین انبیٹھی وال تحریر کیا ہے[۲] اور طبقاتِ اکبری کے مصنف مُلّا نظام الدین احمد نے ان کا نام نامی شیخ نظام الدین امیٹھی وال قلمبند کیا ہے۔[۳] موصوف امیٹھی کے رہنے والے تھے اس لئے امیٹھی کی نسبت سے انہیں امیٹھوی لکھنا صحیح ہو گا۔

تعلیم و تربیت

بندگی نظام الدینؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطنِ مالوف میں حاصل کی اور چودہ سال کی عمر میں وہ چند طلبہ کی معیت میں جونپور روانہ ہوئے۔ سفر کے دوران انہوں نے اپنے ساتھیوں کا سامان اٹھانے اور ان کے لئے کھانا پکانے کی خدمت اپنے ذمے لی اور اس شان سے میاں بندگی جونپور پہنچے۔

جونپور اس زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور وہاں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ صاحبِ "بحرِ مّواج" نے علم کی جو شمع روشن کی تھی اس کے انوار جونپور اور اس کے اطراف کو منّور کر رہے تھے۔ جس زمانے میں بندگی نظام الدین جونپور تشریف لے گئے اُن دنوں وہاں شیخ معروف جونپوری، شیخ نظام الدین اَوجھڑ، شیخ دانیال جونپوری، شاہ تمّن غازی پوری، میر عدل غازی پوری، سیّد محمد جونپوری، شیخ حسن بن طاہر جونپوری، شیخ محمد حسن جونپوری اور قاضی صلاح الدین خلیل کے درس و تدریس کا بڑا شہرہ تھا۔[۴] بندگی نظام الدین نے شیخ معروف کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا اور پھر ان کے دستِ مبارک پر سلسلہ قادریہ اور چشتیہ نظامیہ میں بیعت کر لی۔

شیخ معروف جونپوریؒ

شیخ معروف لودھیوں کے عہد میں جونپور میں بڑے زبردست عالم اور شیخ طریقت ہو

۱ - عبدالحق محدّث دہلویؒ، اخبار الاخیار، دہلی: ۱۳۳۲ھ، ص ۲۸۴۔
۲ - عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ: ۱۸۶۹ء، ج ۳، ص ۱۳۰۔
۳ - نظام الدین احمد، طبقاتِ اکبری، کلکتہ: ۱۹۳۱ء، ج ۲، ص ۴۷۱۔
۴ - ابو العرفان ندوی، نذرِ مقبول، لکھنؤ: ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۔

گذرے ہیں۔ موصوف مولانا الہداد کے مرید اور شاگردِ رشید تھے۔ جن دنوں بندگی نظام الدین ان سے علم حاصل کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے تلمیذِ رشید سے ایک عبارت پڑھوائی۔ اس عبارت میں ایک جگہ 'معروف' لکھا ہوا تھا۔ بندگی نظام الدین نے اس لفظ کی ادائیگی کو سوئے ادب خیال کرتے ہوئے 'مشہور' پڑھا۔ اُستاد گرامی نے دوبارہ وہ عبارت پڑھنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے پھر 'معروف' کو 'مشہور' پڑھا۔ اُستاد سمجھ گئے کہ مؤدب شاگرد ان کے حضور ان کا نام لینا بے ادبی سمجھتا ہے۔[1]

بندگی نظام الدین نے شیخ معروف کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی اور ان کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، عبداللہ خویشگی اور ملا نظام الدین احمد اس پر متفق ہیں کہ انہوں نے ابتدائے سلوک میں بڑا سخت مجاہدہ کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی فرماتے ہیں کہ بندگی نظام الدین نے بہت جلد منازلِ سلوک طے کر لیں اور امیٹھی میں مسندِ رشد و ہدایت پر تشریف فرما ہوئے۔[2]

شیخ الہداد جونپوری

شیخ معروف جونپوری کے اُستاد اور شیخ طریقت شیخ الہداد المعروف بہ مولانا الہدیہ ایک واسطے سے ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی کے شاگردِ رشید اور شیخ حسام الدین مانکپوری کے خلیفۂ ارشد راجی سید حامد شاہ کے مرید تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے انہیں "از اعاظم علمای جونپور" تحریر فرمایا ہے۔[3] شیخ الہداد نے شرح کافیہ، شرح ہدایہ، شرح بزدوی اور شرح مدارک جیسی متعدد بلند پایہ کتابیں اپنی علمی یادگار چھوڑی ہیں۔[4] شیخ عبدالحق محدث اور عبداللہ خویشگی لکھتے ہیں کہ ابتداء میں انہیں تصوف سے کوئی مس نہ تھا۔ ان کے جگری دوست اور ہم سبق شیخ حسن طاہر، راجی سید حامد شاہ کے مرید ہو گئے۔ جب انہیں اس کا علم ہوا تو انہوں نے شیخ موصوف سے کہا کہ انہوں نے "عزتِ علم و طالب علماں" برباد کر دی ہے۔ ان کی بات

۱ - محمد علی، کتابِ مذکور، ص ۱۵۔
۲ - عبدالقادر بدایونی، کتابِ مذکور، ص ۱۵۔
۳ - عبدالحق محدث دہلوی، کتابِ مذکور، ص ۱۹۷۔
۴ - عبداللہ خویشگی، معارج الولایت، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ نمبر 25 - II، ورق ۲۹۸ الف۔

سن کر شیخ حسن طاہر نے کہا کہ پہلے ایک بار ان سے مل لیں' اس کے بعد جو چاہیں ان سے کہیں۔ شیخ الہداد ملاقات پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے چند مشکل سوالات تیار کر لئے۔ ملاقات کے وقت راجی سید حامد شاہ نے انہیں سوالات کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور خود ہی ان موضوعات پر گفتگو شروع کر دی اور ان کے تمام اشکال رفع کر دیئے۔ مولانا الہداد ان کی رُوحانیت اور تبحرِ علم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے مرید ہو گئے۔[۱]

مولانا الہداد نے جونپور میں محلّہ رضوی خاں میں درسگاہ قائم کی جہاں دُور دُور سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کے لئے آتے۔ ان کے بعد ان کے فرزند شیخ بھکاری جونپوری نے اس درسگاہ کی روایت کو قائم رکھا۔[۲]

بندگی نظام الدین کا قیامِ امیٹھی

شیخ معروف سے حصولِ خلافت کے بعد بندگی نظام الدین نے امیٹھی میں مسندِ ارشاد کو زینت بخشی۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی رقم طراز ہیں کہ موصوف اپنی قیام گاہ سے صرف مسجد تک آتے تھے اور کہیں نہیں جاتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار شیخ سعدؒ کے مزار کی زیارت کے لئے خیرآباد تشریف لے جاتے تھے۔[۳]

انہیں احیاء العلوم' عوارف المعارف' رسالۂ مکیّہ اور آداب المریدین جیسی کتابیں بے حد مرغوب تھیں اور ان کا مطالعہ اور درس جاری رکھتے تھے۔ عبداللہ خویشگی سے روایت ہے کہ بندگی نظام الدین سماع سے کامل اجتناب کرتے تھے اور اپنے مریدوں کو بھی سماع سننے سے منع کرتے تھے۔ ان کا یہ قول بڑا مشہور ہے کہ سماع کے بارے میں ہم اختلاف میں کیوں پڑیں۔ اگر تقلید ہی کرنی ہے تو پھر متأخرین کی بجائے اپنے بڑوں (متقدمین) کی کریں۔[۴]

بندگی نظام الدین کو کشف القلوب بہت ہوتا تھا۔ ان کے تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ جو شخص بھی ان کی ملاقات کو جاتا وہ کشفُ القلوب اور اشراقِ باطن کا مشاہدہ ضرور کرتا تھا۔

---

۱ - ایضاً' ورق ۲۹۸ ب۔
۲ - ابوالعرفان ندوی' تذکرِ مقبول' ص ۱۵۔
۳ - عبدالقادر بدایونی' کتابِ مذکور' ص ۱۶۔
۴ - عبداللہ خویشگی' کتابِ مذکور' ورق ۳۲۸ الف۔

ملّا عبدالقادر بدایونی نے شیخ موصوف کو جوتے پہن کر نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ملّا صاحب کے دل میں خیال گذرا تو بندگی نظام الدین نے فرمایا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھار جوتے پہن کر نماز ادا کر لیتے تھے اس لئے موصوف اس عمل کو سنّت سمجھ کر کرتے ہیں۔[۱] اسی طرح حنفی ہونے کے باوجود بندگی نظام الدین فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔ وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک امام کی اقتداء میں فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ حنفی ہونے کے باوجود امام شافعیؒ کے قول پر عمل کرتے تھے۔[۲] اسی طرح ان کے ہاں جمعہ کے خطبے میں حاکمِ وقت کی مدح کرنے کی ممانعت تھی اور خطیب کو اس کا پابند کیا ہوا تھا کہ وہ بادشاہ کی مدح مطلقاً نہ کرے۔

شکار کا شوق

عبداللہ خویشگی سے منقول ہے کہ بندگی نظام الدین کو پرندوں کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ وہ کبھی کبھی شکار کے ارادے سے گھر سے نکلتے تو پرندے آ کر ان کے ہاتھ پر بیٹھ جاتے۔ موصوف انہیں پکڑ کر گھر لے جاتے اور وہاں پہنچ کر انہیں رہا کر دیتے تھے۔[۳]

بدایونی کا مشاہدہ

ملّا عبدالقادر بدایونی ایک بار بندگی نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس روز حضرت نے درس کے دوران یہ شعر پڑھا:

صوفیاں در دمی دو عید کنند
عنکبوتاں مگس قدید کنند

بدایونی کی جو شامت آئی تو اس نے حضرت سے اس شعر کا مطلب پوچھ لیا۔ اس پر حضرت سخت ناراض ہوئے اور ناراضگی کے عالم میں کہنے لگے کہ اس کا مطلب بایزید و جنید یا شبلی و منصور پوچھیں تو مناسب ہے۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟ بڑے آ گئے شعر کا مطلب پوچھنے والے۔ بدایونی سر جھکائے بیٹھا رہا اور جب حضرت خاموش ہو گئے تو بدایونی اٹھ کر اپنی

---

۱ ۔ عبدالقادر بدایونی، کتابِ مذکور، ص ۱۶۔
۲ ۔ عبداللہ خویشگی، کتابِ مذکور، ص ۳۲۸ ب۔
۳ ۔ ایضاً۔

قیام گاہ پر چلا گیا۔ اسی شام عید کا چاند طلوع ہوا لیکن بدایونی حضرت سے اس قدر خائف تھا کہ نماز کے لئے مسجد میں بھی نہ گیا کہ وہاں ان کے ساتھ مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ جب رات کو کھانے کا وقت ہوا تو حضرت نے کھانا اور حلوہ اس کے لئے بھجوایا۔ عید کے روز بدایونی کے بھائی شیخ محمد نے، جو بندگی نظام الدین کا مرید تھا، اپنے بھائی کی سفارش کی تو حضرت نے اسے معاف کر دیا اور فرمایا کہ وہ کسی سے ناراض نہیں ہوا کرتے۔[1]

جب بدایونی نے انہیں دیکھا اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس کے لگ بھگ تھی اور بقول بدایونی اس عمر میں بھی "توالد و تناسل ازو می شد"۔[2]

بندگی نظام الدین کا وصال

محبوب القلوب میں محمد علی نے ان کا یوم وفات ۲۹ ذی قعدہ اور سال وفات ۹۷۹ھ (۱۵ مارچ ۱۵۷۲ء) تحریر کیا ہے۔[3] ان کے لوح مزار پر بھی ۹۷۹ھ کندہ ہے۔ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں اور مُلا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں بھی یہی سن نقل کیا ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور عبداللہ خویشگی کے خیال میں بندگی نظام الدین نے ۹۸۱ھ میں وفات پائی۔[4] ان دونوں حضرات کا بیان صحیح نہیں ہے۔ معلوم نہیں ان کی سند کیا ہے؟

درگاہ بندگی نظام الدین

راقم آثم ۲۷ اگست ۱۹۸۳ء کو لکھنؤ ہوتے ہوئے امیٹھی پہنچا۔ پھلواری شریف کی طرح امیٹھی بھی بیحد گندہ قصبہ ہے۔ گلیوں میں غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور نکاسیٔ آب کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مسلمانوں کی اس رُوحانی بستی میں غیر مسلموں نے سؤر پالے ہوئے تھے جو گلیوں میں غلاظت کے ڈھیروں پر لوٹیں لگا رہے تھے۔ اس قصبے میں آباد گھر کم اور بے چراغ زیادہ ہیں۔ میرے استفسار پر لوگوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ء میں یہاں کی بیشتر آبادی پاکستان چلی گئی تھی۔

بندگی نظام الدین کی درگاہ تک پہنچنے کے لئے پورے قصبے میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے

---

۱ - عبدالقادر بدایونی، کتاب مذکور، ص ۴۳ - ۲۱۔
۲ - ایضاً، ص ۴۴۔
۳ - محمد علی، محبوب القلوب، ص ۱۷۵۔
۴ - i۔ عبدالحق محدث دہلویؒ، کتاب مذکور، ص ۲۸۵۔
ii۔ عبداللہ خویشگی، کتاب مذکور، ص ۳۲۸ ب۔

ملّا احمد جیونؒ صاحبِ تفسیرِ احمدی (م ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء) کا مقبرہ آتا ہے جس کی پیشانی پر سنگِ سرخ کا کتبہ نصب ہے جو بلندی پر ہونے کی وجہ سے مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ بعض لوگ ان کے مزار کی نشاندہی دہلی میں خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ میں کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ ملّا احمد جیونؒ کا انتقال دہلی میں ہوا اور انہیں امانتاً درگاہ خواجہ باقی باللہؒ میں دفنایا گیا۔ بعد ازاں ان کا تابوت امیٹھی منتقل کر دیا گیا۔[1] موصوف بندگی نظام الدین کے احفاد میں سے تھے۔

ملّا احمد جیونؒ کے مزار سے ایک سو میٹر کے فاصلے پر بندگی نظام الدینؒ کی درگاہ ہے۔ مقبرے کی عمارت ہشت پہلو ہے اور اس کے اوپر گنبد بنا ہوا ہے۔ مقبرے کے دروازے پر جو کتبہ نصب ہے وہ مُرورِ زمانہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ البتہ مزار کے سرہانے جو کتبہ لگا ہوا ہے اس کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اس کے سامنے کی جانب سورۂ فاتحہ خطِ ثلث میں منقوش ہے اور پشت کی جانب یہ ابیات کندہ ہیں:

شبی در خوابم آمد قطبِ عالم — نظامِ بحر و بر از مہربانی
طلب کردہ ز من تاریخِ فوتش — کہ بود برسرِ لوحش نشانی
بحر فکر در رقمِ زمانی — خرد گفتا باد "شیخِ جہانی"

۹۷۹ھ

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات محمد علی بن عبدالجبار بن عبدالوہاب بن بندگی نظام الدینؒ ہیں۔ انہوں نے خود تو حضرت کا زمانہ نہیں پایا لیکن ان کے چچا شیخ لیسین اور ماموں علیم اللہ بندگی نظام الدینؒ سے فیضیاب ہوئے تھے۔ محمد علی کو ان دونوں بزرگوں سے شرفِ تلمّذ بھی تھا۔ ان کے علاوہ جامع ملفوظات نے شیخ عبدالرحیم گوپامئوی سے بھی روایات لی ہیں۔ محمد علی نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سَنَد کے ساتھ لکھا ہے۔ اس لئے محبوب القلوب کی حیثیت سرور الصدور جیسی ہے کہ جامع ملفوظات کا صاحبِ ملفوظات کے ساتھ لقا ثابت نہیں۔

جامع ملفوظات محمد علی ایک ذی علم بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ وہ شیخ عیسیٰ جند اللہ سندھی برہانپوریؒ (م ۱۶۲۱ء)، حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ (م ۱۶۲۴ء)، مرزا

---

۱ - صباح الدین عبدالرحمٰن، بزمِ تیموریہ، اعظم گڑھ ۱۹۸۱ء ج ۳، ص ۴۔

حسام الدینؒ خلیفہ حضرت باقی باللہؒ (م ۱۶۳۳ء) اور میر محمد نعمان بدخشیؒ ثم اکبر آبادیؒ (م ۱۶۳۸ء) کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔

محبوب القلوب فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اور غیر مطبوعہ تھی۔ محبیِ مکرم بندگی شاہ محمد برہان الدین بقاؔ نظامی نے، جو بندگی نظام الدین کے رُوحانی سلسلے میں شیخ معروف المعروف بہ گودڑ شاہؒ (م ۱۹۶۴ء) کے خلیفۂ خاص ہیں، شاہ محمد سراج عطاء سلونی سے اس دُرِ نایاب کا اردو میں سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کرایا جو "انوارِ بندگی" کے عنوان سے چند سال ہوئے (تاریخ اشاعت ندارد) کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی اساس یہی ترجمہ ہے، جو بقاؔ نظامی صاحب نے ازرہِ شفقت اس عاجز کو عطا کیا تھا۔

محبوب القلوب کی اہمیت

تاریخی نقطۂ نظر سے محبوب القلوب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ راقم آثم سے پہلے کسی مؤرخ نے اسے بطورِ ماخذ استعمال نہیں کیا۔ بندگی نظام الدینؒ نے سلطان سکندر لودھی، ابراہیم لودھی، بابر، ہمایوں، شیر شاہ، اسلام شاہ، عادل شاہ اور اکبر کا زمانہ پایا تھا۔ پانی پت کی پہلی اور پھر دوسری لڑائی ان کے سامنے ہوئی۔ انہوں نے مغلوں اور افغانوں کی کشمکش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان دونوں گروہوں کے افراد ان کی خدمتِ اقدس میں حصولِ دعا و برکت کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ جب خانِ زمان علی قلی خاں نے اکبر کے خلاف بغاوت کی اور وہ اپنے چند رفقاء کے ہمراہ حصولِ دعا کی غرض سے بندگی نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا تو اسے آتے دیکھ کر حضرت نے حاضرینِ مجلس سے کہا کہ وہ فرش اٹھالیں کیونکہ "بہت گندے لوگ" آ رہے ہیں۔

حضرتِ والا قدر نے خطیب کو عادل شاہ کے نام کا خطبہ امیٹھی میں پڑھنے سے روک دیا۔ جب اس علاقے کے افغان حاکم نے اس کے نام کا خطبہ پڑھنے پر اصرار کیا تو حضرت نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی بادشاہت برائے نام ہے، ہندوستان کی بادشاہت ایک نو عمر لڑکے (اکبر) کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ انہوں نے ہیموں بقال کے گماشتوں کا دَور بھی دیکھا اور ہندوؤں کی چیرہ دستیاں بھی برداشت کیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ ملفوظات بڑا اہم ہے۔

شیر شاہ سوری

بندگی نظام الدین نے ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے مابین ہونے والی جنگوں کو بہت قریب

سے دیکھا تھا۔ موصوف اس شاہراہ پر آباد تھے جو بنگال و بہار کو دارالحکومت آگرہ سے ملاتی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب بھابھوج پور نزد چونسہ میں ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر دارالحکومت کی جانب فرار ہوا تو شیر شاہ نے اس کا تعاقب کر کے حاجی پور (بہار) سے لے کر قنوج تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ قنوج کے مقام پر ایک بار پھر معرکۂ کارزار گرم ہوا جس میں ہمایوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

عام تاریخوں میں جنگِ چونسہ کا ذکر آتا ہے مگر محبوب القلوب پہلی کتاب ہے جس میں بھابھوج پور کا نام آیا ہے۔[1]

ہمایوں اور شیر شاہ کے مابین ہونے والی جنگوں کے دوران انتظامِ سلطنت درہم برہم ہو گیا تھا۔ کاشت کاروں نے سرکاری واجبات خزانے میں جمع نہ کرائے۔ بندگی نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ جب شیر شاہ نے عنانِ اقتدار سنبھالی تو اس نے عوام سے کہا کہ وہ دو سال کے واجبات فوراً سرکاری خزانے میں جمع کروا دیں۔ حضرت ہی سے روایت ہے کہ لوگوں نے زیورات اور گھر کا سامان فروخت کر کے واجبات ادا کئے اور جن لوگوں میں واجبات ادا کرنے کی استطاعت نہ تھی وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر فرار ہو گئے۔[2]

بندگی نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ شیر شاہ علماء کرام کی لیاقت اور قابلیت جانچنے کے بعد انہیں مدد معاش کے لئے اراضی دیا کرتا تھا۔ ایک موقع پر اس نے حضرت نظام الدینؒ کے ہمراہ آنے والے علماء سے سوالات کئے اور خود حضرتِ والا قدر نے اس موقع پر آیاتِ قرآنی کی شانِ نزول اور تفسیر بیان فرمائی۔[3]

سلطان عادل شاہ

اسلام شاہ سوری (م ۱۵۵۳ء) کی وفات کے بعد اس کا بیٹا فیروز تخت نشین ہوا لیکن تین روز بعد اس کے ماموں اور شیر شاہ کے برادر زادے مبارز خان نے اسے قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا اور محمد عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے دادِ حکمرانی دینے لگا۔ تمام ملک میں اس کے

---

۱ - محمد علی، محبوب القلوب، مطبوعہ کراچی، ص ۷۹۔

۲ - ایضاً، ص ۸۰۔

۳ - ایضاً، ص ۸۱۔

نام کا خطبہ و سکہ جاری ہوا لیکن بندگی نظام الدین نے گوپا مئو میں' جہاں ان دنوں ان کی سکونت تھی' خطیب کو جمعہ کے خطبہ میں اس کا نام لینے سے منع کر دیا۔ جب اس علاقے کے افغان حاکم جلال خان کو اس کا علم ہوا تو اس نے بندگی نظام الدین سے کہا کہ اگر عادل شاہ کو اس کی اطلاع ہو گئی تو پھر اس کی خیر نہیں کیونکہ وہ اس معاملے میں اس سے باز پُرس کرے گا۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہندوستان کی بادشاہت ایک لڑکے (اکبر) کے لئے مقدر ہو چکی ہے اور وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ فرشتے اسے نہلا دُھلا کر اس کام کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اس لئے عادل شاہ کی حکومت نہیں ہے۔ دو اینٹوں پر کھڑے ہو کر عادل شاہ کے نام کا خطبہ پڑھنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔[1]

سلیمان کرارانی

پانی پت کی دوسری لڑائی (۱۵۵۶ء) میں شکست کھانے کے بعد افغان شمالی ہند سے بنگال اور بہار کی جانب فرار ہو گئے اور وہاں انہوں نے کچھ عرصے کے لئے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ انہی افغانوں میں سلیمان کرارانی بھی تھا جس نے پٹنہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ سلیمان اور اس کے بعد اس کے دو بیٹے بایزید اور داؤد ۱۵۷۶ء تک بنگال اور بہار پر حکومت کرتے رہے۔

محبوب القلوب میں مذکور ہے کہ سلیمان کرارانی' بندگی نظام الدین کے ایک ہم عصر بزرگ شیخ عبدالعزیزؒ کا عقیدت مند تھا۔ ان دونوں بزرگوں کے مابین رشتہ مؤدت قائم تھا۔ اس لئے سلیمان افسوس کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ ابھی تک بندگی نظام الدینؒ اور ان کے فرزندوں میں سے کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔[2]

ہیموں بقال

عادل شاہ کے عہد میں ہیموں بقال نے وزارتِ عظمٰی کا قلمدان اور افغان فوج کی کمان سنبھالی تو ہندوؤں کے نصیب جاگے۔ اس نے کلیدی آسامیوں پر ہندوؤں کو متعین کیا۔ گوپا مئو میں بھی اس کی جانب سے ایک ہندو گماشتہ متعین تھا جس کے اثر سے گوپا مئو میں مسلمانوں کی

۱ - ایضاً' ص ۸۲۔

۲ - ایضاً' ص ۱۱۷۔

توہین اور دل آزاری شروع ہو گئی۔ جامع ملفوظات فرماتے ہیں کہ گلیوں اور بازاروں میں ہندو دندناتے پھرتے تھے اور علانیہ مکروہات کا ارتکاب کرتے تھے۔ جب مسلمانوں نے ان سے تعرض کیا تو ہندو مسلح ہو کر مقابلے پر اتر آئے۔[۱]

حکیم مرزا

خانِ زمان علی قلی خاں شیبانی نے پانی پت کی دوسری لڑائی میں بہادری کے خوب جوہر دکھائے تھے۔ اس پر اکبر نے خوش ہو کر اسے جونپور کا گورنر مقرر کیا۔ جب اکبر نے مالوہ سے اس کے ہم قوم عبداللہ خان اُزبک کو نکالا تو وہ خانِ زمان کے پاس جونپور پہنچ گیا۔ اسی طرح دوسرے اُزبک سردار بھی اکبر کا جھکاؤ ایرانیوں کی طرف دیکھ کر اس کا ساتھ چھوڑ کر جونپور پہنچ گئے۔ خانِ زمان نے بھی اکبر کی بعض انتظامی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ ان باغی خوانین نے اکبر کی بجائے اس کے سوتیلے بھائی حکیم مرزا والئی کابل کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے زیرِ اثر علاقے میں اس کے نام کا خطبہ جاری کر کے اسے برِّعظیم پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔[۲]

حکیم مرزا نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۵۶۶ء میں برِّعظیم کی جانب پیش قدمی کی اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ جب اکبر کو حکیم مرزا کی آمد کی خبر ملی تو وہ ایک لشکرِ جرار کے ہمراہ لاہور روانہ ہوا۔ حکیم مرزا کو جب اکبر کی روانگی کی اطلاع ملی تو وہ محاصرہ اٹھا کر کابل چلا گیا۔[۳]

اکبر نے حکیم مرزا کی واپسی کے بعد خانِ زماں اور اس کے ساتھیوں کو اطاعت کا سبق دینے کے لئے آگرہ سے اَودھ کی جانب کوچ کیا۔[۴] اس موقع پر باغی خوانین نے بندگی نظام الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی کامیابی کے لئے دعا کی درخواست کی لیکن حضرت نے انہیں اکبر کی اطاعت کرنے کا مشورہ دیا۔[۵]

---

۱ - ایضاً، ص ۸۹ - ۸۸۔

۲ - i- ابوالفضل، اکبر نامہ، کلکتہ ۱۸۷۹ء، ج ۲، ص ۲۸۵۔
ii- محمد بن رستم، تاریخِ محمدی، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، نمبر اورینٹل ۱۸۲۴، ورق ۱۰۲ ب۔

۳ - نظام الدین احمد، طبقاتِ اکبری، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ج ۲، ص ۲۰۲۔

۴ - ایضاً، ص ۱۸۲۔

۵ - محمد علی، محبوب القلوب، ص ۱۵۸۔

باغی خوانین مایوس ہو کر حضرتِ والا قدر کی خدمت سے اٹھے اور انہوں نے اکبر کی آمد سے قبل کڑہ اور مانک پور تک تمام قصبات میں تباہی مچا دی اور عوام کو دھڑی دھڑی کر کے لوٹا۔[1] حضرت کے اس بیان کی تصدیق ابوالفضل نے بھی کی ہے۔[2]

اکبر سے ملاقات

جب اکبر لکھنؤ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ بندگی نظام الدینؒ نے باغیوں کو کھاس نہیں ڈالی تو اس نے ازرہِ تشکر ان کی خدمت میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اپنی روانگی سے قبل اس نے نواب قلیچ خان اندجانی کو حضرت کی خدمت میں بھیجا اور خود ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ حضرت نے اپنے گھر سے باہر نکل کر بادشاہ کا استقبال کیا اور وہ بھی انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سواری سے اتر آیا۔ عندالملاقات بادشاہ نے ان کے ساتھ معانقہ کیا اور ماحضر تناول فرمایا۔[3]

شیخ الاسلام عبداللہ سلطانپوری

اسلام شاہ سوری اور مغل حکمران اکبر کے زمانے میں دینی حلقوں میں مولانا عبداللہ سلطان پوری کا طوطی بولتا تھا۔ وہ شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے اور احکامِ شریعت کے معاملے میں کسی طرح کی رُو رعایت روا نہ رکھتے تھے۔[4] لاہور میں لوگوں نے ایک "شوریدہ سر" صوفی سے کلمہ سنانے کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا "کلمہ تو میں خود ہوں"۔ شدہ شدہ یہ بات مولانا عبداللہ تک پہنچ گئی تو انہوں نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ اگر وہ اس کا قائل ہے کہ "کلمہ تو میں خود ہوں" تو وہ واجب القتل ہے۔ اگر اسے ٹھکانے نہ لگایا گیا تو وہ لوگوں کی گمراہی کا سبب بنے گا اور لوگ دائرہ شریعت سے باہر نکل جائیں گے۔[5]

---

۱ - ایضاً، ص ۱۶۰۔

۲ - ابوالفضل، اکبر نامہ، ص ۱۸۱۔

۳ - محمد علی، محبوب القلوب، ص ۱۶۰۔

۴ - عبدالقادر بدایونی، کتاب مذکور، ص ۷۰۔

۵ - محمد علی، محبوب القلوب، ص ۸۴۔

صوبہ سرحد کے نامور عالمِ دین اخوند درویزہ نے، جو اکبر کے ہم عصر تھے، اپنی مشہور تصنیف "تذکرۃ الابرار و الاشرار" میں اس عہد کے متعدد صوفیائے خام اور اشرار کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نبوّت، مہدویّت، غوثیّت اور قطبیّت کے دعوے کئے تھے اور وہ لوگوں کو گمراہ کرتے تھے۔[۱] انھوں نے اپنی ایک دوسری تصنیف "مخزن الاسلام" میں یہ تحریر فرمایا ہے:

یقین می باشد کہ اگر فقیر را درمیان نمی بود از افغانانِ یوسف زئی کسے مسلمان نمی ماند۔[۲]

یقین جانئے اگر یہ فقیر یوسف زئی افغانوں میں موجود نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی مسلمان نہ رہتا۔

افغانوں اور مغلوں میں چپقلش

پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیموں بقال کی شکست کے بعد اکبر کے اتالیق بیرم خان نے شکست خوردہ افغانوں کے تعاقب میں فوجی دستے روانہ کئے۔ خانِ زمان علی قلی خان شیبانی اور بہادر خاں کو اودھ پر مغلوں کا تسلّط قائم کرنے کے لئے بھیجا۔ لکھنؤ میں افغانوں نے بڑی جمعیت فراہم کر لی اور انھوں نے مغل لشکر کا مقابلہ کیا لیکن مُنہ کی کھائی۔ افغانوں پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد خانِ زمان امیٹھی جا کر بندگی نظام الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔[۳]

ایک دوسرے موقع پر افغانوں اور مغلوں کے مابین سئی ندی کے کنارے جنگ ہوئی تھی۔ سئی ندی لکھنؤ سے ۵۸ کلو میٹر کے فاصلے پر رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہؒ سے قریب سے گذرتی ہے۔ یہی وہ بابرکت جگہ ہے جہاں سید احمدؒ شہید کا بچپن گذرا اور ان دنوں عالمِ اسلام کے نامور عالمِ دین اور مفکّر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وہیں مقیم ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں ہزیمت اٹھانے کے بعد افغانوں نے دوبارہ رائے بریلی سے قریب مغلوں کا مقابلہ کیا۔ اس بار مغلوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اور مقامی باشندوں نے بھاگتے ہوئے مغلوں کا مال و اسباب لوٹ لیا۔[۴]

۱ - اخوند درویزہ، تذکرۃ الابرار و الاشرار، مطبوعہ دہلی ۱۸۹۲ء، ص ۱۶۸، ۱۶۲، ۱۶۳۔
۲ - اخوند درویزہ، مخزن الاسلام، مخطوطہ نمبر ۲۶۳۴، انڈیا آفس لائبریری لندن، ورق ۲ الف۔
۳ - محمد علی، محبوب القلوب، ص ۱۰۔
۴ - ایضاً، ص ۱۵۷۔

سرکاری واجبات کی عدم ادائیگی پر گرفتاری

محبوب القلوب کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ سرکاری واجبات ادا کرنے سے قاصر تھے اور سرکاری کارندے انہیں گرفتار کر لیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے قاضی جمالی قدوائی ساکنِ مسولی کو سرکاری واجبات کی عدم ادائیگی پر گرفتار کر لیا تھا۔[۱]

فصل کاٹنے کے لئے سرکاری اجازت کا حصول

اس زمانے میں کاشت کار سرکاری واجبات اور مالیہ ادا کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے تھے۔ اس لئے حکومت نے یہ پابندی لگا دی کہ کاشت کار فصل کاٹنے سے پہلے مقامی حکام سے اجازت حاصل کریں۔ محبوب القلوب کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوا کہ گویا مئو میں ماش کی فصل پک کر تیار تھی۔ خطیبِ شہر شیخ عبدالوہاب نے حکام سے فصل کاٹنے کی اجازت مانگی لیکن انہیں اس کی اجازت نہ ملی اور فصل "محافظ" کے سپرد ہو گئی۔ چند روز بعد اس کی نگرانی میں فصل کاٹی گئی اور سرکار کا حصہ بیلوں پر لاد کر حاکم کو بھجوایا گیا۔[۲] یہ بہت ہی اہم اطلاع ہے جو محبوب القلوب کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جب کاشت کاروں نے سرکاری واجبات کی ادائیگی میں پس و پیش اختیار کی تو حکومت نے فصل کاٹنے کے لئے مقامی حکام کی اجازت حاصل کرنا لازم قرار دیا اور واجبات کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لئے "محافظوں" کا تقرر ہونے لگا۔

امن و امان کی صورت حال

اس زمانے میں امن و امان کی صورتِ حال اطمینان بخش نہ تھی۔ ڈاکو بقچوں میں آلات ڈکیتی و نقب زنی لئے پھرتے تھے۔[۳] ایک موقع پر بندگی نظام الدینؒ نے ارشاد فرمایا کہ ڈاکوؤں نے ایک کھتری کو قتل کر کے اس کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ وہ ڈاکو قانون سے بچنے کے لئے

۱ - ایضاً ص ۱۱۳۔
۲ - ایضاً ص ۱۱۴۔
۳ - ایضاً ص ۱۱۲۔

سید حسین خان کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہو گئے۔ ایک روز سید حسین خان ان کے ہمراہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں بذریعہ کشف معلوم ہو گیا کہ اس کے ساتھیوں میں دو قاتل اور ڈاکو موجود ہیں۔ حضرت نے سید حسین خان کو الگ لے جا کر حقیقتِ حال سے آگاہ کیا اور اس سے کہا کہ وہ انہیں ان کے جرم کی سزا دے اور مقتول کا مال اس کی بیوہ اور فرزندوں کو پہنچا دے۔[۱]

محبوب القلوب میں مرقوم ہے کہ ایک بار گوپا مئو اور اس کے نواحی قصبوں کے زمیندار سواروں اور پیادہ کے "جمِ غفیر" کے ہمراہ موضع کونڑہ کو لوٹنے کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کونڑہ کے باشندوں کو قتل کر کے ان کے مال و مویشی اپنے قبضے میں لے لیں۔ کونڑہ کے باشندوں نے بندگی نظام الدینؒ سے فریاد کی۔ حضرت کے حوصلہ دلانے پر کونڑہ کے باشندے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور انہوں نے مٹھی بھر جمعیت کے ساتھ "جمِ غفیر" کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔[۲]

ہندوؤں کی چیرہ دستیاں

محبوب القلوب میں مذکور ہے کہ ایک بار قرب و جوار کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے خوف سے بندگی نظام الدینؒ کے گاؤں (گوپا مئو یا امیٹھی) میں پناہ لی۔ اس کے باوجود ہندو حملہ آور ان کا مال و مویشی لوٹ کر لے گئے۔[۳] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ دیہاتوں میں مسلمان حکام کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا اور ہندوؤں کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ اس سے مسلمان حکام کی بے بسی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

اس عہد میں ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کی صدائے باز گشت لطائفِ قدوسی، طبقاتِ اکبری، افسانۂ شاہان اور تاریخِ داؤدی میں سنائی دیتی ہے۔

مقامی حکام کا ظلم

اس زمانے میں مقامی حکام کا ظلم عام تھا۔ محبوب القلوب میں مرقوم ہے کہ ایک روز

---

۱ - ایضاً، ص ۱۵۳۔
۲ - ایضاً، ص ۱۴۶۔
۳ - ایضاً، ص ۱۲۹۔

قصبہ سندیلہ کا ایک پریشان حال زمیندار بندگی نظام الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ کئی بار اپنے رہنے کے لئے مکان تعمیر کر چکا ہے اور وہ جب بھی نیا مکان تعمیر کرتا ہے تو حاکم اس سے وہ مکان چھین لیتا ہے۔ اب اس نے سر چھپانے کے لئے ایک مختصر سا مکان بنوایا ہے اور اس کے باوجود اسے ہر وقت حاکم کی جانب سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔[1]

اسی کتاب میں ایک اور واقعہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے کہ ایک مسافر بندگی نظام الدینؒ کی زیارت کے لئے امیٹھی آیا۔ اس نے اپنا زاد راہ بوریئے میں لپیٹ کر اٹھایا ہوا تھا۔ مقامی حاکم کے ایک پیادے نے زبردستی وہ بوریا چھین لیا۔ بندگی نظام الدینؒ نے حاکم سے شکایت کی۔ اس کے باوجود اس نے سامان واپس لوٹانے سے انکار کر دیا۔[2]

اشیائے ضرورت کی ارزانی

بندگی نظام الدینؒ نے ایک بار بقر عید کے موقع پر قصائی سے کہا کہ وہ قربانی کے لئے ایک گائے انہیں لا دے۔ جب قصائی گائے لے کر حاضر ہوا تو انہوں نے اس کی قیمت دریافت کی۔ قصائی نے اٹھارہ روپے قیمت لگائی۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ وہ صرف بارہ روپے ادا کریں گے۔ قصائی نے پوچھا کہ انہوں نے اس کی قیمت کس حساب سے بارہ روپے لگائی ہے؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ دس روپے گوشت کے اور دو روپے کھال کے۔ قصائی وہ گائے واپس لے گیا اور اس نے ذبح کر کے اس کا گوشت اور کھال فروخت کر دی۔ جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ اسے گوشت سے دس روپے اور کھال کے دو روپے حاصل ہوئے۔ قصائی نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ انہوں نے گائے کی قیمت بالکل صحیح لگائی تھی۔[3]

اللہ اللہ! اس بابرکت زمانے میں ارزانی کا کیا عالم تھا۔ ہمارے زمانے میں بے برکتی اور گرانی کا یہ عالم ہے کہ بارہ روپے میں بغیر ہڈی کے گائے کے گوشت کا ایک پاؤ قیمہ ملتا ہے اور لانڈری والے ایک قمیص شلوار کی دھلائی کے بارہ روپے طلب کرتے ہیں۔

اودھ کا رواج

اس زمانے میں اودھ میں یہ دستور تھا کہ مُردے کی رسم سوئم کے موقع پر محتاجوں میں

۱ - ایضاً' ص ۱۱۹۔
۲ - ایضاً' ص ۱۳۷۔
۳ - ایضاً' ص ۱۳۹۔

اناج بانٹا جاتا تھا اور جو لوگ قرآن خوانی میں شریک ہوتے تھے ان میں عطر تقسیم کیا جاتا تھا۔ بندگی نظام الدین نے اسلام شاہ سوری کی وفات(۱۵۵۳ء) کے موقع پر اس کی رُوح کو ایصالِ ثواب کے لئے محتاجوں میں غلّہ بانٹا اور شرکائے مجلس میں عطر تقسیم کیا۔[1]

داؤد خانی

محبوب القلوب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ "داؤد خانی" نام کی ایک مٹھائی اس زمانے میں اودھ میں بڑی مقبول تھی۔ باقر خانی کا نام تو ہم نے بہت سنا ہے اور کھائی بھی خوب ہیں لیکن "داود خانی" سے پہلی بار محبوب القلوب کے ذریعے ہی متعارف ہوئے ہیں۔[2]

اُردو کی ابتدائی نشو و نما

حضرت نظام الدین پُوربی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ عین ممکن ہے کہ وہ مقامی باشندوں سے اسی زبان میں گفتگو کرتے ہوں اور ان کے گھر میں بھی یہی زبان بُولی جاتی ہو۔ شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کے ملفوظات کی طرح محبوب القلوب میں بھی اُردو اور پُوربی زبان کے مکمل فقرے آتے ہیں۔ اس لئے اُردو زبان کی تاریخ لکھتے وقت ہم محبوب القلوب سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اس سے ہمارے اس دعوے کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ اُردو زبان خانقاہوں میں پروان چڑھی ہے اور صوفیاء کرام نے اس کی تراش خراش میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

۱ - ایضاً ص ۸۵۔

۲ - ایضاً ص ۸۳۔

مناقب الحسن و فوائح العرفان

حضرت سید حسن رسول نما رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۶۹۲ء) ایک نامور بزرگ ہو گزرے ہیں جنہوں نے اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کا زمانہ پایا تھا۔ ان کے والد بزرگوار شاہ محمد مقیم، ضلع ساہیوال کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔[۱] شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ موصوف میرے دادا جان کے ہم شکل تھے۔[۲]

حضرت رسول نماؒ کے ملفوظات ان کے ایک مرید باصفا محمد ہاشم بن محمد کاظم حسنی چشتی نے "مناقب الحسن و فوائح العرفان" کے عنوان سے جمع کئے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ راقم آثم نے یہ کتاب حضرت سیّد انور حسین شاہ صاحب نفیس رقم سے مستعار لے کر بالاستیعاب پڑھی تھی۔ دس بارہ سال ہوئے کوئی شخص یہ کتاب ان سے مطالعہ کے بہانے لے گیا اور اس نے کہیں "گم" کر دی۔ راقم آثم نے اس زمانے میں اس سے جو نوٹس لئے تھے، اب انہیں کے سہارے یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں۔

صاحبِ ملفوظات

سیّد حسن رسولنماؒ کے حالات کے لئے راقم آثم نے منتخب اللباب، آثار الصنادید، واقعات دارالحکومت دہلی اور سیر المنازل کا مطالعہ کیا لیکن کسی مصنف نے بھی ان پر آٹھ دس سطروں سے زیادہ نہیں لکھیں اور ان میں بھی صرف ان کے فضائل لکھے ہیں، سوانحی خاکہ کسی نے نہیں دیا۔ ملفوظات میں جس تفصیل کے ساتھ ان کے حالات ملتے ہیں، وہ ہمارے لئے معلومات کا بیش بہاء خزانہ ہیں۔

حضرت رسولنماؒ کے والد بزرگوار منصب دار تھے اور مغل بادشاہ کی طرف سے انہیں "خان" کا خطاب ملا ہوا تھا لیکن حضرت رسولنماؒ کی طبیعت بچپن ہی سے فقر و درویشی کی جانب مائل تھی۔ موصوف غریبوں کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور جو چیز ان کے ہاتھ لگتی وہ

۱ ۔ ڈاکٹر معین، آثار الصنادید، کراچی ۱۹۶۰ء، حاشیہ بر صفحہ ۱۲۳۔

۲ ۔ ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز، کراچی ۱۹۶۰ء ص ۱۳۱۔

بچوں میں تقسیم کر دیتے۔ اگر وہ کسی کے ہاں کھانا تناول فرماتے تو اتنی ہی رقم کا کھانا پکوا کر غربا کو کھلا دیتے۔ ان کے نزدیک مال و دولت کی حیثیت پر کاہ کے برابر تھی۔[۱]

جب موصوف اٹھارہ سال کے ہوئے تو والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے قرابتداروں نے جائداد کی تقسیم کے لئے ان کے خلاف مقدمات دائر کر دیئے اور انھیں بہت پریشان کیا۔ ان حالات میں حضرت ترک وطن کر کے اکبر آباد چلے گئے اور وہاں بچوں کو پڑھانے کا شغل اختیار کیا۔[۲] کچھ عرصے بعد ان کے دل میں حصول علم کا داعیہ پیدا ہوا تو موصوف نے پورب کا رخ کیا۔ اس زمانے میں پُورب میں علم و ادب کا بڑا چرچا تھا اور اسی بنا پر شاہجہان اسے فخریہ انداز میں "پورب شیراز ماست" کہا کرتا تھا۔[۳]

پُورب کے سفر کے دوران کسی نے سواری کے لئے گھوڑا پیش کیا۔ حضرت اس کی دلداری کے لئے اس پر سوار ہوئے لیکن جلد ہی گھوڑا اسے واپس لوٹا دیا۔ سفر کے دوران حضرت کثرت کے ساتھ نوافل ادا کرتے رہے۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت رسولنماؒ نے پُورب میں چودہ سال تحصیل علم میں صرف کئے۔ ان کے ایک استاد کا نام محمد جمیل تھا۔ وہ حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ (م ۱۶۴۸ء) کا مرید ہونا چاہتا تھا لیکن حضرت نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔[۴] اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت رسولنماؒ شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ کے نظریۂ وحدت الوجود کے شدید مخالف تھے اور اس پر جرح و قدح کیا کرتے تھے[۵] اور شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ نظریۂ وحدت الوجود کا پرچار اس شد و مد کے ساتھ کیا کرتے تھے کہ موصوف ہمارے مذہبی حلقوں میں ابن عربی ثانی کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

حصول علم کے سلسلے میں حضرت رسولنماؒ بنارس، قصبہ بہلول اور جونپور میں رہے۔ جونپور اس زمانے میں علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔

سلاطین شرقی کے عہد میں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ صاحب تفسیر "بحر مواج" نورالدین بن اسعد الدین، قطب الدین بن نورالدین، ملّا بہرام، قاضی تاج الدین ناگی، قاضی نصیر الدین گنبدی، ملّا عبدالملک عادل فاروقی، ملّا علاء الدین عطاء ملک، شاہ ابوالفتح جونپوری نبیرۂ قاضی

---

۱ - محمد ہاشم، مناقب الحسن و فوائح العرفان، ص ۳۱۔
۲ - ایضاً، ص ۳۲۔
۳ - ابوالعرفان ندوی، نذر مقبول، لکھنؤ ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۔
۴ - محمد ہاشم، کتاب مذکورہ، ص ۳۹۔
۵ - ایضاً، ص ۳۳۔

عبدالمقتدر شریحی، شیخ محمد عیسیٰ جونپوری اور قاضی سماء الدین نے علم و ادب کی جو نشر و اشاعت کی تھی لودھیوں کے عہد میں اس کے انوار جونپور اور اس کے اطراف کو منوّر کر چلے تھے۔ لودھیوں کے زمانے میں ملّا اللہ داد جونپوریؒ نے ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ بھکاری نے اپنے والد کے کام کو اور آگے بڑھایا۔ مغلوں کے ابتدائی دور میں سیّد عبدالاول جونپوری اور ملّا یوسف ظفر آبادی نے جونپور کی روایت قائم رکھی۔ ان کے بعد استاد العلماء محمد افضل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، شیخ شمس الدین جونپوری، ملّا نورالدین، ملّا باب اللہ جونپوری، ملّا محمود صاحبِ "شمس بازغہ" اور دیوان عبدالرشیدؒ نے جونپور کو مصر و شام تک مشہور کر دیا۔

جن دنوں حضرت رسولنماؒ جونپور پہنچے تو ان دنوں یہ شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ علم و ادب کے چرچے کے علاوہ حضرت تاج عیسیٰؒ کے انفاسِ طیبہ سے پوری فضاء معطر ہو رہی تھی۔ جونپور میں حضرت رسولنماؒ نے دیوان عبدالرشیدؒ کے حضور زانوئے تلمّذ تہ کیا۔[۱]

پُورب میں قیام کے زمانے میں ایک روز حضرت اپنے کسی استاد کی خدمت میں حاضر تھے۔ اس پر وحدت الوجود کا بڑا غلبہ تھا۔ اس کے سامنے کسی شخص نے کہا کہ آج ایک شخص نے کسی کی ناک کاٹ دی۔ اس کی بات سن کر استاد نے کہا "ایک خدا نے دوسرے خدا کی ناک کاٹ دی۔" استاد کی زبان سے یہ بات سن کر حضرت نے فرمایا کہ انہوں نے وہاں جا کر جو کچھ سیکھا تھا، اس نے پہلے علم کو بھی برباد کر دیا ہے۔ اگر علم قے کرنے والی کوئی چیز ہوتی تو وہ قے کر دیتے۔[۲]

چودہ سال پُورب میں گذار کر حضرت نارنول تشریف لائے اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانے میں حضرت بھیک مانگ کر طلبہ کو کھانا فراہم کیا کرتے تھے۔ نارنول میں بارہ سال گذارنے کے بعد حضرت ایک اشارۂ غیبی کے تحت دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی آنے کے بعد انہوں نے سترِ احوال کی خاطر کپڑے کی آڑھت شروع کر دی اور جلد ہی عوام میں حسن دلّال کے نام سے معروف ہو گئے۔[۳] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زیادہ عرصے تک خود کو آڑھتی کے بھیس میں نہ چھپا سکے اور لوگوں کا رجوع ان کی طرف ہو گیا۔ انہوں نے پنچکیاں روڈ نئی دہلی پر خانقاہ تعمیر کر کے مسندِ ارشاد کو زینت بخشی اور سالکوں کی تربیت میں مشغول ہو گئے۔

---

۱ - ایضاً، ص ۴۷۔
۲ - ایضاً، ص ۴۸۔
۳ - ایضاً، ص ۷۵۔

ان کے لقب کے بارے میں یہ روایت زبان زدِ خلائق ہے کہ وہ جس شخص کو چاہتے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کروا دیتے تھے[1] اسی بنا پر موصوف رسولنمأ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

حضرت رسولنمأ نے سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ بڑھاپے میں انہوں نے ٹھوس غذا بالکل ترک کر دی تھی اور صرف گائے کے دودھ پر ان کی گذران تھی۔[2] جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ان کی یومیہ آمدنی دو روپے تھی لیکن وہ اپنی ذات پر صرف اڑھائی پیسے صَرف کرتے تھے۔[3]

حضرت رسولنمأ کا انتقال ۹ مئی ۱۶۹۲ء کو ہفتہ کے روز نمازِ عصر کے وقت ہوا۔ حضرت کی درگاہ پنچکوئیاں روڈ پر ہے۔ ان کی قبر کھلے آسمان کے نیچے ہے لیکن چاروں جانب برآمدے بنے ہوئے ہیں۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ ان کے مزار کے سرہانے ایک سل پر یہ شعر کندہ ہے:

حسن رسول نماؒ افتخار آلِ حسن
اویس قرنیؒ ثانی و ثالثِ حسنینؓ[4]

مولوی بشیرالدین احمد لکھتے ہیں کہ برآمدے کی پیشانی پر یہ عبارت منقوش ہے:

"رسول نماؒ با رسولؐ باقی شد"

کتبہ العبد المذنب یاقوت رقمخان عرف عباداللہ ۱۱۰۳ھ[5]

عمائدین دہلی میں سے خاندانِ شریفی کے کئی افراد حضرت رسولنمأ کے جوار میں مدفون ہیں۔ ان میں سے حکیم محمد عبدالمجید خان (م ۱۳۱۹ھ) اور حکیم واصل خان (م ۱۳۲۲ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت رسولنمأ کے تین فرزند تھے:

۱۔ سید ہاشم

انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے ایک فرزند سید قاسم اپنے والد کی وفات کے وقت طالب علم تھے۔

---

۱ ۔ بشیرالدین احمد، واقعاتِ دارالحکومت دہلی، دہلی ۱۹۹۰ء، ج ۲، ص ۵۵۷۔
۲ ۔ محمد ہاشم، کتاب مذکورہ، ص ۱۶۶۔
۳ ۔ ایضاً، ص ۳۸۔
۴ ۔ سر سید احمد خان، آثار الصنادید، کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۳۔
۵ ۔ بشیر الدین احمد، کتاب مذکورہ، ص ۵۵۷۔

۲۔ سید عبداللہ
یہ مجنون تھے اور نارنول میں رہتے تھے۔
۳۔ عطاء اللہ
یہ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے وقت تحصیل علم میں لگے ہوئے تھے۔[۱]

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات نے مناقب الحسن و فوائح العرفان کے دیباچے میں اپنا نام محمد ہاشم بن محمد کاظم حسنی حسینی نجفی لکھا ہے۔ اس نے تیرہ چودہ سال حضرت رسولنما کی صحبت میں گذارے تھے۔[۲] یہ ملفوظات اسی زمانے کا مرقع ہیں۔ محمد ہاشم ایک پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے ملفوظات میں صدہا کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ اتنے نام راقم آثم نے کسی اور مجموعۂ ملفوظات میں نہیں دیکھے۔ عین ممکن ہے کہ اب ان میں سے کئی کتابیں دستیاب نہ ہوں۔

ملفوظات

حضرت رسولنماؒ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ مرید بننے کے لئے بھی لیاقت چاہئے۔ ایک اور مجلس میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ جو پیر اپنے مرید کو شریعت کے خلاف حکم دے وہ پیر نہیں بلکہ شیطان ہے۔[۳]

دارا شکوہ

شاہجہان کا ولی عہد شہزادہ دارا شکوہ ہندوؤں کے علوم کی طرف مائل ہو گیا تھا اور اس نے "مجمع البحرین" لکھ کر کفر و اسلام کی تمیز ختم کر دی تھی۔ حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے بقول اس کی طبیعت زندقہ کی طرف مائل تھی۔[۴] دارا شکوہ نے حضرت رسولنماؒ سے ملنے کی تمنا ظاہر کی تو انہوں نے ملاقات کی اجازت نہ دی۔[۵]

اورنگ زیبؒ کی شمالی ہند سے طویل غیر حاضری کا اثر

اورنگ زیبؒ کے آخری چھبیس سال دکن میں مرہٹوں کی سرکوبی اور بیجا پور اور گولکنڈہ کی

۱۔ محمد ہاشم، کتاب مذکورہ، ص ۳۶۶ - ۳۶۵۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔
۳۔ ایضاً، ص ۶۴۔
۴۔ محمد کامگار خان، ملفوظات خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، مخطوط نمبر ۱۸۹، خانقاہ تونسہ شریف، ص ۴۷۔
۵۔ محمد ہاشم، کتاب مذکورہ، ص ۴۷۔

تسخیر میں صرف ہوئے۔ اس کا حرم، عمائدین سلطنت اور لشکری اس کے ساتھ تھے۔ اس لئے دہلی میں کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا اور بقول حضرت رسولنماؒ لوگ تنگیٔ معاش کا گلہ کرنے لگے۔[۱]

حضرت رسولنماؒ فرماتے ہیں کہ اورنگ زیبؒ کے عہد میں شمالی ہند میں سخت قحط رونما ہوا۔ پورب کے باشندے تنگ آ کر دہلی چلے آئے۔ ان کی دہلی میں آمد کے بعد یہاں بھی اناج کی قلت پیدا ہو گئی۔ مہنگائی کا یہ عالم تھا کہ روپے کا دس سیر آٹا فروخت ہونے لگا۔[۲]

میرٹا میں راجپوتوں کی بغاوت

میرٹا راجستھان کا ایک تاریخی مقام ہے۔ مشہور جوگن میرا بائی کی نسبت اسی شہر کی طرف ہے۔ اورنگ زیبؒ کی شمالی ہند سے طویل غیرحاضری سے راجپوتوں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو شہید کر دیا۔ جامع ملفوظات محمد ہاشم کا ایک بھائی محمد صالح بھی شہیدوں کی صف میں شامل تھا۔[۳]

اورنگ زیبؒ کا احتساب

اورنگ زیبؒ کے زمانے میں شیخ بایزید مضوری نام کے ایک بہت بڑے درویش ہو گذرے ہیں۔ انہوں نے بڑا سخت مجاہدہ کیا تھا اور عوام ان کی ریاضت کی وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے۔ شیخ موصوف امر بالمعروف کے معاملے میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مجمع عام میں اورنگ زیبؒ سے پوچھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے نکاح کیوں نہیں کرتا۔ اورنگ زیبؒ نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کر کے ان سے اپنی گلو خلاصی کرائی۔[۴]

امن و امان کی صورت حال

اورنگ زیبؒ کی شمالی ہند سے طویل غیر حاضری کی وجہ سے اسلام دشمن قوتوں اور جرائم پیشہ افراد کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ حضرت رسولنماؒ اس پر شاہد ہیں کہ قزاقوں نے سرہند کے نواح میں تاجروں کا ایک قافلہ لوٹ لیا تھا۔[۵]

---

۱ ۔ ایضاً، ص ۷۸۔
۲ ۔ ایضاً، ص ۷۶۔
۳ ۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔
۴ ۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔
۵ ۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔

اورنگ زیب عالمگیر نے علماء کرام سے فتاویٰ عالمگیری مدوّن کرایا اور عدالتوں میں اس کے مطابق فیصلے ہونے لگے۔ حضرت رسولنماؒ نے چاندنی چوک میں کوتوالی کے چبوترے پر ایک چور کا ہاتھ کاٹنے کا منظر دیکھا تھا۔[۱]

تصوّف کا زوال

اورنگ زیبؒ کے عہد میں تصوّف کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی تعلیمات کے برعکس آزاد مشرب صوفیوں نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس زمانے میں آزاد مشرب صوفیوں نے شطحیات بکنا شروع کر دی تھیں۔ دارا شکوہ نے اس موضوع پر "حسنات العارفین" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جو اس زمانے میں متداول تھی۔

پنجہ در پنجۂ خدا دارم
من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

جیسے گستاخانہ شعر اسی زمانے میں منصۂ شہود پر آئے۔ حضرت رسولنماؒ فرماتے ہیں کہ مولانا یعقوب کے فتووں پر کئی صوفی شطحیات بکنے کے جرم میں قید ہوئے۔[۲]

شاہ قلی کی نذر

سلطان بیگ المعروف بہ شاہ قلی لکھنؤ کا صوبیدار تھا۔ اس نے کافروں کی ایک جماعت پر تاکتاز کی۔ جب وہ اس ارادے سے لکھنؤ سے روانہ ہوا تو اس نے یہ نذر مانی کہ اگر اسے فتح نصیب ہوئی تو مال غنیمت میں جتنے لونڈی غلام ہاتھ لگیں گے، وہ سید حسن رسولنماؒ کی خدمت میں پیش کرے گا۔ چنانچہ فتح کے بعد اس نے لونڈیاں اور غلام حضرت کی خدمت میں بھیجے۔[۳] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کے زمانے میں بھی غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

سالک کے لئے ہدایات

حضرت رسولنماؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ وہ کسی شخص کے ضامن نہ بنیں، کسی کی شادی کے معاملے میں نہ پڑیں اور کسی کی بات میں دخل نہ دیں۔ وہ نماز ادا کریں لیکن

۱ - ایضاً ص ۱۶۶۔
۲ - ایضاً ص ۳۱۲۔
۳ - ایضاً ص ۲۳۰۔

جہاں تک ممکن ہو سکے' امام نہ بنیں۔ وہ تھوڑا کھانا کھائیں' جو لذیذ کھانا دستیاب ہو تو اسے خود تناول کرنے کی بجائے یتامی اور مساکین کو کھلا دیں۔ حضرت رسولنمأ فرماتے ہیں کہ سالک کو کم سونا چاہئے کیونکہ زیادہ سونے سے روح کی نورانیت کم ہو جاتی ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنے نفس کو سمجھائے کہ سونے سے وقت چشم زدن میں ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور اس طرح یاد خدا فوت جاتی ہے' جو ایک نعمت عظمیٰ اور دولت کبریٰ ہے۔[1]

مولانا بدرالدین فرغانی کا فتویٰ

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ تفسیر "زادالذاکرین" میں مرقوم ہے کہ اہل فرغانہ نے وہاں کے مشہور عالم دین مولانا بدرالدین سے یزید پر لعن طعن کرنے کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے جواب دیا کہ چکاوک نامی ایک پرندہ دن میں ستر مرتبہ یزید پر لعنت بھیجتا ہے اور اس نے خود اپنے کانوں سے چکاوک کو یزید پر تبرّیٰ کرتے ہوئے سنا ہے۔ بدرالدین نے سائلوں سے کہا کہ وہ تو انسان ہیں' اس لئے انہیں چکاوک سے پیچھے نہیں رہنا چاہئے۔[2] یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد محمد ہاشم حسنی حسینی نجفی نے پانچ صفحات یزید پر لعنت بھیجنے کے جواز میں سیاہ کئے ہیں۔ یہ اہل سنت کا مذہب نہیں ہے اس لئے یہ رسولنمأ کی بجائے محمد ہاشم کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ جتنا وقت یزید پر لعنت بھیجنے میں صرف ہوتا ہے' اگر اتنا ہی وقت حضرت حسینؓ پر رحمت بھیجنے میں لگا دیا جائے تو اس سے حضرت حسینؓ کو فائدہ پہنچے گا اور رحمت بھیجنے والے کو اس کا اجر ملے گا۔

نقشبندی افغانوں کا تقویٰ

حضرت رسولنمأ فرماتے ہیں کہ نقشبندی سلسلے کے افغان چونے اور پان کے استعمال کو حرام اور مکروہ سمجھتے تھے۔[3] حضرت رکن الدین عشاری کے ملفوظات میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ ملتا ہے کہ بنگال کے علماء نے چونے کے استعمال کو حرام قرار دے دیا تھا جس سے پان خور مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔[4]

✪✪✪

۱۔ ایضاً' ص ۱۷۷۔
۲۔ ایضاً' ص ۲۴۹۔
۳۔ ایضاً' ص ۷۵۔
۴۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے' شاہ رکن الدین عشاری کے ملفوظات جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

مجالسِ کلیمی

صاحبِ ملفوظات

سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ کے مجدد حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ ۲۴ جون ۱۶۵۰ء شاہجہان کے عہد حکومت میں شاہجہان آباد (دہلی) میں پیدا ہوئے۔[۱] ان کا خاندان اسلامی فنِ تعمیر کا ماہر اور علوم ریاضی اور فلکیات میں اپنی نظیر آپ تھا۔ حضرت کے دادا بزرگوار نادرالعصر احمد معمار نے تاج محل تعمیر کیا تھا اور آنجناب کے والدِ محترم جناب نور اللہ بھی اپنے خاندانی اوصاف سے متصف تھے۔ وہ اپنے دور کے ایک نامور خطاط تھے۔ جامع مسجد دہلی کی پیشانی پر لکھے ہوئے کتبے ان کے فن کا شاہکار ہیں۔[۲] ایک روایت کے مطابق موچی دروازہ لاہور کے اندر نور گلی کا نام انہی کے نام پہ رکھا گیا تھا جہاں اس خاندان کے افراد اصطرلاب بنانے کا کام کیا کرتے تھے۔

شاہ کلیم اللہؒ کے تایا لطف اللہ مہندس ماہرِ تعمیرات ہونے کے ساتھ بہت بڑے عالم، شاعر اور علوم ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام "دیوانِ مہندس" کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔[۳]

لطف اللہ مہندس کے دو بیٹوں امام الدین الریاضی اور خیراللہ نے ریاضی اور فلکیات کے موضوع پر متعدد کتابیں تحریر کی ہیں۔ خیراللہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کو دہلی، جے پور، اجین اور بنارس میں رصدگاہیں تعمیر کرنے میں مدد دی اور اپنی نگرانی میں یہ رصدگاہیں تعمیر کروائیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ کلیم اللہ کا تعلق ایک بڑے علمی گھرانے سے تھا۔

شاہ کلیم اللہؒ کے اساتذہ میں شیخ بہلول اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تایا شیخ ابوالرضا قابلِ ذکر ہیں۔[۴] یہ ظاہر ہے کہ موصوف اپنے بزرگوں سے بھی مستفیض ہوئے ہوں گے۔ ذاتی

۱ ۔ حاجی نجم الدین سلیمانی، مناقب المحبوبین، لاہور: ۱۹۷۵ء، ص ۸۳۔

۲ ۔ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دارالمؤلفین اسلام آباد، ص ۳۷۲۔

۳ ۔ محمود نظامی، دیوان مہندس، مشمولہ "نقوش" لاہور: ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۵ تا ۱۹۹۔

۴ ۔ [illegible]، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور: ۱۹۸۰ء، ج ۱۷، ص ۹۷۳۔

سے عالم میں ایک مجذوب کے کہنے پر شاہ کلیم اللہؒ نے مدینہ منورہ جا کر حضرت یحییٰ مدنیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ حضرت یحییٰ مدنیؒ، حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے بھانجے علامہ کمال الدین کی اولاد سے تھے۔ ان کا وطن احمد آباد تھا اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ان کا انتقال ۴ اپریل ۱۶۹۰ء کو ہوا اور ان کا جسدِ خاکی جنت البقیع میں حضرت عثمان غنیؓ کے روضہ اقدس کے جوار میں سپردِ خاک کیا گیا۔[1]

شاہ کلیم اللہؒ نے وطن واپسی کے بعد لال قلعہ دہلی اور جامع مسجد کے درمیان خانم بازار میں قیام فرمایا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کیا عمدہ بات کی ہے کہ قلعہ اور جامع مسجد کے معماروں کے لئے اس سے زیادہ موزوں جگہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔[2] شاہ صاحب نے اپنی بقیہ زندگی درس و تدریس اور عوام کی رشد و ہدایت میں گذار دی۔ انھوں نے اورنگ زیبؒ کی وفات کے بعد ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۷۲۹ء تک کا پرآشوب زمانہ دیکھا اور اس بے یقینی کے دور میں لاکھوں افراد کے قلوب کو ایمان و ایقان سے مطمئن کیا۔

شاہ کلیم اللہؒ دس کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ شاعر بھی تھے لیکن ان کا کلام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔[3] وہ بڑے اعلیٰ اخلاق کے مالک، حلیم الطبع اور خوش مزاج انسان تھے۔ موصوف اتباعِ شریعت پر بڑا زور دیتے تھے۔ انھوں نے سماع کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کیا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ چشتی بزرگوں نے جن کڑی شرائط کے تحت سماع کو جائز قرار دیا تھا، وہ شرائط اب کہاں باقی رہ گئی ہیں؟[4]

انھوں نے لاکھوں افراد کی تربیت کی۔ ان کے بہت سے خلفاء تھے، جن میں سے شاہ فخرالدینؒ کے والد بزرگوار حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[5] دکن میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی ترویج ثانی ان کی سعی و کاوش سے ہوئی۔ ان کے فرزند ارجمند شاہ فخرالدینؒ دہلی تشریف لے آئے۔ ان کے وجودِ مسعود کی برکت سے پنجاب میں اس سلسلے کی نشر و اشاعت ہوئی۔ خواجہ نور محمد مہارویؒ، خواجہ سلیمان تونسویؒ، حضرت شمس الدین سیالویؒ، پیر مہر علی گولڑویؒ، غلام حیدر شاہ جلالپوریؒ، خواجہ غلام فریدؒ اور خواجہ محمد یارؒ کا سلسلۂ تصوف حضرت شاہ فخرالدینؒ سے جا ملتا ہے۔

۱۔ نجم الدین سلیمانی، کتاب مذکورہ، ص ۸۲۔

۲۔ خلیق احمد نظامی، دیباچہ کشکول کلیمی، لاہور ۱۹۸۸ء، ص ۳۲۔ ۳۔ ایضاً

۴۔ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ص ۴۱۷۔

۵۔ بزمی انصاری، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۱۰، ص ۳۸۱۔

شاہ کلیم اللہؒ نے ۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو انتقال فرمایا۔[۱] ان کا مزار جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان مرجع خلائق ہے۔ رحمتہ اللہ علیہ واسعاً کثیراً۔

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات خواجہ کامگار خان، خواجہ برہان الدین کے فرزند، خواجہ محمد خاوندؒ کے پوتے اور حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشان لاہوریؒ (م ۱۶۴۲ء) کے پڑپوتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت بہاء الدین نقشبندؒ کے داماد حضرت علاء الدین عطارؒ سے جا ملتا ہے۔[۲] نسباً نقشبندی ہونے کے باوجود خواجہ کامگار خان اور ان کے بھائی محمد نور الدین نے سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ میں حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ وہ شاہی لشکر میں ملازم تھے اور لشکر کے ساتھ نقل و حرکت کرتے رہتے تھے۔ شولاپور میں ان کی ملاقات حضرت نظام الدینؒ سے ہوئی اور وہیں ان کے مرید ہو گئے۔[۳] وہ ایک پڑھے لکھے شخص تھے۔انہوں نے "احسن الشمائل" میں اپنے غزل گو شاعر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔[۴] انہوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات کے دو مجموعے "احسن الشمائل" اور "ملفوظاتِ خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی" کے عنوانات سے تیار کئے۔ فرخ سیر کے عہد میں جب امیر الامراء سیّد حسین علی خان حیدر آباد سے دہلی روانہ ہوا تو کامگار خان بھی اپنے مرشد سے اجازت لے کر اس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔[۵] دہلی پہنچ کر وہ اپنے دادا مرشد شاہ کلیم اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی زمانے میں انہیں یہ اطلاع ملی کہ ان کی عدم موجودگی میں دکن میں ان کے بھائی محمد نور الدین کا انتقال ہو گیا ہے۔ خواجہ کامگار خان نے اپنے مرحوم بھائی کے ایصالِ ثواب کی خاطر شاہ کلیم اللہؒ کی چودہ مجالس کے ملفوظات "مجالسِ کلیمی" کے عنوان سے مرتب کئے۔[۶]

مجالسِ کلیمی کا ایک مخطوطہ خانقاہ عالیہ تونسہ شریف میں محفوظ ہے، جس کا اندراج ۱۸۹ نمبر کے تحت ہوا ہے۔ یہ مضمون اسی مخطوطہ کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

۱ - خواجہ گل محمد احمد پوری، تکملہ سیر الاولیاء، (مترجم مسعود حسن شہاب) بہاولپور: ۱۹۷۸ء، ص ۱۵۔

۲ - محمد اسلم، سہ ماہی اردو، کراچی بابت اپریل تا جون ۱۹۸۰ء، ص ۲۷۔

۳ - محمد کامگار خان، ملفوظاتِ خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، مخطوطہ نمبر ۱۸۹، خانقاہ تونسہ شریف، ص ۳۱۔

۴ - محمد کامگار خان، احسن الشمائل، مخطوطہ شیفتہ کلکشن، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، ورق ۱۴ الف۔

۵ - محمد کامگار خان، مجالسِ کلیمی، مخطوطہ خانقاہ تونسہ شریف، ورق ۲ ب۔

۶ - ایضاً، ورق ۳ ب۔

فرخ سیر کی امور سلطنت سے غفلت

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک روز ان کی موجودگی میں ایک شخص نے شاہ کلیم اللہؒ کی خدمت میں فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) کی امور سلطنت میں عدم دلچسپی کا ذکر کیا۔ اس کی بات سن کر حضرت نے فرمایا کہ موجودہ بادشاہ (فرخ سیر) کا پردادا عالمگیر اورنگ زیب اُمورِ سلطنت کی انجام دہی اور ان سے واقفیت میں اپنی مثال آپ تھا۔[۱] اُمورِ سلطنت سے واقفیت کے معاملے میں اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس کا حافظہ اتنا تیز تھا کہ اپنی وسیع و عریض مملکت میں رُونما ہونے والے معمولی سے معمولی واقعات کو بھی فراموش نہیں کرتا تھا، لیکن موجودہ بادشاہ کو کچھ معلوم نہیں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ حکمرانوں کو اس قدر غافل نہیں ہونا چاہئے اور نہ اس طرح بیکار بیٹھنا چاہئے۔[۲] خافی خاں رقم طراز ہے کہ فرخ سیر کا دادا شاہ عالم بہادر شاہ بھی عوام میں "شاہِ بے خبر" کے نام سے مشہور تھا۔[۳]

رفیع الدرجات

شاہ کلیم اللہؒ کی محفل میں فرخ سیر کی اُمورِ سلطنت سے غفلت کے ذکر کو ابھی ایک ماہ ہی گذرا تھا کہ "سیدانِ بادشاہ گر" نے اسے تاج و تخت سے محروم کر کے اس کی جگہ رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھا دیا۔ شاہ کلیم اللہؒ کی محفل میں اس کی تخت نشینی کا ذکر ہوا اور کسی نے بتایا کہ اس کے سکّے پر یہ بیت منقوش ہوئی ہے۔[۴]

زد سکّہ بہند باہزاراں برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

تخت نشینی کے چار روز بعد اتوار کے دن رفیع الدرجات شاہ کلیم اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس موقع پر حضرت نے انقلابِ زمانہ اور فنائے عالم حادث کے موضوع پر گفتگو فرمائی۔

حاضرین کی موجودگی میں حضرت نے بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ حالت فنا و بقا ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ ندی کو دیکھ لیجئے۔ اس میں جتنا پانی آگے بڑھتا ہے پیچھے سے اتنا ہی پانی

---

۱ ۔ ایضاً ص ۴ ب۔
۲ ۔ ایضاً ص ۶ ب۔
۳ ۔ خافی خان، منتخب اللباب، کراچی: ۱۹۶۳ء ج ۳، ص ۸۱۔
۴ ۔ کامگار خان، مجالس کلیمی، ورق ۷ الف۔

اس کی جگہ لینے کے لئے آ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شعلے کی جگہ دوسرا شعلہ لے لیتا ہے۔ ایک فنا ہوتا ہے تو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔[۱]

رفیع الدرجات اتوار کے روز شاہ کلیم اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ جمعہ کے روز حضرت نے جامع ملفوظات سے دریافت کیا کہ اس نے نمازِ جمعہ کس مسجد میں ادا کی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ وہ نمازِ جمعہ ادا کرنے جامع مسجد گیا تھا۔ اتفاق سے رفیع الدرجات بھی وہیں نماز ادا کرنے آیا تھا۔ مسجد میں نواب قطب الملک عبداللہ خان' نواب امیر الامراء حسین علی خان اور امراء و خوانین موجود تھے۔ جب بادشاہ مسجد میں داخل ہوا تو وہ کورنش بجا لائے اور بادشاہ کو تہنیت پیش کی۔ خطیب نے خطبہ میں بادشاہ کا نام لے کر دعا کی تو نماز کے بعد بادشاہ نے اسے خلعت سے نوازا۔[۲]

اس واقعہ کے تین روز بعد شاہ کلیم اللہؒ کی مجلس میں رفیع الدرجات کا ذکر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کے اطوار اورنگ زیب عالمگیرؒ سے ملتے ہیں لیکن سید برادران سے نیکی کی اُمید نہیں۔[۳]

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ جو کسی ہمعصر تاریخ یا تذکروں میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خان اثنا عشری مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے باوجود جب بادشاہ جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے آیا' تو وہ اس کے استقبال کے لئے وہاں موجود تھے اور انہوں نے نمازِ جمعہ سُنّی امام کی اقتداء میں ادا کی۔

مرہٹوں کا منصوبہ

جامع ملفوظات رقمطراز ہے کہ مرہٹوں نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا کہ جونہی فرخ سیر کی جگہ رفیع الدرجات تخت پر بیٹھے گا تو وہ دہلی میں لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دیں گے۔ اس موقع پر شہریوں نے بڑی ہمت سے کام لیا اور وہ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑے۔ کامگار خان نے قلعہ سے لے کر نخاس تک مرہٹوں کی لاشیں پڑی دیکھی تھیں۔ موصوف رقمطراز ہے کہ شہریوں نے مرہٹوں کا غرور خاک میں ملا دیا۔[۴]

---

۱ - ایضاً' ورق ۷ الف۔
۲ - ایضاً' ورق ۷ ب۔
۳ - ایضاً' ورق ۹ الف۔
۴ - ایضاً' ورق ۸ الف۔

شاہ کلیم اللہؒ کی علالت

خواجہ کامگار خان لکھتے ہیں کہ ایک روز ایک شخص شاہ کلیم اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ نقرس کا مریض تھا۔ اس نے حضرت سے اپنی بیماری کا ذکر کیا تو حضرتِ والا نے فرمایا کہ وہ بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس نے کہا کہ اس مرض میں مبتلا مریض اگر گرم پانی میں اپنے پاؤں ڈبوئے اور جلاب لے تو بہت آرام ملتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر ساگ میں انگوری سرکہ ڈال کر کھایا جائے تو مریض بڑا سکون محسوس کرتا ہے۔[۱]

اس نے عرض کیا کہ ایسے مریض کو لبنیات' ترش اشیاء اور بادی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ حضرت نے فرمایا کہ جلاب بھی اس کا علاج ہے لیکن ان کا یہ تجربہ ہے کہ اگر انگوری سرکہ ساگ میں ملا کر کھایا جائے تو مریض بڑا سکون محسوس کرتا ہے۔[۲]

فصوص الحکم کا ایک نادر نسخہ

شاہ کلیم اللہؒ نے ایک روز حاضرین مجلس کو بتایا کہ شاہی کتاب خانے میں فصوص الحکم کا ایک نسخہ تھا جو مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ فرخ سیر نے وہ کسی نااہل شخص کو دے دیا اور اس نے ضائع کر دیا۔ حضرت نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ اولاً: اسے مصنف کے ہاتھ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ثانیاً: وہ صحت کے اعتبار سے قابل اعتماد ہوتا ہے۔[۳] کامگار خان لکھتے ہیں کہ اورنگ آباد میں ان کے شیخ طریقت حضرت نظام الدینؒ کے کتاب خانے میں بھی فصوص الحکم موجود تھی۔

خانقاہِ کلیمیؒ میں درس و تدریس

کامگار خان لکھتے ہیں کہ ایک روز ان کی موجودگی میں شاہ کلیم اللہؒ نے تفسیر مدارک' بیضاوی اور صحیحین کا درس دیا تھا۔ درس میں بہت سے علماء موجود تھے۔ درس کے دوران حضرت اقدس نے غزوۂ بدر بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا۔[۴] ایک روز کامگار خان حضرت کی

---

۱ - ایضاً' ورق ۸ ب۔
۲ - ایضاً۔
۳ - ایضاً' ورق ۹ ب۔
۴ - ایضاً' ورق ۱۳ الف۔

خدمت میں حاضر ہوئے تو وہاں کتاب شرح الصدور کا ترجمہ سنایا جا رہا تھا۔

شہادت عثمان غنیؓ

ایک روز شاہ کلیم اللہؒ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد سب سے پہلا فتنہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مابین جنگیں ہوئیں' وہ حضرت عثمان غنیؓ کا خون بہاء تھا۔[1]

شاہ بے وفاؒ

لاہور میں شاہ بے وفا نام کے ایک بزرگ ہو گذرے ہیں۔ ان کا ذکر "مجالسِ کلیمی" کے علاوہ اور کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذرا۔ شاہ کلیم اللہ کا آبائی وطن لاہور تھا اس لئے حضرت اس سے واقف تھے۔ شاہ بے وفا قلندر مشرب بزرگ تھے لیکن وہ بڑے صاف ستھرے رہتے تھے اور ان کا گھر بھی ایسا ہی تھا۔ وہ ہر وقت مسلح رہتے تھے اور ہمیشہ تیر کمان اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھتے تھے۔ ایک روز خانِ عالم نامی ایک امیر اپنے ملازمین کے ہمراہ شاہ بے وفاؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دوران ملاقات ایک ملازم نے زمین پر تھوک دیا۔ اس پر شاہ بے وفا کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "اے مردک! تو آداب صحبت بھی نہیں جانتا؟" اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن اس کے بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔ شاہ بے وفا نے اس کا سبب پوچھا تو خانِ عالم نے عرض کیا کہ اس کے بارے میں جو الفاظ انہوں نے استعمال کئے ہیں' ایسے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے۔ اس لئے اس پر یہ حالت طاری ہو گئی ہے۔ خانِ عالم کی بات سن کر شاہ بے وفا نے فرمایا: "میں کیا کروں۔ تمام اہل دنیا مردک ہوتے ہیں۔ تم سب سے بڑے مردک ہو۔" جب اس ملازم نے اپنے آقا کو "مردکِ کلاں" کا خطاب ملتے دیکھا' تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔[2]

خاتمۂ کلام

خواجہ کامگار خان ۲۷ ربیع الاول کو شاہ کلیم اللہؒ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا تھا۔ ۸

---

۱ - ایضاً' ورق ۱۵ ب۔
۲ - ایضاً' ۲۱ ب۔

جمادی الثانی کو حضرت نے فاتحہ پڑھ کر اسے رخصت کیا اور خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے لئے ایک خط دیا۔

چند غلطیوں کا ازالہ

زیرِ مطالعہ مخطوطہ میں کاتب نے محمد نور الدین نقشبندی الحسینی الحصاری لکھا ہے۔ راقم کے خیال میں الحصاری کی جگہ العطاری ہونا چاہئے کیونکہ ان کے پردادا حضرت ایشان لاہوریؒ حضرت علاء الدین عطارؒ کی اولاد سے تھے اور وہ اپنے نام کے بعد العطاری لکھا کرتے تھے۔[1]

اسی طرح ایک جگہ حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کو نظام الملک والدین لکھا ہے۔ میرے خیال میں یہاں نظام الملّت والدین ہونا چاہئے۔ نظام الملک تو اس زمانے میں دکن کا صوبیدار تھا۔

اسی طرح کاتب نے ہر جگہ ۱۱۳۲ھ لکھا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ اس کی بجائے ۱۱۳۱ھ ہونا چاہئے۔ ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۰ء میں تو محمد شاہ حکمران تھا۔ فرخ سیر کو سید برادران نے ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء میں تخت سے معزول کر کے اس کی جگہ رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ اپنے تین ماہ اور دس دن کے دورِ حکومت میں دو بار شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔[2] تین ماہ دس دن کے بعد اس نے اپنی علالت کے پیشِ نظر سید برادران سے درخواست کی کہ اس کی جگہ اس کے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیں۔ سید برادران نے بادشاہ کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اسے بادشاہت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا۔ اس کے تین دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ رفیع الدولہ شاہجہانِ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا لیکن تین ماہ اور چند روز بعد وہ بھی راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ اس کی وفات کے بعد قرعۂ فال محمد شاہ کے نام پڑا۔ یہ سب کچھ ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء میں ہو گیا۔ اس لئے ۱۱۳۲ھ کو سہوِ کاتب کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

✪✪✪

---

۱ - معین الدین، مراۃ طیبہ، مخطوطہ رضا لائبریری رام پور، نمبر فارسی ۲۳۷۹، ورق ۲ ب۔
۲ - کامگار خان، مجالس کلیمی، ورق ۷ الف، ۲۱ ب۔

احسن الشمائل

"احسن الشمائل" حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے' جو ان کے ایک مرید با اخلاص خواجہ محمد کامگار خان نے مرتب کیا تھا۔ "احسن الشمائل" کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ ۸۴ اوراق پر مشتمل ہے۔[1] اسی فاضل مرتب نے اپنے شیخِ طریقت کے ملفوظات کا ایک دوسرا مجموعہ بھی مرتب کیا تھا جو "ملفوظاتِ خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ خانقاۂ عالیہ تونسہ شریف میں محفوظ ہے۔[2] "ملفوظات" میں انہوں نے "احسن الشمائل" کا ذکر کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "احسن الشمائل" ' "ملفوظات" سے پہلے مرتب ہوئی تھی۔

صاحبِ ملفوظات

حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ ' پروفیسر خلیق احمد نظامی کے اندازے کے مطابق ۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ء میں شمالی ہند میں پیدا ہوئے۔[3] ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی جائے ولادت کاکوری یا نگراؤں لکھی ہے۔[4] یہ دونوں قصبے لکھنؤ کے نواح میں موجود ہیں۔

حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کا سلسلۂ نسب شیخ الشیوخ ابو حفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے توسط سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔[5] انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطنِ مالوف میں حاصل کی اور پھر تکمیلِ علم کے لئے دہلی چلے آئے۔ دہلی میں قیام کے زمانے میں ان کا تعارف حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ سے ہوا اور ان کی رُوحانیت سے متأثر ہو کر ان کے مرید ہو گئے۔ جب انہوں نے سلوک کی منازل طے کر لیں تو ان کے مرشد نے انہیں دکن جانے کا حکم دیا۔ حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے مریدِ خاص اور جامع ملفوظات خواجہ محمد کامگار خان سے روایت ہے کہ حضرتِ والا قدر مدینہ منورہ جا کر حضرت یحییٰ مدنیؒ سے

---

۱ - مخطوطہ نمبر ۵۴ / ۵۷' شیفتہ گلکشن' مولانا آزاد لائبریری' مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ۔

۲ - مخطوطہ نمبر ۱۸۹' کتابخانہ درگاہِ عالیہ تونسہ شریف۔

۳ - خلیق احمد نظامی' تاریخِ مشائخِ چشت' دارالمولفین اسلام آباد' ص ۴۲۸۔

۴ - نجم الدین سلیمانی' مناقب المحبوبین' لاہور: ۱۹۷۷ء ص ۸۵۔

۵ - خواجہ گل محمد احمد پوری' تکملہ سیرالاولیاء' بہاولپور: ۱۹۷۸ء' ص ۴۶۔

فیضیاب ہونے کے متمنی تھے۔ اس ارادے سے وہ دہلی سے روانہ ہوئے۔ جب وہ دکن پہنچے تو انہیں یہ اطلاع ملی کہ حضرت یحییٰ مدنیؒ (م ۱۶۹۰ء) کا انتقال ہو چکا ہے۔ موصوف چونکہ صرف انہیں کی زیارت کے لئے مدینہ طیبہ جانا چاہتے تھے، اس لئے ان کے وصال کی خبر سن کر سفرِ حجاز منسوخ کر دیا اور شاہ کلیم اللہؒ سے آئندہ پروگرام کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے دکن میں قیام کرنے کا حکم دیا۔[1]

دکن چشتیہ سلسلے کا قدیم مرکز تھا۔ حضرت منتجب الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت زین الدینؒ، امیر حسن علاء سجزیؒ اور بندہ نواز گیسودرازؒ نے دکن میں چشتیہ سلسلے کی خوب اشاعت کی تھی۔ دکن جا کر خواجہ نظام الدینؒ نے شاہی لشکر میں قیام کیا اور وہاں سپاہیوں کی روحانی تربیت فرماتے رہے[2] ان کے مرشد کے مکتوبات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا قیام شولاپور، برہانپور اور بیجا پور میں رہا لیکن انہوں نے مستقل سکونت کے لئے اورنگ آباد کا انتخاب کیا اور وہاں ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ خواجہ گل محمد احمد پوری سے منقول ہے کہ اس خانقاہ میں حضرتِ والا قدر نے ایک لاکھ سے زائد افراد کی تربیت کی[3]۔ انہوں نے اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق اپنی خانقاہ کا دروازہ ہر کس و ناقص کے لئے کھلا رکھا تھا۔

حضرت نظام الدینؒ کے قیامِ دکن کے دوران ہی ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیبؒ نے احمد نگر کے نواح میں وفات پائی۔[4] اورنگ زیبؒ کے فرزند محمد اعظم نے فوراً شاہی کیمپ پر قبضہ کر کے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اورنگ زیبؒ کا سب سے چھوٹا بیٹا کام بخش بھی دکن میں موجود تھا۔ اس نے بھی اورنگ زیبؒ کا جانشین ہونے کا اعلان کر دیا۔ اورنگ زیبؒ کا سب سے بڑا بیٹا معظم کابل کا گورنر تھا۔ وہ ان دنوں جمرود میں مقیم تھا۔ اسے والد کی وفات کی اطلاع ملی تو اس نے بھی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ معظم نے شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے لاہور اور سرہند کے راستے دہلی کا رخ کیا۔ دوسری جانب سے اعظم آگرے کی جانب بڑھا۔ جاجو کے میدان میں دونوں بھائیوں کا مقابلہ ہوا جس میں اعظم مارا گیا۔ جاجو کی جنگ میں کامیابی کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ نے دکن کا رخ کیا۔ حیدر آباد کے نواح میں شاہ عالم اور کام بخش کے درمیان مقابلہ ہوا جس میں کام بخش گھائل ہو کر فوت ہوا۔

---

۱ - کامگار خان، ملفوظاتِ خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، ص ۱۲۔
۲ - ایضاً۔
۳ - خواجہ گل محمد احمد پوری، تکملہ سیرالاولیاء، بہاولپور: ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۶۔
۴ - مستعد خان ساقی، مآثر عالمگیری (انگریزی ترجمہ از جدوناتھ سرکار) کلکتہ: ۱۹۴۷ء، ص ۳۰۹۔

تخت نشینی کی ان جنگوں نے مغلوں کی فوجی قوت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۷۱۲ء میں شاہ عالم کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس کے مرتے ہی اس کے چار بیٹوں میں حصولِ تخت کے لئے جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں جہاندار شاہ اپنے تین بھائیوں عظیم الشان، رفیع الشان اور جہاں شاہ کو ٹھکانے لگا کر تخت نشین ہوا۔[۱] اس کا زیادہ وقت لعل کنور نامی ایک مغنیّہ کی صحبت میں گذرتا تھا۔[۲] اس کی اُمورِ مملکت میں عدم دلچسپی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عظیم الشان کے فرزند فرخ سیر نے اسے شکست دے کر قتل کروا دیا اور خود تخت و تاج کا مالک بن گیا۔ فرخ سیر کی تخت نشینی کے جلد بعد اس کا سیّد برادران سے اختلاف ہو گیا جس نے آگے چل کر طرفین کو مخالف کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔ سیّد برادران نے ۱۷۱۹ء میں فرخ سیر کو تخت و تاج سے معزول کر کے اس کی جگہ رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ تپدق کا مریض تھا۔[۳] تین ماہ دس دن کے بعد اس نے سیّد برادران سے درخواست کی کہ اس کی جگہ اس کے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیں۔[۴] سیّد برادران نے اس کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اس کی جگہ اس کے بھائی رفیع الدولہ کو شاہجہان ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ سوا تین ماہ کے بعد اس نے بمرضِ اسہال انتقال کیا تو سیّد برادران نے روشن اختر کو قید خانے سے نکال کر محمد شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔[۵] وہ افیم کا رسیا تھا اور اس کا زیادہ وقت عیش و طرب کی مجالس میں گذرتا تھا۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ اپنے ۲۸ سالہ دورِ حکومت میں اگر وہ کبھی محل سے باہر نکلا تو لوتی پارک میں گھومنے کے لئے یا گڈھ کا میلہ دیکھنے کے لئے۔[۶]

اورنگ زیبؒ کے جانشینوں کی کمزوری اور امورِ مملکت میں عدم دلچسپی سے پنجاب میں سکھوں نے سرکشی اختیار کی۔ دہلی اور آگرہ کے درمیانی علاقے میں جاٹوں نے اپنا اقتدار قائم کر لیا اور دکن میں مرہٹوں نے دوبارہ قوت پکڑ لی۔ دکن پر قبضہ جمانے کے لئے امیر الامراء حسین علی خان، مبارز خان اور نظام الملک آصف جاہ اوّل میں رسّہ کشی شروع ہو گئی۔ مبارز خان اور نظام الملک کے مابین شکر کھیڑہ کے مقام پر ایک خونریز جنگ ہوئی۔[۷] اس کا ذکر حضرت نظام

---

۱ ۔ خافی خان، منتخب اللباب، کراچی: ۱۹۶۳ء، ج ۴، ص ۱۳۸۔

۲ ۔ خلیق احمد نظامی، تاریخِ مشائخِ چشت، دارالمولفین اسلام آباد، ص ۳۵۶۔

۳ ۔ Pandey, A.B: Later Medieval India, Allahabad: 1978, P. 298.

۴ ۔ خافی خان، منتخب اللباب، کراچی: ۱۹۶۳ء، ج ۴، ص ۲۷۷۔

۵ ۔ Pandey, A.B: Later Medieval India, Allahabad: 1978, P. 298

۶ ۔ خلیق احمد نظامی، تاریخِ مشائخِ چشت، دارالمولفین اسلام آباد، ص ۳۵۸۔

۷ ۔ محمد محبوب جنیدی، حیاتِ آصف، حیدر آباد: ۱۳۵۶ھ، ص ۲۱۳۔

الدین کے ملفوظات میں بھی آیا ہے۔[۱]

حضرت نظام الدینؒ نے بائیس سال اسی سیاسی اتار چڑھاؤ کے زمانے میں گذارے۔ انہیں اس عرصے میں کتنی ذہنی اور روحانی کوفت ہوئی ہو گی' اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں۔ اس تمام عرصے میں وہ اپنی خانقاہ میں بیٹھ کر پریشان حال عوام کی ہمت بندھاتے رہے اور بے سکون قلوب کو سکون بخشتے رہے۔ ان کے ملفوظات اور احسن الشمائل کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنا چاہئے۔

احسن الشمائل

احسن الشمائل میں بیشتر ملفوظات وہ ہیں جو خواجہ کامگار خان نے خود حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کی زبان فیض ترجمان سے سُنے تھے۔ کئی جگہ انہوں نے اپنے بھائی نور الدین سے بھی روایت کی ہے۔ متوخر الذکر بھی حضرت نظام الدینؒ کے مرید با اخلاص تھے۔

تاریخی انکشاف

حضرت نظام الدینؒ نے ایک روز حاضرین مجلس کو بتایا کہ جب حضرت عثمان ہارونیؒ نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اجمیر روانہ فرمایا تو اسی زمانے میں اپنے ایک مرید باصفا محمد طاہر المعروف بہ حاجی رومیؒ کو دکن بھیجا۔ ان کا مزار بیجا پور میں ہے اور حضرت نظام الدینؒ نے وہاں مراقبہ کیا تھا۔[۲]

جس وقت حضرت محمد طاہرؒ دکن پہنچے تو وہاں کا حکمران "اشد و اکفر" تھا۔ اس کی رعایا بھی ہندو دھرم کی پیرو تھی۔ حضرت محمد طاہرؒ نے بیجا پور آنے کے بعد گائے ذبح کی تو ہندوؤں نے ان پر بلہ بول دیا۔ حضرت کی کرامت سے حملہ آوروں کی بینائی جاتی رہی۔ چند مخلصین کی سفارش پر حضرت نے دعا کی تو ان کی بینائی لوٹ آئی۔ ان کی یہ کرامت دیکھ کر بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔[۳]

میاں فیضو

برہان پور میں میاں فیضو نامی ایک عالم رہتے تھے جنہیں علوم ظاہری پر عبور کامل تھا۔

---

۱ - کامگار خان' ملفوظات خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ' ص ۱۸۴۔

۲ - کامگار خان' احسن الشمائل' ورق ۵ الف۔

۳ - ایضاً' ورق ۵ ب۔

وہ درویشوں اور درویشی کے مخالف تھے۔ شاہ وجیہ الدین گجراتیؒ نے احمد آباد سے اپنے ایک مرید دلربا کو برہان پور بھیجا اور چلتے وقت ان سے کہا کہ میاں فیضو کا حصہ ان کے پاس ہے۔ لہٰذا وہ اسے یاد حق میں لگا دیں۔

دلربا طالب علم بن کر میاں فیضو کے درس میں حاضر ہوئے اور ان سے میزان پڑھنے کی درخواست کی۔ میاں فیضو نے کہا کہ اس کا کوئی طالب علم انہیں یہ کتاب پڑھا دے گا۔ دلربا نے میاں فیضو سے ہی پڑھنے پر اصرار کیا۔ جب میاں فیضو نے پڑھانا شروع کیا تو دلربا پر شوقِ الٰہی کا غلبہ ہوا اور انہوں نے میاں فیضو پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کا دل مقناطیس کی طرح کھینچ لیا۔ میاں فیضو کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ اسی حال میں گھر چلا گیا اور سارا ماجرا اپنی والدہ سے بیان کیا۔ وہ زاہدہ' عابدہ اور صاحبۂ دل خاتون تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ جیسے بھی ہو' وہ یہ نعمت دلربا سے حاصل کرے۔ میاں فیضو نے واپس جا کر دلربا سے معافی مانگی اور ان کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کیں۔!

حضرت نظام الدینؒ کا اخلاق اور معمولات

کامگار خان لکھتے ہیں کہ حضرت نظام الدینؒ ہر آنے والے کا کھڑے ہو کر استقبال کرتے تھے خواہ وہ چار سال کا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔۲

نماز فجر ادا کرنے کے بعد موصوف اپنے حجرے میں تشریف لے جاتے اور وہاں پانچ چھ گھڑی عبادت میں مصروف رہتے۔ اس وقت کسی کو بھی ان کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی۔ معمولات سے فراغت کے بعد حضرت حجرے کا دروازہ کھولتے۔ اس وقت اگر کوئی ملنے والے ہوتے تو دوپہر تک ان کے پاس بیٹھتے اور نماز ظہر ادا کر کے پھر اپنے حجرے میں تشریف لے جاتے۔ جب پانچ چھ گھڑی دن باقی رہ جاتا تو حضرت اپنے حجرے سے برآمد ہوتے اور ملاقاتیوں سے ملتے۔ پھر کامگار خان کے بھائی محمد نور الدین مشکوٰۃ شریف یا کوئی اور کتاب پڑھ کر سناتے۔۳

نماز عصر کے بعد خواجہ کامگار خان مشائخ کے احوال پر مشتمل کتابیں پڑھ کر سناتے۔ مغرب کی نماز ادا کر کے حضرت دوبارہ اپنے حجرے میں تشریف لے جاتے۔ اس وقت جس کا جی

---

۱ - ایضاً' ورق ۷ ب۔
۲ - ایضاً' ورق ۷۶ الف۔
۳ - ایضاً' ورق ۷۷ ب۔

چاہتا وہ ان سے مل سکتا تھا۔ اسی وقت خواجہ نورالدین لوگوں کی سفارش کرتے۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت اپنی زبان مبارک سے معارف کا بیان پسند نہ فرماتے تھے۔ اگر کوئی محض معارف کے بارے میں سوال کرتا تو حضرت اس سے کہتے کہ فلاں بزرگ کی کتاب میں اس کا جواب موجود ہے، وہاں دیکھ لے۔ حضرت خود معارف گوئی سے پرہیز فرماتے تھے۔[۱]

کامگار خان نے اس تصنیف دل پذیر میں حضرت کا حلیہ بیان کیا ہے اور ان کے جسم کے ایک ایک عضو کی تعریف کی ہے۔ وہ ہر عضو کی تعریف میں اپنے والد بزرگوار خواجہ برہان الدین کی بیاض سے شعر نقل کرتے ہیں۔[۲] اس بیاض کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اب کس کتابخانے میں محفوظ ہے یا ضائع ہو گئی ہے۔

احسن الشمائل کی تکمیل ۲۲ ماہ صفر کو اورنگ زیب عالمگیر کے اڑتالیسویں سال جلوس میں ہوئی۔ ہمارے حساب سے یہ ۱۷۰۴ء تھا۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا مخطوطہ ۱۷۸۵ء کا تحریر شدہ ہے۔

✪✪✪

---

۱ ۔ ایضاً ورق ۷۸ الف۔

۲ ۔ ایضاً ورق ۷۹ الف۔

ملفوظات خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ

"احسن الشمائل" کی تدوین کے بعد خواجہ محمد کامگار خان نے اپنے شیخ طریقت کے ملفوظات جمع کیے۔[1] اس تصنیف دل پذیر میں جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام حضرت نظام الدینؒ کے شوق دلانے پر کیا ہے۔ انہوں نے فاضل مرتب سے کہا تھا کہ جو مرید اپنے پیر کے "مقالات و حالات" جمع کرتا ہے اسے اجر عظیم ملتا ہے۔[2]

حضرت نظام الدینؒ کی علم دوستی

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ان کے مرشد کی مجالس میں تفسیر حسینی، مناقب چشتیہ، دیوان مولانا جلال الدین رومیؒ، کیمیائے سعادت، مشکوٰۃ شریف، مثنوی معنوی، لطائف اشرفی، بحرالاسرار، سبع سنابل، حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کی تصنیف مرأت، مکتوبات اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور تاریخ فرشتہ پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ جب خواجہ کامگار خان نے حضرت کے دست مبارک پر بیعت کی تو آنجناب نے اسے رشحات عین الحیات پڑھنے کی تلقین فرمائی۔[3] حضرت نظام الدینؒ نے تفسیر حسینی کے متن کا تقابلی مطالعہ فرمایا تھا اور کبھی کبھی خود بھی اپنی خانقاہ میں مشکوٰۃ شریف کا درس دیا کرتے تھے۔

حضرت نظام الدینؒ کا قیام اورنگ آباد

کامگار خان لکھتے ہیں کہ حضرت کے دکن آنے کی وجہ زیارت بیت اللہ تھی اور موصوف مدینہ منوّرہ میں اپنے دادا مرشد حضرت یحییٰ مدنیؒ سے ملنے کے متمنی تھے۔ جب آنجناب برہانپور پہنچے تو ایک زائر حرم نے انہیں حضرت یحییٰ مدنیؒ کی وفات کی اطلاع دی۔ اس لئے انہوں نے حجاز مقدس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور حضرت شاہ کلیم اللہؒ کے مشورے سے دکن میں مقیم ہو گئے۔[4]

---

۱ - مخطوط نمبر ۱۸۹، خانقاہ عالیہ تونسہ شریف۔

۲ - ایضاً، ص ۱۔ (مخطوطے پر اوراق کی بجائے صفحات کے نمبر لگائے گئے ہیں)۔

۳ - ایضاً، ص ۲۲۔

۴ - ایضاً، ص ۳۔

دارا شکوہ

حضرت نظام الدین شاجہان کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ابھی آٹھ سال کے تھے جب دارا شکوہ اور عالمگیر اورنگ زیب کے مابین ساموگڈھ کا معرکہ ہوا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ دارا شکوہ کی طبیعت زندقہ کی طرف مائل تھی اور وہ نماز و رُوزہ ترک کر چکا تھا۔[۱]

شاہ پیر سلونی

حضرت شاہ پیرؒ ضلع رائے بریلی کے ایک گاؤں سلون کے رہنے والے اور شاجہان کے ہم عصر تھے۔ اس عہد کے کسی مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر موجود ہے جس میں شاجہان اپنے فرزندوں سمیت ان کی خدمت میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ حضرت نظام الدینؒ ان کے قریب العہد تھے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ شاہ پیر کے بے شمار مرید تھے۔ ایک بار موصوف اپنے بیٹے کی بارات لے کر گئے۔ دوران سفر ایک "انبوہ کثیر" نے ان کا مرید ہونے کی تمنا ظاہر کی تو حضرت نے اپنی دستار پھیلا دی۔ جس نے اسے تھام لیا' اسے اپنا مرید کر لیا۔ حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں پر درد اور شوق کا غلبہ ہو جاتا تھا اور ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔[۲]

سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ

حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ فرماتے ہیں کہ سلطان المشائخؒ کو راگ پُوربی بہت پسند تھا اور یہ راگ سن کر ان پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ ایک بار کسی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے عالم ارواح میں "الستُ بربکم" کی آواز اسی راگ میں سنی تھی اور اسی راگ میں ہی "بلیٰ" کہا تھا۔ اسی روز سے یہ آواز ان کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔[۳]

ایک اہم انکشاف

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ شولاپور کے نواح میں بہت سے ہندو دَر پردہ مسلمان تھے اور وہ اپنے رشتہ داروں سے اپنا اسلام مخفی رکھتے تھے۔[۴]

---

۱ ۔ ایضاً' ص ۱۶۔
۲ ۔ ایضاً' ص ۷۶۔
۳ ۔ ایضاً' ص ۱۵۷۔
۴ ۔ ایضاً' ص ۱۳۲۔

جنگِ شکر کھیڑہ

دکن کی تاریخ میں جنگِ شکر کھیڑہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ جنگ میر قمرالدین نظام الملک آصف جاہ اوّل اور سید برادران کے حلیف مبارز خان کے مابین ۱۱ اکتوبر [illegible] برار کے مشہور مقام شکر کھیڑہ میں لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں کامیابی کے بعد نظام نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی۔ خواجہ کامگار خان لکھتے ہیں کہ اس جنگ میں پانچ چھ ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔[1] "حیاتِ آصف" میں مرقوم ہے کہ مبارز خان کی فوج کے تین ہزار سپاہی اس جنگ میں کام آئے اور وہ خود بھی مارا گیا۔[2] اب اگر اتنی ہی تعداد نظام الملک کے مقتولین کی تصور کر لی جائے' تو کامگار خان کے اعداد و شمار صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ "حیاتِ آصف" کے مصنف نے غنیم کے مقتولین کی تعداد تو بتا دی لیکن نظام الملک کے ہمراہیوں کا ذکر گول کر گئے۔

سیّد یوسف المعروف بہ راجو قتالؒ

سیّد یوسفؒ' حضرت بندہ نوازؒ گیسو درازؒ کے والدِ محترم تھے۔ اور ان کا مزار خلد آباد میں ہے۔ خواجہ کامگار خاں لکھتے ہیں کہ لوگ ان کے مزار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔[3] (حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کی ایک اہلیۂ محترمہ' جو شاہ فخرالدینؒ کی والدۂ ماجدہ تھیں' حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی اولاد سے تھیں)۔

چشتی بزرگوں کا مسلک

مشائخ چشت ہمیشہ شاہی درباروں سے دور رہتے تھے اور سلاطین کو ملنے سے اجتناب کرتے تھے۔ ایک بار حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے اپنی مجلس میں اس مسلک کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ ایک بار شہزادہ محمد اعظم نے ان سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت نے اپنے مشائخ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس کے ساتھ رابطہ قائم نہ کیا۔[4]

---

۱ - ایضاً' ص ۱۸۴۔
۲ - محمد محبوب جنیدی' حیاتِ آصف' حیدر آباد ۱۳۶۵ھ' ص ۲۲۳۔
۳ - کامگار خان' ملفوظاتِ خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ' ص ۶۸۔
۴ - خلیق احمد نظامی' تاریخِ مشائخِ چشت' دارالمولفین اسلام آباد' ص ۴۵۰۔

مخدوم جہانیاں کے ملفوظات

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ کسی نے مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشتؒ کے ملفوظات کا خلاصہ "خلاصہ الالفاظ" کے عنوان سے تیار کیا تھا۔ یہ بہت بڑا علمی انکشاف ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا ذکر کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے بیشتر احفاد اپنے جدِّامجد کا دینی مشرب اور فقہی مسلک ترک کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض الحاد و زندقہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں کچھ افراد ایسے بھی ہیں' جو واجب القتل ہیں۔[۱]

حضرت نظام الدینؒ رُوحانی طبیب ہونے کے ساتھ جسمانی طبیب بھی تھے۔ انہوں نے خواجہ کامگار خان اور محمد نورالدین کا علاج کیا۔ ایک بار حضرت خود ایک موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تو انہوں نے اپنا علاج خود ہی کیا۔[۲]

حضرت نظام الدینؒ اور سماع

چشتی بزرگوں کی خانقاہوں میں کبھی کبھی محفل سماع منعقد ہوا کرتی تھی۔ حضرت نظام الدینؒ کے ہاں بھی تیسرے چوتھے روز سماع کا اہتمام ہوتا تھا۔ خواجہ کامگار خان رقمطراز ہیں کہ ان کے مرشد کی خانقاہ میں دَف کے علاوہ اور کوئی ساز نہیں بجتا تھا۔[۳]

حضرت نظام الدینؒ کا وصال

شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو دہلی میں ہوا۔ جب ان کے انتقال کی خبر اورنگ آباد پہنچی تو ان دنوں حضرت نظام الدینؒ علیل تھے۔ مرشد کی وفات ان کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ/ ۲۹ مئی ۱۷۲۹ء کو ان کا بھی وصال ہو گیا۔[۴]

✪✪✪

۱ - کامگار خان' کتاب مذکورہ' ص ۴۰۔
۲ - ایضاً' ص ۸۰۔
۳ - ایضاً' ص ۱۵۔
۴ - ایضاً' ص ۲۰۷۔

ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ملفوظات ان کے ایک مرید نے' جس نے متن میں اپنا نام نہیں لکھا' قلمبند کئے تھے۔ یہ ان کی عمر کے آخری دور میں مرتب ہوئے تھے۔اس لئے ان ملفوظات کو پکے ہوئے پھل کہنا بیجا نہ ہو گا۔ ملفوظات کی تدوین کے دوران میں ہی ۱۸۱۸ء میں شاہ رفیع الدینؒ کا انتقال ہوا اور ان کی تکمیل شاہ عبدالعزیز کی وفات ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کے ساتھ ہوئی۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات میں متاخر مغلوں کے دورِ حکومت کی تہذیب و ثقافت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان میں بعض ایسے حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں جو اور کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ مؤرخِ شہیر سید معین الحق مرحوم (م ۱۹۸۹ء) ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیزؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:
"یہ ملفوظات مختلف معلومات کا بیش بہاء ذخیرہ ہیں۔ شرعی احکام' تاریخی واقعات' تحقیقی نکات اور علمی بیانات غرضیکہ گونا گوں نوادرات کا ایک مختصر مگر دلچسپ دائرۂ معارف ہے۔"[1] اس لئے اس دور کی تاریخ مرتب کرتے وقت اس تصنیفِ دلپذیر سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

ملفوظات کا یہ مجموعہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۸۹۶ء میں فارسی زبان میں شائع ہوا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں مولوی عظمت الٰہی بن مولوی محمد ہاشم نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا لیکن اس ترجمے میں بہت سی اغلاط راہ پا گئی تھیں جن کی تصحیح ضروری تھی ۶۳ برس انتظار کے بعد سید معین الحق مرحوم کی فرمائش پر مولوی محمد علی قریشی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی گوپاموی نے اس کا فارسی سے دوبارہ اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۹۶۰ء میں کراچی سے طبع ہوا۔ اس وقت یہی ترجمہ میرے پیش نظر ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ' حضرت شاہ ولی اللہ محدِّث دہلویؒ کے فرزندِ ارجمند' جانشین اور اپنے عہد کے سب سے بڑے محدِّث اور مفسّر تھے۔ آج پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں شاید ہی کوئی عالمِ دین ایسا ہو جس کا سلسلۂ تلمذ شاہ صاحب سے نہ ملتا ہو۔ میرے فاضل دوست نورالحسن راشد کاندھلوی نے ایک شجرہ شائع کیا ہے جس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے سوانح حیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔اس لئے میں اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے براہِ راست ان کے ملفوظات کی اہمیت اور حاصلِ مطالعہ پر اپنے تاثرات قلمبند کر رہا ہوں۔

---

۱ - ڈاکٹر معین الحق' پیش لفظ' ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیزؒ' مطبوعہ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز' کراچی ۱۹۶۰ء۔

شاہ عبدالرحیمؒ

شاہ عبدالعزیزؒ کے دادا شاہ عبدالرحیمؒ نے منازل سلوک خواجہ باقی باللہؒ کے فرزند ارجمند خواجہ خرد' سید عظمت اللہ اکبرآبادی اور ابوالقاسم اکبرآبادی کی نگرانی میں طے کی تھیں اور ان پر اُبُوالعلائی نسبت غالب تھی۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ان کی توجہ اتنی قوی تھی کہ ایک بار انہوں نے توجہ ڈال کر من بھر کا پتھر اپنی جگہ سے ایک بالشت سرکا دیا تھا۔[۱]

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ان کے والدِ بزرگوار نے ہر فن میں ایک ماہر تیار کر لیا تھا اور وہ اس فن کے طالب علموں کو اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ موصوف خود معارف گوئی اور معارف نویسی میں مشغول رہتے تھے اور حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ باوجود سخت محنت کے وہ بہت کم بیمار ہوتے تھے۔[۲]

شاہ عبدالعزیزؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کے برابر حافظ کسی کا نہیں دیکھا۔[۳] ایک بار شاہ عبدالعزیزؒ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ طب بھی ان کے خاندان میں معمول تھا۔ ان کے دادا شاہ عبدالرحیمؒ اور چچا شاہ اہل اللہؒ باقاعدہ مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ البتہ شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے باوجود اطباء مؤخرالذکر کے پاس طبی مشکلات کے حل کے لئے آیا کرتے تھے۔[۴]

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ جب ان کے والدِ بزرگوار شاہ ولی اللہؒ اپنے اُستاد شیخ ابو طاہر بن ابراہیم مدنیؒ سے اجازت لے کر مدینہ طیبّہ سے عازمِ ہندوستان ہوئے تو چلتے وقت اپنے اُستاد سے کہنے لگے کہ انہوں نے اب تک جو کچھ پڑھا تھا وہ فراموش کر دیا ہے بجز علمِ حدیث کے' جو ان کے ذہن میں محفوظ ہے۔[۵] شاید ایسے ہی موقع کے لئے یہ شعر کہا گیا تھا:

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلّا حدیثِ یار کہ تکرار می کنیم

---

۱ - ایضاً' ص ۹۵ - ۹۴۔
۲ - ایضاً' ص ۹۵۔
۳ - ایضاً' ص ۵۳۔
۴ - ایضاً' ص ۷۹۔
۵ - ایضاً' ص ۱۷۴۔

ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیزؒ سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے بعد جب ان کی جانشینی کا مسئلہ اٹھا تو ان کے معتقدین نے بڑی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے چاروں بیٹوں کی دستار بندی کر دی تاکہ کسی کے دل میں برتری یا کمتری کا احساس پیدا نہ ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی اپنے وفات سے قبل اپنے برادر زادوں اور نواسوں کے سروں پر دستاریں بندھوا دیں۔[۱]

شاہ رفیع الدینؒ

شاہ عبدالعزیزؒ اپنے بھائی شاہ رفیع الدینؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے علومِ ریاضی میں اس قدر استعداد پیدا کر لی تھی کہ اس فن کا موجد محمد علی بھی ان سے زیادہ علم نہیں رکھتا تھا۔[۲] (محمد علی، خیر اللہ مہندس کا بیٹا تھا۔ علامہ تفضل حسین نے اسی سے ریاضی کی تکمیل کی تھی۔ سر سید احمد خان کے دادا فریدالدین احمد علّامۂ موصوف کے شاگرد تھے)۔

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ رفیع الدینؒ کا انتقال طاعون کے مرض سے ہوا تھا۔[۳]

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ

شاہ عبدالعزیزؒ شکل و شباہت میں اپنے دادا شاہ عبدالرحیمؒ سے مشابہ تھے۔ انھوں نے خود ایک مجلس میں اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔[۴] ایک روز شاہ عبدالعزیزؒ نے حاضرین کو بتایا کہ ان کے ہاتھ پر صدہا ہندوؤں نے اسلام قبول کیا ہے۔[۵]

بعض لوگوں نے اس نعتیہ رباعی کو شیخ سعدی کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے شاہ ولی اللہؒ کو اس کا مصنّف بتایا ہے۔ علمی رسائل میں اس پر بڑی لے دے ہو چکی ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اس رُباعی کو اپنی تصنیف بتایا ہے:۔[۶]

یا صاحبَ الجمالِ یا سیّدَ البشر
من وجہکَ المنیر لقد نوّر القمر

---

۱ - ایضاً، ص ۱۵۳۔
۲ - ایضاً، ص ۹۵۔
۳ - ایضاً، ص ۱۲۰۔
۴ - ایضاً، ص ۱۰۰۔
۵ - ایضاً، ص ۷۰۔
۶ - ایضاً، ص [illegible]۔

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ شاہ صاحب امریکہ سے واقف تھے اور اسے "فرنگیوں کی ارض جدید" کہتے تھے۔ موصوف ہندوستان اور امریکہ کے وقت میں فرق سے بھی کما حقہٗ واقف تھے۔[1]

تحفہ اثنا عشریہ شاہ عبدالعزیزؒ کی معرکہ آراء تصنیف ہے جس کا اب تک کوئی عالم جواب نہیں لکھ سکا۔ شاہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ایک شخص کا کہنا ہے کہ اگر یہ کتاب سونے کے برابر تول کر فروخت کی جائے تو بھی بیچنے والا نقصان میں رہے گا۔[2] ملفوظات ہی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ عبدالعزیزؒ کی حیات ہی میں تحفہ اثنا عشریہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ مترجم کا نام مولوی اسلمی تھا اور محمد علی خان ارکانی کے فرزند نے اس کا ایک نسخہ عرب بھجوایا تھا۔[3]

شاہ عبدالعزیزؒ کی فن موسیقی پر بڑی گہری نظر تھی اور انہوں نے اس فن پر ایک کتاب "سا گیت شاستر" کے عنوان سے تحریر کی تھی جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔[4] جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک روز ایک قوال حاضر خدمت ہو کر عرض پیرا ہوا کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اس کا نام تجویز کر دیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس کا نام سلام یا سلامت اللہ رکھنا۔ اسکے بعد انہوں نے فرمایا کہ اب اسی خوشی میں "دہنا سری" میں کچھ سناؤ۔ اس نے دہنا سری میں گانا شروع کیا اور جب کوئی اور راگ چھیڑا تو حضرت نے فرمایا کہ وہی خوب تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے سر میں درد تھا جو دہنا سری سننے سے جاتا رہا۔ انہوں نے سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی، راگ سن کر وہ کھول دی۔[5]

شاہ عبدالعزیزؒ اور قومی تشخص

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ مسلمانوں کو تانبے کے برتن استعمال کرنے چاہئیں

۱ - ایضاً ص ۱۷۰۔
۲ - ایضاً ص ۱۴۴۔
۳ - ایضاً ص ۷۰۔
۴ - شاہ عبدالعزیزؒ، سا گیت شاستر، مخطوطہ نمبر ۱۸۶۹، رضا لائبریری رام پور۔
۵ - ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ ص ۱۳۳۔

کیونکہ پیتل کے برتن استعمال کرنے سے ہندوؤں سے مشابہت لازم آتی ہے۔ اسی طرح ایسے برتن جو صرف ہندو ہی استعمال کرتے ہیں مثلاً تھال اور لوٹا (یہاں لوٹے سے مراد گڑوی ہے) ان کے بارے میں بھی یہ حکم ہے کہ مسلمان انہیں استعمال نہ کریں۔[۱]

ہُنڈی کا کاروبار

نواب نوازش علی خان کے استفسار پر شاہ صاحب نے ہُنڈی کے کاروبار کو جائز بتایا کیونکہ ان کے خیال میں یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ رقم بھیجنے کا محفوظ طریقہ تھا۔[۲]

عربی تصانیف کی صفت

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عربی تصانیف کی تعریف یہ ہے کہ اس میں عجمی بو نہ آئے۔ ان کے خاندان کے افراد نے جتنی کتابیں عربی زبان میں لکھیں، ان میں عجمیت کا شائبہ تک نہ تھا۔[۳]

ایک اہم انکشاف

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ گذشتہ تیس برسوں سے دین کا کچھ چرچا ہوا ہے ورنہ صبح سے شام تک بجز معقولات کے، حدیث و تفسیر کی کتابیں کوئی کھول کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور کوئی پڑھتا پڑھاتا تھا اور نہ اس کے متعلق مسائل دریافت کرتا تھا اور نہ ہی کوئی طالب حق تھا۔ اب الحمدللہ اس کا بہت رواج ہو گیا ہے۔[۴]

خلافتِ راشدہ کے بارے میں ایک نادر توضیح

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک انسان کی زندگی کے چار مراحل ہیں، اسی طرح خلافتِ راشدہ کے بھی چار درجے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عہد بچے کی مانند تھا جس کی کمزوری میں نشوونما ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا عہد شباب کا زمانہ تھا اور حضرت عثمان غنیؓ کا عہد کہولت کا دور تھا جس میں بعض اعضاء درست ہوتے اور بعض کمزور، حضرت علی المرتضیٰؓ کا دور سن پیری سے مشابہ ہے۔[۵]

---

۱ - ایضاً، ص ۹۰۔
۲ - ایضاً، ص ۸۷۔
۳ - ایضاً، ص ۱۰۰۔
۴ - ایضاً، ص ۱۷۱۔
۵ - ایضاً، ص ۱۷۵۔

دہلی کی رسمیں

اٹھارہویں صدی میں دہلی میں یہ دستور تھا کہ اگر کسی شخص کے بچے فوت ہو جاتے تھے تو وہ اپنے نومولود بچے کو نہلا دھلا کر مسجد میں رکھ آتے تھے۔ والدین یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنا بچہ خدا کی نذر کر دیا ہے اور پھر اسے امانت سمجھ کر گھر لے آتے تھے۔ خود شاہ عبدالعزیزؒ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ان کے کئی بڑے بھائی فوت ہو گئے تھے اس لئے انہیں پیدا ہونے کے بعد مسجد میں رکھ دیا۔ رمضان کے دن تھے۔ شاہ محمد عاشق پھلتیؒ اور مولوی نور احمدؒ وہاں معتکف تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیزؒ کو اٹھا کر بطور امانت شاہ ولی اللہؒ کو تھما دیا۔[1]

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانے میں اگر کوئی شخص کسی مشکل میں پھنس جاتا تو وہ کھانا تیار کر کے اس کے سات حصے کر کے سات متقی اور پرہیز گار لوگوں کو کھلا دیتا تھا اور اصحاب کہف کے ایصال ثواب کی نیت کر لیتا تھا۔ اس سے ایک روز قبل وہ سگ اصحاب کہف کی دعوت کے بہانے ایک کتے کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔[2] اسی طرح اس زمانے میں حاجت مند حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے نام پر تین کوڑیوں پر فاتحہ دلا کر فقراء میں تقسیم کر دیتا تھا۔[3]

راقم نے ایک بار شہرۂ آفاق مؤرخ پروفیسر شیخ عبدالرشید مرحوم (م ۱۹۹۴ء) سے سنا تھا کہ ایک بار متأخر مغلوں کے دور میں ارباب حل و عقد کسی شہزادے کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ اس وقت کسی نے اعتراض کیا کہ وہ تو مختون ہے اس لئے وہ تخت پر بیٹھنے کا حق دار نہیں ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سلاطین تیموریہ میں ختنہ کا رواج نہ تھا۔[4]

اٹھارہویں صدی کا معاشرہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دہلی والے بیجا اسراف کرتے تھے۔ نواب قمرالدین خان کے محل کی خواتین (نواب شعلہ پوری بیگم وغیرھا) عرق گلاب کے ساتھ غسل کیا کرتی تھیں اور بعض نوابوں کے گھروں میں روزانہ سو سو روپے کے پھول اور پان آیا کرتے تھے۔[5]

۱ - ایضاً ص ۲۰۲۔
۲ - ایضاً ص ۵۸۔
۳ - ایضاً ص ۹۲۔
۴ - ایضاً ص ۲۰۸۔
۵ - ایضاً ص ۲۰۴۔

اس زمانے میں لوگ اسلام کی صحیح تعلیمات سے اتنے دُور ہو چکے تھے کہ وہ رسم و رواج کو ہی دین سمجھ بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ اس زمانے میں ملامتی ہونے کے لئے منہیات کے ارتکاب کی ضرورت نہیں' صرف قرآن ہاتھ میں رکھنا ہی ملامتی ہونے کے لئے کافی ہے۔[1]

شاہجہان کے عہد کا لاہور

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ جن دنوں شہزادہ دارا شکوہ لاہور میں مقیم تھا تو اس نے وہاں کے حفّاظ کو جمع کیا۔ وہاں حفّاظ کی اتنی کثرت تھی کہ صرف ایک محلّے سے پانچ ہزار حافظ جمع ہوئے۔[2] (یہ محلّہ بلّہ تھا' جو اب گاندھی سکوئر کہلاتا ہے)۔

ملفوظاتِ خواجگانِ چشت

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ "فوائد الفواد" بہت معتبر کتاب ہے اور اس زمانہ میں یہ کتاب دستور العمل رہی ہے مگر دوسرے ملفوظات مشتبہ ہیں اور غالباً" وہ اصلی ملفوظات نہیں ہیں۔[3] شاہ صاحب اپنے زمانے کے سب سے بڑے محدّث تھے اور انہوں نے جرح و تعدیل کے اُصولوں پر ان ملفوظات کا جائزہ لیا تو ان میں کئی طرح کے جھول نظر آئے۔

سُونی پت کے قاضی

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے زمانے میں سُونی پت کے قاضی رُوزے کی حالت میں حقّہ نوشی کیا کرتے تھے اور وہ اسے مباح سمجھتے تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ گرد و غبار اور دھواں حلق میں جانے سے رُوزہ فاسد نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب اس پر گواہ ہیں کہ قاضی کی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ رُوزے کی حالت میں تمباکو نوشی کرنے لگے تھے۔ اسی طرح چند پٹھان مولویوں نے ایک امیر ریاست (امیر ٹونک؟) کو رُوزہ کی حالت میں نسوار سُونگھنے کی اجازت دے دی تھی۔[4]

۱ - ایضاً' ص ۱۹۳۔
۲ - ایضاً' ص ۱۴۴۔
۳ - ایضاً' ص ۱۵۵۔
۴ - ایضاً' ص ۱۴۰۔

نوابانِ اودھ کا دورِ حکومت

شاہ صاحب نے ایک بار فرمایا کہ نوابانِ اودھ کی حکمرانی میں برکت اور طمانیت نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں انگریزوں کے زیرِ اثر علاقوں میں اور بھی زیادہ بے برکتی ہے۔[۱]

برطانوی ہند کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ

ایک بار نواب محمد سعید خان کے استفسار پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ رام پور اور لکھنؤ دارالحرب نہیں ہیں لیکن کلکتہ سے لاہور تک کا علاقہ دارالحرب کا حکم رکھتا ہے۔[۲] اس کے بعد شاہ صاحب نے لکھنؤ کے بارے میں اپنی رائے بدل لی اور اس کے لئے دارالرفض کی نئی اِصطلاح وضع کر لی۔[۳]

شاہ صاحب اپنے ہم عصر مسلم حکام سے ناخوش تھے۔ ایک روز انہوں نے فرمایا کہ اہلِ اسلام میں ظلم نہایت درجہ شائع ہو گیا ہے اور ملک کفر کے ساتھ تو قائم رہ سکتا ہے لیکن ظلم کے ساتھ نہیں[۴]

اِمامِ اعظمؒ کے بارے میں تحقیق

عوام میں یہ مشہور ہے کہ امام اعظمؒ، امام جعفر صادقؒ کے شاگرد ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ امامِ اعظم ابو حنیفہؒ امام جعفر صادقؒ اور ان کے والدِ ماجد امام باقرؒ سے کم روایت کرتے ہیں لیکن زید شہیدؒ سے زیادہ روایت کرتے ہیں۔[۵]

نوّاب نجیب الدولہ کی علم پروری

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ روہیل کھنڈ کے حکمران نوّاب نجیب الدولہ کی سرکار میں نو سو علماء ملازم تھے جن کو پانچ روپے سے لے کر پانصد روپے تک وظیفہ ملتا تھا۔ اس کے دربار میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مذاہب کے قاضی موجود رہتے تھے۔[۶]

---

۱ - ایضاً، ص ۱۱۱
۲ - ایضاً، ص ۳۳۔
۳ - ایضاً، ص ۱۱۱
۴ - ایضاً، ص ۴۲۔
۵ - ایضاً، ص ۸۸۔
۶ - ایضاً، ص ۱۵۲۔

شیخ خیالیؒ

شیخ خیالی' شاہ عبدالعزیز شکر بارؒ کے برادرِ بزرگ اور اپنے زمانے کے نامور شیخِ طریقت تھے۔ ان کے خلفاء میں حضرت اللہ بخش گڑھ مکتیسریؒ' شیخ عبدالرزاق جھنجھانویؒ' شیخ پیر محمد میرٹھیؒ اور شیخ زمان پانی پتیؒ شارح لوائح قابلِ ذکر ہیں[1]

فضل اللہ جمالی

فضل اللہ جمالی صاحب "سیرالعارفین" اپنے زمانے کے نامور شاعر اور درویش تھے۔ موصوف سلطان سکندر لودھی (م ۱۵۱۷ء) کے اُستاد اور مولانا نور الدین عبدالرحمٰن جامی[2] کے ہم نشین تھے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جمالی معمّہ خوب کہتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے اپنے نام کا بھی کوئی معمّہ کہا ہے؟ انہوں نے کہا: "جمع مالاً" و عددہ (سورہ الھمزہ : ۲)

نواب روشن الدولہ

نواب روشن الدولہ' بانیٔ سنہری مسجد دہلی' حضرت میراں بھیک چشتی صابریؒ کے بڑے خاص مرید تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی "مقدمہ شعر و شاعری" میں نور بائی مغنّیہ کے ضمن میں ان کا ذکر کیا ہے۔[3] شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نواب صاحب کی قبر قدم شریف سے قریب ہے۔ ایک روز موصوف وہاں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی قبر پر ایک غلاف پڑا ہوا ہے جس پر ---- اللہ محمد بھیک ---- زرّیں حروف میں لکھا ہوا تھا۔[4]

شیخ علی حزین

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ فارسی کا نامور شاعر شیخ علی حزین بڑا متعصب تھا اور مذہب کے معاملہ میں ہندوستان کے باشندوں سے بڑا عناد رکھتا تھا۔ اسی بنا پر سراج الدین علی خان آرزو نے اس کی لغزشوں پر تنبیہ کی ہے۔ جب وہ دہلی آیا تو ایک حویلی کرایہ پر لے

---

۱ - ایضاً' ص ۱۳۵۔

۲ - ایضاً' ص ۱۳۵۔

۳ - الطاف حسین حالی' مقدمہ شعر و شاعری' مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ' ص

۴ - ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیزؒ' ص ۱۹۳۔

... رہنے لگا۔ اس حویلی کے دروازے پر ایک فقیر رہتا تھا جو فقراء کے دستور کے مطابق علی الصبح بلند آواز سے شجرۂ طریقت پڑھا کرتا تھا۔ ایک روز حویلی کے مالک نے حزین سے پوچھا کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ اور تو ہر طرح سے آرام ہے مگر دروازے پر تذکرۃ الاولیاء تشریف فرما ہے' اسے یہاں سے چلتا کریں۔

ایک روز اس کی حویلی میں مشاعرہ ہو رہا تھا اور سامعین شعراء کا کلام سن کر داد دے رہے تھے۔ حزین ہندوستان کے کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتا تھا (اور انہیں پوچ گویانِ ہند کہا کرتا تھا)۔ جب اس نے اپنے ہی گھر میں شعراء کو داد ملتے دیکھی تو کہنے لگا کہ اس نے سنا ہوا تھا کہ ہندوستان میں ڈاکے بہت پڑتے ہیں' آج اس کی حویلی پر بھی ڈاکہ پڑا ہے۔[۱] (راقم نے علی حزین کا مزار دیکھا ہے۔ وہ بنارس کے ایک امام باڑے "فاطمان" میں مدفون ہے)۔

حضرت عبدالاحد وحدتؒ

حضرت عبدالاحد المتخلص بہ وحدت' خواجہ محمد سعید سرہندیؒ کے فرزند ارجمند اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے پوتے تھے۔ موصوف اپنے زمانے میں نامور شاعر اور شیخ طریقت مانے جاتے تھے۔ شاہ گلشنؒ کو ان سے شرفِ تلمذ ہے۔ ملفوظات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوا کہ حضرت عبدالاحدؒ بڑے اچھے تاریخ گو تھے اور انہوں نے زینت المساجد دہلی کی تعمیر کی تاریخ اس آیتِ کریمہ سے نکالی تھی۔[۲]

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ (سورۂ توبہ: ۱۰۸)

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ مزامیر کے ساتھ سماع سنا کرتے تھے اور انہوں نے مزامیر کے جواز میں کئی رسالے بھی تحریر کئے تھے۔[۳]

تصوف برائے شعر گفتن خوب است

غازی الدین خان فیروز جنگ' میر قمرالدین خان' نظام الملک آصف جاہ بانیٔ سلطنتِ آصفیہ کے والد تھے۔ اورنگ زیب انہیں بڑا عزیز رکھتا تھا۔ ایک بار غازی الدین خان بیمار ہوئے تو

۱۔ ایضاً' ص ۲۰۲۔
۲۔ ایضاً' ص ۱۷۴۔
۳۔ ایضاً' ص ۹۲۔

اطباء نے انگور کھانے سے منع کیا۔ اورنگ زیب کو اس کا علم ہوا تو اس نے خان موصوف کے نام ایک خط میں تحریر کیا کہ اس نے بھی انگور کھانے بند کر دیئے ہیں۔ جب انہیں صحت ہو گی تو پھر اکٹھے ہی تناول کریں گے۔[۱]

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ غازی الدین خان بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ جس شعر کے معنی پیدا نہ ہوتے ہوں' اس کو تصوف میں لے جایئے' عمدہ معنی پیدا ہو جائیں گے۔[۲]

شاہ فخرالدینؒ

شاہ عبدالعزیزؒ شاہ فخرالدینؒ کو چچا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ ان کے شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے۔ موصوف جب کبھی مدرسۂ رحیمیہ میں تشریف لاتے تو شاہ ولی اللہؒ ان کے لئے بغیر مزامیر کے سماع کا اہتمام فرماتے۔ اگر انہیں کبھی مزامیر کے ساتھ سماع کی خواہش ہوتی تو پھر شاہ ولی اللہؒ مدرسے سے قریب اپنے برادرِ نسبتی کے گھر میں اس کا انتظام کر دیتے تھے۔[۳]

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ شاہ فخرالدینؒ کا ایک ہی بیٹا تھا جو انہوں نے پرورش کے لئے اپنی بہن کے پاس دکن (اورنگ آباد) میں چھوڑا ہوا تھا۔ شاہ فخرالدینؒ دہلی میں بڑے متفکر اور پریشان رہتے تھے اور احباب کے کام کی انجام دہی کے لئے ایسے مصروف رہتے تھے جیسے لوگ اپنے اہل و عیال کی فکر اور تدبیر میں مشغول رہتے ہیں۔[۴]

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ شاہ فخرالدینؒ اثنا عشریوں کو بھی مرید کر لیا کرتے تھے۔ ایک بار شاہ صاحب نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ ان کی بیعت کرنے کے بعد وہ اکابرِ اہلِ سنّت کو سبّ و شتم نہیں کرتے' اس لئے انہیں اثنا عشریوں کو مرید کرنے کا اجر ضرور ملتا ہو گا۔[۵]

---

۱ - محمد محبوب جنیدی' حیاتِ آصف' حیدر آباد: ۱۳۶۵ھ' ص ۶۴۔
۲ - ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز' ص ۵۲۔
۳ - ایضاً' ص ۱۹۔
۴ - ایضاً' ص ۲۱۷۔
۵ - ایضاً' ص ۷۹۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانے میں شاہ فخرالدینؒ کی خانقاہ میں دارالضرب قائم ہو گیا تھا جہاں سکّے ڈھالے جاتے تھے[1]۔

۱ - ایضاً ص ۱۹۹۔

دُرّالمعارف

حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کا شمار ان اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانانِ پاک و ہند کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں اپنی سیرت و کردار کے اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ دہلی اور اس کے اطراف میں اُنیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں عوام کی رُشد و ہدایت اور تعمیرِ مِلّت کا اہم فریضہ جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے شاہ غلام علیؒ نے انجام دیا ہے، اس کی مثال مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ شاہ صاحب کے ملفوظات دُرّ المعارف کو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی تعلیمات کا مرقع سمجھنا چاہئے۔ یہ کتاب اب تک تین بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۰۴ھ میں مطبع نامی سے شائع ہوا اور دوسری بار اسے شاہ زید ابو الحسن فاروقی سجادہ نشین درگاہ شاہ ابوالخیرؒ نے بڑے اہتمام کے ساتھ دہلی سے شائع کیا۔ تیسری بار یہ ۱۹۷۴ء میں استنبول میں طبع ہوئی۔ راقم الحروف کے پیشِ نظر اس کا پہلا ایڈیشن ہے۔

صاحبِ ملفوظات کا مختصر تعارف

شاہ غلام علیؒ، جن کا اصل نام عبداللہ تھا، ۱۷۴۵ء میں مشرقی پنجاب کے مشہور علمی و رُوحانی مرکز بٹالہ میں پیدا ہوئے۔[۱] ان کے والدِ بزرگوار شاہ عبداللطیف علویؒ شاہ ناصر الدین قادریؒ سے بیعت تھے اور ان کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا۔

شاہ غلام علیؒ کی ابتدائی زندگی بٹالہ میں گزری۔ ان کے والد بزرگوار کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے فرزندِ ارجمند کو اپنے مرشد سے بیعت کرا دیں۔ جب شاہ صاحب کی عمر سولہ سترہ یا بروایتے اٹھارہ برس کی ہوئی تو ان کے والد نے انہیں دہلی طلب فرمایا۔[۲] جس ان شاہ

۱۔ شاہ رؤف احمدؒ نے جواہرِ علویہ میں بٹالہ کو خالص پنجابی لہجے میں وٹالہ لکھا ہے۔ سر سید احمد خان نے بھی تذکرۂ اہلِ دہلی میں بٹالہ کی املا وٹالہ کی ہے۔

۲۔ شاہ رؤف احمد، دُر المعارف، مطبوعہ نامی پریس ۱۳۰۴ھ، ص ۴۳۔

غلام علیؒ دہلی پہنچے اسی روز شاہ ناصر الدین قادریؒ کا انتقال ہوا۔ شاہ صاحب کے والد نے ان سے کہا کہ اب موصوف جہاں چاہیں، بیعت کر لیں۔

شاہ غلام علی چار سال تک مختلف بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے اور اسی زمانے میں انہوں نے شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کی خدمت میں رہ کر دورۂ حدیث مکمل کیا۔ ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء میں وہ حضرت شمس الدین حبیب اللہ المعروف بہ مرزا مظہر جان جاناںؒ کی خدمت میں پہنچے اور مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا صاحب نے فرمایا: "جہاں ذوق و شوق اور کیفیات میتر آ سکیں وہاں بیعت کر لو' یہاں تو بغیر نمک کے پتھر کھانا ہے۔" شاہ صاحب نے عرض کیا: "مجھے یہی منظور ہے۔" مرزا صاحب نے ان کا جواب سن کر ارشاد فرمایا "مبارک ہو' آؤ بیعت کرو۔"[1] شاہ صاحب نے مرزا صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور یہ شعر پڑھا:[2]

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم
سر زمینے بود منظور آسمانے یافتم

شاہ غلام علیؒ پندرہ سال تک مرزا مظہر جان جاناںؒ کی مجلس ذکر اور حلقے میں بیٹھے اور ان کی خصوصی توجہ سے سلوک کی منازل طے کیں۔ مرزا صاحب کی شہادت (۱۷۸۰ء) کے بعد شاہ غلام علیؒ مسندِ ارشاد پر رونق افروز ہوئے اور چوالیس برس تک اپنے انفاسِ طیبہ اور حرارتِ عشق سے مرزا مظہر جان جاناںؒ کی خانقاہ کو آباد رکھا۔

شاہ رؤف احمدؒ رقم طراز ہیں کہ حضرت شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ میں سمرقند' بخارا' غزنی' تاشقند' حصار' قندھار' کابل' پشاور' ملتان' کشمیر' لاہور' سرہند' امروہہ' سنبھل' بریلی' رام پور' جائس' بہرائچ' گورکھ پور' عظیم آباد' ڈھاکہ' بنگال' حیدر آباد اور پونا کے باشندے دیکھنے میں آتے تھے۔[3] درالمعارف میں ایک اور موقع پر شاہ رؤف احمدؒ لکھتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کا رہنے والا ایک شخص شیخ خالد کردیؒ[4] سے شاہ غلام علیؒ کا ذکر سن کر ان کی زیارت کے لئے دہلی آیا۔ سرسید احمد خان رقم طراز ہیں:[5] "میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدماتِ خانقاہ کو

۱۔ شاہ رؤف احمد' جواہرِ علویہ' مطبوعہ اللہ والے' کشمیری بازار لاہور' تاریخ ندارد' ص ۱۳۱۔
۲۔ سرسید احمد خان' تذکرۂ اہلِ دہلی' کراچی ۱۹۶۵ء' ص ۲۵۔
۳۔ شاہ رؤف احمد' درالمعارف' ص ۱۰۶۔
۴۔ ایضاً' ص ۱۱۵۔

سعادتِ ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو ذکر ہی نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امڈتے تھے۔[1] شاہ رؤف احمدؒ اور سرسیّد احمد خان کی ان تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ غلام علیؒ کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور ان کی خانقاہ کو برِّعظیم پاک و ہند میں مرکزی مقام حاصل تھا۔

شاہ غلام علیؒ نے برِّعظیم پاک و ہند کے علاوہ افغانستان کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ شاہ رؤف احمدؒ رقم طراز ہیں کہ ایک روز شاہ صاحب کو القاء ہوا کہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ اپنے خلفاء کو دکن بھیجا کرتے تھے' اس لئے انہیں اپنے خلفاء کابل' قندھار اور بخارا بھیجنے چاہئیں۔[2]

"درالمعارف" کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ غلام علیؒ کے مشہور خلیفہ شیخ خالد کردیؒ نے بغداد میں قیام فرمایا تھا اور علمائے روم اور اکابرینِ عراق نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس علاقے میں یہ مشہور تھا کہ شیخ خالد کردی شاہ غلام علیؒ سے طریقۂ نقشبندیہ اخذ کر کے آئے ہیں۔[3] شاہ صاحب، شیخ کردیؒ سے برابر رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ شاہ رؤف احمدؒ نے ایک موقع پر شاہ غلام علیؒ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے' جو انہوں نے خالد کردیؒ کے نام لکھوایا تھا۔[4] درّالمعارف میں مرقوم ہے کہ ایک روز "مغرب" سے ایک شخص شاہ غلام علیؒ کی زیارت کے لئے آیا۔ دہلی آنے سے قبل وہ بغداد میں شیخ خالد کردیؒ سے مل چکا تھا۔ اس نے شاہ صاحب کو بتایا کہ ایک لاکھ کے قریب افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور اس نواح کے ایک ہزار عالم ان کے مرید ہیں۔[5] ایک روز سمرقند سے کچھ لوگ شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو موصوف انہیں دیکھ کر رونے لگے۔ شاہ غلام علیؒ نے روتے روتے مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "حضورا میں اس قابل نہیں ہوں کہ لوگ اس طرح سے دُور دراز کا سفر کر کے مجھے دیکھنے آئیں۔ یہ سب آپ کی عنایت ہے' ورنہ میں تو ایک نالائق پنجابی شخص ہوں۔[6]

---

۱ ۔ سرسیّد احمد خان' تذکرۂ اہلِ دہلی' ص ۲۶۔

۲ ۔ شاہ رؤف احمدؒ' درّالمعارف' ص ۱۰۷۔

۳ ۔ ایضاً" ص ۱۱۵۔

۴ ۔ ایضاً" ص ۱۷۸۔

۵ ۔ ایضاً" ص ۱۷۷۔

۶ ۔ شاہ رؤف احمدؒ' درّالمعارف' ص ۵۶ ' ۵۷۔

شاہ غلام علی کا شمار نقشبندی سلسلے کے مجددین میں ہوتا ہے۔ سرسید احمد خان کی تربیت ان کی گود میں ہوئی تھی۔ سرسید ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "حق یہ ہے کہ ایسا برشتہ جان شخ دیکھنے میں نہیں آیا اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور خود رفتگی کے سرمو احکامِ شریعت سے تجاوز نہ تھا اور جو کام تھا وہ باتباعِ سنت تھا۔ لقمہ مشتبہ سے نہایت پرہیز کرتے اور مالِ مشتبہ ہرگز نہ لیتے۔ جو شخص خلافِ شرع اور سنت ہوتا' اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے پاس اس کا آنا گوارا نہ کرتے۔"[1]

شاہ غلام علیؒ ۱۸۲۴ء میں فوت ہوئے۔ نمازِ جنازہ جامع مسجد میں ان کے خلیفہ اور جانشین شاہ ابُو سعید مجددیؒ نے پڑھائی اور انہیں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے پہلو میں جانبِ قبلہ ابدی آرام کے لئے جگہ ملی۔

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات شاہ رؤف احمد فاروقی، حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کی اولاد تھے۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ سے اس طرح سے ملتا ہے: شاہ رؤف احمد بن شعور احمد بن محمد شرف بن رضی الدین بن زین العابدین بن محمد یحییٰ بن مجددِ الفِ ثانیؒ ۔[2] موصوف ۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد انہوں نے شاہ درگاہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن کچھ عرصہ بعد اپنے خالہ زاد بھائی شاہ ابُو سعید مجددیؒ کے ساتھ شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں چلے آئے اور ان کی خدمت میں رہ کر سلوک کی منازل طے کیں۔

شاہ غلام علیؒ سے حصولِ خلافت کے بعد موصوف بھوپال تشریف لے گئے۔ وہاں انہیں قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ شاہ غلام علیؒ کے طریقے کی اشاعت زیادہ تر انہی کے ذریعے ہوئی۔ ان کی تصانیف میں سے جواہرِ علویہ' دُرّالمعارف اور مراتب الوصول خاص طور پر مشہور ہیں۔ شاہ رؤف احمدؒ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں سفرِ حج کے دوران میں فوت ہوئے۔ ہمارے زمانے میں ان کی اولاد سے شاہ محمد یعقوب مجددیؒ بڑے صاحبِ دل بزرگ ہو گزرے ہیں۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ان پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

دُرّالمعارف

دُرّالمعارف کا آغاز بروزِ ہفتہ ۱۲ ربیع الاخر ۱۲۳۱ھ کو ہوا اور یہ کتاب بروزِ اتوار یکم شوّال

۱۔ سرسید احمد خان' تذکرہ اہلِ دہلی' ص ۲۸' ۲۹۔

۲۔ شاہ رؤف احمد' جواہرِ علویہ' ص ۱۰۔

۱۲۳۱ھ کو مکمل ہوئی۔ جامع ملفوظات نے اکثر مجالس کی تاریخیں درج کی ہیں لیکن ان میں ایسے ملفوظات بھی موجود ہیں جن کی تاریخیں درج نہیں ہیں۔ شاہ غلام علیؒ کے ملفوظات میں چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کے ملفوظات کی طرح حکایات کی بھرمار نہیں ہے۔ ان کے ملفوظات عالمانہ ہیں اور ان کا ایک ایک ملفوظ ان کی شانِ علم پر دال ہے۔ دُرّ المعارف کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ غلام علیؒ اپنی خانقاہ میں قرآنِ حکیم، صحیح بخاری، ترمذی شریف اور مثنویٔ معنوی کا درس دیا کرتے تھے۔[۱] شاہ رؤف احمدؒ لکھتے ہیں کہ ان کے پیر و مرشد فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں تین کتابوں کا جواب نہیں ہے اور یہ تین کتابیں قرآنِ حکیم، صحیح بخاری اور مثنویٔ معنوی ہیں۔[۲]

ایک دن شاہ رؤف احمدؒ درسِ حدیث میں شریک تھے۔ شاہ غلام علیؒ نے ترمذی شریف کی یہ حدیث بیان فرمائی: فضل عائشہ علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام۔ یہ حدیث پڑھ کر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس حدیث سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر ثابت ہے اور انہیں یہ شرف ان کی علمیّت، اجتہاد، فقاہت، ترک و تجرید اور محبوبیتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔[۳]

گستن اچھا یا پیوستن

صوفیائے کرام میں گستن یا پیوستن کے بارے میں ہمیشہ سے اختلاف رائے چلا آتا ہے۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ ایک بار خواجہ حسن نظامی دہلوی نے علامہ اقبال کو "سرّ الوصال" کا خطاب دیا تو حضرت علامہ نے انہیں لکھا کہ وہ سرّ الوصال کی بجائے "سرّ الفصال" کہلانا پسند فرمائیں گے۔ بعض صوفیائے کرام کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصل سے سالک کی اپنی ہستی فنا ہو جاتی ہے اور فصل کی صورت میں اس کا ذاتی تشخّص باقی رہتا ہے۔ جو صوفیا نظریۂ وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ ہمیشہ خدا کے ساتھ وصل کے متمنّی رہتے ہیں لیکن جو بزرگ نظریۂ وحدت الشہود کے قائل ہیں وہ ذاتِ حق میں فنا کی بجائے بقا کے قائل ہیں۔ شاہ غلام علیؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک گستن سے پیوستن اچھا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ صوفیاء کے نزدیک یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جب خدا

---

۱ - شاہ رؤف احمدؒ، دُرّ المعارف، ص ۱۲۳، ۱۵۳، ۱۵۴۔
۲ - ایضاً" ص ۵۳، ۷۴، ۱۸۹، ۲۳۳۔
۳ - ایضاً" ص ۱۵۲۔

سے وصل ہو گا تو خلق سے خود بخود فصل ہو جائے گا اور اگر خلق سے فصل ہو گا تو خدا سے خود بخود وصل ہو جائے گا۔[۱]

وحدت الوجود

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ان کے پیر طریقت کو وحدت الوجود کے موضوع پر بہت سے اشعار یاد تھے اور موصوف اس موضوع پر مولانا رومیؒ ' ابن عربیؒ ' مولانا جامیؒ ' مولانا مغربیؒ اور شیخ احمد جامؒ کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔[۲] شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ فرمایا کرتے تھے کہ انا الحق کہنا آسان ہے لیکن "انا" کو ختم کرنا مشکل ہے۔[۳]

مریدوں کا احترام

شاہ رؤف احمدؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز شاہ غلام علیؒ کے ایک مرید بشارت اللہؒ خانقاہ میں آئے تو شاہ صاحب ان کے استقبال کے لئے اپنی قیام گاہ سے نکل کر مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مزار تک تشریف لائے۔ بشارت اللہؒ سے مل کر موصوف بے حد خوش ہوئے اور ان سے کہا کہ وہ جتنی نسبت لے کر گئے تھے' اس سے زیادہ لے کر واپس آئے ہیں۔ شاہ صاحب نے ان سے خوش ہو کر انہیں کلاہ رضا عنایت فرمائی' جو اس سے پہلے کسی اور مرید کو نہیں ملی تھی۔[۴]

طریقۂ نقشبندیہ

شاہ غلام علیؒ فرمایا کرتے تھے کہ قدماء صوفیا بڑی بڑی ریاضتیں کیا کرتے تھے۔ "حضرت خواجگان پیر پیراں مرہم دلہائے درد مند خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ" نے سنت خیر الانامؐ پر عمل کر کے راہِ طریقت کو آسان بنا دیا ہے۔ انہوں نے قرآنِ پاک کی اس آیت "یرید اللہ بکم الیسر ولایرید بکم العسر" پر نظر رکھتے ہوئے سخت قسم کی ریاضتوں سے منع کر کے ہم جیسے کم ہمتوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس طریقے میں بغیر کسی محنت کے پیرانِ کبار کی توجہ سے فیض ملتا ہے اور ہر سالک ہر مقام کے فیض سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔[۵] شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شاہ بہاء الدین نقشبندؒ نے طریقۂ نقشبندیہ کی بنیاد دو چیزوں پر رکھی ہے۔ اول: محبّت۔ دوم: متابعتِ شریعت۔[۶]

---

۱ - شاہ رؤف احمد' دُرّالمعارف' ص ۶۵۔
۲ - ایضاً" ص ۴۹ ' ۵۵۔
۳ - ایضاً" ص ۱۸۰ ۔ اناالحق گفتن آسان ست و انا را شکستن مشکل است۔
۴ - ایضاً" ص ۲۵۷۔
۵ - شاہ رؤف احمد' دُرّالمعارف' ص ۳۸۔
۶ - ایضاً" ص ۴۰۔

شاہ غلام علیؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ طریقۂ نقشبندیہ میں دو چیزیں اختیار کرتے ہیں۔ اول: سنت' دوم: توجہ بقلب۔ یہی طریقہ صحابہ کرام کا تھا اور وہ تمام امت کے اولیاء اللہ سے افضل ہیں۔ صحابۂ کرامؓ کے کمالات اصول ہیں تو اولیاء اللہ کے فروع اور ظلال ہیں۔ پس وہی طریقہ جو صحابۂ کرامؓ کا طریقہ ہے' باقی تمام طریقوں سے افضل ہو گا۔[1] شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ طریقۂ نقشبندیہ میں محرومی نہیں ہے۔ جو شخص اس سلسلے میں داخل ہوتا ہے وہ نسبتِ نقشبندیہ سے محروم نہیں رہتا اور جو ازلی بدبخت ہے وہ اس طریقے میں داخل ہی نہیں ہوتا۔[2] شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ طریقۂ نقشبندیہ سے چار چیزیں مراد ہیں۔ اول: بے خطرگی' دوم: دوامِ حضور و آگاہی' سوم: جذبات' چہارم: واردات[3] شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نسبتِ نقشبندیہ کو "بے نمک" کہا کرتے تھے اور انہوں نے ایک بار یہ الفاظ شاہ صاحب کی موجودگی میں بھی کہے تھے۔[4]

جس وقت شاہ غلام علیؒ نے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ سے مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی تو انہوں نے جواب میں یہی فرمایا تھا "جہاں ذوق و شوق اور کیفیات میسر آ سکیں وہاں بیعت کر لو۔ یہاں تو بغیر نمک کے پتھر کھانا ہے۔"[5]

شاہ غلام علیؒ کی تجرّد پسندی

شاہ غلام علیؒ نے اپنی عمر فقر و تجرّد میں گزار دی اور زوج و اولاد سے بے نیاز رہے۔ درّالمعارف میں جا بجا ان کی تجرّد پسندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایک صوفی کو دنیا سے روگردانی کر کے ترک و تجرید کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسے چاہئے کہ وہ غیر اللہ سے انحراف کرے اور امیروں کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نکاح ان چیزوں میں مانع آتا ہے' کیوں کہ عورتوں میں صبر' توکّل اور قناعت جیسی صفات نہیں ہوتیں الّا ماشاء اللہ۔[6] شاہ صاحب دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بیوی اپنے خاوند کو دنیاوی اشیاء کے حصول کی طرف مائل کرتی ہے اور یہ چیز ترک و تجرید کے منافی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ صوفی زوج و اولاد سے بے نیاز رہے۔

شاہ غلام علیؒ نے ایک روز اپنی مجلس میں فرمایا کہ ایک بار خواجہ ناصر الدین عبیداللہ

---

۱ - شاہ رؤف احمد' درّالمعارف' ص ۴۰ ' ۴۱۔
۲ - ایضاً" ص ۹۱۔
۳ - ایضاً" ص ۳۰۔
۴ - ایضاً" ص ۴۸ -- نسبتِ این طریقۂ نقشبندیہ بے نمک است۔
۵ - شاہ رؤف احمدؒ' جواہر علویہ' ص ۱۳۱۔
۶ - شاہ رؤف احمدؒ' درّالمعارف' ص ۲۳۔

احرارؒ نے ارشاد فرمایا کہ ان سے ایک ایسا گناہ سرزد ہوا ہے کہ اگر وہ پانچ سو سال تک زندہ رہیں اور توبہ و استغفار کرتے رہیں، تب بھی اس گناہ کا کفارہ ممکن نہیں۔ حاضرینِ مجلس نے عرض کیا کہ ایسا کون سا گناہ ان سے سرزد ہوا ہے؟ خواجہ بزرگ نے فرمایا: "نکاح۔"[۱]

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے نکاح کیا تو ان کے ہم عصر صوفیوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ شیخ موصوف نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انہوں نے یہ نکاح امرِ ربّی کے تحت کیا ہے۔[۲] اس ضمن میں ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ صوفی کو نکاح نہیں کرنا چاہئے اور اسے عورتوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "آداب المریدین" میں حضرت ابونجیب عبدالقاہر سہروردیؒ لکھتے ہیں: "ہمارے زمانے میں صوفی کو نکاح نہیں کرنا چاہئے۔" یہ کئی سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں جو صوفی نکاح کرتے ہیں، ان پر سخت افسوس ہے۔"[۳]

شاہ غلام علیؒ کا استغنا

ایک روز شاہ صاحب نے اپنے احباب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کی خانقاہ میں ۱۴۰ طالبانِ حق موجود ہیں، لیکن انہیں ان کے کھانے اور کپڑے کی مطلق فکر نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے مزید ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اس کا خیال ہی دل سے نکال دیا ہے۔[۴] سرسید احمد خان، جن کا بچپن غلام علیؒ کی خانقاہ میں گزرا تھا، لکھتے ہیں: "حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتے تھے اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمے تھا اور باوجودیکہ کہیں سے ایک حبّہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا۔ اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا۔[۵] شاہ رؤف احمد رقم طراز ہیں کہ شاہ صاحب کبھی کبھی یہ رباعی، جو ان کے حسبِ حال تھی، پڑھا کرتے تھے:

ما در دوجہاں غیر ز خدا کار نداریم
ما یار بجز حضرتِ جبّار نداریم

---

۱ - شاہ رؤف احمد، 'درالمعارف'، ص ۲۳۔
۲ - ایضاً'' ص ۲۰۔
۳ - ایضاً'' ص ۲۲۔
۴ - ایضاً'' ص ۴۵۔
۵ - سرسید احمد خان، 'تذکرۂ اہلِ دہلی'، ص ۲۶۔

مستانہ فدائیم سر و پای برہنہ
حاجت بکسی جبّہ و دستار نداریم[۱]

ایک بار نواب ٹونک امیر خان نے خانقاہ کے خرچ کے لئے کچھ رقم مقرر کرنا چاہی تو شاہ صاحب نے شاہ رؤف احمدؒ سے کہا کہ نواب صاحب کو یہ شعر لکھ کر بھیج دیں:

آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
بامیر خان بگوی کہ روزی مقدّر است[۲]

شاہ رؤف احمدؒ رقم طراز ہیں کہ جب کوئی حکمران یا امیر خانقاہ کے لئے رقم مقرر کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا' تو شاہ صاحب یہ قطعہ پڑھ کر اس کی درخواست رد فرما دیتے:

خاک نشین درِ رحمانیم
بہ کہ بود ملک سلیمانیم
ہست چہل سال نمد پوشش
کہنہ نہ شد جامہ عریانیم[۳]

شاہ غلام علیؒ کی جواں ہمتی

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ جن دنوں موصوف دُرّالمعارف کی تدوین میں مصروف تھے' ان دنوں شاہ غلام علیؒ کی عمر پچھتر برس تھی۔ یک ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ اب موصوف کمزور ہو گئے ہیں۔ جس زمانے میں ان میں طاقت تھی تو موصوف جامع مسجد دہلی کے حوض کا پانی پیتے تھے اور قرآنِ پاک کے دس پارے روزانہ تلاوت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں دس ہزار بار نفی اثبات ان کا روزانہ معمول تھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں انہیں جامع مسجد انوار سے پُر نظر آتی تھی اور موصوف جس گلی محلّے سے گزرتے تھے' وہاں نور ہی نور نظر آتا تھا۔[۵]

شاہ رؤف احمدؒ فرماتے ہیں کہ شاہ غلام علیؒ کسی کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اگر ان کے کسی معتقد کے ہاں سے کھانا آتا تو موصوف اسے محتاجوں میں تقسیم فرما دیتے۔ ایک روز ایک امیر اور ایک "زنِ فاحشہ" کے ہاں سے کھانا آیا تو شاہ صاحب نے وہ کھانا محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔[۶]

---

۱ - شاہ رؤف احمد' دُرّالمعارف' ص ۹۰۔
۲ - شاہ رؤف احمد' جواہر علویہ' ص ۱۴۲۔
۳ - ایضاً۔
۴ - شاہ رؤف احمد' دُرّالمعارف' ص ۲۲۶۔
۵ - ایضاً" ص ۲۱۰۔
۶ - ایضاً" ص ۲۲۷۔

توسیعِ خانقاہ

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کی خانقاہ میں جگہ ناکافی تھی اور شاہ غلام علیؒ ارد گرد کے مکانات خانقاہ میں شامل کر کے اس کی توسیع کرنا چاہتے تھے۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان کے بعد شاہ ابوؒ سعید یہاں حلقہ کرائیں گے۔ اس کے علاوہ حدیث اور تفسیر کا درس دیں گے، اس لئے زیادہ ضرورت پڑے گی۔ علاوہ بریں لوگ دُور دُور سے یہاں آتے ہیں اور انہیں رہنے کو جگہ نہیں ملتی[1]!

زیارتِ قبور اور شاہ غلام علیؒ

درالمعارف کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اولیائے دہلی کے مزارات کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ شاہ رؤف احمد نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزارات پر شاہ غلام علیؒ کی حاضری کا ذکر کیا ہے[2]۔ ایک دوسرے موقع پر جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ شاہ غلام علیؒ کبھی کبھی خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر بھی تشریف لے جایا کرتے تھے[3]۔

حضرت شاہ غلام علیؒ کا یہ معمول تھا کہ موصوف بزرگوں کے یومِ وفات پر کھانا پکوا کر غریبوں اور محتاجوں کو کھلایا کرتے تھے۔ شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ان کی موجودگی میں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور شیخ محمد عابدؒ کے ایصالِ ثواب کے لئے کھانا پکوا کر تقسیم کیا تھا[4]۔

نصابِ زکوٰۃ

شاہ غلام علیؒ کی مجلس میں زکوٰۃ کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو موصوف نے فرمایا کہ زکوٰۃ ایک سال کے بعد واجب ہوتی ہے لیکن انہیں جب بھی کہیں سے کوئی رقم ملتی ہے موصوف اسی وقت اس کی زکوٰۃ نکال دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں انہوں نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر شبلیؒ سے

---

۱ - شاہ رؤف احمد، دُرّالمعارف، ص ۴۷۔

۲ - شاہ رؤف احمد، دُرّالمعارف، ص ۱۷۔

۳ - ایضاً، ص ۵۵، ۵۷۔

۴ - ایضاً، ص ۲۲۷۔

کسی نے زکوٰۃ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ شریعت کے مطابق سو روپے پر سال گزر جانے کے بعد ڈھائی روپے زکوٰۃ ہو گی لیکن ان کے نزدیک ڈھائی روپے بھی مستحقین میں تقسیم کر دیں اور سو روپے بھی[1]۔

شاہ غلام علیؒ اور سماع

ایک چشتی بزرگ نے حضرت خواجہ مودودؒ چشتی کے عرس کی تقریبات میں شرکت کے لئے شاہ صاحب کو دعوت نامہ بھیجا تو آپ نے کہا:

ما در جائیکہ مجلس سماع و وجد و تواجد باشد ہرگز نرویم اگر فاتحہ بزرگے از بزرگان دین باشد۔

ہم ایسی جہاں مجلس سماع' وجد اور تواجد ہو' ہر گز نہیں جائیں گے خواہ وہاں بزرگان دین میں سے کسی بزرگ کی فاتحہ ہی کیوں نہ ہو۔

شاہ غلام علیؒ اور ہنود

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک روز جب وہ شاہ صاحب کی مجلس میں پہنچے تو اس وقت وہاں مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مکتوبات کا درس ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب نے ایک موقع پر ہندوؤں کے مذہب کی بنیاد اور ان کی چاروں کتابوں کا ذکر فرمایا ہے' مرزا صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ الہامی کتابیں تھیں اور انہوں نے ایک کتاب میں "معارف" کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مرزا صاحب کی تحریر پڑھ کر شاہ غلام علیؒ نے فرمایا کہ اپنے پیر و مرشد کے کلام پر حرف گیری کرنا کمال بے ادبی ہے لیکن ان کے نزدیک ان کی کتابوں میں معارف نہیں پائے جاتے[2]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اپنے پیر و مرشد کی نسبت ہندوؤں کے بارے میں سخت روّیہ رکھتے تھے۔

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ چرن داس نامی ایک ہندو زاہد تھا اور وہ ترک و تجرید میں ثابت قدم تھا۔ ایک بار اس کا ایک معتقد ہر قدم پہ ماتھا ٹیکتا ہوا کئی ماہ میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انہوں نے خود اسے یہ مسافت طے کرتے ہوئے دیکھا تھا اور موصوف اس کے مجاہدے سے بڑے حیران ہوئے تھے۔ شاہ صاحب

---

۱ ۔ ایضاً" ص ۲۱۔

۲ ۔ شاہ رؤف احمد' درّالمعارف' ص ۶۵۔

ابھی اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ خدا جانے ان کے دل میں کیا خیال آیا اور انہوں نے استغفار پڑھتے ہوئے فرمایا کہ :ہدووں کے مجاہدات کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ بعدازاں انہوں نے تین بار کلمۂ طیبہ پڑھا اور اس کے بعد درود شریف پڑھنے لگے[1]۔

خصوصیاتِ مذاہبِ اربعہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ چاروں مذاہب کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ مثلاً حنفی مذہب میں ہدایہ جیسی عظیم کتاب موجود ہے جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ شافعی مذہب میں امام غزالیؒ جیسا فاضل موجود ہے اور حنبلی مذہب میں سیّد عبدالقادر جیلانیؒ جیسا بزرگ موجود ہے۔ مالکی مذہب میں امام مالکؒ جیسی شخصیت موجود ہے جو آیاتِ الٰہی میں سے ایک آیت تھے[2]۔

حنفی مذہب

شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ امام ابو حنیفہؒ کے مقلد تھے' لیکن اس کے باوجود موصوف امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کو خواب میں دیکھا تو انہوں نے خواجہ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کے مذہب میں بڑے بڑے اولیاء ہو گزرے ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اس واقعہ کے بعد خواجہ صاحب نے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی ترک کر دی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کسی نہ کسی امام کی تقلید لازمی ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کی پیروی بہتر ہے' کیوں کہ ایک انبوہِ کثیر اسی مسلک پر گامزن ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تین چوتھائی اُمت کا مذہب حنفی ہے اور ایک چوتھائی اُمت بقیہ تین آئمہ کی تقلید کرتی ہے۔ شاہ صاحب اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے: پیروی در مسائلِ جزئیات بمذہبِ حنفی اولیٰ است[3]۔

شاہ غلام علیؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ ایک حنفی کے لئے اپنے پاس مؤطاء امام محمدؒ رکھنی ضروری ہے کیوں کہ اس کتاب میں امامِ موصوف نے اپنے مذہب کی تائید میں "اخبارِ صریح" اور "آثارِ صحیح" جمع کئے ہیں[4]۔

حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ

ایک روز ایک شخص شاہ غلام علیؒ کی مجلس میں کہنے لگا کہ حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ

۱ - شاہ رؤف احمد' دُرّالمعارف' ص ۱۹۴۔
۲ - ایضاً" ص ۱۷۸۔
۳ - شاہ رؤف احمد' دُرّالمعارف' ص ۲۴۰۔
۴ - ایضاً" ص ۱۴۵۔

ہندوستان کے تمام اولیاءؒ سے افضل ہیں۔ اس کی بات سن کر شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ وہ کرۂ ارض کے اولیاءؒ سے افضل ہیں[1]۔ جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک روز ایک شخص شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کے دوران کہنے لگا کہ شیخ احمدؒ کے مکتوبات میں اس طرح لکھا ہے۔ شاہ صاحب نے پوچھا کون شیخ احمد؟ اس نے کہا کہ شیخ احمد سرہندیؒ۔ شاہ غلام علیؒ نے فرمایا "میری مجلس سے نکل جاؤ۔ میرے سامنے میرے پیر کی اس طرح بے ادبی کرتے ہو۔" چنانچہ اس شخص کو مجلس سے نکال دیا گیا[2]۔

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کا ذکر کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ ان کی ذاتِ گرامی ان سے پہلے ہزار سال میں گزرنے والے تمام اولیاء اللہ کے برابر ہے[3]۔ ایک روز شاہ رؤف احمد حاضر خدمت ہوئے تو اس وقت شاہ غلام علیؒ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کے فضائل بیان کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ "ہموزن اولیاء ہزار سالہ" ہیں[4]۔ ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات آپ کے نام کی برکت سے ہزار سال بعد حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کی ذات میں جلوہ گر ہوئے ہیں[5]۔ ایک بار شاہ صاحب نے ایک مجلس میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا یہ مشہور قول سنایا: "شیخ احمد آفتاب ہے اور ہمارے جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہیں۔ شیخ احمد کے معارف انبیائے کرام کے معارف جیسے ہیں[6]۔"

جامع ملفوظات تحریر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت موصوف مکتوباتِ امام ربّانیؒ کا درس دے رہے تھے۔ اسی طرح دو اور موقعوں پر بھی انہوں نے مکتوبات کے درس کا ذکر کیا ہے۔ شاہ صاحب مکتوبات امام ربّانیؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ زمین و آسمان میں عرفانِ یزداں میں حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کے مکتوبات جیسی اور کوئی کتاب نہیں ہے[7]۔

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں حاضرین کو بتایا کہ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ نے جو معارف

---

۱ - ایضاً" ص ۲۴۴۔
۲ - ایضاً" ص ۴۷۔
۳ - ایضاً" ص ۳۲۔
۴ - ایضاً" ص ۳۶ ' ۳۷۔
۵ - ایضاً" ص ۳۶۔
۶ - شاہ رؤف احمد' ذرّالمعارف' ص ۱۰۔
۷ - ایضاً" ص ۱۱۶۔

بیان فرمائے ہیں اُمتِ مُسلمہ میں سے کسی دوسرے بزرگ نے ان کا اظہار نہیں فرمایا۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مکتوبات کو سمجھنے میں ان کا ایسا ہی معاملہ ہے جیسا ایک عجمی اور اُمّی قرآنِ پاک کھول کر الفاظ پر انگلی رکھ کر یہ کہتا جائے: الٰہی راست گفتی، راست گفتی دُرسفتی دُرسفتی۔[۱]

شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ شاہ غلام علیؒ مکتوباتِ امام ربانیؒ کو پیرِ کامل سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "این ہم ہمبائی پیر است۔"[۲] شاہ غلام علیؒ سے روایت ہے کہ حضرت آدم بنوڑیؒ نے حضرت مجدِّدِ الفِ ثانیؒ کے احوال تحریر فرمائے تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک موقع پر یہ تحریر فرمایا تھا:

از توجہ اکابرانِ طریقت در دلِ سالک توجہی پیدا می شود و از توجہِ مرشدِ من زوالِ توجہ از دلِ من می شود۔[۳]	اکابرانِ طریقت کی توجہ سے سالک کے دل میں توجہ پیدا ہوتی ہے لیکن میرے مرشد کی توجہ سے دل سے توجہ زائل ہو جاتی ہے۔

خدا ہی جانتا ہے کہ اس کتاب میں حضرت آدم بنوڑیؒ نے کیسے کیسے مُوتی رُولے ہوں گے۔ اب یہ کتاب ناپید ہو چکی ہے اور اگر اس کا کوئی نسخہ کہیں سے دریافت ہو جائے تو حضرت مجدِّدِ الفِ ثانیؒ کے رُوحانی کمالات کو سمجھنے میں ممِد و معاون ثابت ہو۔

بُو علی سینا

شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز انہوں نے حضرت مجدِّدِ الفِ ثانیؒ کے مکتوبات کا مطالعہ کیا اور ان کی برکت سے بڑا فیض پایا۔ بعد ازاں انہوں نے شاہ ولی اللہ محدّثؒ کی ایک کتاب پڑھی جس سے اسرارِ ملکوت ظاہر ہوا۔ ایک روز انہوں نے بُوعلی سینا کی ایک کتاب مطالعہ کے لئے اٹھائی تو ابھی ایک صفحہ ہی پڑھنے پائے تھے کہ ان کے قلب پر تاریکی چھانے لگی۔ انہوں نے وہ کتاب رکھ دی اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اس تاریکی کو دُور کرنے میں مصروف ہو گئے۔[۴]

---

۱ - ایضاً" ص ۹۷۔
۲ - ایضاً" ص ۴۸۔
۳ - ایضاً" ص ۸۴۔
۴ - شاہ رؤف احمد، دُرّالمعارف، ص ۲۴۴۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

دُرّالمعارف میں متعدد بار حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا ذکر آیا ہے۔ شاہ صاحب کے آباؤ اجداد سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے[1]۔ شاہ صاحب کے والد بزرگ وار انہیں اپنے مرشد شاہ ناصرالدینؒ سے بیعت کرانا چاہتے تھے لیکن جس روز شام غلام علیؒ بٹالہ سے دہلی پہنچے، اسی روز شاہ ناصرالدینؒ انتقال کر گئے۔ شاہ غلام علیؒ اگرچہ نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے لیکن انہیں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ملفوظات میں موصوف کا بار بار ذکر آتا ہے۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ

یہ واقعہ اکثر تذکروں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ خواجہ معین الدینؒ اپنے بیٹوں کے اصرار پر حصول اراضی کے لئے سلطان شمس الدین التمش سے ملنے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب جیسا تارک الدنیا بزرگ غنی کے دروازے پر جانے کے لئے کس طرح آمادہ ہو گیا اور زمین لے کر کیسے راضی ہو گیا؟[2]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور سماع

شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس میں سماع کے وقت مزامیر، مستورات اور بے ریش نوجوان موجود نہیں ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں سماع کے دوران تالی بجانے کی بھی ممانعت تھی۔ اس طرح کی سماع شریعت میں جائز ہے[3]۔ شاہ صاحب سے روایت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ کاش ان کا انتقال سماع سنتے ہوئے ہو[4]۔ شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ سماع وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور غیر اللہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی سنتے ہیں اسے حق کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ ان کی نظروں سے "غیریت" اٹھ جاتی ہے[5]۔

---

۱ - ایضاً" ص ۸۹۔

۲ - ایضاً" ص ۹۸۔

۳ - شاہ رؤف احمد، دُرّالمعارف ص ۷۔

۴ - ایضاً" ص ۶۔

۵ - ایضاً" ص ۶۔

شاہ سعداللہ گلشنؒ

شاہ گلشنؒ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے اور اپنے زہد و ریاضت کے لئے دور دور تک مشہور تھے۔ ان کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے تیس سال ایک ہی کمبل میں گزار دیئے تھے۔ شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ دو تین روز بعد موصوف بازار سے گرے پڑے خربوزے اور تربوز کے چھلکے جمع کر لاتے اور انہیں دھو کر تناول فرماتے تھے۔ ان کی رہائش جامع مسجد میں تھی اور جب انہیں پیاس لگتی تو حوض سے پانی کے دو تین چلو پی لیتے تھے۔ ایک روز ایک فاحشہ عورت، جو بڑے اچھے کپڑے پہنے اور بناؤ سنگھار کئے ہوئے تھی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ شاہ گلشنؒ کے معتقدین نے ان سے کہا کہ اسے توجہ دیں۔ شاہ گلشنؒ نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ عورت سرمنڈائے اور کفنی پہنے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے شاہ گلشنؒ کے ہاتھ پر توبہ کی اور ان کے حلقۂ مریدی میں داخل ہو گئی[1]۔

شاہ غلام علیؒ سے روایت ہے کہ ایک روز شاہ گلشنؒ تشریف فرما تھے کہ ایک غیر مسلم ادھر آ نکلا۔ شاہ گلشنؒ اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ایک غیر مسلم کا اس قدر احترام دیکھ کر حاضرین بڑے حیران ہوئے۔ جب وہ غیر مسلم قریب آیا تو شاہ صاحب نے اس سے پوچھا "تم سے میرے مرشد کی خوشبو آ رہی ہے۔" اس نے عرض کیا کہ اس کے پاس ایک کتاب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ شاہ گلشنؒ نے اس کتاب کو لے کر کھولی تو اس میں ان کے مرشد حضرت عبدالاحدؒ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر موجود تھی[2]۔

شاہ ابوُ سعید مجددیؒ

شاہ ابوُ سعیدؒ، غلام علیؒ کے لاڈلے مرید، خلیفہ اور جانشین تھے۔ شاہ صاحب ان کے ساتھ بڑی شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان پر اس قدر شفقت اور عنایت کا سبب پوچھتا تو موصوف فرماتے کہ ابوُ سعید صاحب اجازت و خلافت تھے اور ان کے پانصد مرید تھے۔ وہ سب کو چھوڑ کر اپنے مُرشد کی زندگی ہی میں ان کے پاس چلے آئے تھے، اس لئے ان پر خاص لُطف و عنایت کیوں نہ کریں[3]۔

---

۱ - ایضاً" ص ۷۱۔

۲ - ایضاً" ص ۳۴۔

۳ - شاہ رؤف احمد' دُرّالمعارف' ص ۷۵۔

شیخ ابنِ عربیؒ

شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ طائفۂ وجودیہ کے سرخیل حضرت محی الدین اکبر ابن عربیؒ حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ کی توجہ سے اس "مقامِ تنگ" سے ترقی کر کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جائیں گے۔[1]

حضرت آدم بنوڑیؒ

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت آدم بنوڑیؒ جس شخص کو بیعت کرتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اسے فنائے قلبی تک پہنچا دیتے تھے۔ ایک بار ایک فاسق نے مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے فرمایا کہ پہلے اپنا ظاہر سنّت کے مطابق بنا کر آؤ پھر تمہاری بیعت لوں گا۔ وہ شخص بے دل ہو کر ان کی خانقاہ سے لوٹ گیا۔ اس کی واپسی کے بعد انہیں القا ہوا کہ انہوں نے ایک طالبِ خدا کو اپنے دَر سے محروم لوٹا دیا ہے۔ حضرت نے فوراً ایک شخص کو اس کی تلاش میں دوڑایا اور اسے فوراً ان کی خدمت میں پہنچنے کا پیغام دیا۔ اس شخص نے شیخ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے ایک دوسرے شخص کو بلانے بھیجا لیکن اس نے حسبِ سابق آنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے ایک شخص کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس کے کان میں "اللہ" کہہ دے۔ حضرت کا حکم ملتے ہی وہ شخص بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے کہا کہ وہ چپکے سے اس کی بات سن لے۔ جب اس نے اپنا کان قریب کیا تو قاصد نے کہا کہ شیخ نے "اللہ" کہا ہے۔ اللہ کا نام سنتے ہی وہ شخص بے تاب ہو گیا اور گرتے پڑتے حضرت کی خدمت میں پہنچا۔ شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ حضرت نے اس سے بیعت لی اور اسے "ولایت نقشبندی" حاصل ہو گئی۔[2] شاہ غلام علیؒ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ جب حضرت آدم بنوڑیؒ حجِ بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو مسجدِ قباء سے مسجدِ نبوی تک ہر قدم پر دوگانہ ادا کرتے ہوئے پہنچے تھے۔[3]

خواجہ محمد زبیرؒ

شاہ غلام علیؒ سے روایت ہے کہ خواجہ محمد زبیر سرہندیؒ نمازِ مغرب کے بعد اوّابین کے

---

۱ - ایضاً" ص ۱۵۴۔

۲ - شاہ رؤف احمد' درّالمعارف' ص ۹۹ - ۹۸۔

۳ - ایضاً" ص ۱۹۷۔

نوافل ادا فرماتے اور ان نوافل میں دو پارے تلاوت فرماتے۔ اوّابین سے فراغت کے بعد موصوف حلقہ کرتے اور مریدوں کو توجہ دیتے۔ بعد ازاں آپ گھر تشریف لے جاتے اور وہاں عورتوں کو توجہ دیتے۔ نصف شب کے بعد خواجہ صاحب چند گھڑی آرام فرماتے اور بیدار ہو کر تہجّد کی نماز ادا فرماتے۔ تہجّد کے نوافل میں موصوف چالیس اور کبھی ساٹھ مرتبہ سورۂ یٰسین تلاوت فرماتے۔ تہجّد سے لے کر چاشت کی نماز تک موصوف مراقبہ فرماتے اور اگر طبیعت چاہتی تو حلقہ بھی کرتے تھے۔ چاشت کے بعد خواجہ صاحب قیلولہ فرماتے اور بیدار ہو کر زوال کے نفل ادا فرماتے۔ ان نوافل میں بڑی لمبی قرأت فرماتے۔ یہ عمل چار گھڑی جاری رہتا تھا۔ بعد ازاں موصوف ختمِ خواجگان پڑھتے اور نمازِ ظہر کے بعد تلاوت فرماتے تھے۔ تلاوت سے فراغت کے بعد کھانا تناول فرماتے۔ یہی کھانا رات دن کے لئے کافی ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد آں جناب عصر کی نماز ادا فرماتے اور نماز سے فارغ ہو کر مشکوٰۃ شریف یا مکتوباتِ امامِ ربانیؒ کا درس دیتے تھے۔

خواجہ محمد زبیرؒ گھر سے مسجد آتے تو راستے میں امراء اپنے دوشالے زمین پر بچھاتے اور ان کے قدم زمین پر نہ پڑنے دیتے۔ اگر کبھی کسی کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تو ان کی سواری شاہانہ انداز سے نکلتی تھی۔ ایک بار خواجہ صاحب کی سواری جامع مسجد کے نیچے سے گزری تو شاہ گلشنؒ نے دیکھا کہ ایک پالکی میں کوئی صاحب سوار ہیں اور ان کی پالکی کے پیچھے کئی پالکیاں جا رہی ہیں۔ ان پالکیوں کے ساتھ لوگوں کا ہجوم تھا۔ شاہ گلشنؒ نے دیکھا کہ جو پالکی سب سے آگے ہے اس پالکی سے لے کر آسمان تک نُور ہی نُور نظر آ رہا ہے اور گلی کوچے اس نُور سے پُر ہیں۔ شاہ گلشنؒ اس وقت ایک کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کمبل میں تیس سال گزارے تھے۔ موصوف نے حاضرین سے کہا کہ یہ کیا سبب ہے کہ اس کمبل میں وہ انوار نظر نہیں آتے جو اس امیر کی پالکی میں نظر آ رہے ہیں۔ شاہ گلشنؒ کے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص نے ان کی بات سن کر کہا کہ یہ خواجہ محمد زبیرؒ کی سواری جا رہی ہے۔ شاہ گلشنؒ نے اس کی بات سن کر فرمایا "الحمدللہ۔ وہ ہمارے پیرزادے ہیں۔ ہماری آبرو رہ گئی ہے۔" موصوف نے اپنے مریدوں کو خواجہ صاحب کی خدمت میں فیض حاصل کرنے کے لئے بھیجا اور یہ اعلان کیا کہ جب تک خواجہ صاحب یہاں موجود ہیں، ان کے لئے مرید کرنا جائز نہیں ہے[1]۔ شاہ رؤف احمدؒ رقم طراز ہیں کہ شاہ غلام علیؒ، خواجہ محمد زبیرؒ کے کمالات کے معترف تھے اور ان کے مرید ان کی اجازت سے خواجہ صاحب کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے[2]۔

---

۱ - شاہ رؤف احمد، دُرّالمعارف، ص ۱۱۹ - ۱۱۸۔

۲ - ایضاً، ص ۹۵۔

خانوادہ شاہ ولی اللہؒ سے تعلقات

جامع ملفوظات اس بات کے شاہد ہیں کہ شاہ غلام علیؒ کی شاہ عبدالعزیزؒ[۲] اور شاہ رفیع الدینؒ کے ساتھ صحبت رہتی تھی اور موصوف ان کے ساتھ علمی مسائل پر گفتگو فرمایا کرتے تھے[۱]۔ شاہ غلام علیؒ کو شاہ عبدالعزیزؒ سے تلمذ تھا اور ان کے باوجود شاہ عبدالعزیزؒ ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔ شاہ صاحب اپنے شاگردِ رشید کی فضیلت کے بھی معترف تھے[۲]۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے تلامذہ جب نصابِ تعلیم مکمل کر لیتے تو موصوف انہیں رُوحانی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کے لئے کچھ عرصہ کے لئے شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہؒ سے اختلاف

شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ شاہ ولی اللہؒ نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے نظریۂ وحدت الوجود اور نظریۂ وحدت الشہود میں جو تطبیق کی ہے اس میں ان سے خطا ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے حال کو قال بنا کر معارفِ کشفیہ کو علمی بحث بنا دیا ہے۔ جو لوگ حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے معارف سے فیض یاب ہوئے ہیں ان کا یہ تجربہ ہے کہ ابتدا میں توحیدِ وجودی ظاہر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ان پر لطیفۂ قلب کے اسرار ظاہر ہوتے ہیں اور بعد ازاں جب وہ لطیفۂ نفس کے اسرار سے واقف ہوتے ہیں تو ان پر توحیدِ شہودی منکشف ہوتی ہے۔ حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے معارف ان دونوں مقامات سے ماوراء ہیں۔ شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ ابن عربیؒ کے معارف اگر قطرہ ہیں تو حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے معارف کو دریائے محیط کہا جا سکتا ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابنِ عربیؒ، حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے ہم عصر ہوتے اور ان کی زبان سے یہ معارف سنتے اور سمجھتے تو موصوف ان سے فیض یاب ہوتے[۳]۔

---

۱ ۔ ایضاً" ص ۴۸۔

۲ ۔ ایضاً" ص ۱۲۳۔

۳ ۔ شاہ رؤف احمد، دُرّالمعارف، ص ۱۸۵۔

شاہ غلام علیؒ کی ایک نادر تصنیف

دُرّالمعارف کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے "رسالۂ مراقبات" کے عنوان سے ایک تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ شاہ رؤف احمدؒ نے یہ مختصر سا رسالہ دُرّالمعارف میں شامل کر دیا۔